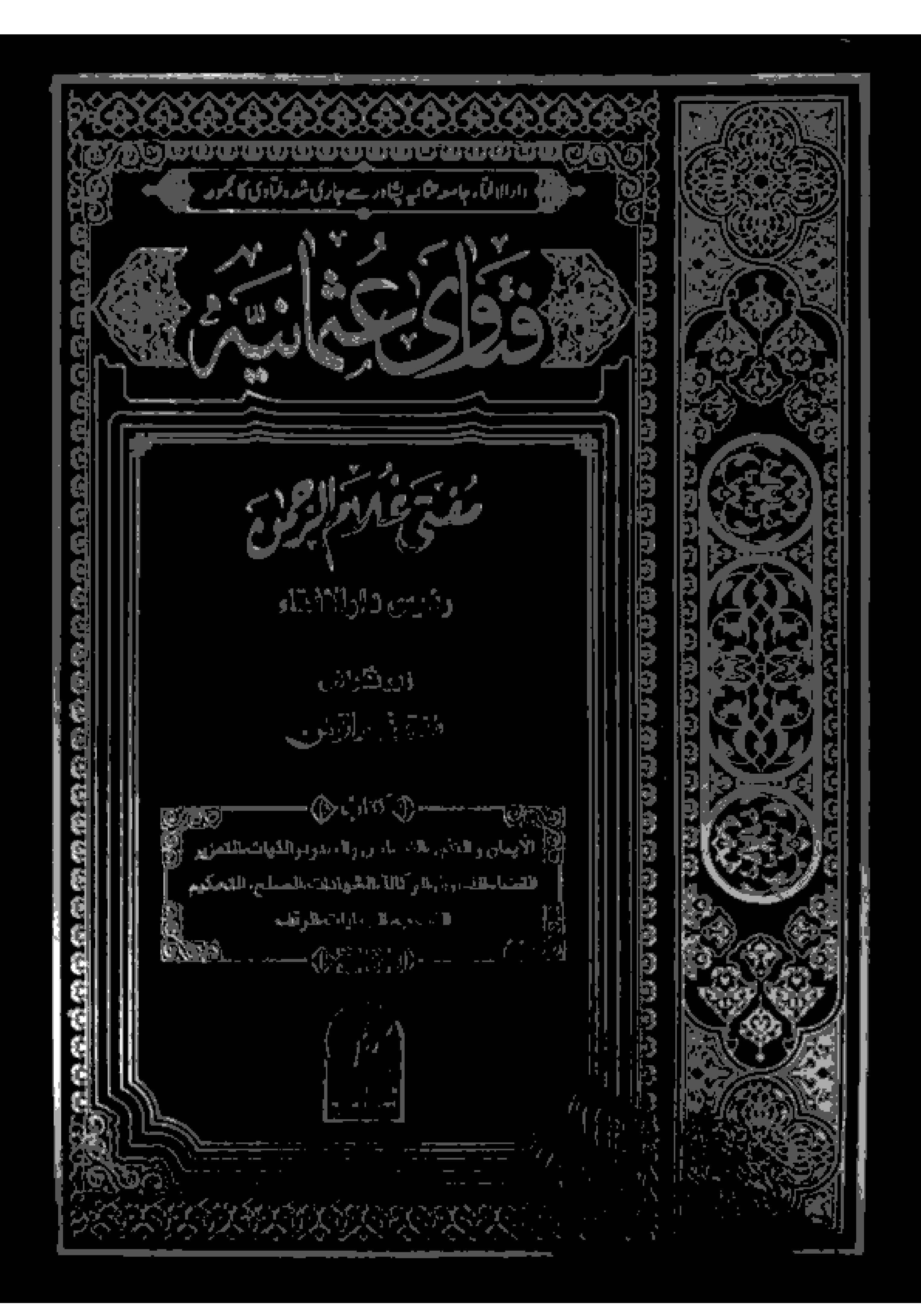
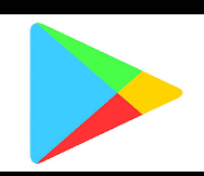

دارالافتاء جامعہ عثمانیہ پشاور سے جاری شدہ فتاویٰ کا مجموعہ
فتاویٰ عثمانیہ
مفتی غلام الرحمٰن
رئیس دارالافتاء



Maktaba Tul Ishaat

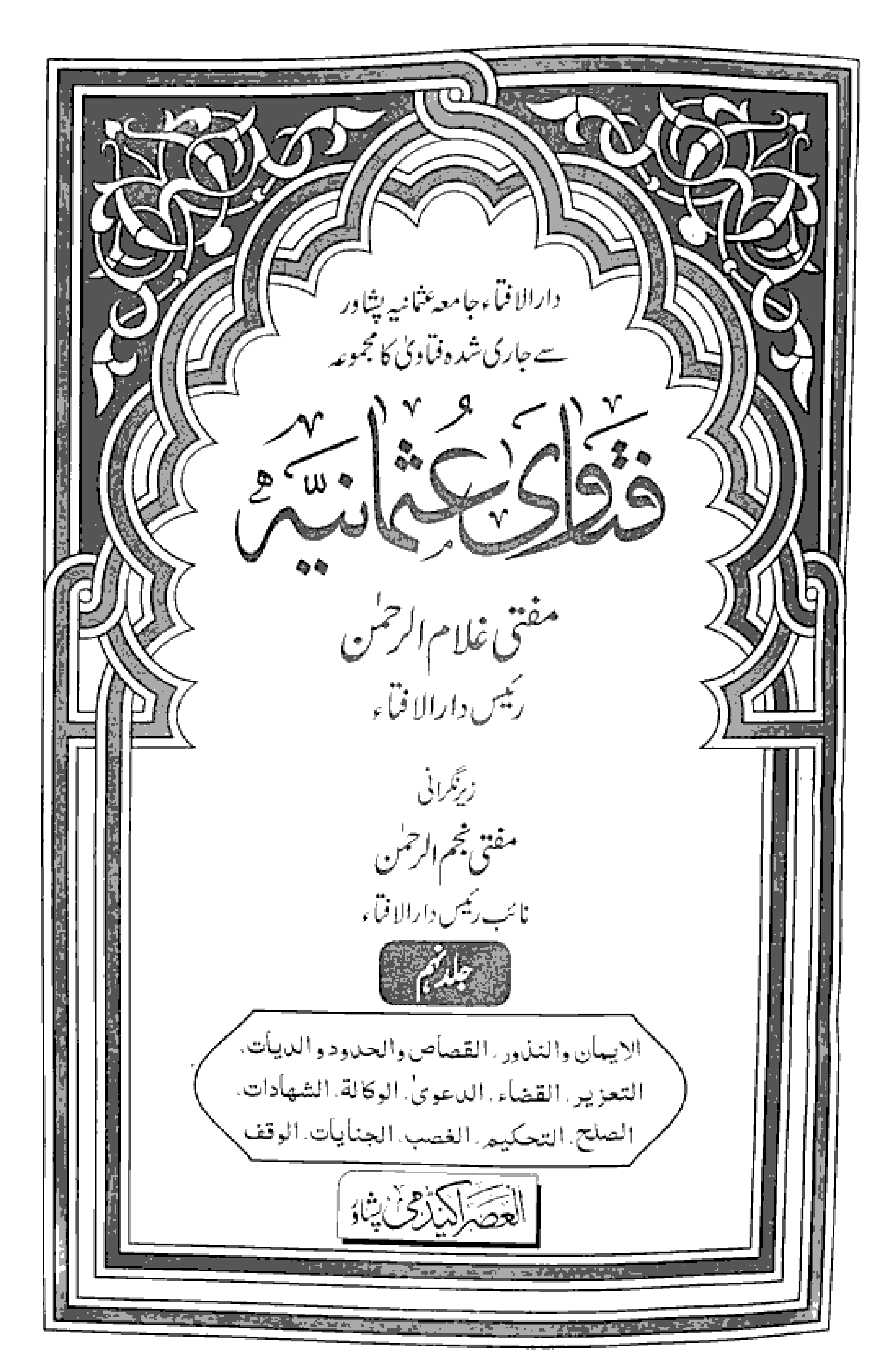


تمام فنون کے کتب ہمارے ویب سائٹ اور پلے سٹور سے فری ڈاون لوڈ کریں۔ ہم روزانہ کی بنیاد پر اس میں مزید نئے کتب شامل کر رہے ہیں نئے شامل شدہ کتب لیے روزانہ ہمارے پلے سٹور اور ویب سائٹ کو باقاعدگی سے چیک کیا کریں۔

اپنی کتاب کو ہمارے ویب سائٹ پر شائع کرنے کے لیے رابطہ کریں

تفاسیر	خطبات	منطق
احادیث	سیرت	معانی
فقہ	تاریخ	تصوف
سوانح حیات	صرف	تقابل ادیان
درس نظامی	نحو	تجوید
لغت	فلسفہ	نعت
فتاوی	حکمت	تراجم
اصلاحی	بلاغت	تبلیغ و دعوت
آڈیو دروس	مناظرے	تمام فنون


العصر اکیڈمی پشاور
AL-ASR ACADEMY
JAMIA USMANIA PESHAWAR



دارالافتاء جامعہ عثمانیہ پشاور
سے جاری شدہ فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ عثمانیہ

مفتی غلام الرحمٰن
رئیس دارالافتاء

زیر نگرانی
مفتی نجم الرحمٰن
نائب رئیس دارالافتاء

جلد نہم

الایمان والنذور۔ القصاص والحدود والدیات۔
التعزیر۔ القضاء۔ الدعویٰ۔ الوکالۃ۔ الشھادات۔
الصلح۔ التحکیم۔ الغصب۔ الجنایات۔ الوقف

العصر اکیڈمی پشاور





علمی افادات: شیخ التفسیر والحدیث
حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہ
مہتمم ورئیس دارالافتاء جامعہ عثمانیہ پشاور

زیرنگرانی: حضرت مولانا مفتی نجم الرحمٰن مدظلہ
استاذالحدیث ونائب رئیس دارالافتاء جامعہ عثمانیہ پشاور

تحقیق وتبویب: شرکائے شعبہ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء

باہتمام: احسان الرحمٰن عثمانی

سنِ طباعت اشاعت ہفتم:
ذی الحجہ 1442ھ / جولائی 2021ء

سنِ طباعت اشاعت اوّل:
جمادی الثانیہ 1437ھ / مارچ 2016ء
سنِ طباعت اشاعت دوم:
جمادی الاولیٰ 1438ھ / فروری 2017ء
سنِ طباعت اشاعت سوم:
رجب المرجب 1439ھ / اپریل 2018ء
سنِ طباعت اشاعت چہارم:
ربیع الثانی 1440ھ / دسمبر 2018ء
سنِ طباعت اشاعت پنجم:
ربیع الاول 1441ھ / نومبر 2019ء
سنِ طباعت اشاعت ششم:
رجب المرجب 1442ھ / دسمبر 2020ء





Ihsan.usmani@gmail.com
+92 333-9273561 / +92 321-9273561
+92 312-0203561 / +92 315-4499203

ملنے کا پتہ
مکتبہ العصر
احاطہ جامعہ عثمانیہ پشاور
عثمانیہ کالونی نوتھیہ روڈ پشاور کینٹ
صوبہ خیبر پختونخوا، پاکستان
رابطہ: 0314 9061962 / 0348 0191692



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست جلد ۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	کتاب الایمان والنذور	
	(مباحث ابتدائیہ)	
1	ایمان کی مشروعیت قرآن وحدیث سے	1
2	یمین کا لغوی اور اصطلاحی معنی	1
3	قسم کے مترادف الفاظ	2
4	قسم کھانے کا حکم	2
5	صحت حلف کے لیے شرائط	3
6	یمین منعقد ہونے کی ترتیبیں	3
7	(۱) حالف سے متعلق شرائط	3
8	(۲) محلوف علیہ کی شرائط	3
9	(۳) محلوف بہ کی شرائط	3
10	(۴) صیغہ قسم سے متعلق شرائط	4
11	کس کی قسم کھائی جائے؟	4
12	کن چیزوں کی قسم کھانا درست نہیں	4
13	یمین میں عرف کا کردار	5
14	قرآن مجید کی قسم	5
15	کسی حلال چیز کو خود پر حرام کرنا	5
16	خود کو یہودی یا منافق کہنے کا حکم	6

کتاب القصاص والحدود والدیات

(مباحث ابتدائیہ)

باب حد قطع الطريق

(مباحث ابتدائیہ)

باب حد الزنا

(مباحث ابتدائیہ)

قصاص، حدود، دیات

(مسائل)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

کتاب التعزیر

(مباحث ابتدائیہ)

❁❁❁

کتاب التعزیر

(مسائل)

باب الدعوی

(مباحث ابتدائیہ)

مسائل

(باب الدعوی)

مسائل

(كتاب الوكالة)

کتاب الشہادات

(مباحث ابتدائیہ)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	مسائل	
	(کتاب الشهادات)	
389	جھوٹی گواہی دے کر رقم وصول کرنا	266
390	گواہ کو مشہود بہ کا علم ہونا	267
391	گواہوں کی گواہی کے الفاظ کا مختلف ہونا	268
392	فاسق کی گواہی	269
393	جھوٹی گواہی دینے والوں کی گواہی	270
394	بہن کے لیے گواہی دینا	271
395	نابالغ بچوں کی گواہی	272
396	ملازمت کے حصول کے لیے دینی اسناد پیش کرنا	273
397	قصاص کے باب میں مجروح اور عورت کی گواہی کا اعتبار	274
398	جعلی شناختی کارڈ بنوا کر ملازمت حاصل کرنا	274
399	جعلی سند سے عہدہ حاصل کرنا	276
400	کسی غیر سے امتحان دلوا کر ڈگری حاصل کرنا	277
401	حدِ زنا میں گواہوں کی تحدید	277
402	مدعیٰ علیہ کے یمین کے بعد مدعی کا گواہ پیش کرنا	279
	❁❁❁	
	کتاب الصلح	
	(مباحث ابتدائیہ)	
403	تعارف اور حکمتِ مشروعیت	280
404	لغوی تحقیق	280

کتاب التحکیم

(مباحث ابتدائیہ)

مسائل

(کتاب الغصب)

کتاب الجنایات

(مباحث ابتدائیہ)

کتاب الوقف

(مسائل)

باب أحكام المسجد

(مسائل)

کتاب الأیمان والنذور

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اسے قوتِ گویائی عطا فرما کر مافی الضمیر کے اظہار کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ قوتِ گویائی کے جوہر سے مالا مال کرنے کے بعد اس کو چند ایسے اسالیب کی بھی ضرورت تھی جن سے وہ اپنی گویائی میں قوت اور پختگی کا حسن بھر دے۔ شریعتِ مطہرہ نے اس ضرورت کا ادراک کرتے ہوئے ایک ایسا اسلوب (قسم) متعارف کروایا جو کئی حکمتوں کا جامع ہے، مثلاً:

(۱) مخاطب کو اپنے کلام کی سچائی کا یقین دلانا۔

(۲) خود کو کسی ایسے کام پر اُبھارنا یا اس سے منع کرنا جو شاید قسم کے بغیر نہ ہو سکے۔

(۳) مخاطب کو کسی کام کی اہمیت جتا کر اس کو اُبھارنا یا منع کرنا۔(۱)

ایمان کی مشروعیت قرآن وحدیث سے:

ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا﴾(۲)

ترجمہ: قسم کو مؤکد کرنے کے بعد مت توڑو۔

بہت سے مواقع پر خود اللہ تعالیٰ نے بھی قسم کھائی ہے اور متعدد احادیث سے رسول اللہ ﷺ کا قسم کھانا بھی ثابت ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ کے ہاں اس پر امت کا اجماع بھی ہے۔(۳)

یمین کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

ایمان جمع یمین کی ہے۔ بمعنی قوت، قسم، برکت، دایاں ہاتھ اور دائیں جہت۔(۴)

---

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة أيمان: ۷/۲۴۵

(۲) النحل: ۹۱

(۳) قاموس الفقه، مادة يمين، بحواله المغني: ۵/۳۵۳

(۴) الموسوعة الفقهية، مادة أيمان: ۷/۲۴۵

جب کہ اصطلاح میں یمین کی تعریف کچھ یوں ہے:

"هو عقد قوي به عزم الحالف على الفعل أو الترك".(۱)

ترجمہ: ایسے الفاظ جن سے قسم کھانے والا کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر ارادے میں پختگی لائے۔

قسم کے مترادف الفاظ:

الحلف، القسم، العهد، الميثاق، الإيلاء (۲)

ایمان کی چند اور خاص قسمیں بھی ہیں، مثلاً: ایلاء، لعان، قسامہ، یمین مغلظہ، یمینِ بیعت، یمینِ الاثبات والانکار (مقدمات اور عدالت سے متعلقہ قسمیں) کتب فقہ میں ان سب کی تعریفات اور احکام کی تفصیل موجود ہے۔ (۳)

قسم کھانے کا حکم:

قسم کھانا جائز ہے، البتہ اس میں افراط مناسب نہیں، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا تَجعَلُوا اللّٰهَ عُرضَةً لِأَيمَانِكُم﴾

ترجمہ: اللہ (کے نام) کو اپنی قسموں کے لیے نشانہ نہ بناؤ۔ (۴)

اہل علم کے ہاں حکم کے اعتبار سے قسم کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) واجب: اگر قسم کے ذریعے کسی بے گناہ انسان کی جان بچائی ہو۔

(۲) مستحب: مسلمانوں کے مابین صلح کرنے یا کسی کے شر کو ختم کرنے کے لیے۔

(۳) مباح: کسی مباح چیز کے کرنے یا چھوڑنے کے لیے، کسی امر واقعی کی خبر کے لیے یا اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے۔

(۴) مکروہ: مکروہ کام کرنے کے لیے یا مستحب کام چھوڑنے کے لیے کھائی جانے والی قسم۔

(۵) حرام: جھوٹی بات، ارتکابِ معصیت یا ترکِ واجب پر کھائی جانے والی قسم۔ (۵)

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الأيمان: ٤٧٠/٥، ٤٧١

(۲) فتح القدير، كتاب الأيمان: ٣٤٧/٤

(۳) الموسوعة الفقهية، مادة أيمان: ٢٤٩/٧

(٤) البقرة: ٢٢٤

(٥) قاموس الفقه، مادة يمين: ٣٥٣/٥، ٣٥٤

رکنِ یمین:

اللفظ الذي يستعمل في اليمين بالله تعالى.(۱)

ترجمہ: وہ لفظ جس کے ذریعے اللہ پر قسم کھائی جائے۔

صحت حلف کے لیے شرائط:

(۱) قسم پر تلفظ ضروری ہے، محض نیت معتبر نہیں۔

(۲) قسم پر اتنی اونچی آواز میں تکلم کرنا کہ کم از کم خود سن سکے، البتہ اخرس یعنی گونگے کے لیے اشارہ بھی تلفظ کے قائم مقام ہے۔(۲)

یمین منعقد ہونے کی شرطیں:

فقہائے کرام کے ہاں شرائط یمین چار قسم پر ہیں:

(۱) حالف سے متعلق شرائط:

عاقل، بالغ اور مسلمان ہو۔ حنفیہ کے ہاں یمین کے انعقاد کے لیے نہ تو اختیار شرط ہے اور نہ ارادہ، لہٰذا جبراً کھائی جانے والی قسم یا مزاح میں کھائی جانے والی قسم بھی معتبر ہوگی۔

(۲) محلوف علیہ کی شرائط:

جس کے متعلق قسم کھائی جاتی ہے "محلوف علیہ اور مقسم علیہ" کہلاتا ہے۔ اس کی دو شرطیں ہیں:

(۱) مستقبل کے کسی کام سے متعلق ہو۔

(۲) عادتاً یا فی نفسہٖ ممکن ہو۔

(۳) محلوف بہ کی شرائط:

جس پر قسم کھائی جائے، وہ لفظ "اللہ" ہو یا اللہ کے وہ اسماء وصفات ہوں جن پر عرف میں قسم کھائی جاتی ہو۔

---

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الأيمان، فصل في ركن اليمين: ۱۳/٤

(۲) الموسوعة الفقهية، مادة أيمان: ٢٦٦/٧

(۴) صیغۂ قسم سے متعلق شرائط:

(۱) محلوف بہ اور محلوف علیہ کے درمیان غیر ضروری فصل نہ ہو۔

(۲) استثنا سے خالی ہو۔ استثنا کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ قسم اور استثنا میں ضرورت، یعنی سانس، کھانسی وغیرہ سے زیادہ وقت فاصل نہ ہو۔(۱)

کس کی قسم کھائی جائے؟

حنفیہ کے ہاں مندرجہ ذیل اسما وصفات سے قسم کھانا جائز ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ کے اسم ذات ''اللہ'' سے یا مختلف زبانوں میں اس کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ جیسے: خدا، God

(۲) اللہ تعالیٰ کے ان تمام ناموں سے جو قرآن وحدیث سے ثابت ہوں، چاہے ان سے قسم متعارف ہو یا نہ ہو، البتہ اگر نام صرف اللہ کے ساتھ مختص ہو تو پھر خاص اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لینے کی نیت ضروری نہیں، بخلاف اسم مشترک (کریم، رحیم، حکیم وغیرہ) کے، اس میں اگر غیر اللہ کی نیت کی تو قسم معتبر نہیں۔

(۳) اللہ کے وہ نام جو قرآن وحدیث میں مذکور ہوں، لیکن وہ مختلف زبانوں میں صرف اللہ کے لیے بولے جاتے ہوں، ان اسما میں لوگوں کے عرف کا اعتبار ہوگا۔ اگر عرف میں وہ قسم کے لیے مستعمل ہوں تو ٹھیک ہے، ورنہ قسم معتبر نہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی اُن صفات سے جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہوں، ان سے قسم متعارف ہو یا نہ ہو۔

(۵) صفات مشترکہ سے، البتہ ان میں بھی عرف کو دیکھا جائے گا۔ اگر عرف میں بطورِ قسم متعارف ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ نہیں۔(۲)

کن چیزوں کی قسم کھانا درست نہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو زیادہ تر مخلوق کے لیے استعمال ہوں، مثلاً: علم، رحمت اور غضب وغیرہ، البتہ اگر عرف میں یہ صفات اللہ تعالیٰ کے لیے زیادہ استعمال ہوں اور لوگ اس سے قسمیں بھی کھاتے ہوں تو پھر قسم کھانا درست ہے۔

(۲) ان اسما وصفات سے جن کا اطلاق اللہ پر درست نہیں، اُن میں نہ نیت کا اعتبار ہوگا اور نہ عرف کا۔

---

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة أيمان: ٢٦٥/٧ ـ ٢٧٠

(٢) بدائع الصنائع، كتاب الأيمان، فصل في ركن اليمين: ١٣/٤ ـ ١٥، الموسوعة الفقهية، مادة أيمان: ٢٥٤/٧، ٢٥٥

(۳) غیر اللہ کی قسم، مثلاً: کسی پیغمبر، بزرگ، ماں باپ، اولاد، زندگی اور موت یا کسی متبرک چیز، مثلاً: کعبہ، زم زم وغیرہ کی قسم کھانا جائز نہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ: ’’طاغوت (معبودانِ باطلہ) اور اپنے آباؤ اجداد کی قسم نہ کھاؤ۔ جو تم میں سے قسم کھانا چاہے تو اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔(۱)

یمین میں عرف کا کردار:

یمین کے سلسلے میں فقہائے کرام نے عرف کا اعتبار کیا ہے، لہٰذا عرف میں جس تعبیر اور جس صفت سے قسم مراد لی جاتی ہو اور اس سے شریعت میں کوئی ممانعت نہ ہو تو وہ قسم ہوگی اور جس کے بارے میں عرف نہ ہو، اس سے قسم نہیں ہوگی۔ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

”وعن مشائخنا من قال: ماتعارفه الناس يميناً يكون يمينا، إلا ما ورد الشرع بالنهي عنه، ومالم يتعارفوه يمينا لا يكون يميناً.(۲)

قرآن مجید کی قسم:

فقہائے حنفیہ کے ہاں قرآنِ کریم سے قسم منعقد نہیں ہوتی۔ ائمہ ثلاثہ اور احناف میں سے علامہ ابن ہمامؒ کی رائے یہ ہے کہ اس سے قسم منعقد ہوجاتی ہے۔ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں چونکہ قرآن مجید پر قسم کھانا مروج ومعروف ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام بھی ہے اس لیے قرآن کریم پر قسم کھانا معتبر ہوگا۔(۳)

کسی حلال چیز کو خود پر حرام کرنا:

اگر کوئی شخص الفاظِ قسم کے بغیر یہ کہے کہ فلاں (حلال) چیز مجھ پر حرام ہے تو وہ مذکورہ چیز اگرچہ اس کے کہنے سے حرام نہ ہوگی، لیکن اس کا یہ قول بمنزلہ قسم ہے، لہٰذا اس چیز کے استعمال سے کفارہ لازم ہوگا، البتہ اگر وہ چیز کسی دوسرے کی ملکیت ہو یا پہلے ہی سے حرام ہو تو اس صورت میں اگر اس نے یمین کی نیت کی تو ٹھیک ہے، ورنہ یمین نہیں ہوگی۔(۴)

---

(۱) الصحيح للبخاري: ۹۸۳/۲، سنن ابن ماجة، النهي عن الحلف: ۱۵۲/۱، الموسوعة الفقهية: ۲۵۵/۷

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الأيمان، فصل في ركن اليمين: ۱۵/٤

(۳) فتح القدير، باب مايكون يمينا ومالايكون يمينا: ۳۵٦/٤

(٤) الموسوعة الفقهية، مادة أيمان: ۲٦۱/۷

خود کو یہودی یا منافق کہنے کا حکم:

اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ اگر میں فلاں کام نہ کروں تو یہودی یا عیسائی ہوں گا اور اس سے مراد تاکید ہو، نہ کہ کفر وارتداد۔ تو حنفیہ وحنابلہ کے ہاں اس سے یمین منعقد ہو جائے گی اور اگر اس نے قسم پوری نہیں کی تو قسم کا کفارہ اس پر واجب ہوگا۔ یہ اس وقت ہے جب مستقبل پر قسم کھائے، اگر ماضی میں کسی طے شدہ امر پر جانتے ہوئے بھی کفر معلق کرے تو اگر حالف کی نیت قسم کی ہو تو سخت گنہگار رہو گا، البتہ کفارہ واجب نہیں، اس لیے کہ یمین غموس ہے، لیکن کفر سمجھ کر قسم کھالے تو کافر ہو جائے گا۔(۱)

قسم کی اقسام اور ان کے احکام:

حنفیہ کے ہاں اللہ تعالیٰ پر قسم کھانے کی تین قسمیں ہیں:

یمین غموس:

ماضی، حال یا استقبال کے بارے میں کسی واقعہ کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قصداً جھوٹی قسم کھانے کو یمین غموس کہتے ہیں۔ ماضی اور حال کی مثالیں تو ظاہر ہیں البتہ استقبال کی مثال یہ ہوگی: واللہ لا أموت أبداً۔(۲)
اس کو یمین غموس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ غموس کا معنی ہے ڈوبنا، چونکہ اس قسم میں بھی انسان جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے جس سے وہ گویا خود کو گناہ کے سمندر اور دوزخ کی آگ میں ڈبو دیتا ہے، اس لیے مناسبت ظاہر ہے۔

یمین غموس میں سخت گناہ ہے، لہٰذا حالف پر توبہ واستغفار واجب ہے، البتہ اس میں کفارہ نہیں۔

(۲) یمینِ لغو:

حال یا گزرے ہوئے زمانے کے بارے میں کسی بات کے ہونے یا نہ ہونے سے متعلق اپنے آپ کو سچا جانتے ہوئے قسم کھانا، اگرچہ وہ بات خلاف واقعہ ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ نہ تو اس میں گناہ ہے اور نہ کفارہ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ أَيْمَانِكُمْ﴾(۳)

(۱) فتح القدیر، باب مایکون یمینا ومالا یکون یمینا: ۳۶۲/٤

(۲) الموسوعة الفقهية، مادة أيمان: ۲۸۲/۷

(۳) البقرة: ۲۲۵

(۳) یمینِ منعقدہ:

مستقبل کے بارے میں کسی ایسی بات کی قسم جو ممکنات میں سے ہو، یمینِ منعقدہ ہے۔ اگر ممکن نہ ہو، جیسے: ''بخدا سورج غروب نہیں ہوگا'' تو یہ یمین غموس سمجھا جائے گا۔ یمینِ منعقدہ کو پورا نہ کرنے سے تمام فقہاے کرام کے ہاں کفارہ واجب ہوگا۔(۱)

وقت کے تعیین وعدمِ تعیین کے اعتبار سے یمین کی اقسام:

مطلق:

جس میں کسی وقت یا مدت کی قید نہ ہو۔ اس میں قسم کھانے والا کام کرنے یا نہ کرنے سے حانث ہوگا، نہ کہ وقت سے، یعنی کسی بھی وقت وہ کام کرلے، کفارہ لازم ہوگا۔

مقید:

جس میں کسی وقت یا مدت کی قید ہو۔ اس میں وقت کے اندر کام کرنے یا نہ کرنے سے حانث ہوگا۔(۲)

یمینِ فور اور اس کا حکم:

یمینِ فور سے مراد یہ ہے کہ قسم میں تو کسی وقت کی صراحت نہ ہو، لیکن دلالت حال اور قرائن سے اندازہ ہوتا ہو کہ اس قسم کا تعلق فی الفور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے سے ہے، جیسے: ایک شخص نے کسی کو کھانے کی دعوت دی اور اس نے جواب میں قسم کھا کر کہا کہ: ''میں کھانا نہیں کھاؤں گا'' تو بظاہر اگرچہ مطلق نہ کھانے کی قسم ہے، لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد یا اپنے گھر میں وہ کھانا کھالے تو حانث نہیں ہوگا اور سمجھا جائے گا کہ یہ قسم اس کھانے سے متعلق تھی جس کی اس کو دعوت دی گئی تھی۔(۳)

معصیت کے ارتکاب کی قسم:

اگر کسی گناہ کے ارتکاب، جیسے: قتل، زنا یا شراب پینے کی قسم کھائے تو کفارہ کے ساتھ ساتھ توبہ واستغفار کرنا

---

(۱) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الأیمان: ٥/٤٧٨

(۲) قاموس الفقه، مادة یمین: ٥/٣٥٨

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الأیمان، فصل في رکن الیمین: ٤/٣٦

بھی واجب ہے اور ایسے قسم کا توڑنا اور پورا نہ کرنا واجب ہے۔(۱)

قسم کا کفارہ:

اگر کوئی شخص اپنی قسم میں حانث ہو جائے تو اس پر کفارہ کی ادائیگی واجب ہے۔کفارے کی ترتیب سورۂ مائدہ آیت نمبر 89 کے مطابق کچھ یوں ہے:

(۱)دس مسکینوں کو دو وقت کا مناسب کھانا کھلانا یا ایک دن کے حساب سے نصف صاع (پونے دوکلو) گندم دینا۔حنفیہ کے ہاں کھانا کھلانے میں تملیک (کھانے کا مالک بنانا) شرط نہیں، بلکہ اباحت (سیر ہو کر کھانا کھلانا) بھی درست ہے۔

(۲)یا دس مسکینوں کو اتنا کپڑا پہنانا جو کہ ان کے بدن کو ڈھانپ دے۔اس میں عرف کو مدار بنانا زیادہ مناسب ہے۔

(۳)یا غلام آزاد کرنا۔

اگر ان میں سے کسی پر بھی قدرت نہ ہو تو حنفیہ کے نزدیک تین مسلسل روزوں کے ذریعے کفارہ ادا کرنا ہوگا۔(۲)

ادائیگی کفارے کا وقت:

حنفیہ کے ہاں حانث ہونے کے بعد کفارہ ادا کیا جائے گا۔اگر کسی نے پہلے ادا کیا تو یہ کافی نہیں ہوگا اس لیے کہ کفارے کا سبب حنث ہے اور سبب کے بغیر مسبب کا وجود میں آنا ممکن نہیں۔(۳)

❁❁❁❁❁

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الأیمان، فصل في حکم الیمین: ٤/ ٤٥، ٤٦

(۲) فتح القدیر، باب مایکون یمیناومالایکون یمینا، فصل في الکفارة: ٤/ ٣٦٥، ٣٦٦، ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الأیمان: ٥/ ٥٦٣

(۳) فتح القدیر، باب مایکون یمیناومالایکون یمینا، فصل في الکفارة: ٤/ ٣٦٧

باب النذر

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمت مشروعیت:

مسلمان کی فطرت میں طبعی طور پر تقرب الی اللہ اور حصولِ درجات کی حرص ودیعت رکھی گئی ہے۔اس مقصد کے حصول میں ایک بڑی رکاوٹ اکتاہٹ، سستی اور ٹال مٹول ہے،لہٰذا تقرب الی اللہ اور نفلی عبادات کے لیے طبیعت میں نشاط اور تازگی لانے کے لیے ایک ایسے باعث کی ضرورت تھی جو ایک طرف تو خالق ومخلوق کے مابین ان رکاوٹوں کو ختم کرے اور دوسری طرف ان عبادات کو رخصت اور اباحت سے نکال کر لزوم کے اس درجے پر لے آئے جہاں ان عبادات کو بجالانے پر نفس خود بخود راضی ہوجائے اور اس کے چھوڑنے پر خوف محسوس کرے۔یہی باعث اور محرک نذر ہے۔

نذر کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق:

نذر کا لغوی معنی ہے:''کسی ایسے کام کو اپنے اوپر واجب کرنا جو واجب نہ ہو''۔(۱)

جب کہ اصطلاحِ شریعت میں اس کی تعریف یہ ہے:

التزام المکلف شیئاً لم یکن علیه، منجزاً أو معلقاً، بحدوثِ أمرٍ تعظیماً للّٰہ تعالی.(۲)

کسی کام کے ہونے کی صورت میں، کسی مکلف اور بااختیار شخص کا اللہ تعالی کی تعظیم کی خاطر اپنے آپ پر کسی ایسی چیز کو فی الحال یا کسی شرط پر معلق کرکے لازم کرنا جو اصل شرع میں اس پر لازم نہ ہو۔

نذر کی مشروعیت:

نذر کی مشروعیت قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔قرآن کریم میں ہے:

﴿ وَلۡيُوفُوا نُذُورَهُمۡ﴾(۳)

اور چاہیے کہ اپنی منتیں پوری کریں۔

(۱) المنجد في اللغة والأعلام، مادة نذر: ۸۰۰

(۲) القاموس الفقهي لغةً واصطلاحاً، مادة نذر، ص: ۳۵۰، کتاب التعریفات، مادة نذر، ص: ۱۶۶، مرقاة المفاتیح شرح مشکوٰة المصابیح، کتاب الأیمان والنذور، باب الأیمان، قبیل الفصل الأول: ۵۷۹/۶ (۳) الحج: ۲۹

سورہ دہر کی آیت نمبر ۷ اور توبہ کی آیت نمبر ۷۵ سے بھی نذر کی مشروعیت ثابت ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

جو اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری کی نذر مانے تو اسے نذر پوری کرنی چاہیے اور جو نافرمانی کی نذر مانے تو اسے نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔(۱)

اور علامہ ابن قدامہؒ نے نذر کے صحیح ہونے اور اس کے ایفا کے وجوب پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔(۲)

باب النذر سے متعلقہ اصطلاحات:

(۱) ناذر:......نذر ماننے والا شخص،

(۲) منذور:......وہ چیز جس کی نذر مانی جائے۔

نذر ماننے کا حکم:

حنفیہ کے ہاں ایسی چیزوں کی نذر ماننا، جن کی جنس سے کوئی چیز شریعت میں واجب ہو، یا مباح ہو لیکن اس پر عمل کرنا وجوب کے درجہ میں ہو۔ ائمہ ثلاثہ میں سے صرف امام مالکؒ نذرِ مطلق کے استحباب کے قائل ہیں۔ باقی سب ہی نذر کو مکروہ کہتے ہیں، چاہے نذر مطلق ہو یا مقید ہو۔(۳)

رکنِ نذر:

حنفیہ کے ہاں نذر کا بس ایک ہی رکن ہے اور وہ ہے زبان سے صیغہ نذر ادا کرنا، یعنی ہر وہ جملہ جس سے نذر شدہ چیز کا التزام سمجھ میں آجائے، جیسے: میں اللہ کے لیے فلاں چیز کی نذر مانتا ہوں یا اللہ کے لیے یہ فلاں کام یا چیز مجھ پر واجب ہے یا میرا مال اللہ کے لیے ہے یا اللہ کی راہ میں صدقہ ہے وغیرہ۔ حنفیہ کے ہاں محض نیت سے نذر منعقد نہیں ہوگی۔(۴)

لکھی ہوئی نذر بھی تلفظ کے قائم مقام ہے، بشرطیکہ لکھنے کے وقت نذر کی نیت کی ہو۔

(۱) الصحیح للبخاري، کتاب الأیمان والنذور، باب النذر في مایملك وفي معصیته: ۹۹۱/۲

(۲) المغني لابن قدامة، أول کتاب النذر: ۳۳۲/۱۱

(۳) الموسوعة الفقهية، مادة نذر: ۱۳۹،۱۳۸/۴۰، مرقاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح، كتاب الأيمان والنذور، باب الأيمان، قبيل الفصل الأول: ۵۷۹/۶

(۴) بدائع الصنائع، كتاب النذر: ۳۳۳/۶

گونگے شخص کے لیے ایسا اشارہ جس سے کسی چیز کا التزام سمجھ میں آجائے، تلفظ کا قائم مقام ہوسکتا ہے۔(۱)

شرائط نذر:

نذر سے متعلقہ شرائط تین قسم کی ہیں:

(۱)......ناذر، یعنی نذر ماننے والے سے متعلق،

(۲)......منذور، یعنی جس کی نذر مانی جائے، اس سے متعلق،

(۳)......صیغہ نذر سے متعلق۔

ناذر سے متعلق شرائط:

(۱)......نذر ماننے والا نذر کا اہل ہو، یعنی عاقل، بالغ اور مسلمان ہو، لہٰذا پاگل، بچے اور کافر کی نذر معتبر نہیں۔

(۲)......حنفیہ کے ہاں یمین کی طرح نذر میں بھی رضا اور رغبت اور ارادے کی ضرورت نہیں، لہٰذا جبراً یا مزاحاً مانی ہوئی نذر بھی معتبر ہوگی۔

نذر مانی ہوئی چیز سے متعلق شرائط:

(۱)......شرعاً اس کا وجود ممکن ہو، لہٰذا رات کے وقت روزہ کی نذر، گزشتہ دن کے روزہ کی نذر یا عورت کے لیے ایامِ حیض میں روزہ و نماز کی نذر درست نہ ہوگی، اس لیے کہ رات کے وقت، گزشتہ دن اور حالتِ حیض میں شرعاً روزہ ممکن ہی نہیں۔ پس جو چیز بذاتِ خود ناممکن ہو یا شرعاً ممنوع ہو، اس کی نذر درست نہیں۔

(۲)......وہ چیز قربت اور عبادت کی قبیل سے ہو، لہٰذا معصیت کی نذر درست نہ ہوگی۔ اگر کسی نے شراب، زنا وغیرہ کی نذر مانی تو اس کا پورا نہ کرنا واجب ہے اور حنفیہ کے ہاں اس پر قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔ اسی طرح مباحات (کھانے، پینے اور جماع وغیرہ) کی نذر بھی معتبر نہیں، اس لیے کہ یہ چیزیں قربت اور عبادت کے قبیل سے نہیں۔

(۳)......جس بات کی نذر مانی جائے، وہ عبادتِ مقصودہ ہو، جیسے: نماز، روزہ، حج، عمرہ، اعتکاف، قربانی وغیرہ، لہٰذا حنفیہ کے ہاں مریضوں کی عیادت، جنازوں کے پیچھے چلنا، وضو، غسل، دخول مسجد، مسِ مصحف، اذان، پلوں اور مساجد کی تعمیر وغیرہ کی نذر درست نہیں، اس لیے کہ یہ چیزیں عباداتِ مقصودہ نہیں۔(۲)

(۱) الدرالمختار، مسائل شتى بعد كتاب الخنثى: ١٠/ ٤٦٠، شرح المجلة، مادة: ٧٠،٦٩، الموسوعة الفقهية، مادة نذر: ٤٠/ ١٤٠

(٢) بدائع الصنائع، كتاب النذر، فصل في شرائط ركن النذر: ٦/ ٣٣٤،٣٣٣

اُصولی نکتہ: فقہائے کرام نے ان اشیا کے متعلق یہ اصول وضع کیا ہے کہ جس چیز کی جنس سے انسان پر کوئی عبادت واجب ہو، اسی چیز کی نذر درست ہوگی، لہٰذا اس نکتے کی رعایت کرتے ہوئے نذر کی صحت وعدم صحت کا حکم لگایا جائے گا۔

(۴)......جس چیز کی نذر مان رہا ہے، اگر وہ مال ہو تو نذر ماننے کے وقت اس کی ملکیت میں ہو یا بذاتِ خود نذر مضاف ہو ملک یا سبب ملک کی طرف، مثلاً: یہ کہے کہ مستقبل میں جس مال کا میں مالک ہو جاؤں، وہ اللہ کے لیے صدقہ ہے یا اگر میں نے فلاں (غیر معین) چیز خریدی تو وہ اللہ کے لیے صدقہ ہے۔ان صورتوں میں وہ مذکورہ چیز جب ملکیت میں آجائے گی تو حنفیہ کے ہاں نذر کی تکمیل واجب ہوگی۔

(۵)......جس چیز کی نذر مانی جارہی ہو، وہ پہلے سے فرض یا واجب نہ ہو، لہٰذا پنج وقتہ نماز، رمضان کے روزے، جنازہ، صدقہ فطر، قربانی، سلام کا جواب، مردے کی تجہیز وتکفین وغیرہ کی نذر درست نہیں، اس لیے یہ تو نذر سے پہلے بھی فرض (عین یا کفایہ) یا واجب (عین یا کفایہ) ہیں۔(۱)

(۶)......منذور معصیت لذاتہ نہ ہو، جیسے: قتل، زنا وغیرہ۔اور اگر معصیت لغیرہ ہو تو نذر درست ہے، لہٰذا یوم الفطر اور یوم النحر کے روزوں کی نذر حنفیہ کے ہاں درست ہے، البتہ اس پر واجب ہے کہ وہ ان دنوں میں روزے نہ رکھے، بلکہ دوسرے دنوں میں اس کی قضا کرے، اس لیے کہ ان ایام میں روزہ رکھنا اعراض عن ضیافۃ اللہ (اللہ تعالیٰ کی مہمان نوازی سے منہ موڑنے) کی وجہ سے ممنوع ہے۔روزہ بذاتِ خود معصیت نہیں۔(۲)

(۷)......یا جس چیز کی نذر مانی جارہی ہو، وہ موجودہ ملکیت سے زیادہ نہ ہو، لہٰذا اگر ہزار روپے صدقہ کی نذر مانی اور فی الحال سو روپے کا مالک ہو تو اس پر سو روپے دینے واجب ہوں گے۔(۳)

رکن، یعنی صیغہ نذر کی شرائط:

(۱)......زبان سے تلفظ ہو یا تلفظ کے قائم مقام کوئی چیز ہو، جیسے: نیت کے ساتھ لکھا ہوا خط (کتابت) یا گونگے شخص کے

(۱) الفقہ الاسلامي وأدلتہ، الباب السادس الأیمان والنذور والکفارات، الفصل الثاني النذر، شرائط المنذور بہ: ٤/ ٢٥٥٤- ٢٥٥٨، بدائع الصنائع، کتاب النذر، فصل في شرائط رکن النذر: ٦/ ٣٣٣، ٣٥١، الفتاوی الهندیة، کتاب الصوم، الباب السادس في النذر: ١/ ٢٠٨

(٢) الدر المختار، کتاب الأیمان، مطلب في أحکام النذر: ٥/ ٥١٨

(٣) أیضا: ٥/ ٥١٩

لیے اشارہ کرنا۔(۱)

(۲)......کلام میں بلاضرورت فصل نہ ہو، جیسے: ''بخدا'' اور ''میں کل روزہ رکھوں گا'' کے درمیان طویل وقفہ کرنا۔(۲)

(۳) استثنا کے ذریعے سابقہ کلام کو بے اثر نہ کیا جائے، یعنی متصلاً ان شاء اللہ وغیرہ کہہ کر ماقبل کلام کی تاثیر ختم نہ کی جائے۔(۳)

منذور کی قسمیں:

منذور، یعنی وہ چیز جس کی نذر مانی جاتی ہے، دو قسم پر ہے: غیر معین (مبہم) اور معین

(۱) غیر معین (مبہم):

نذرِ مبہم وہ ہے جس کی نوع بیان نہ ہوئی ہو، جیسے: ''اللہ کے لیے مجھ پر نذر ہے'' اور کسی چیز کا تذکرہ اس میں نہ ہو۔ حنفیہ کے ہاں اگر اس کی کوئی نیت نہ ہو تو اس پر کفارہ یمین لازم ہوگا۔(۴)

(۲) معین:

نذرِ معین وہ ہے جس میں نذر مانی ہوئی چیز کی نوع بیان ہوئی ہو، وہ چار قسم پر ہے:

(۱)......جس چیز کی نذر مانی ہو، وہ قربت ہو، یعنی اللہ کی اطاعت اور عبادت کی قبیل سے ہو۔ ایسی نذر کو پورا کرنا واجب ہے۔

(۲)......معصیت ہو، اس کو پورا کرنا حرام ہے اور ترک کرنا واجب ہے، البتہ اس صورت میں حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں کفارۂ قسم ادا کرنا واجب ہے۔(۵)

(۳)......مکروہ ہو تو اس کو پورا کرنا بھی مکروہ ہوگا۔

(۴)......مباح ہو، جیسے: کھانا پینا وغیرہ۔ اس سے نذر منعقد نہیں ہوتی، لہٰذا اس کو کرنا اور چھوڑنا دونوں درست ہیں۔(۶)

---

(۱) الدرالمختار، مسائل شتی بعد كتاب الخنثیٰ: ۱۰/۴۶۰، شرح المجلة، مادة: ۶۹، ۷۰

(۲) الموسوعة الفقهية، مادة: ۴۰/۱۴۰ (۳) بدائع الصنائع، كتاب النذر، آخر فصل في شرائط ركن النذر: ۶/۳۵۱

(۴) ردالمحتار مع الدرالمختار، كتاب الأيمان، مطلب في أحكام النذر: ۵/۵۱۶

(۵) مرقاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح، كتاب الأيمان والنذور، باب الأيمان، قبيل الفصل الأول: ۶/۵۷۹

(۶) الفقه الإسلامي وأدلته، الباب السادس الأيمان والنذور والكفارات، الفصل الثاني النذر: ۴/۲۵۰۲

مسائل کتاب الأیمان والنذور

(قسم اور نذر کے مسائل کا بیان)

امام کے ساتھ باتیں نہ کرنے کی قسم کھا کر اس کو لقمہ دینا

سوال نمبر(1):

امام اور مقتدی کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہوئے۔مقتدی نے قسم اٹھائی کہ "میں مولانا صاحب سے باتیں نہیں کروں گا۔" ایک دن اسی مولانا صاحب کے پیچھے نماز پڑھی اور دوران نماز مولانا صاحب کی غلطی پر اس نے لقمہ دیا اور مولانا صاحب نے لقمہ لیتے ہوئے قرأت درست کی۔ایسی حالت میں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

(الف)......کیا مولانا صاحب سے ناراضگی کے باوجود اقتدا جائز ہے؟

(ب)......امام سے ترکِ کلام کی قسم اٹھانے پر لقمہ دینے سے حانث ہوگا یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

امام اور مقتدی کا ایک باریک رشتہ ہے۔خود امام کی ذمہ داری ہے کہ وہ مقتدیوں سے ایسا رویہ رکھے جس کی وجہ سے مقتدیوں کے ذہن میں اُس کی عظمت پیدا ہو اور مقتدیوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ معمولی باتوں پر امام مسجد سے مخالفت نہ کریں۔مسندِ رسول کے وارث ہونے کی وجہ سے مقتدیوں پر امام کی تعظیم واجب ہے۔خاص کر جب امام صاحب میں کوئی دینی کمزوری نہ ہو تو عام باتوں پر اُن سے ترکِ تعلق پر قسم اٹھانا غیر سنجیدہ فعل ہے۔پھر صحتِ اقتدا کے لیے فقہائے کرام نے یہ شرط نہیں رکھی کہ مقتدی اور امام کے درمیان اختلافات نہ ہوں اس لیے ایسے امام کی اقتدا جائز ہے اور قسم کے باوجود امام کے پیچھے پڑھی گئی نماز ادا ہو جاتی ہے۔

جہاں تک امام کو لقمہ دینے کا مسئلہ ہے تو اس کی وجہ سے حانث نہیں ہوگا،اگر چہ امام نے لقمہ لیا ہو،کیونکہ عرف میں امام کو لقمہ دینا کلام الناس (عام باتیں) نہیں۔باتوں سے مراد باہمی گفتگو ہے جو انسانی ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ ہو یا اس کلام سے اظہار مافی الضمیر ہو جائے۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا حلف لایکلم فلانا فاقتدی الحالف بالمحلوف علیه، فسها المحلوف علیه، فسبح له

الحالف، لم یحنث.(۱)

ترجمہ:

جب کسی نے قسم اٹھائی کہ فلاں شخص سے باتیں نہیں کروں گا، پھر قسم اُٹھانے والے نے محلوف علیہ کی اقتدا کی اور محلوف علیہ سے نماز میں غلطی ہوئی، اس کی غلطی پر حالف نے سبحان اللہ کہا تو یہ شخص حانث نہیں ہوگا۔

❁❁❁

''اگر فلاں کام کیا تو امت محمدیہ میں سے نہیں ہوں گا'' کہنا

سوال نمبر(2):

بعض اوقات لوگ اس طرح کہتے ہیں کہ: ''اگر فلاں کام کیا تو امت محمدیہ میں سے نہیں ہوں گا'' اس سے قسم واقع ہوجاتی ہے یا نہیں؟ حانث ہونے کی صورت میں یہ شخص دینِ اسلام سے خارج متصور ہوگا یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی چیز سے اپنے آپ کو روکنے کے لیے یا کسی کام کو کرنے کے لیے کسی ایسے عقیدے اور نظریے کو معلق کرنا جو شرعی اعتبار سے کفر ہو، استحساناً یمین کے زمرے میں آتا ہے۔ صورت مسئولہ میں کسی شخص کا یہ کہنا کہ: ''اگر فلاں کام کیا تو امت محمدیہ میں سے نہیں ہوں گا'' قسم کے الفاظ ہیں اور اس سے قسم منعقد ہوجاتی ہے۔

جہاں تک یہ مسئلہ ہے کہ ایسے یمین کے بعد حانث ہونے کی صورت میں کفر واقع ہوجاتا ہے یا نہیں؟ تو اگر وہ کام کرتے وقت اس شخص کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اس سے صرف حنث ہوگا، کفر نہیں تو حانث ہونے سے یہ شخص کافر نہیں ہوگا اور اگر وہ کام کرتے وقت یہ ذہن میں ہو کہ حانث ہونے کی صورت میں ان الفاظ سے بندہ کافر ہوجاتا ہے اور پھر بھی وہ کام کرے تو کفر پر رضامندی کی وجہ سے کفر واقع ہوگا، لہٰذا ایسے شخص کے لیے تجدید ایمان اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں تجدیدِ نکاح ضروری ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو قال: إن فعل كذا فهو يهودي أو نصراني أو مجوسي أو بريء من الإسلام أو كافر أو يعبد

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الايمان، الباب السادس في اليمين على الكلام: ۹۷/۲

من دون الله أو يعبد الصليب أو نحو ذلك مما يكون اعتقاده كفرا، فهو يمين استحسانا كذا في البدائع. حتى لو فعل ذلك الفعل يلزمه الكفارة ، وهل يصير كافرا؟ اختلف المشايخ فيه قال: شمس الأئمة السرخسي رحمه الله تعالى: والمختار للفتوى أنه إن كان عنده أنه يكفر متى أتى بهذا الشرط، ومع هذا أتى يصير كافرا لرضاه بالكفر ، وكفارته أن يقول: لا إله إلا الله محمد رسول الله، وإن كان عنده أنه إذا أتى بهذا الشرط لايصير كافرا لا يكفر .(۱)

ترجمہ:

اگر یہ کہے کہ ''اگر اس طرح کام کروں تو یہودی یا عیسائی یا مجوسی ہوں گا یا اسلام سے بری ہوں گا یا کافر ہوں گا یا اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کروں گا یا صلیب کی عبادت کروں گا'' یا اس طرح کی کوئی اور ایسی بات کرلے جس کا عقیدہ رکھنا کفر ہو تو استحساناً یہ قسم شمار ہوگا۔ چنانچہ اگر یہ کام کیا تو کفارہ لازم ہوگا، تاہم اس بات کی وجہ سے وہ کافر ہوگا یا نہیں؟ اس کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: فتویٰ کے لیے منتخب قول یہ ہے کہ اگر اسے معلوم ہو کہ اس شرط کو پورا کرنے سے کافر ہو جاتا ہے تو جب وہ یہ کام کرے تو گویا وہ کفر پر راضی ہے (لہٰذا اسلام سے خارج ہو جائے گا) اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ کلمہ پڑھے (ایمان کی تجدید کرے) اور اگر اس کے علم میں ہو کہ اس شرط کے کرنے سے کافر نہیں ہوتا تو پھر کافر نہ ہوگا۔

❁❁❁

قسم کھانے کے بعد مجبوراً توڑنا

سوال نمبر (3):

ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں فلاں کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گا، اگر اس قسم کھانے والے پر جبر کیا جائے اور زبردستی اس شخص کے گھر میں داخل کیا جائے جس کے بارے میں اس نے قسم کھائی تھی تو کیا یہ شخص حانث ہوگا؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کوئی شخص کسی کے گھر میں نہ جانے کی قسم کھائے اور اس کے بعد اس کو زبردستی اس مکان میں کسی نے

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الأيمان، الباب الثاني فيمايكون يميناً ومالايكون يميناً: ۲/٥٤

داخل کیا اور اس کو یہ قدرت حاصل نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو اس مکان میں داخل ہونے سے روک لے تو بالاتفاق یہ شخص اپنی قسم میں حانث نہیں ہوتا، اسی طرح جب اس کو یہ قدرت حاصل ہو کہ اپنے آپ کو روک لے، لیکن ایک گونہ زبردستی پائی جانے کی وجہ سے داخل ہو جائے تو پھر بھی یہ شخص حانث نہیں ہوتا۔

والدليل على ذلك:

وإن احتمله إنسان وأدخله فيها، فإن كان الحالف لايقدرعلى الامتناع لايحنث في قولهم، وإن كان يقدر ولم يمتنع، وهوراض بقلبه اختلفوا فيه، والصحيح أنه لايحنث مروي ذلك عن ابي حنيفةؒ.(۱)

ترجمہ:

اگر کوئی شخص اس کو گود میں اٹھا کر اس گھر میں داخل کرے تو اگر قسم کھانے والا اس سے جان چھڑانے پر قدرت نہیں رکھتا تو تمام فقہائے کرام کے ہاں یہ شخص قسم میں حانث نہیں ہوتا اور اگر قدرت رکھتا ہو، پھر بھی جان نہ چھڑائے اور اس پر دل سے بھی راضی ہو تو اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ صحیح مذہب یہ ہے کہ اس سے بھی یہ شخص حانث نہیں ہوتا، یہ امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے۔

❁❁❁

کسی کو نہ دیکھنے کی قسم کھا کر اس کو شیشے میں دیکھنا

سوال نمبر(4):

ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں فلاں کو نہیں دیکھوں گا پھر اس کو شیشہ میں دیکھا تو کیا وہ حانث ہوا ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

شیشہ سے دیکھنا اور آئینہ میں دیکھنا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اوّل الذکر میں دیکھنے کی حقیقت پائی جاتی ہے، اگرچہ شیشہ درمیان میں ہے لیکن شفاف ہونے کی وجہ سے دیکھنے سے حائل نہیں، جب کہ دوسری صورت، یعنی آئینہ میں دیکھنا اس شخص کا دیکھنا نہیں، بلکہ اس کا عکس دیکھنا ہے، اس لیے پہلی صورت میں حانث ہوگا اور دوسری صورت میں نہیں۔

(۱) الفتاوى الخانية على هامش الهندية، كتاب الأيمان، فصل في الدخول: ۷۷/۲

والدلیل علی ذلك:

حلف أن لاینظر إلی فلان فرأی من خلف ستر، أو زجاجة یستبین وجهه من خلفها حنث، بخلاف مالو نظر في مرآة فرأی وجهه حیث لایحنث.(۱)

ترجمہ: کسی نے قسم اُٹھائی کہ فلاں کی طرف نہیں دیکھے گا، پھر اس کو ایسے پردے یا شیشے کے پیچھے سے دیکھ لے کہ اس کا چہرہ پیچھے سے نظر آتا ہو تو حانث ہو جاتا ہے، بخلاف اس کے کہ آئینہ میں اس کے چہرے کو دیکھ لے تو اس سے حانث نہیں ہوتا۔

❁❁❁

اگر فلاں کام کیا تو کافر ہوں گا کہنا

سوال نمبر(5):

ایک شخص نے اپنے آپ کو ایک فعل بد سے روکنے کے لیے یوں کہا کہ: ''اگر فلاں کام کیا تو کافر ہوں گا'' کیا یہ قسم کے دائرے میں داخل ہے یا نہیں؟ اور اس کام کے کرنے پر اس پر کفارہ لازم ہوتا ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی کام سے اپنے آپ کو روکنے کے لیے یوں کہنا کہ: ''اگر فلاں کام کیا تو کافر ہوں گا'' فقہائے کرام نے ان الفاظ کو یمین منعقدہ میں شمار کیا ہے، لہٰذا اس کے باوجود اگر وہ شخص اس فعل بد کا ارتکاب کرے تو اس پر کفارہ یمین لازم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک یہ مسئلہ ہے کہ ایسی قسم کے بعد حانث ہونے کی صورت میں کفر واقع ہو جاتا ہے یا نہیں؟ تو اگر وہ کام کرتے وقت اس شخص کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اس سے صرف حنث ہوگا، کفر نہیں تو حانث ہونے سے یہ شخص کافر نہیں ہوگا اور اگر وہ کام کرتے وقت یہ ذہن میں ہو کہ حانث ہونے کی صورت میں ان الفاظ سے بندہ کافر ہو جاتا ہے اور پھر بھی وہ کام کرے تو کفر پر رضامندی کی وجہ سے کفر واقع ہوگا، لہٰذا ایسے شخص کے لیے تجدید ایمان اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں تجدید نکاح ضروری ہے۔

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الأیمان، الباب الثاني عشر في الیمین: ۲/۱۳۹

والدلیل علی ذلك:

ولو قال: إن فعل كذا فهو يهودي أو نصراني أو مجوسي أو بريء من الإسلام أو كافر أو يعبد من دون الله أو يعبد الصليب أو نحو ذلك مما يكون اعتقاده كفرا، فهو يمين استحسانا كذا في البدائع. حتى لو فعل ذلك الفعل يلزمه الكفارة وهل يصير كافرا؟ اختلف المشايخ فيه قال: شمس الأئمة السرخسي رحمه الله تعالى: والمختار للفتوى أنه إن كان عنده أنه يكفر متى أتى بهذا الشرط، ومع هذا أتى يصير كافرا لرضاه بالكفر، وكفارته أن يقول: لا إله إلا الله محمد رسول الله، وإن كان عنده أنه إذا أتى بهذا الشرط لا يصير كافرا لا يكفر. (۱)

ترجمہ:

اگر یہ کہے کہ ''اگر اس طرح کام کروں تو یہودی یا عیسائی یا مجوسی ہوں گا یا اسلام سے بری ہوں گا یا کافر ہوں گا یا اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کروں گا یا صلیب کی عبادت کروں گا'' یا اس طرح کی کوئی اور ایسی بات کرلے جس کا عقیدہ رکھنا کفر ہو تو استحساناً یہ قسم شمار ہوگا۔ چنانچہ اگر یہ کام کیا تو کفارہ لازم ہوگا، تاہم اس بات کی وجہ سے وہ کافر ہوگا یا نہیں؟ اس کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: فتویٰ کے لیے منتخب قول یہ ہے کہ اگر اسے معلوم ہو کہ اس شرط کو پورا کرنے سے کافر ہو جاتا ہے تو جب وہ یہ کام کرے تو گویا وہ کفر پر راضی ہے (لہٰذا اسلام سے خارج ہو جائے گا) اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ کلمہ پڑھے (ایمان کی تجدید کرے) اور اگر اس کے علم میں ہو کہ اس شرط کے کرنے سے کافر نہیں ہوتا تو پھر کافر نہ ہوگا۔

❁❁❁

''اگر فلاں کام کیا تو انسان کا بچہ نہیں ہوں گا'' کہنا

سوال نمبر(6):

اگر کوئی شخص اس طرح کہے کہ: ''اگر میں نے فلاں کام کرلیا تو انسان کا بچہ نہیں ہوں گا''۔ کیا ایسا جملہ کہنے سے یمین منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟

بيّنوا تؤجروا

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الأيمان، الباب الثاني فيما يكون يميناً وما لا يكون يميناً: ۲/۵۴

الجواب وباللہ التوفیق:

قسم کے وقوع کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اِسم ذات ''اللہ'' کے ساتھ قسم کھائی جائے یا اِسم صفت کے ساتھ، جیسے: الرحمن، الرحیم یا اللہ تعالیٰ کی کسی ایسی صفت کی قسم اُٹھائی جائے جس پر قسم کھانا متعارف ہو، جیسے: اللہ تعالیٰ کی عزت اور کبریائی کی قسم کھانے سے قسم واقع ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان چیزوں کی قسم کھانے سے بھی قسم واقع ہوجاتی ہے جن پر قسم کھانا متعارف ہو، جیسے: قرآن کریم کی قسم کھانا۔ اور جو کلام ایسا ہو کہ مذکورہ دونوں صورتوں سے خالی ہو، اس پر قسم کا اطلاق نہیں ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں یہ کہنا کہ: ''اگر میں نے فلاں کام کیا تو انسان کا بچہ نہیں ہوں گا'' یہ قسم نہیں، کیوں کہ نہ اس میں باری تعالیٰ کا اسم ذات یا کوئی صفت ہے اور نہ عرف میں یہ الفاظ قسم کے لیے استعمال ہوتے ہیں، لہٰذا ان الفاظ کے کہنے سے یمین منعقد نہیں ہوتی۔

والدلیل علی ذلک:

والیمین باللہ تعالی أو باسم آخر من أسماء اللہ تعالی کالرحمن والرحیم أو بصفة من صفاته التي یحلف بها عرفا کعزة اللہ وجلاله وکبریائه ؛ لأن الحلف بها متعارف...... (ولو قال وغضب اللہ وسخطه، لم یکن حالفا)......لأن الحلف بها غیر متعارف.(۱)

ترجمہ:

قسم کا انعقاد ''اللہ'' کے نام سے ہوتا ہے یا اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی دوسرا نام ہو، جیسے: الرحمٰن اور الرحیم یا اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں سے کوئی ایسی صفت ہو جس کے ساتھ عرف میں قسم کھائی جاتی ہو، جیسے: عزتِ الٰہی اور جلالِ الٰہی، کیوں کہ ان صفات کے ساتھ قسم کھانا رائج ہے۔۔۔۔۔ اور اگر کہا کہ اللہ کی غضب اور ناراضگی تو اس سے وہ قسم کھانے والا نہیں بنتا۔۔۔۔ کیوں کہ اس سے قسم کھانا متعارف نہیں ہے۔

۞۞۞

(۱) الهدایة، کتاب الأیمان، باب مایکون یمیناً ومالایکون یمیناً: ۴۷۷/۲

معصیت کی قسم کھانا

سوال نمبر(7):

اگر کوئی شخص غصہ میں آکر یوں کہے کہ: ''اللہ کی قسم میں فلاں کو دس دن کے اندر اندر قتل کروں گا'' تو ایسی قسم کھانے کی صورت میں شریعت کی تعلیم کیا ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی کو قتل کرنے کی قسم کھانا معصیت پر قسم کھانے کے زمرے میں آتا ہے، لہٰذا ایسی قسم کھانے سے اس شخص کو قتل کرنا جائز نہیں ہو جاتا بلکہ اس پر واجب یہ ہے کہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کرے۔

والدلیل علی ذلک:

ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع أبویه، أو قتل فلان الیوم وجب الحنث والتکفیر. (۱)

ترجمہ:

اور جو کسی گناہ پر قسم کھائے، جیسے: والدین سے باتیں نہ کرنے کی یا آج کے دن کسی کو قتل کرنے کی تو اس قسم کا توڑنا اور اس کا کفارہ دینا (اس پر) واجب ہے۔

۞۞۞

جھوٹی قسم کھانا

سوال نمبر(8):

اگر ایک شخص گزشتہ زمانہ میں کوئی کام انجام دے چکا ہو، پھر کچھ عرصہ بعد کسی سے جھگڑے کے دوران اس کام کے کرنے سے منکر ہو جائے اور اس کام کے نہ کرنے پر قصداً جھوٹی قسم کھائے، تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

بینوا تؤجروا

(۱) تنویر الأبصار مع الدر المختار، کتاب الأیمان: ۵/۶۰۵۰۷

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کوئی شخص گزشتہ زمانہ میں کسی کام کے وقوع یا عدمِ وقوع پر باخبر رہنے کے باوجود قصداً وعمداً جھوٹی قسم کھائے تو اسے شریعت کی اصطلاح میں یمین غموس کہتے ہیں۔اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں اگرچہ اس شخص پر کوئی کفارہ نہیں آتا لیکن سخت گناہ گار ہونے کی وجہ سے اس کی تلافی کے لیے اللہ تعالیٰ کے دربار میں سچے دل سے توبہ واستغفار کرے۔

والدّلیل علی ذلک:

فیمین الغموس: هي الحلف علی أمرماض یتعمدالکذب فیه، فهذا الیمین یأثم بها صاحبها، ولاکفارة فیها إلاالتوبة والاستغفار.(۱)

ترجمہ:

یمین غموس یہ ہے کہ گزشتہ زمانہ کے کسی ایسے کام پر قسم اُٹھائے، جس میں قصداً جھوٹ بولے، ایسی قسم سے حالف گناہ گار ہوتا ہے اور اس میں سوائے توبہ اور استغفار کے کوئی کفارہ نہیں۔

❁❁❁

کسی کی طرف نہ دیکھنے کی قسم کھا کر اس پر غیر اختیاری نظر پڑنا

سوال نمبر(9):

ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں فلاں کی طرف نہیں دیکھوں گا۔پھر راستے پر جاتے وقت اچانک غیر اختیاری طور پر نظر اس شخص پر پڑ گئی تو کیا اس سے حنث واقع ہو جاتی ہے یا نہیں؟اسی طرح اگر وہ شخص کسی کمرے میں بیٹھا ہو اور یہ قسم کھانے والا اس کو باہر سے شیشے کے حائل ہوتے ہوئے دیکھ لے تو کیا اس سے حنث واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

یمین(قسم) کا دارومدار عرف وعادت پر ہوا کرتا ہے لہٰذا جب تک متکلم نے اپنے کہے ہوئے جملے میں کوئی خاص مُراد نہ لی ہو تو عرف وعادت میں اس جملہ سے جو مراد لی جاتی ہو، اس پر اس کے کلام کو محمول کیا جائے گا۔

(۱) مختصر القدوری، کتاب الأیمان: ص/۱۹۹،۱۹۸

صورتِ مسئولہ میں کسی خاص شخص کی طرف نہ دیکھنے کی قسم کھانے سے عرف وعادت میں اس شخص کے ساتھ ترکِ تعلق مراد لیا جاتا ہے، اس لیے ایسی صورت میں اس شخص پر صرف نظر پڑنے یا نظر ڈالنے سے یہ شخص حانث نہیں ہوتا، تاہم اگر اس نے اس جملہ سے اِس کا حقیقی معنی مراد لیا ہو تو پھر اس کی طرف نظر کرنے سے حانث ہوگا، چاہے بلا حائل کے اسے دیکھا ہو یا درمیان میں شیشہ حائل ہو، تاہم غیر اختیاری طور پر اول نظر پڑنے سے حانث نہیں ہوتا۔

والدّلیل علی ذلك:

حلف أن لاينظر إلى فلان فرأى من خلف ستر، أو زجاجة يستبين وجهه من خلفها حنث، بخلاف مالو نظر في مرآة فرأى وجهه حيث لايحنث.(١)

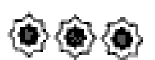
ترجمہ:

کسی نے قسم کھائی کہ فلاں کی طرف نہیں دیکھوں گا، پھر اس کو ایسے پردے یا شیشے کے پیچھے سے دیکھ لے کہ اس کا چہرہ نظر آرہا تھا تو حانث ہو جاتا ہے، بخلاف اس کے کہ آئینہ میں اس کے چہرے کو دیکھ لے تو اس سے حانث نہیں ہوتا۔

فوجب على المفتي أن يفتي بما هو المعتاد في كل مصر وقع فيه حلف الحالف.(٢)

ترجمہ:

مفتی پر واجب ہے کہ جس شہر میں قسم کھانے والے نے قسم کھائی، وہ اس شہر کے عرف کے مطابق فتویٰ دے دے۔



یمینِ غموس میں کفر کو معلق کرنا

سوال نمبر(10):

ایک شخص نے یوں کہا کہ: ''اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں کافر ہوں گا'' حالانکہ قسم کھاتے وقت اُسے یاد تھا

---

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الأيمان، الالباب الثاني عشرفي اليمين: ١٣٩/٢

(٢) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الأيمان، باب اليمين في الأكل والشرب، مطلب لايأكل طعاما: ٥٧٥/٥

کہ وہ کام کیا ہے، صرف ملامتی سے بچنے کے لیے ایسا کہا۔ کیا اس سے یہ شخص کافر ہوتا ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

گزشتہ زمانہ کے بارے میں قصداً جھوٹی قسم کھانا یمین غموس کہلاتا ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے قسم میں اپنے کفر کو معلق کرے تو اگر قسم کھاتے وقت اس کا خیال ہو کہ یہ صرف قسم ہے اور اس سے بندہ کافر نہیں ہوتا تو یہ شخص کافر نہیں ہوگا، لیکن اگر اس کے ذہن میں یہ بات ہو کہ مذکورہ کلمات کہنے سے بندہ کافر ہو جاتا ہے اور پھر بھی قصداً عمداً قسم کھائے تو کافر ہو جائے گا، لہٰذا اس پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح ضروری ہے۔

والدلیل علی ذلک:

أما إذا حلف بهذه الألفاظ على أمر في الماضي بأن قال: هو يهودي أو نصراني أو مجوسي إن كان فعل كذا أمس، وهو يعلم أنه قد كان، لا شك أنه لا يلزمه الكفارة عندنا ؛ لأنه يمين غموس. وهل يصير كافرا اختلف المشايخ فيه قال: شمس الأئمة السرخسي رحمه الله تعالى: والمختار للفتوى أنه إن كان عنده أن هذا يمين ولا يكفر متى حلف به لا يكفر، وإن كان عنده أنه يكفر متى حلف به يكفر لرضاه بالكفر.(۱)

ترجمہ: جب کوئی ان الفاظ کے ساتھ گزشتہ زمانے میں کسی کام پر قسم کھائے، یعنی اس طرح کہے کہ وہ (قسم کھانے والا) یہودی ہوگا یا عیسائی ہوگا یا مجوسی ہوگا اگر اس نے (یعنی قسم کھانے والے نے) گزشتہ کل اس طرح کام کیا ہو، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کام کیا تھا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پر ہمارے ہاں کفارہ لازم نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ یمین غموس ہے۔ البتہ کیا اس سے کافر ہو جائے گا؟ اس میں مشائخ نے اختلاف کیا ہے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ نے کہا ہے کہ: ''فتویٰ کے لیے منتخب قول یہ ہے کہ اگر اس کے علم میں یہ ہو کہ یہ صرف قسم ہے اور بندہ اس سے کافر نہیں ہوتا تو اس سے یہ شخص بھی (اس کے اعتقاد کے موافق) کافر نہیں بنتا اور اگر اس کے علم میں یہ ہو کہ جب اس (مذکورہ) کلام کے ساتھ کوئی قسم کھائے تو اس سے بندہ کافر ہو جاتا ہے تو کفر پر راضی ہونے کی وجہ سے یہ شخص بھی (ان الفاظ کے ساتھ قسم کھانے سے) کافر ہو جاتا ہے''۔

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الأيمان، الباب الثاني فيمايكون يميناً ومالايكون يميناً: ۲/ ٥٤

قرآنِ کریم پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا

سوال نمبر(11):

اگر کوئی شخص قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر اس بات پر قسم کھائے کہ میں آئندہ فلاں کام نہیں کروں گا اور پھر اس کا مرتکب ہو گیا تو کیا اس سے حنث لازم ہو گی؟ اور اس پر کفارہ یمین لازم آئے گا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

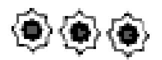
قرآن مجید پر صرف ہاتھ رکھنے سے یا ہاتھ میں لینے سے قسم نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے ساتھ الفاظ قسم نہ کہے، مثلاً: قرآن کی قسم! یا کلام اللہ کی قسم! یا قرآن کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ اس میں جو کلام اللہ ہے اس کی قسم! اگر اس طرح کے الفاظ استعمال کرے تو قسم ہو جائے گی اور توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہو گا۔

صورتِ مسئولہ میں سائل نے اگر قرآن پر ہاتھ رکھ کر اس طرح کی قسم کھائی ہو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور اس کو اپنے کسی فعل کے نہ کرنے کے ساتھ معلق کر دیا ہو تو اُس کام کے ارتکاب کی صورت میں وہ حانث ہو گا اور اس پر کفارۂ یمین لازم آئے گا۔لیکن اگر قسم کے الفاظ استعمال نہ کیے ہوں تو محض ہاتھ رکھنے سے حانث نہ ہو گا۔

والدّلیل علی ذلک:

وقال محمد بن مقاتل الرازي: لو حلف بالقرآن قال: یکون یمیناً، و به أخذ جمهور مشائخنا.(۱)

ترجمہ: اور محمد بن مقاتل الرازیؒ نے کہا ہے کہ: ’’اگر کسی نے قرآن مجید پر قسم کھائی تو یہ یمین ہو گی اور اسی کو ہمارے جمہور مشائخ نے اختیار کیا ہے‘‘۔



باپ کے ساتھ بات نہ کرنے کی قسم کھانا

سوال نمبر(12):

ایک شخص نے بھائی اور ماں کی موجودگی میں یہ قسم کھائی کہ آج کے بعد میں باپ سے کسی قسم کی بات نہیں

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الأیمان، الباب الثاني فیمایکون یمیناً وفیمالایکون یمیناً: ۲/۵۳

کروں گا، لیکن اب وہ نادم ہے اور باپ سے باتیں شروع کرنا چاہتا ہے، باتیں شروع کرنے سے قسم کا کفارہ لازم آئے گا یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر کوئی شخص کسی معصیت پر قسم کھائے تو اس کا توڑنا واجب ہوتا ہے، اور کفارہ لازم۔ صورتِ مسئولہ کی روشنی میں مذکورہ شخص کے لیے باپ سے باتیں نہ کرنے کی قسم توڑنا واجب ہے اور قسم توڑنے کے بعد اس کا کفارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع أبویه، أوقتل فلان الیوم وجب الحنث، والتکفیر. (۱)

ترجمہ: جو کسی گناہ پر قسم کھائے، جیسے: والدین سے باتیں نہ کرنے کی یا آج کے دن کسی کو قتل کرنے کی تو اس قسم کا توڑنا اور اس کا کفارہ دینا (اس پر) واجب ہے۔

۞۞۞

قتل کی قسم کھانا

سوال نمبر (13):

ایک شخص نے غصہ میں آکر قسم کھائی کہ آئندہ مہینے کی فلاں تاریخ کو فلاں شخص قتل کروں گا، لیکن اب وہ اپنے قول پر نادم ہے، اگر یہ شخص قسم توڑ دے تو شرعاً اس پر کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کوئی شخص گناہ اور معصیت کے کام پر قسم کھائے تو اس کا توڑنا اس پر واجب ہے، چونکہ کسی کو ناحق قتل کرنا گناہِ کبیرہ ہے، اس لیے قتل کی قسم کھانے والے پر قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا لازم ہے۔

(۱) تنویر الأبصار علی ردالمحتار، کتاب الأیمان: ۵/۰۶،۵۰۷

والدّلیل علی ذلك:

ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع أبویه، أو قتل فلان الیوم وجب الحنث، والتکفیر. (۱)

ترجمہ:

جو کسی گناہ پر قسم کھائے، جیسے: والدین سے باتیں نہ کرنے کی یا آج کے دن کسی کو قتل کرنے کی تو اس قسم کا توڑنا اور اس کا کفارہ دینا (اس پر) واجب ہے۔

❁❁❁

پانچ سال روزے رکھنے کی قسم کھانا

سوال نمبر (14):

ایک عورت نے قسم کھائی ہے کہ اگر میں اپنے باپ کے گھر چلی گئی تو قسم ہے کہ پانچ سال روزے رکھوں گی، جب کہ بعد میں وہ باپ کے گھر چلی گئی تو اب اس پر پانچ سال روزے واجب ہیں یا کفارہ قسم لازم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کسی عورت کا یوں کہنا کہ "اگر میں اپنے باپ کے گھر چلی گئی تو قسم ہے کہ پانچ سال روزے رکھوں گی" فقہ حنفی کی رُو سے قسم ہے، اس لیے جب وہ بعد میں باپ کے گھر چلی گئی ہے تو اس پر قسم کا کفارہ لازم ہے، کفارہ ادا کرنے سے ذمہ فارغ ہو جائے گا۔ پانچ سال روزے رکھنا ضروری نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

وإن علق بشرط لایرید کونه کدخول الدار أو نحوه، یتخیر بین الکفارة و بین عین ماالتزمه ......
وروي أن أباحنیفةؒ رجع إلی التخییر أیضا.(۲)

(۱) تنویرالابصار علی ردالمحتار، کتاب الأیمان: ۵۰۷،۵۰۶/۵
(۲) الفتاوی الهندیة، کتاب الایمان، فصل فی الکفارة، ممایتصل بذلك مسائل النذر: ۶۵/۲

ترجمہ:

اگر کوئی شخص قسم کو کسی ایسی شرط سے معلق کرے جس کو وہ نہ کرنا چاہتا ہو، جیسے کہ گھر میں داخل ہونا تو اس کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ کفارہ دے یا وہ کام کرے جس کا اس نے التزام کیا ہے اور امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے بھی اختیار دینے والے قول کی طرف رجوع کیا۔

۞۞۞

یمین غموس پر ندامت کا حکم

سوال نمبر(15):

ایک شخص نے ماضی میں ایک کام کیا ہے۔ پوچھنے پر قسم کھا کر کہا کہ میں نے نہیں کیا ہے۔ اب وہ نادم ہو کر قسم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے تو کیا جھوٹی قسم کھانے کی صورت میں قسم کا کفارہ ادا کرکے ذمہ فارغ ہوسکتا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کوئی شخص ماضی میں کیے ہوئے کام پر جھوٹی قسم کھائے، اس کو یمینِ غموس کہتے ہیں۔ حدیث شریف کی رُو سے ایسا شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، اس لیے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ و استغفار کرنا چاہیے، کیونکہ بغیر توبہ و استغفار کے گناہ کبیرہ کی معافی ممکن نہیں، جبکہ اس کے علاوہ جھوٹی قسم پر کوئی کفارہ وغیرہ لازم نہیں آتا، بلکہ اس کا کفارہ توبہ و استغفار ہی ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

فالغموس هو الحلف على أمرماض يتعمد الكذب فيه، فهذه اليمين يأثم فيها صاحبها لقوله عليه السلام "من حلف كاذبا أدخله الله النار" ولا كفارة فيها إلاالتوبةوالاستغفار.(۱)

ترجمہ: یمینِ غموس ماضی کے کام پر ایسی قسم کھانا ہے جس میں جھوٹ کا قصد کیا جائے۔ اس میں قسم کھانے والا گناہ گار ہوگا، کیونکہ حضورﷺ کا ارشاد ہے: ''جو جھوٹ کی قسم کھائے، اللہ اس کو جہنم میں داخل کرے گا'' اور توبہ و استغفار کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں۔

(۱) الهداية، كتاب الأيمان: ۲/۴۷۶

فلاں سے بات کی تو سود خور ہوں گا

سوال نمبر(16):

''الف'' نے کہا کہ اگر میں نے ''ب'' سے بات کی تو میں سود کھانے والا ہوں گا۔ بعد میں ''الف'' نے ''ب'' سے باتیں شروع کیں، باتیں کرنے کے بعد الف حانث ہوگا یا نہیں؟ اور الف پر کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کوئی شخص کہے کہ اگر میں نے فلاں سے بات کی تو میں سود خور ہوں گا، شریعتِ مطہرہ کی رُو سے اس میں کوئی مواخذہ نہیں۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں الف کا یہ کہنا کہ اگر میں نے ''ب'' سے باتیں کی تو سود خور ہوں گا، چونکہ قسم میں داخل نہیں، اس لیے باتیں شروع کرنے کی صورت میں الف پر کوئی چیز واجب نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

لو قال إن فعلت كذا فأنا زان، أو سارق، أو شارب خمر، أو آكل ربوا، فليس بحالف. (١)

ترجمہ:

اگر یہ کہے کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں زانی یا چور یا شرابی یا سود خور ہوں گا تو یہ قسم کھانے والا نہیں ہے۔

۞۞۞

معاہدہ کی پابندی کی قسم کھانا

سوال نمبر(17):

ہمارے خاندان کے سربراہان نے متفقہ طور پر ایک معاہدہ طے کیا جو خاندان کے باہمی اتفاق واتحاد سے متعلق تھا۔ سربراہانِ قوم کے دستخط معاہدہ پر ثبت ہوئے اور ہر ایک نے قسم کھائی کہ اس معاہدہ پر عمل کریں گا۔ جن دفعات پر حلفیہ دستخط ہوئے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الايمان، الباب الثاني فيمايكون يميناً ومالايكون يميناً: ٥٥/٢

(۱)...... قوم کا کوئی فرد دوسرے فرد کو نقصان نہیں پہنچائے گا اور ہر تنازعہ اتفاق رائے سے حل کیا جائے گا۔

(۲)...... بیرونی تنازعہ کی صورت میں تمام قوم متفق ہوگی، اس میں نفع ونقصان کی صورت میں پوری قوم شریک رہے گی۔

(۳)...... خاندانی تنازعہ کو باہمی مشورہ سے حل کریں گے، تعدی کرنے والا خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہوگا۔

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

خاندان کے درمیان اتفاق واتحاد کے قیام کے لیے اور باہمی اختلافات سے بچنے کے لیے ایسا معاہدہ مستحسن اقدام ہے۔ بظاہر محررہ دفعات میں کوئی ایسا دفعہ نہیں جو خلاف شرع ہو، اس لیے قوم کے جن افراد نے اصالتاً یا وکالتاً اس پر کاربند رہنے کے لیے معاہدہ کیا ہو، معاہدہ کی پاس داری ان جملہ شرکا کی اخلاقی اور مذہبی ذمہ داری ہے اور جن افراد نے دستخط کر کے قسم کھائی ہے، ان پر حنث سے بچنے کے لیے بھی معاہدہ کا پاس رکھنا شرعاً ضروری ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

إذاكان المحلوف عليه ترك معصية فإن البر واجب.(۱)

ترجمہ: جب محلوف علیہ (جس چیز پر قسم کھائی ہو) معصیت کا ترک کرنا ہو تو قسم کو پورا کرنا واجب ہے۔

تاہم اگر مذکورہ اتفاق کسی ایسے مطالبہ پر منتج ہو، جس میں شریعت کا تقدس مجروح ہوتا ہو تو پھر پابند رہنا ضروری نہیں، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

من نذر أن يطيع الله فليطعه، ومن نذر أن يعصيه، فلايعصيه.(۲)

ترجمہ: جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر مانی تو اس کی اطاعت کرے اور جس نے معصیت کی نذر مانی تو معصیت نہ کرے۔

❁❁❁

۱) البحرالرائق، كتاب الايمان، تحت قوله(ومن حلف على معصية): ٤٩١/٤

۲) الصحيح البخاری، كتاب الاحكام، باب النذر في الطاعة: ٩٩١/٢

کفارہ یمین کے روزوں میں تسلسل

سوال نمبر(18):

اگر کوئی عورت یمین منعقدہ میں حانث ہو جائے اور مالی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے کفارہ کے تین دن روزے رکھنا شروع کرے، دو دن مسلسل روزے رکھے، جب کہ تیسرے دن اس کو حیض آیا تو حیض سے پاک ہونے کے بعد صرف ایک روزہ رکھے گی یا از سرِ نو تینوں روزے رکھنا ضروری ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کفارہ یمین کے تین دن روزے رکھنے میں تتابع اور تسلسل شرط ہے، لہٰذا بغیر تسلسل کے اگر تین روزے بطور کفارہ رکھے جائیں تو جائز نہیں اور اس سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا۔

صورتِ مسئولہ میں تیسرے دن عورت کو حیض آجانے سے تتابع برقرار نہیں رہا، لہٰذا حیض سے پاک ہو جانے کے بعد تینوں روزے مسلسل رکھنا لازمی ہے۔ اگر صرف بقیہ ایک دن کا روزہ رکھا تو اس سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا۔

والدّلیل علی ذلک:

لو صام الثلاثه متفرقة لایجوز... ولو حاضت المرأة في الثلاثة استقبلت.(۱)

ترجمہ:

اگر (کفارہ یمین میں) تین روزے الگ الگ رکھے تو جائز نہیں۔۔۔۔۔اور اگر عورت کو ان تین روزوں کے درمیان حیض آئے تو از سرِ نو یہ روزے رکھے گی۔

❁❁❁

مالی استطاعت کے ہوتے ہوئے کفارہ یمین میں روزے رکھنا

سوال نمبر(19):

اگر کوئی شخص یمین منعقدہ میں حانث ہو جائے تو وہ اگر دس مساکین کو دو وقت کھانا کھلانے کی قدرت رکھتا ہو،

(۱) البحرالرائق، کتاب الأیمان تحت قوله(وإن عجز عن احدها): ٤/٤٨٩

اسی طرح دس مساکین کو کپڑے دینے کی قدرت رکھتا ہو تو اس شخص کے لیے اس قدرت کے ہوتے ہوئے تین دن روزے بطورِ کفارہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

یمینِ منعقدہ میں حانث ہونے والے شخص کی اگر اس پر قدرت ہو کہ دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلائے یا دس مساکین کو جسم ڈھانپنے کے بقدر کپڑے دے، تو اس کے لیے تین دن روزے بطورِ کفارہ یمین رکھنا جائز نہیں، بلکہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی کی دس مساکین کو کھانا کھلانے یا ان کو کپڑے دینے کی قدرت نہ تھی اور اس نے بطور کفارہ روزے رکھنا شروع کیے اور تیسرے دن بالکل اخیر وقت میں یہ مالی استطاعت اور قدرت کا حامل ہوا، تب بھی یہ روزے کفارہ میں شمار نہیں ہوں گے، بلکہ دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلائے یا ان کو جسم ڈھانپنے کے بقدر کپڑے دے دے، تب کفارہ ادا ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

ولایجوز التکفیر بالصوم إلالمن عجز عما سوی الصوم ...... ویشترط استمرار العجز إلی وقت الفراغ من الصوم، فلو صام المعسر یومین ثم أیسر لایجوزله الصوم.(۱)

ترجمہ: (کفارہ یمین میں) روزے بطورِ کفارہ رکھنا جائز نہیں، مگر صرف اس شخص کے لیے جو روزوں کے علاوہ دوسرے طریقے سے کفارہ دینے سے عاجز ہو۔۔۔۔۔اور تین دن کے روزوں سے فراغت کے وقت تک عجز میں دوام شرط ہے۔ پس اگر کسی تنگ دست نے دو دن روزے رکھے، پھر اس کے بعد غنی بن گیا تو اس کے لیے روزے (بطور کفارہ) جائز نہیں۔

۞۞۞

قسم کے کفارہ میں روزوں کا تسلسل

سوال نمبر(20):

ایک شخص قسم کھانے کے بعد حانث ہو چکا ہے۔ اب وہ قسم کا کفارہ روزوں سے ادا کرنا چاہتا ہے، کیا کفارہ

(۱) البحرالرائق، کتاب الأیمان تحت قوله(وإن عجز عن احدها): ٤/٤٨٨،٤٨٩

کے روزوں میں تسلسل ضروری ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہ حنفی کی رُو سے کفارہ قسم میں اول دس مسکینوں کو کھانا کھلانا، پھر دس مسکینوں کو کپڑے دینا، پھر غلام آزاد کرنا ہے، جب کوئی ان تینوں سے عاجز ہو تو اس کے لیے تین دن مسلسل روزے رکھنا ضروری ہے۔

صورتِ مسئولہ میں حانث ہونے کی صورت میں کفارہ کے طور پر دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ان کو کپڑے دے دے یا غلام آزاد کرے، اگر ان تینوں سے عاجز ہو تو پھر مسلسل تین روزے رکھے، اگر ان میں ناغہ ہو جائے تو روزوں کا از سر نو رکھنا ضروری ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

فإن لم یقدر علی أحد الأشیآء الثلاثة، صام ثلاثة أیام متتابعات، وقال الشافعيؒ: یخیر لإطلاق النص، ولنا قرأة ابن مسعودؓ "فصیام ثلثة أیام متتابعات" وهي کالخبر المشهور.(۱)

ترجمہ: اگر تین چیزوں میں سے کسی پر قادر نہ ہو تو تین دن مسلسل روزے رکھے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اسے اختیار دیا جائے گا، کیونکہ نص مطلق ہے اور ہماری دلیل عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت ہے "پس تین دن متواتر روزے رکھے" اور یہ قرأت خبر مشہور کی طرح ہے۔

❁❁❁

قسم کے کفارہ میں بیس مساکین کو ایک وقت کا کھانا کھلانا

سوال نمبر(21):

ایک شخص پر قسم کا کفارہ لازم ہو چکا ہے، وہ دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانے کی جگہ بیس مسکینوں کو ایک وقت کا کھانا کھلانا چاہتا ہے، تا کہ جلد اس کا ذمہ فارغ ہو تو کیا قسم کے کفارہ میں بیس مساکین کو ایک وقت کھانا کھلانے سے کفارہ ادا ہو جائے گا۔

بینوا تؤجروا

(۱) الهدایة، کتاب الأیمان، باب مایکون یمیناً ومالایکون یمیناً: ۲/۴۷۹

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کوئی شخص قسم کے کفارہ میں دس مسکینوں کو دووقت کا کھانا کھلانے کی بجائے بیس مسکینوں کو ایک وقت کا کھانا کھلائے تو ذمہ فارغ نہ ہوگا، ایک وقت میں کھانا کھلانے سے صرف ایک وقت کا کھانا متصور ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

وإذا غدّی مسکینا وعشّی غیرہ عشرة أیام لم یجزہ الأنه فرق طعام العشرة علی عشرین، کماإذا فرق حصة المسکین علی مسکینین.(۱)

ترجمہ:

اور اگر دس دن دوپہر ایک مسکین کو اور شام دوسرے مسکین کو کھانا کھلایا تو یہ جائز نہیں، کیوں کہ اس نے دس مسکینوں کے کھانے کو بیس پر تقسیم کردیا، یہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے ایک مسکین کے حصے کو دو مسکینوں پر تقسیم کردیا۔(اور یہ جائز نہیں)۔

۞۞۞

معصیت پر قسم کھانے کا کفارہ

سوال نمبر(22):

ایک شخص نے کسی معصیت پر قسم کھائی تھی، لیکن بعد میں وہ قسم توڑ دی۔ اب اس شخص پر کتنا کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

دس مسکینوں کو دووقت کا کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو پہننے کے لیے کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا قسم کا کفارہ ہے۔ اگر مذکورہ شخص ان تین چیزوں کی ادائیگی سے عاجز ہو تو پھر تین روزے پے درپے رکھنے سے کفارہ ادا ہو جائے گا۔

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الأیمان، مطلب کفارة الیمین: ۵/۵۰۳

والدلیل علی ذلك:

وکفارته تحریررقبة، أوإطعام عشرة مساکین کمافي الظهار، أو کسوتهم بمایستر عامة البدن، فإن عجز عن أحدها صام ثلثة أیام متتابعات. (۱)

ترجمہ:

اوراس (قسم) کا کفارہ ایک غلام آزادکرنا یادس مساکین کوکھانا کھلانا، جیساکہ ظہار میں ہے یاان کوایسے کپڑے دینا ہے جن سے بدن کا اکثر حصہ ڈھانپا جا سکے۔ اگران تینوں میں ہرکام سے عاجز ہوتو تین دن متواتر روزے رکھے۔



غیراللہ کی نذر ماننا

سوال نمبر(23):

ایک عورت نے نذر مانی ہے کہ اگر میری بیٹی کا رشتہ فلاں شخص کے ساتھ ہوجائے تو میں اپنے پیر، جوکہ زندہ ہے، کے نام ایک بکرا ذبح کروں گی۔کیا اس طرح غیراللہ کی نذر ماننا درست ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ نذر کی ادائیگی ایک عبادت ہےاورمخلوق کے لیےعبادت کرنا جائزنہیں، بلکہ عبادت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے جائز ہے۔مذکورہ عورت نے چونکہ اللہ تعالیٰ کی بجائے غیراللہ کے نام پر ذبح کرنے کی نذر مانی ہےاس لیے یہ نذر بالاجماع باطل اورحرام ہے۔اوراس پرلازم ہےکہ مشرکانہ اقدام سےتوبہ نکالے۔

والدّلیل علی ذلك:

ومنها أن یکون قربة فلا یصح النذر بما لیس بقربة رأسا کالنذر بالمعاصي ....

---

(۱) کنزالدقائق، کتاب الأیمان: ۱/ ۱۵۵

لقوله علیه الصلاة والسلام لا نذر في معصیة الله تعالی وقوله: علیه الصلاة والسلام من نذر أن یعصي الله تعالی فلا یعصه، ولأن حکم النذر وجوب المنذور به ووجوب فعل المعصیة محال.(۱)

ترجمہ:

اور نذر کی شرائط میں سے یہ ہے کہ وہ قربت (عبادت) ہو، اس لیے جو قربت نہ ہو تو اس کی نذر درست نہیں، جیسے کہ گناہ کی نذر درست نہیں۔۔۔۔ حضور ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ: ''اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں نذر درست نہیں ہوتی'' اور اس ارشاد کی وجہ سے کہ: ''جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نذر مانے تو نافرمانی نہ کرے'' اور اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ نذر کا حکم منذور کا واجب ہوتا ہے اور گناہ کا واجب ہونا محال ہے (کیوں کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم نافرمانی کا حکم نہیں دے سکتا)۔

وفي ردالمحتار: لوجوه منها: أنه نذر لمخلوق، والنذر للمخلوق لایجوز لأنه عبادة والعبادة لاتکون لمخلوق.(۲)

ترجمہ: اور شامی میں ہے کہ (غیر اللہ کی نذر کی حرمت کی) بہت سی وجوہات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ مخلوق کے لیے نذر کرنا ہے اور مخلوق کے لیے نذر کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لیے نہیں ہوتی۔

۞۞۞

کسی جگہ کے ساتھ نذر نماز خاص کرنا

سوال نمبر (24):

اگر کوئی شخص اس بات کی نذر مان لے کہ اگر میرا فلاں کام ہوا تو میں دو رکعات نماز فلاں مسجد میں پڑھوں گا، تو کام ہوجانے کے بعد کیا اس پر اُسی مسجد میں نفل نماز پڑھنا واجب ہوگا یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی بھی مخصوص جگہ میں نماز پڑھنے کی نذر ماننے سے اُس مخصوص جگہ میں نماز پڑھنا لازمی نہیں ہوتا،

(۱) بدائع الصنائع، کتاب النذر: ۶/۳۳۵

(۲) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصوم، باب مایفسد الصوم، مطلب: النذرالذی یقع للاموات: ۳/۴۲۷

بلکہ جہاں کہیں بھی کسی پاک جگہ پڑھ لے تو ذمہ فارغ ہو جاتا ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

واختلف أصحابنا في من نذر صوما أوصلاة في موضع بعینه، قال أبو حنیفة ومحمد: له أن یصوم ویصلي في أيّ موضع شاء. (١)

ترجمہ:

فقہائے کرام نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ جو شخص روزہ یا نماز کسی مخصوص جگہ میں ادائیگی کی نذر مان لے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ اس کو اختیار ہے کہ یہ شخص جہاں چاہے روزہ اور نماز ادا کرے۔

❁❁❁

عیدین اور ایام تشریق کے روزے رکھنے کی نذر ماننا

سوال نمبر(25):

اگر کوئی شخص نذر مان لے کہ میں عیدین اور ایام تشریق کے دنوں میں روزے رکھوں گا تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

عیدین اور ایام تشریق کے روزے رکھنے کی نذر ماننا فی نفسہٖ صحیح ہے، لیکن ان دنوں میں روزہ رکھنا چونکہ ممنوع ہے، لہٰذا جب کوئی شخص ان ایام کے روزوں کی نذر مان لے تو ان دنوں میں روزے نہ رکھے، بلکہ اس کے لیے افطار کرنا ضروری ہے اور بعد میں ان روزوں کی قضا کرلے۔

والدّلیل علی ذلك:

فإذا قال للّٰہ عليّ صوم یوم النحر أفطر وقضی، وھذا النذر صحیح؛ لأنه مشروع بنفسه منھي لغیرہ، وھو ترك إجابة دعوة اللّٰہ تعالیٰ، وإن صام فیه یخرج عن العھدة. (٢)

---

(١) الفتاوی الھندیة، کتاب الأیمان، الباب الثاني فیمایکون یمیناً ومالایکون یمیناً: ٦٥/٢

(٢) الفتاوی الھندیة، کتاب الصوم، الباب السادس في النذر: ٢٠٨/١

ترجمہ: اگر کہا کہ ''مجھ پر اللہ تعالیٰ کے لیے قربانی کے دن روزہ رکھنا لازم ہے'' تو اس دن افطار کرے اور بعد میں اس کی قضا کرلے اور یہ نذر ماننا صحیح ہے، اس لیے کہ بالذات یہ نذر مشروع ہے اور غیر کی وجہ سے اس کی ممانعت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول نہ کرنا ہے اور اگر اس دن روزہ رکھ لیا تو اس کا ذمہ اس سے فارغ ہو جاتا ہے۔

❁❁❁

نذر کی رقم قسط وار ادا کرنا

سوال نمبر(26):

کسی شخص نے نذر مانی کہ اگر فلاں لڑکی سے میری شادی ہوئی تو میں دس ہزار روپے اللہ کے نام پر صدقہ کروں گا۔ بڑی مشکل سے اس کی شادی اسی لڑکی سے ہوگئی۔ اب اگر وہ دس ہزار روپے قسط وار فقرا میں تقسیم کرتا ہے تو کیا اس طرح اس کا ذمہ فارغ ہو جائے گا، کیوں کہ اس کے پاس یک مشت اتنی رقم نہیں ہے۔

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کوئی آدمی نذر کو شرط کے ساتھ معلق کرے تو شرط پائے جانے کی صورت میں نذر کی ادائیگی لازم ہوگی، تاہم رقم صدقہ کرنے کی نذر ہو تو اُس کو یکمشت صدقہ کرنا ضروری نہیں بلکہ قسط وار ادائیگی سے بھی ذمہ فارغ ہو جائے گا۔ صورتِ مسئولہ میں جب شادی کی نذر پوری ہوئی تو دس ہزار روپے صدقہ کرنا لازم ہے۔ اگر یکمشت اتنی رقم نہ ہو تو تھوڑا تھوڑا صدقہ کرتا رہے اِس سے بھی ذمہ فارغ ہو جائے گا۔

والدّلیل علی ذلك:

(وجد الشرط) المعلق به (لزم الناذر)لحديث "من نذ روسمى فعليه الوفاء بماسمّى" (كصوم وصلوة وصدقة).(٢)

ترجمہ: جب نذرِ معلق کی شرط پائی جائے تو اِس حدیث کی رُو سے ناذر پر اس کا ایفا لازم ہے کہ ''جس نے نذر مانا اور متعین کیا تو اُس پر وہی متعین کردہ چیز ادا کرنا ضروری ہے۔ جیسے روزہ، نماز اور صدقہ۔

---

(١) الدرالمختار على صدرردالمحتار، كتاب الايمان: ٥/٥١٦، ٥١٧

بھائی کو نذر کے پیسے دینا

سوال نمبر(27):

میں نے تین ہزار روپے کی نذر مانی ہے اور میرا بھائی ایک غریب شخص ہے تو کیا میں اپنے بھائی کو نذر کے پیسے دے سکتا ہوں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق مستحق بہن بھائیوں کو صدقاتِ واجبہ دینا نہ صرف جائز، بلکہ افضل اور بہتر ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں نذر ماننے والے کا بھائی اگر صدقاتِ واجبہ لینے کا مستحق ہو تو اس کو چاہیے کہ دوسرے کسی شخص کو دینے کی بجائے اپنے اس غریب بھائی کو دے دے تاکہ فراغتِ ذمہ کے ساتھ ساتھ صلہ رحمی کا ثواب بھی حاصل ہو۔

والدّلیل علی ذلک:

والأفضل في الزكاة والفطر والنذر الصرف أولاً إلى الإخوة والأخوات، ثم إلى أولادهم، ثم إلى الأعمام والعمات.(۱)

ترجمہ: زکوٰۃ، صدقہ فطر اور نذر وغیرہ میں افضل یہ ہے کہ پہلے اپنے بہن بھائیوں کو دی جائے، پھر ان کی اولاد وغیرہ کو پھر اسی ترتیب سے چچاؤں اور خالاؤں کو دی جائے۔

❁❁❁

نذر مانی ہوئی رقم سے بیٹے کو دینا

سوال نمبر(28):

اگر کوئی عورت نذر مان لے اور پھر وہ کام ہو جائے تو کیا یہ عورت نذر کی رقم اپنے بیٹے کو دے سکتی ہے؟

بینوا تؤجروا

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف: ۱/۱۹۰

الجواب وباللہ التوفیق:

جس چیز کی نذر مانی گئی ہو اس کا صدقہ کرنا واجب ہے اور صدقاتِ واجبہ جس طرح اغنیا کو نہیں دیے جا سکتے، اسی طرح اصول وفروع کو بھی نہیں دیے جا سکتے۔ لہٰذا اس عورت کا اپنے بیٹے کو نذر کی رقم دینا صحیح نہیں، بلکہ اصول وفروع کے علاوہ دیگر فقرا ومساکین میں تقسیم کرنا واجب ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

باب المصرف، أي مصرف الزكاة والعشر. قال ابن عابدينؒ قوله: أي مصرف الزكاة والعشر يشير إلى وجه مناسبته هنا والمراد بالعشر ما ينسب إليه كما مرّ، فيشمل العشر ونصفه المأخوذين من أرض المسلم ....وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة.(۱)

ترجمہ:

یہ زکوٰۃ اور عشر کے مصرف کا باب ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ مصرف الزکاۃ والعشر کہنے سے خصوصی مناسبت بیان کرتا ہے۔ اور عشر سے مراد وہ ہے جو اس کی طرف منسوب ہے، لہٰذا یہ عشر، نصف عشر جو مسلمانوں کی زمین سے لیا جاتا ہے، ان سب کو شامل ہے.......اور یہی مصارف صدقہ فطر، کفارات، نذر اور تمام صدقات واجبہ کے لیے ہیں۔

— ولا يعطي من الزكاة والده وإن علا، ولا ولداً وإن سفل.(۲)

ترجمہ: اور مال زکوٰۃ میں سے نہ تو اپنے باپ، دادا، پردادا کو کچھ دے سکتا ہے اور نہ اپنے بیٹے، بیٹی اور نہ ان کی اولاد کو۔

❁❁❁

نذر کی رقم شادی میں خرچ کرنا

سوال نمبر (29):

ایک آدمی کی بکری نے روٹی کھائی جس کی وجہ سے وہ پھول کر مرگئی، لیکن اس کے پیٹ میں بچہ تھا، اس آدمی

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکاۃ، باب مصرف الزکاۃ: ۲۸۳/۳

(۲) الفتاویٰ التاتارخانیة، کتاب الزکاۃ، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة: ۲۰٤/۲

نے یہ نذر مان لی کہ اگر یہ بچہ نہیں مرا اور بچ گیا تو میں اس کو اللہ کی راہ میں قربان کروں گا۔ اب یہ بچہ بچ گیا لیکن جب اس آدمی کی بیٹی کی شادی تھی تو اس نے وہ بچہ فروخت کر کے رقم سے دیگ پکایا۔ کیا اس سے اس کی نذر ادا ہوگئی؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق نذر شدہ چیز واجب التصدق ہوتی ہے جس کا مصرف فقرا و مساکین ہیں، یہی وجہ ہے کہ نذر شدہ چیز سے نہ ناذر خود کھا سکتا ہے اور نہ اس سے اغنیا کو کچھ کھلا سکتا ہے۔ نذر شدہ چیز کو بیچنے کے بعد اس کی قیمت کا بھی یہی حکم ہے۔

مسئولہ صورت میں اگر اس آدمی نے نذر شدہ بکری کی قیمت اپنی بیٹی کی شادی کی دعوت میں نذر کی نیت سے خرچ کی ہو تو جتنی مقدار (خوراک) خود کھائی ہے یا اغنیا اور اصول وفروع کو کھلائی ہے، اس کے بقدر رقم فقرا کو دینا واجب ہے اور اگر دعوت کھلانے میں نذر کی نیت نہیں تھی، بلکہ صرف خوشی کے موقع پر لوگوں کو کھلانا مقصود تھا تو اب نذر شدہ بکری کی کل قیمت فقرا و مساکین کو دینا واجب ہے۔

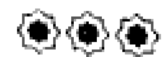
والدّلیل علی ذلک:

(نذر أن یتصدق بعشرة دراهم من الخبز، فتصدق بغیره جاز إن ساوی العشرة) کتصدقه بثمنه.(۱)

ترجمہ: کسی نے نذر مانی کہ وہ دس دراہم کی روٹی صدقہ کرے گا اور اس نے روٹی کے علاوہ کوئی دوسری چیز صدقہ کردی تو جائز ہے، بشرطیکہ وہ چیز دس دراہم کی قیمت رکھتی ہو، جیسا کہ اس شخص کا دس دراہم صدقہ کرنا جائز ہے۔

وفي الأصل: الناذر لا یأکل مما نذره، ولو أکل فعلیه قیمة ما أکل.(۲)

ترجمہ: اور کتاب الاصل میں مذکور ہے کہ نذر ماننے والا منذور چیز سے نہیں کھا سکتا ہے اور اگر کہیں کھالیا تو اس پر اس کھانے کی قیمت دینا لازم ہے۔



(۱) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الأیمان: ۵/۵۲۵

(۲) البحر الرائق، کتاب الأضحیة، قبل قوله (ولا یذبح مصري قبل الصلاة): ۸/۳۲۱

آمدنی میں اضافہ کی صورت میں متعین رقم صدقہ کرنے کی نذر

سوال نمبر(30):

ایک شخص نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میری روزانہ کی آمدنی تین ہزار روپے تک پہنچا دی تو ان میں سے ہر روز دوسو روپے صدقہ کروں گا۔ جب اس کی روزانہ آمدنی تین ہزار روپے ہو جائے تو کیا اس پر ان میں سے روزانہ دوسو روپے صدقہ کرنا لازم ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نذرِ معلق میں وجوبِ نذر کے لیے کسی صیغہ لزوم کا ہونا ضروری ہے جو اپنے اوپر کسی چیز کے لازم کرنے پر دلالت کرتی ہو، تاہم استحساناً اگر نذر میں لزوم کے الفاظ استعمال نہ بھی ہوں، تب بھی جب کسی کام کے ہونے کے ساتھ کوئی عمل معلق کرے تو اس کام کے ہو جانے کی صورت میں وہ عمل لازم ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں جب اس شخص نے کہا کہ: ''اگر اللہ تعالیٰ نے میری روزانہ کی آمدنی تین ہزار روپے تک پہنچا دی تو ان میں سے ہر روز دوسو روپے صدقہ کروں گا'' اس جملہ میں اگر چہ التزام کا کوئی لفظ بظاہر موجود نہیں ہے، لیکن استحسان اور عرف کا تقاضا یہ ہے کہ شرط پوری ہونے کی صورت میں اس پر روزانہ دوسو روپے صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

والدلیل علی ذلك:

إن عوفيت صمت كذا لم يجب حتى يقول لله عليّ وهذا قياس ، وفي الاستحسان يجب، وإن لم يكن تعليق لايجب عليه قياساً ولا استحساناً.(۱)

ترجمہ:

اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے عافیت (شفا) ملی تو میں اتنے روزے رکھوں گا، قیاساً اس پر اتنے روزے رکھنا واجب نہیں ہوتے، جب تک یہ نہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مجھ پر (روزے رکھنا) لازم ہے اور استحسان کی رُو اس پر روزے رکھنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر شرط کے ساتھ اس کو معلق نہ کیا ہو تو پھر اس پر وجوب نہیں آتا، نہ قیاساً اور نہ استحساناً۔



(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصوم، الباب السادس في النذر: ۱/ ۲۱۰

نذر مانی ہوئی رقم کی مقدار میں غلط بیانی

سوال نمبر(31):

ایک شخص نے دوسو روپے کی نذر مان لی، اس کے بعد باپ سے اپنی مانی ہوئی نذر کے متعلق قصداً اس طرح کہا کہ میں نے ہزار روپے کی نذر مانی تھی، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس پر دوسو روپے کی نذر پورا کرنا واجب ہے یا ہزار روپے کی؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نذر کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جو لزوم پر دلالت کرتا ہو، لہٰذا جو کلمات ایسے ہوں کہ لزوم سے خالی ہوں، ان سے نذر واجب نہیں ہوتی۔

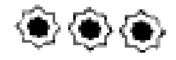
صورت مسئولہ میں جب اس شخص نے ایک بار دوسو روپے کی نذر مان لی اور پھر اپنے باپ سے سابقہ نذر کے متعلق حکایت کے طور پر یوں کہا کہ "میں نے ہزار روپے کی نذر مانی تھی"، یہ نذر کا جملہ نہیں ہے، بلکہ سابقہ نذر سے جھوٹی حکایت ہے اور اس سے اپنے اوپر ہزار روپے کی نذر ماننا مقصود نہیں، لہٰذا اس پر صرف سابقہ دوسو روپے کی نذر پوری کرنا واجب ہے اور سابقہ نذر سے جھوٹی حکایت کرنے سے اس پر ہزار روپے نذر کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی۔

والدليل على ذلك:

فركن النذر: هو الصيغة الدالة عليه، وهو قوله لله عزشأنه عليّ كذا أوعليّ كذا،أوهذا هدي أوصدقة......أوماأملك صدقة، ونحو ذلك.(١)

ترجمہ:

نذر کا رکن ایسا کلمہ استعمال کرنا ہے جو نذر پر دلالت کرتا ہو اور وہ اس (ناذر) کا یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مجھ پر اتنا (صدقہ کرنا) لازم ہے یا مجھ پر اتنا لازم ہے یا یہ (چیز) ہدیہ ہے یا صدقہ ہے۔۔۔۔۔یا جس چیز کا میں مالک ہوں وہ صدقہ ہے یا اس طرح کا کوئی لفظ ہو۔



(١) بدائع الصنائع، كتاب النذر: ٦/٣٣٣

ہر جمعہ کے روزے کی نذر مان کر اس سے عاجز ہونا

سوال نمبر(32):

ایک شخص نے کہا کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو ہر جمعہ کو روزہ رکھنا مجھ پر لازم ہوگا، پھر کچھ عرصہ بعد وہ کام ہو گیا، لیکن جب یہ شخص ہر جمعہ کو روزہ رکھنے سے بیماری یا کسی اور وجہ سے عاجز ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو ہر جمعہ کو روزہ رکھنا مجھ پر لازم ہے تو اس کام کے ہونے کی صورت میں زندگی بھر ہر جمعہ کو اس پر روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے، تاہم اگر کسی وجہ سے جمعہ کے دن روزہ رکھنا چھوٹ جائے تو کسی دوسرے دن اس کی قضا کرے گا۔

لیکن اگر اس کا ذریعہ معاش ایسا ہو جس میں مشقت ہونے کی بنا پر اس کے لیے جمعہ کے دن نذر کا روزہ رکھنا مشکل ہو یا بیماری یا انتہائی بڑھاپے کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے تو ہر جمعہ کے روزے کے بدلے ایک روزے کا فدیہ ادا کرتا رہے، لیکن اگر غربت کی وجہ سے فدیہ ادا کرنے پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا رہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف کرے گا۔

والدلیل علی ذلک:

إذا نذر أن يصوم كل خميس يأتي عليه، فأفطر خميسا واحدا، فعليه قضاءه. و لو أخر القضاء حتى صار شيخا فانيا، و كان النذر بصيام الأبد، فعجز لذلك أو باشتغاله بالمعيشة لكون صناعته شاقة فله أن يفطر ويطعم لكل يوم مسكينا على ماتقدم، وإن لم يقدر على ذلك لعسرته يستغفر الله إنه هو الغفور الرحيم.(۱)

ترجمہ:

جب کسی شخص نے ہر آنے والے جمعرات کے دن روزہ رکھنے کی نذر مان لی، پھر کسی ایک جمعرات کو بھی افطار کیا تو اس کی قضا اس پر لازم ہے۔ اگر قضا کو اس قدر موخر کیا کہ شیخ فانی بن گیا اور اس کی نذر پوری زندگی روزے رکھنے کی

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصوم، الباب السادس في النذر: ۱/ ۲۰۹

تھی تو اس سے عاجز ہوا یا مشکل ذریعہ معاش میں مشغول رہنے کی وجہ سے عاجز ہوا تو اس کے لیے افطار جائز ہے اور جیسا کہ پہلے گزرا ہے کہ ہر روزہ کے بدلے مسکین کو (فدیہ کے طور پر) کھانا کھلائے اور اگر (مالی) تنگی کی وجہ سے اس پر بھی قدرت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا رہے، بے شک وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

❀❀❀

نذر مانی ہوئی نماز کا معین مکان میں پڑھنا

سوال نمبر(33):

اگر کوئی شخص اس بات کی نذر مان لے کہ اگر میرا فلاں کام ہوا تو میں دو رکعت نماز بادشاہی مسجد لاہور میں پڑھوں گا تو کام ہو جانے کے بعد یہ شخص جدھر بھی یہ دو رکعت نذر نماز پڑھے، اس کا ذمہ فارغ ہو جائے گا یا بادشاہی مسجد میں پڑھنا لازمی ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی بھی مخصوص جگہ میں نماز پڑھنے کی نذر ماننے سے اس مخصوص جگہ میں وہ منذور نماز پڑھنا لازمی نہیں ہوتی، بلکہ جہاں کہیں پر بھی پڑھ لے، ذمہ فارغ ہو جاتا ہے۔لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بادشاہی مسجد لاہور میں وہ نماز پڑھنا ضروری نہیں، بلکہ جہاں کہیں ادا کرے درست ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

وكذا إذا نذر ركعتين في المسجد الحرام، فأدّاها في أقلّ شرفا منه أو فيما لا شرف له أجزأه. (۱)

ترجمہ:

اور اسی طرح اگر مسجدِ حرام میں دو رکعت (نفل) کی نذر مانے۔ پھر مسجد حرام سے کم فضیلت والی مسجد یا جس جگہ کی کوئی فضیلت نہ ہو، وہاں اس کو ادا کرے تو جائز ہے۔

❀❀❀

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الأیمان: ۵/۵۲۵

نذر میں کہے ہوئے الفاظ کے خصوص پر عمل کرنا

سوال نمبر(34):

ایک شخص کو اپنی ڈاڑھی کے بال نکالنے کی عادت تھی، اس بری عادت سے اپنے آپ کو روکنے کے لیے اس نے یہ کہا کہ جب بھی میں اپنی ڈاڑھی کو ہاتھ لگاؤں تو مجھ پر پانچ روپے کی نذر ہوگی اب پوچھنا یہ ہے کہ آیا اس کا کلام حقیقت پر محمول کیا جائے گا کہ جب بھی داڑھی کو ہاتھ لگائے گا اس پر نذر واجب ہوگی یا یہ کہ ڈاڑھی کے بال نکالنے کی غرض سے ہاتھ لگانے کی صورت میں اس پر پانچ روپے لازم ہوں گے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کوئی شخص کسی کام سے اپنے آپ کو روکنے کے لیے نذر مانے اور کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرے جو حقیقت کے اعتبار سے عموم پر دلالت کرتے ہوں، حالانکہ اس کلام سے ایک خاص مقصد مراد ہو تو ایسی صورت میں اس کلام کو عام معنی کی بجائے اس خاص مقصد پر محمول کیا جائے گا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں عام حالات میں اگر یہ شخص اپنی ڈاڑھی کو ہاتھ لگائے تو نذر واجب نہ ہوگی، بلکہ ڈاڑھی کے بال نکالنے کی غرض سے ہاتھ لگانے کی صورت میں نذر واجب ہوگی۔

والدّلیل علی ذلک:

(والحقیقة تترك بدلالة العادة كالنذربالصلوة والحج...... وبدلالة معنى يرجع إلى المتكلم وقصده، فيحمل على الأخص مجازاً وإن كان اللفظ دالاً على العموم بحقيقته كما في يمين الفور.(١)

ترجمہ:

اور حقیقت متروک ہوتی ہے دلالت عادت کی وجہ سے جیسے نماز اور حج کی نذر۔۔۔۔اور ایسے معنی کی دلالت اور قصد کرنے کی وجہ سے جو متکلم کی طرف راجع ہو، پس ایسا کلام مجازاً اخص پر محمول ہوگا، اگرچہ لفظ اپنی حقیقت کی وجہ سے عموم پر دلالت کرتا ہو، جیسے یمین فور میں ہوتا ہے۔

❁❁❁

(١) نورالأنوار، مبحث الحقيقة والمجاز: ص/١١١، ١١٢

معین مقدار میں رقم مدرسہ کو دینے کا کہنے سے نذر

سوال نمبر(35):

ایک شخص نے کہا کہ اگر ممکن ہو تو ان شاء اللہ میں ہر مہینہ ۵۰۰ روپے مدرسہ کو دوں گا۔ کیا یہ کہنا نذر میں سے شمار ہوگا؟ کیا مدرسہ کے منتظمین پر ان پیسوں کی تملیک ضروری ہے؟ اور کیا ان شاء اللہ کے ساتھ نذر معلق ہو سکتی ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے نذر کے انعقاد کے لیے نذر یا کوئی دوسرا صیغہ جو التزام پر دلالت کرتا ہو، کہنا ضروری ہے، البتہ نذرِ معلق میں استحساناً صیغہ التزام ضروری نہیں۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر کسی شخص نے یہ کہا ہو کہ ''اگر ممکن ہو تو ان شاء اللہ میں ہر مہینہ ۵۰۰ روپے مدرسہ کو دوں گا'' یہ نذر کے زمرے میں نہیں آتا کیونکہ یہ نذرِ مطلق ہے اور اس کے لیے صیغہ التزام، اللہ کے لیے مجھ پر یا صرف مجھ پر لازم ہے وغیرہ کہنا ضروری ہے، لہٰذا ایسے الفاظ کے کہنے سے اس پر منذور چیز پانچ سو روپے لازم نہیں ہوتے۔ ان شاء اللہ کے ساتھ نذر کو اگر تبرک کے لیے معلق کیا جائے تو اس سے نذر باطل نہیں ہوتی، ورنہ اگر تبرک کی نیت نہ ہو تو نذر باطل ہو جاتی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

أمّا الأول: فركن النّذر، وهو الصيغة الدّالة عليه، وهو قوله: لِله عليّ كذا، أو عليّ كذا.(۱)

ترجمہ:

پہلی بحث نذر کے رکن کے بارے میں ہے اور (نذر کا رکن) وہ صیغہ ہے جو کہ اس پر دلالت کرتا ہو، جیسا کہ کسی قائل کا یہ کہنا کہ اللہ کے لیے مجھ پر فلاں چیز ہے یا مجھ پر فلاں چیز ہے۔

(وصل بحلفه إن شآء الله بطل) يمينه (وكذا يبطل به) أي بالاستثناء المتصل (كل ما تعلق بالقول عبادة أو معاملة) قال ابن عابدين: تحت قوله (عبادة) كنذر وإعتاق.(۲)

---

(۱) بدائع الصنائع، كتاب النذر: ۳۳۳/٦

(۲) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الأيمان: ٥/٥٢٦، ٥٢٧

ترجمہ:

اپنی قسم کے ساتھ ان شاء اللہ کو ملایا تو اس کی قسم باطل ہو جائے گی اور اسی طرح استثنائے متصل کے ساتھ ہر وہ چیز جو متعلق ہو، خواہ عبادت میں سے ہو یا معاملہ میں سے (باطل ہوتی ہے)۔ ابن عابدینؒ نے عبادت کی تشریح میں فرمایا: ''جیسا کہ نذر اور اعتاق وغیرہ ہے''۔

❁❁❁

کسی ولی کی قبر پر چادر چڑھانے کی نذر ماننا

سوال نمبر(36):

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں فلاں بزرگ کی قبر پر چادر چڑھاؤں گا جیسا کہ عام مزارات پر ہوتا ہے۔ اگر زید کا کام حسب منشا ہو جائے تو اس پر چادر چڑھانا واجب ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ نذر کے من جملہ شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جس چیز کی منت مانی جائے وہ عبادت مقصودہ ہو اور فی نفسہٖ گناہ نہ ہو، اگر وہ گناہ کا کام ہو تو منت کا پورا کرنا اس پر لازم نہ ہوگا۔

صورت مسئولہ میں یہ کہنا کہ میں فلاں ولی کی قبر پر چادر چڑھاؤں گا، کوئی عبادت نہیں، اس لیے یہ نذر صحیح نہیں اور اس کا پورا کرنا لازم نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

ومنها:أن يكون قربة مقصودة، فلا يصح النذر بعيادة المرضى، وتشييع الجنائز، والوضوء، والاغتسال.(۱)

ترجمہ:

اور نذر کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ نذر کسی ایسی چیز کی مانی جائے جو کہ عبادتِ مقصودہ ہو، لہذا

(۱) بدائع الصنائع، كتاب النذر، فصل في شرائط ركن النذر: ٦/٣٣٦

کسی مریض کی عیادت کی نذر اور کسی کے جنازہ کے ساتھ جانے کی نذر وضو اور غسل کرنے کی نذر صحیح نہ ہوگی۔

تکرہ السّتور علی القبور. (۱)

ترجمہ:

قبروں پر چادریں ڈالنا مکروہ ہے۔

❁❁❁

نذرِ معلق کا حکم

سوال نمبر (37):

ایک شخص نے یہ نذر مانی ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں حج کروں گا۔اب وہ کام ہوگیا ہے تو اس کے ذمہ حج لازم ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کسی شخص نے نذر کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا ہو تو جب کبھی وہ شرط پوری ہوگی اس ناذر پر نذر کا پورا کرنا واجب ہوگا۔صورتِ مسئولہ میں جب اس شخص نے یہ کہا تھا کہ ''اگر میرا یہ کام ہوگیا تو میں حج کروں گا'' اور اب اس کا کام ہو چکا ہے،تو اس پر حج کرنا واجب ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

(ووجد الشرط) المعلق بہ (لزم الناذر) لحدیث "من نذروسمّی فعلیہ الوفاء بماسمّی" (کصوم وصلوٰۃ وصدقۃ).(۲)

ترجمہ: وہ شرط پائی گئی جس کے ساتھ نذر معلق کی گئی ہو تو ناذر پر نذر کی ادائیگی ضروری ہے،اس حدیث پاک کی رو سے ''جس نے نذر مانی اور اس کو متعین کیا تو اس پر متعین کردہ نذر کا پورا کرنا لازم ہے'' جیسا کہ روزہ نماز یا صدقہ وغیرہ

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجنائز، مطلب في دفن المیت: ۱۴۵/۳

(۲) الدرالمختار علی صدرردالمحتار، کتاب الأیمان: ۵۱۶/۵، ۵۱۷

نذرِ معین کی صورت میں پیسے دینا

سوال نمبر(38):

ایک شخص نے نذر مان لی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں یہ بکری ذبح کروں گا، پھر اس کی خواہش پوری ہو گئی، مگر اس وقت وہ بکری حاملہ تھی تو کیا اس مخصوص بکری کے بدلے دوسری بکری نذر کے طور پر ذبح کرنا جائز ہے یا اس کی جگہ اس کی رقم دے سکتا ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی طور پر جب کسی کام کے ہونے پر اپنی مملوکہ معین چیز کی نذر مانی جائے تو اس کام کے ہونے کی صورت میں وہی معین چیز کا صدقہ کرنا لازم ہے۔ اگر اس معین چیز کے علاوہ کسی اور چیز سے نذر پوری کی تو اگرچہ نذر پوری ہو جائے گی، لیکن گناہ گار ہوگا۔ صورتِ مسئولہ میں اگر اس شخص نے اس معین بکری کے علاوہ کوئی اور بکری یا اس کی قیمت صدقہ کی تو اگرچہ نذر پوری ہو جائے گی، لیکن گناہ گار ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

ویلزمہ عین ماسمّی ..... للہ علي أن أعتق ھذہ الرقبة، وھو یملکھا، فعلیه أن یفي بذلك، ولو لم یف یأثم. (۱)

ترجمہ: اور نذر میں معین مسمی چیز لازم ہے۔۔۔۔اگر کوئی کہے کہ میں اس غلام کو آزاد کروں گا اور حال یہ ہے کہ وہ غلام اس کی ملکیت میں ہے تو اس پر اس کا صدقہ کرنا لازم ہے، اور اگر اس کو صدقہ نہ کیا تو گناہ گار ہوگا۔

۞۞۞

منذور گائے کا گوشت ولیمہ میں مہمانوں کو کھلانا

سوال نمبر(39):

ایک شخص نے اپنی گائے کی نذر مان لی، اس کے چند دنوں بعد اس کے بیٹے کی شادی تھی، اس نے دعوتِ ولیمہ

(۱) الفتاوی الھندیة، کتاب الایمان، الباب الثاني، الفصل الثاني في الکفارة، ومایتصل بذلك مسائل النذر: ۲/ ۶۵، ۶۶

میں اس نذر مانی ہوئی گائے کو ذبح کرکے مہمانوں کو اس کا گوشت کھلایا۔کیا اس سے اس کا ذمہ فارغ ہوگیا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جتنے بھی صدقات واجبہ ہیں، ان کی ادائیگی صحیح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ کسی فقیر مسکین کو تملیک کے طور پر دیے جائیں، اس کا لحاظ نہ رکھنے کی صورت میں صدقہ واجبہ کی ادائیگی متاثر ہو جاتی ہے۔

صورتِ مسئولہ میں نذر مانی ہوئی گائے کا گوشت بیٹے کی شادی کے موقع پر دعوتِ ولیمہ میں مہمانوں کو کھلانے سے اس شخص کا ذمہ فارغ نہیں ہوا، کیونکہ اس قسم کی دعوت تملیک کے طور پر نہیں ہوا کرتی، بلکہ بطورِ اباحت کے ہوا کرتی ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسے موقع پر ان لوگوں کو بھی دعوت دی جاتی ہے جو کہ صدقاتِ واجبہ کا مصرف نہیں ہوا کرتے، لہٰذا جس گائے کی نذر اس شخص نے مانی تھی، اب اس کی قیمت کے بقدر پیسے فقرا و غربا کو بطورِ تملیک دینے سے اس کا ذمہ فارغ ہو سکتا ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

بابُ المصرف أي مصرف الزكاة والعشر. قال ابن عابدينؒ قوله: أي مصرف الزكاة والعشر يشير إلى وجه مناسبته هنا والمراد بالعشر ما ينسب إليه كما مر، فيشمل العشر ونصفه المأخوذين من أرض المسلم ....وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة.(١)

ترجمہ: یہ زکوٰۃ اور عشر کے مصرف کا باب ہے۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ مصرف الزکاۃ والعشر کہنے سے مقصود مناسبت بیان کرنا ہے۔اور عشر سے مراد وہ ہے جو اس کی طرف منسوب ہیں، لہٰذا یہ عشر، نصف عشر جو مسلمانوں کی زمین سے لیا جاتا ہے، ان سب کو شامل ہے۔۔۔۔۔اور یہی مصارف صدقہ فطر، کفارات، نذر اور تمام صدقات واجبہ کے لیے ہیں۔

ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة كمامر. (قوله: تمليكا) فلايكفي فيها الإطعام إلابطريق التمليك، ولو أطعمه ناويا الزكاة لاتكفي.(٢)

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة: ٢٨٣/٣

(٢) أيضاً: ٢٩١/٣

ترجمہ:

زکوۃ کی ادائیگی میں شرط یہ ہے کہ وہ تملیک کے طور پر ہو، اباحت کے طور پر نہ ہو،اس لیے اس میں کھانا کھلا دینا کافی نہیں،اگرزکوۃ کی نیت سے اس (مستحق) کوکھلایا تو یہ کافی نہیں ہوگا۔

❁❁❁

نذر کی رقم کا مصرف

سوال نمبر(40):

ہمارے علاقے میں لائبریری بنی ہوئی ہے جس میں لوگ روزانہ آکر مطالعہ کرتے ہیں،اس کے لیے کتابوں کی ضرورت ہے۔میرے پاس کچھ نذر کی رقم موجود ہے۔کیا اس رقم کو لائبریری کی کتابوں پر خرچ کرنے سے نذر ادا ہو جائے گی؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفیق:

واضح رہے کہ تمام صدقات واجبہ میں (بشمولِ نذر کے) تملیک ایک بنیادی شرط ہے جس کے بغیر صدقاتِ واجبہ سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا۔صورتِ مسئولہ میں چونکہ کتابیں خرید کر لائبریری کو دینے میں تملیک کی شرط مفقود ہے، اس لیے نذر کی رقم سے کتابیں خریدنا درست نہیں،تاہم اگر وہ اس رقم سے کتابیں خرید کر کسی مستحق کو اس کا مالک بنائے اور پھر وہ اپنی مرضی سے وہ کتابیں کسی لائبریری کو وقف کرے تو یہ جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

باب المصرف أي مصرف الزكاة والعشر. قال ابن عابدينؒ قوله: أي مصرف الزكاة والعشر يشير إلى وجه مناسبته هنا والمراد بالعشر ما ينسب إليه كما مر، فيشمل العشر ونصفه المأخوذين من أرض المسلم ....وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة.(١)

---

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة: ٢٨٣/٣

ترجمہ: یہ زکوۃ اور عشر کے مصرف کا باب ہے۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ مصرف الزکاۃ والعشر کہنے سے مقصود مناسبت بیان کرنا ہے۔اور عشر سے مراد وہ ہے جو اس کی طرف منسوب ہیں،لہٰذا یہ عشر،نصف عشر جو مسلمانوں کی زمین سے لیا جاتا ہے،ان سب کو شامل ہے۔۔۔۔۔اور یہی مصارف صدقہ فطر،کفارات،نذر اور تمام صدقات واجبہ کے لیے ہیں۔

ويشترط أن يكون الصّرف (تمليكا) لاإباحة كمامر.(قوله تمليكا) فلا يكفي فيها الإطعام إلابطريق التمليك، ولوأطعمه ناويا الزكاة لاتكفي. (۱)

ترجمہ: (زکوۃ کی)ادائیگی میں شرط یہ ہے کہ وہ تملیک کے طور پر ہو،اباحت کے طور پر نہ ہو،اس لیے اس میں کھانا کھلا دینا کافی نہیں،اگر زکوۃ کی نیت سے اس (مستحق) کو کھلایا تو یہ کافی نہیں ہوگا۔

❁❁❁

منذور چیز کی تبدیلی

سوال نمبر(41):

ایک شخص نے اللہ کے نام پر کپڑا دینے کی نذر مانی،بعد میں اس کی قیمت لگائی اور اس رقم پر مٹھائی خرید کر فقرا وغربا میں تقسیم کی،اس سے اس کی نذر ادا ہوگئی یا نہیں؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

چونکہ منذور چیز کی جگہ اس کی قیمت یا اس قیمت کے برابر دوسری چیز اللہ کے نام پر دینا شرعاً جائز ہے،اس لیے اگر کوئی شخص کپڑے کی نذر ماننے کے بعد اس کی قیمت لگا کر مٹھائی خریدے اور پھر فقرا میں تقسیم کردے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

والدّليل على ذلك:

(نذرأن يتصدق بعشرة دراهم من الخبز، فتصدق بغيره جاز إن ساوى العشرة) كتصدقه بثمنه.(۲)

(۱) ردالمحتارعلی الدرالمختار،کتاب الزکاۃ، باب مصرف الزکاۃ: ۲۹۱/۳

(۲) الدرالمختارعلی صدرردالمحتار، کتاب الایمان: ۵۲۵/۵

ترجمہ:

کسی نے نذر مانی کہ وہ دس درہم کے برابر روٹی صدقہ کرے گا اور اس نے اس کے علاوہ کسی اور چیز کو صدقہ کیا جس کی قیمت دس درہم کے برابر تھی تو جائز ہے، گویا کہ اس نے اس کی قیمت کے برابر صدقہ کیا۔

۞۞۞

مریض کی عیادت کی نذر ماننا

سوال نمبر (42):

ایک شخص نے نذر مانی ہے کہ اگر میرے حج کی منظوری آجائے تو میں اپنے دوست جو کراچی میں قیام پذیر ہے، اس کے بیٹے کی عیادت کروں گا۔ اب الحمدللہ اس کی منظوری آچکی ہے تو کیا مریض کی عیادت اس شخص کے ذمہ واجب ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نذر کے انعقاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس جنس سے کوئی فرض یا واجب عمل موجود ہو، چونکہ مریض کی عیادت ایک ایسا عمل ہے جس کی جنس سے کوئی واجب عمل موجود نہیں، اس لیے مذکورہ شخص کی یہ نذر کہ "میں فلاں شخص کے بیٹے کی عیادت کروں گا" منعقد نہیں ہوگی، لہٰذا اس کے ذمے مذکورہ مریض کی عیادت لازمی اور ضروری نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

(ولم یلزم) الناذر (مالیس من جنسه فرض کعیادة المرضی، وتشییع جنازة، ودخول مسجد).(۱)

ترجمہ:

اور ناذر پر وہ نذر واجب نہ ہوگی جس کی جنس سے فرض نہ ہو، جیسا کہ مریض کی عیادت، جنازہ کے ساتھ چلنا یا مسجد میں داخل ہونا۔

۞۞۞

(۱) تنویر الابصار مع الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الایمان: ۵/ ۵۱۸

بزرگ کے نام شمع جلانے کی نذر

سوال نمبر(43):

ایک شخص نے نذر مانی ہے کہ اگر میرا گم شدہ جانور مل جائے تو میں فلاں بزرگ کے نام اس کی قبر پر چار شمعیں چالیس دن تک جلاؤں گا۔اب وہ جانور مل گیا تو کیا بزرگ کے نام پر اس کی قبر پر شمعیں جلانا ضروری ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

غیر اللہ کے نام پر نذر ماننا جائز نہیں،اگر کوئی شخص کسی بزرگ شخص کے نام پر یا اس کی قبر پر شمع یا چراغ وغیرہ بطور نذر جلائے تو فقہائے کرام نے بالا جماع اس کو حرام اور باطل قرار دیا ہے،لہٰذا غیر اللہ کے نام پر یا قبروں پر شمع اور چراغ وغیرہ جلانے سے اجتناب ضروری ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

واعلم أن النذر الذي يقع للأموات من أكثر العوام، وما يؤخذ من الدراهم، والشمع، والزيت ونحوها إلى ضرائح الأولياء الكرام تقرباً إليهم، فهو بالإجماع باطل وحرام.(١)

ترجمہ:

جان لو! کہ جو نذر مردوں کے لیے اکثر عوام کی جانب سے کی جاتی ہے اور جو دراہم اور شمع،تیل وغیرہ اولیا کرام کے مزارات پر عبادت کی نیت سے لے جائے جاتے ہیں یہ بالا جماع باطل اور حرام ہے۔

❁❁❁

منت والے جانور کی عمر

سوال نمبر(44):

اگر کوئی شخص نذر مان لے کہ اگر میرا بیٹا بیماری سے صحت یاب ہو جائے تو میں ایک بکرا اللہ کے نام پر دوں گا یا یوں کہہ دے کہ میں ایک گائے اللہ کے نام پر دوں گا تو نذر مانے ہوئے بکرے اور گائے کی کتنی عمر ہونا ضروری ہے؟

(١) ردالمحتارعلی الدرالمختار،کتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم ومالا يفسده : ٤٢٧/٣

الجواب وباللہ التوفیق:

جن شرائط کا لحاظ قربانی کے جانور میں ضروری ہے، ان ہی شرائط کا لحاظ نذر کے جانور میں بھی ضروری ہے، اگر بکرے کی نذر مانی ہو تو وہ ایک سال کا جب کہ گائے دو سال کی ہونی چاہیے، لہٰذا بکری اور گائے دونوں میں شرائط قربانی کا لحاظ رکھ کر اللہ کے نام پر دینے چاہیے۔

والدّلیل علی ذلک:

(ولو قال: لله عليّ أن أذبح جذوراً و أتصدق بلحمه، فذبح مكانه سبع شياه جاز) ووجهه لايخفى. قال ابن عابدين: وهو أن السبع تقوم مقامه في الضحايا والهدايا. (١)

ترجمہ:

اگر یہ کہے کہ: اللہ تعالیٰ کے لیے مجھ پر لازم ہے کہ اونٹ کو ذبح کر کے اس کا گوشت صدقہ کروں گا، پھر اس کی جگہ سات بکریاں ذبح کیں تو یہ جائز ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے، کیونکہ سات بکریاں قربانی اور ہدایا میں ایک اونٹ کی قائم مقام ہیں۔



قرض معاف کردینے سے نذر کی ادائیگی

سوال نمبر(45):

ایک شخص کے ذمہ کچھ قرض ہے، اگر قرض دہندہ وہ قرض اس غریب آدمی کو نذر کی ہوئی رقم کی جگہ معاف کردے تو کیا اس شخص کی نذر ادا ہوجائے گی؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نذر صدقات واجبہ میں سے ہے جس میں تملیک شرط ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ تملیک کی شرط مفقود ہے، بغیر وصولی کے معاف کیا جاتا ہے، اس لیے نذر ادا نہیں ہوگی، تاہم اس کا متبادل درست طریقہ یہ ہے کہ پہلے مقروض کو نذر کی رقم ادا کردے، پھر اس کے بعد اس سے اپنے قرض کا مطالبہ کرے اس سے نذر کی ادائیگی بھی درست ہو

(١) ردالمحتار، کتاب الایمان، قبیل مطلب: النذر المعلق لایختص بزمان ومکان ودرهم وفقیر: ٥/ ٥٢٤

جائے گی اور قرضہ بھی وصول ہو جائے گا۔

والدّليل على ذلك:

باب المصرف أي مصرف الزكاة والعشر. قال ابن عابدينؒ قوله: أي مصرف الزكاة والعشر يشير إلى وجه مناسبته هنا والمراد بالعشر ما ينسب إليه كما مر، فيشمل العشر ونصفه المأخوذين من أرض المسلم ....وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة.(۱)

ترجمہ:

یہ زکوۃ اورعشر کے مصرف کا باب ہے۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ مصرف الزکاۃ والعشر کہنے سے مقصودمناسبت بیان کرنا ہے۔اورعشر سے مراد وہ ہے جواس کی طرف منسوب ہے، لہٰذا یہ عشر،نصف عشر جومسلمانوں کی زمین سے لیا جاتا ہے،ان سب کوشامل ہے۔۔۔۔اوریہی مصارف صدقہ فطر،کفارات،نذراورتمام صدقات واجبہ کے لیے ہیں۔

ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة كمامر.(قوله تمليكا)فلايكفي فيها الإطعام إلابطريق التمليك، ولو أطعمه ناوياالزكاة لاتكفي.(۲)

ترجمہ:

(زکوۃ کی)ادائیگی میں شرط یہ ہے کہ وہ تملیک کے طور پر ہواباحت کے طور پر نہ ہو،اس لیے اس میں کھانا کھلادینا کافی نہیں،اگرزکوۃ کی نیت سے اس(مستحق)کوکھلایا تو یہ کافی نہیں ہوگا۔

وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته ثم يأخذهاعن دينه.(۳)

ترجمہ:

اور جواز کا حیلہ یہ ہے کہ فقیر قرض دار کو اپنی زکوۃ دے دے پھراس سے اپنا قرضہ لے لے۔

❁❁❁

(۱) ردالمحتارعلی الدرالمختار، کتاب الزکاۃ، باب مصرف الزکاۃ: ۲۸۳/۳

(۱) ردالمحتارعلی الدرالمختار، کتاب الزکاۃ، باب مصرف الزکاۃ: ۲۹۱/۳

(۲) الدرالمختارعلی صدر ردالمحتار، کتاب الزکاۃ، باب مصرف الزکاۃ: ۲۹۰/۳، ۲۹۱

نذر مانی ہوئی چیز کے بدلے اُس کی قیمت ادا کرنا

سوال نمبر(46):

ایک شخص نے یوں نذر مانی ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں پانچ من چاول فقرا اور غربا میں اللہ کے نام پر تقسیم کروں گا۔اب اس کا کام ہو چکا ہے،لیکن وہ چاول کی بجائے اس کی قیمت غریب لوگوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو کیا اس سے نذر درست ہو جائے گی یا چاول تقسیم کرنا ضروری ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

صدقاتِ واجبہ میں غربا اور مساکین کی ضرورت کو سامنے رکھ کر ان کی امداد کرنی چاہیے،اس لیے اگر کوئی شخص منذور چیز کی بجائے اس کی قیمت غربا و فقرا میں تقسیم کرنا چاہے تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(نذر أن یتصدق بعشرة دراهم من الخبز، فتصدق بغیره جاز إن ساوی العشرة) کتصدقه بثمنه.(۱)

ترجمہ: کسی نے نذر مانی کہ وہ دس دراہم کی روٹی صدقہ کرے گا اور اس نے روٹی کے علاوہ کوئی دوسری چیز صدقہ کردی تو جائز ہے،اگر وہ چیز دس دراہم کی قیمت رکھتی ہو،جیسا کہ اس شخص کا پیسے (دس دراہم) صدقہ کرنا جائز ہے۔

❁❁❁

ناذر کا اپنی نذر سے کھانا

سوال نمبر(47):

ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں عیدالاضحیٰ کے دن اللہ کے نام پر ایک بکرا قربان کروں گا۔کام ہو جانے کے بعد عید کے دن بکرا ذبح کرکے اس میں سے تین کلو گوشت خود استعمال کیا۔کیا ایسی صورت میں نذر کا گوشت ناذر اپنے استعمال میں لا سکتا ہے؟

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الأیمان: ۵/۵۲۵

الجواب وباللہ التوفیق:

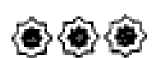
واضح رہے کہ نذر کی ہوئی قربانی سے ناذر خود گوشت نہیں کھاسکتا نہ ہی اپنے اہل وعیال کو کھلاسکتا ہے، بلکہ سارا گوشت فقرا و غربا میں تقسیم کرنا ضروری ہے، البتہ اگر لاعلمی یا غفلت کی بنا پر اس سے خود کھالے تو پھر اس کی قیمت لگا کر رقم فقرا میں تقسیم کرنی ہوگی۔صورتِ مسئولہ میں جب ناذر نذر کے گوشت سے تین کلو گوشت خود کھا گیا ہے، اس لیے اس کی قیمت لگا کر فقرا میں تقسیم کرنا ضروری ہوگا۔

والدّليل على ذلك:

ولو ذبحها تصدق بلحمها، ولو نقصها تصدق بقيمة النقصان أيضاً، ولا يأكل الناذر منها، فإن أكل تصدق بقيمة ما أكل.(١)

ترجمہ:

اگر اس کو ذبح کیا تو اس کے گوشت کو صدقہ کرے اور اگر اس سے کچھ کم کیا تو بقدرِ نقصان قیمت صدقہ کرے اور نذر کرنے والا اس میں سے نہیں کھائے گا، اگر کھالیا تو اس مقدار کے برابر قیمت صدقہ کرے گا۔



مشروط نذر

سوال نمبر(48):

اگر کوئی شخص نذر کو کسی شرط کے ساتھ معلق کردے، مثلاً یہ کہ اگر میں نے فلاں شخص کی غیبت کی تو اتنی رقم اللہ کے نام پر دوں گا تو اگر اس سے گناہ مذکورہ کا ارتکاب ہوجائے تو اس پر رقم کی ادائیگی واجب ہوگی یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کوئی شخص نذر کو کسی شرط کے ساتھ معلق کردے اور وہ شرط موجود ہوجائے تو اس نذر کو پورا کرنا واجب ہوگا۔ محررہ حالات کی روشنی میں اگر مذکورہ شخص نے گناہ مذکورہ، یعنی غیبت کرنے کا ارتکاب کیا تو اس سے نذر کا ایفا ضروری ہے۔

(١) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الاضحية: ٤٦٤/٩

والدّلیل علی ذلك:

(ووجد الشرط) المعلق به (لزم الناذر)لحدیث "من نذر وسمی فعلیه الوفاء بماسمی" (کصوم وصلوة وصدقة).(۱)

ترجمہ: جب نذرِ معلق کی شرط پائی جائے تو اِس حدیث کی رُو سے ناذر پر اس کا ایفا لازم ہے کہ "جس نے نذر مانا اور متعین کیا تو اُس پر وہی متعین کردہ چیز ادا کرنا ضروری ہے۔ جیسے روزہ، نماز اور صدقہ۔

❁❁❁

تبلیغی جماعت کے ساتھ چلہ کی نذر

سوال نمبر(49):

اگر کوئی شخص یہ نذر مان لے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ چلہ لگاؤں گا۔ تو شرط پوری ہونے پر اس کے لیے تبلیغی جماعت میں نکلنا ضروری ہے؟ بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعت مطہرہ کی روسے یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی نذر مانی جائے وہ عبادتِ مقصودہ ہو، اگر ایسی چیز کی نذر مانی جائے جو عبادتِ مقصودہ نہ ہو، بلکہ وسیلہ ہو تو اس کی نذر ماننا درست نہیں۔

صورت مسؤلہ میں چونکہ مروجہ تبلیغی جماعت کی ترتیب بذاتِ خود عبادتِ مقصودہ نہیں بلکہ دین پر چلنے اور چلانے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ اور جو چیز کسی عبادتِ مقصودہ کا وسیلہ ہو اس کی نذر درست نہیں، مثلاً وضو نماز کے لیے وسیلہ ہے، اس کی نذر صحیح نہیں، اسی طرح چلہ وغیرہ بھی دین کے احیا کا ایک ذریعہ ہے، مقصودی عبادت نہیں لہٰذا اس کی نذر صحیح نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

وفي البدائع: ومن شروطه أن یکون قربة مقصودة، فلا یصح النذر بعیادة المرضی وتشییع الجنازة والوضوء والاغتسال وإن کانت قربا إلا أنها غیر مقصودة.(۲)

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الایمان: ۵/۵۱۶، ۵۱۷

(۲) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب في احکام النذر: ۵/۵۱۶

ترجمہ:

نذر کی شرائط میں سے یہ ہے کہ وہ عبادت مقصودہ میں سے ہو، لہٰذا مریض کی عیادت، جنازہ کے ساتھ جانے، وضو اور غسل کرنے کی نذر درست نہیں، اگرچہ ان سے ثواب ملتا ہے، مگر یہ عبادت مقصودہ نہیں۔

❁❁❁

ہر پیر کے دن روزہ رکھنے کی نذر

سوال نمبر(50):

ایک شخص نے نذر مانی ہے کہ اگر میرا والد کینسر کی بیماری سے ٹھیک ہو جائے تو میں زندگی بھر ہر پیر کے دن روزے رکھوں گا۔ اب اس کا والد صحت یاب ہو چکا ہے تو کیا اس پر ہر پیر کے دن روزہ رکھنا لازم ہے اور اگر قضا ہو جائے تو اس کی تلافی لازم ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کو نذر کے ساتھ مشروط کرے۔ تو شرط کے موجود ہونے کے ساتھ نذر کی ادائیگی واجب ہوگی۔

مذکورہ شخص نے چونکہ والد کی صحت کے ساتھ پیر کے دن روزہ رکھنا معلق کیا ہے، اس لیے والد کی صحت یابی کی صورت میں اس پر ہر پیر کے دن روزہ رکھنا واجب ہوگا، تاہم اگر کسی وجہ سے قضا ہو جائے تو دوسرے دن اس کی قضا کرنے سے ذمہ فارغ ہو جائے گا۔ نیز آئندہ شیخ فانی ہونے کی وجہ سے یا کسی مشقت میں پڑنے کی وجہ سے اگر روزے نہ رکھ سکے تو روزہ کا فدیہ دے گا اور اگر تنگ دستی کی بنا پر فدیہ دینے سے بھی قاصر ہو تو استغفار و توبہ سے اپنا ذمہ فارغ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

والدّلیل علی ذلك:

إذا نذر أن يصوم كل خميس يأتي عليه، فأفطر خميسا واحدا، فعليه قضاءه.و لو أخر القضاء حتى صار شيخا فانيا، و كان النذر بصيام الأبد، فعجز لذلك أو باشتغاله بالمعيشة لكن صناعته شاقة فله أن يفطر و يطعم لكل يوم مسكينا على ماتقدم، وإن لم يقدر على ذلك لعسرته يستغفر الله إنه هو

الغفور الرحیم.(۱)

ترجمہ: جب کسی شخص نے ہر آنے والے جمعرات کے دن روزہ رکھنے کی نذر مان لی، پھر کسی ایک جمعرات کو بھی افطار کیا تو اس کی قضا اس پر لازم ہے۔ اگر قضا کو اس قدر موخر کیا کہ شیخ فانی بن گیا اور اس کی نذر پوری زندگی روزے رکھنے کی تھی تو اس سے عاجز ہوا یا مشکل ذریعہ معاش میں مشغول رہنے کی وجہ سے عاجز ہوا تو اس کے لیے افطار جائز ہے اور جیسا کہ پہلے گزرا ہے کہ ہر روزہ کے بدلے مسکین کو (فدیہ کے طور پر) کھانا کھلائے اور اگر (مالی) تنگی کی وجہ سے اس پر بھی قدرت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا رہے، بے شک وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

❁❁❁

نذر کے روزے تاخیر سے رکھنا

سوال نمبر(51):

ایک شخص نے نذر مانی ہے، کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں سات روزے رکھوں گا۔ اب اس کا کام ہو گیا ہے، لیکن وہ چار مہینوں کے لیے کسی سفر پر جا رہا ہے تو کیا یہ روزے علی الفور واجب ہوں گے یا چار مہینوں کے بعد روزے رکھنے سے ذمہ فارغ ہو جائے گا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جب کوئی شخص ایسی نذر مانے کہ اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہ ہو تو اس کی ادائیگی علی التراخی واجب ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ کام ہو جانے کے فوراً بعد روزے رکھ کر اپنا ذمہ فارغ کر دے۔ لہٰذا حالتِ محررہ میں چار مہینوں کے بعد روزے رکھنا جائز ہوں گے۔

والدّلیل علی ذلك:

إذا قال: لله علي أن أصوم يوماً، فإنه يلزمه صوم يوم، وتعيين الأداء إليه، وهو على التراخي بالإجماع.(۲)

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصوم، الباب السادس في النذر: ۲۰۹/۱

(۲) أيضًا

ترجمہ: اگر کسی نے کہا کہ اللہ کے لیے مجھ پر ایک دن کا روزہ رکھنا واجب ہے تو اس پر ایک دن کا روزہ واجب ہوگا اور ادائیگی کا تعین اس کی طرف سے ہوگا اور بالا جماع اس پر تراخی کے ساتھ واجب ہے۔

❁❁❁

نذر کی رقم غنی کو دینا

سوال نمبر (52):

ایک شخص نے نذر مانی ہے کہ اگر مجھے سرکاری ملازمت مل جائے تو میں اتنی رقم اللہ تعالیٰ کے نام پر دوں گا۔ اب اس شخص کو ملازمت مل گئی ہے تو کیا مذکورہ رقم فقرا وغربا کے علاوہ غنی کو دے سکتا ہے؟ بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

نذر دیگر صدقاتِ واجبہ کی طرح فقرا ومساکین کو دینا ضروری ہے، اگر کسی شخص نے نذر کی رقم فقرا وغربا کے علاوہ مالدار شخص کو دی تو یہ ادائیگی درست نہ ہوگی۔ لہٰذا مذکورہ سوال میں جس شخص کو ملازمت مل گئی ہے وہ نذر کی رقم فقرا کو دے، کسی غنی اور صاحبِ نصاب شخص کو دینا درست نہیں۔

والدّليل على ذلك:

وفي القنيه: نذر التصدق على الأغنياء لم يصح.(۱)

ترجمہ: اور قنیہ نامی کتاب میں ہے کہ مالداروں پر رقم صدقہ کرنے کی نذر صحیح نہیں۔

❁❁❁

شرط پوری نہ ہونے کی صورت میں نذر کا وجوب

سوال نمبر (53):

ایک شخص نے منت مانی ہے کہ اگر مجھے پورے پانچ لاکھ روپے مل جائیں تو میں اس میں سے کچھ رقم مساکین پر تقسیم کروں گا، لیکن اس کو پانچ لاکھ روپے کی بجائے دو لاکھ روپے ملے ہیں۔ تو کیا ایسی صورت میں دو لاکھ کے حساب سے نذر واجب ہوگی؟

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الایمان: ۵/۵۲۰

الجواب وباللہ التوفیق:

نذر اگر کسی شرط کے ساتھ معلق ہو جائے تو شرط پوری ہو جانے کی صورت میں نذر پوری کرنا ضروری ہے۔ صورتِ مسئولہ میں نذر پانچ لاکھ روپے کے حصول کے ساتھ مشروط ہے لہٰذا اگر دو لاکھ روپے ملے ہیں، تو شرط پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔

والدّلیل علی ذلک:

وإن كان معلقاً بشرط نحو أن يقول: إن شفي الله مرضي، أو إن قدم فلان الغائب، فللّٰه عليّ أن أصوم شهراً أو أصلي ركعتين أو أتصدق بدرهم ونحو ذلك، فوقته وقت الشرط، فمالم يوجد الشرط لايجب بالإجماع.(١)

ترجمہ: اگر نذر کسی شرط کے ساتھ مشروط ہو، مثلاً یہ کہا ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے میری بیماری سے شفا دے دی، یا اگر وہ فلاں غائب شخص آ گیا تو اللہ تعالیٰ کے لیے مجھ پر ایک ماہ روزے رکھنا واجب ہے، یا دو رکعت نفل پڑھوں گا یا ایک درہم صدقہ دوں گا یا اسی طرح کوئی نذر مان لی، تو اس نذر کی ادائیگی کا وقت وجودِ شرط کا وقت ہے، جب تک شرط نہیں پائی گی تو ایفائے نذر بالاجماع واجب نہیں۔



دوسرے کی ملکیت کی نذر ماننا

سوال نمبر(54):

ایک طالب علم نے نذر مانی ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں چچازاد بھائی کا بکرا اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کروں گا۔ اب وہ مطلوبہ کام ہو گیا ہے تو کیا اس طرح نذر ماننا صحیح ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

چونکہ نذر کی صحت کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ منذور چیز ناذر کی مِلک میں ہو، اس لیے دوسرے شخص کے مال میں نذر ماننا درست نہیں۔

(١) بدائع الصنائع، كتاب النذر، فصل في حكم النذر:٦/٣٥٨

صورتِ مسئولہ میں اگر بکرا چچازاد بھائی کی مِلک میں ہو تو مذکورہ طالب علم کے لیے مِلک نہ ہونے کی وجہ سے اس میں نہ نذر کی نیت کرنا درست نہ ہوگا اور نہ اس کی ایفا ضروری ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو قال: لله عليّ أن أهدي هذه الشاة، وهي مملوكة الغير، لا يصح النذر، ولا يلزمه شيء.(١)

ترجمہ: اور اگر کہے: اللہ تعالیٰ کے لیے مجھ پر لازم ہے کہ میں اس بکری کو قربان کروں گا، حالانکہ وہ کسی اور کی ملکیت ہو تو نہ یہ نذر صحیح ہوگی اور نہ ہی کوئی چیز لازم ہوگی۔

❁❁❁

عیدالاضحیٰ کی قربانی کے علاوہ قربانی کی نذر

سوال نمبر(55):

ایک صاحبِ نصاب شخص نے نذر مانی ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں عیدالاضحیٰ کے دن ایک بکری اللہ کے نام پر ذبح کروں گا، اگر اس کا کام ہو جائے تو اس پر بکری ذبح کرنے کے علاوہ مالکِ نصاب ہونے کے سبب جو قربانی واجب ہوگی، اس کو بھی ادا کرنا لازم ہے یا صرف نذر کی قربانی سے ذمہ فارغ ہو جائے گا؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر صاحبِ نصاب شخص عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کی منت مانے تو اس پر دو قربانیاں واجب ہوں گی۔ ایک قربانی نذر کے سبب واجب ہے اور دوسری صاحبِ نصاب ہونے کی وجہ سے، لہٰذا نذر ماننے کی وجہ سے اس شخص پر دو قربانیاں واجب ہوں گی۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو نذر أن يضحي شاة، وذلك في أيام النحر، وهو موسر، فعليه أن يضحي بشاتين عندنا، شاة بالنذر، وشاة بإيجاب الشرع ابتداءً.(٢)

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الايمان، الباب الثاني، الفصل الثاني في الكفارة (ومما يتصل بذلك مسائل النذر: ٢ / ٦٥

(٢) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الاضحية: ٩/٤٦٤

ترجمہ:

اگر کسی نے ایک بکری قربانی کرنے کی نذر مانی اور یہ نذر قربانی کے دنوں میں واجب ہوئی، حالانکہ وہ مال دار بھی تھا تو ہمارے نزدیک وہ دو بکریوں کی قربانی دے گا، ایک بکری نذر کی اور ایک بکری شریعت کی طرف سے اس پر ابتداءً واجب ہونے کی۔

❁❁❁

ایک جگہ کی مقرر کردہ نذر دوسری جگہ صرف کرنا

سوال نمبر(56):

ایک شخص نے نذر مانی ہے کہ اگر میرا بیٹا سفر سے سلامتی کے ساتھ گھر لوٹ آئے تو میں اپنے گاؤں کے غربا میں پانچ ہزار روپے تقسیم کروں گا۔ بیٹا پہنچ جانے کے بعد مذکورہ رقم دوسرے گاؤں میں تقسیم کرنے کا ارادہ ہے تو کیا نذر شدہ رقم اپنے گاؤں کی بجائے دوسرے گاؤں کے غربا میں تقسیم کی جاسکتی ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اگر منذور رقم کسی جگہ کے لوگوں کے ساتھ خاص کی جائے تو یہ تخصیص لازم نہیں ہوتی، بلکہ دوسرے گاؤں کے لوگوں کو بھی نذر کی رقم دینا درست ہوگا۔

لہٰذا صورتِ مسئلہ میں اگر کوئی شخص نذر کی رقم اپنے گاؤں کے غربا کے لیے خاص کرے اور پھر دوسرے گاؤں کے غربا میں تقسیم کرے تو ایک جگہ کے لوگوں کے لیے مختص رقم دوسری جگہ کے غربا میں تقسیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

رجل قال: مالي صدقة على فقراء مكة إن فعلت كذا، فحنث وتصدق على فقراء بلخ أو بلدة أخرى، جاز ويخرج عن النذر.(۱)

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الايمان، الباب الثاني، الفصل الثاني في الكفارة (ومما يتصل بذلك مسائل النذر: ۲ / ٦٥

ترجمہ:
اگر کوئی شخص نذر مانے کہ اگر میرا فلاں کام ہوا تو میرا مال مکہ کے فقرا پر صدقہ ہو، پس وہ حانث ہوا اور وہ مال بلخ کے فقرا میں تقسیم کیا یا کسی اور شہر کے فقرا میں تقسیم کیا تو یہ جائز ہے اور نذر پوری ہوگئی۔

❁❁❁

کام ہونے سے پہلے نذر ادا کرنا

سوال نمبر(57):

ایک شخص نے کہا ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں تین ہزار روپے اللہ کے نام پر دوں گا لیکن ابھی تک وہ کام نہیں ہوا اور مذکورہ شخص پہلے سے یہ رقم اللہ کے نام پر دینا چاہتا ہے۔کیا نذر کی رقم کام ہونے سے پہلے دینے سے ذمہ فارغ ہو جاتا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:
واضح رہے کہ نذر جس کام سے مشروط کی جائے، وہ کام ہو جانے کے بعد نذر ادا کرنا واجب ہوتا ہے اور شرط کی موجودگی سے پہلے مشروط کی ادائیگی درست نہیں۔لہٰذا جب مذکورہ شخص کا کام ہو جائے تو تین ہزار روپے اللہ کے نام پر دینا واجب ہوگا۔شرط پائے جانے سے پہلے ادا کرنے سے ذمہ فارغ نہیں ہوگا، بلکہ کام ہو جانے کے بعد دوبارہ نذر کی ہوئی رقم کی ادائیگی واجب ہوگی۔

والدّلیل علی ذلک:
(بخلاف) النذر (المعلق) فإنه لایجوز تعجیله قبل وجود الشرط.(۱)

ترجمہ:
نذر معلق کا حکم (نذر مطلق سے) مختلف ہے، کیونکہ نذر معلق میں شرط کے وجود سے پہلے اس کی ادائیگی میں جلدی کرنا جائز نہیں۔

❁❁❁

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الصوم، باب مایفسد الصوم ومالایفسده: ٤٢٤/٣

درود شریف پڑھنے کی نذر

سوال نمبر (58):

ایک شخص نے منت مانی ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں روزانہ سو مرتبہ حضرت محمد ﷺ پر درود پڑھوں گا۔ کیا ایسی نذر منعقد ہو جاتی ہے اور اس کا پورا کرنا ضروری ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نذر کی صحت کے لیے یہ قاعدہ ہے کہ اس کی جنس میں سے کوئی عمل فرض یا واجب موجود ہو، چونکہ درود شریف عمر بھر میں ایک مرتبہ پڑھنا واجب ہے، اس لیے درود شریف پڑھنے کی نذر ماننا درست ہے، اگرچہ بعض فقہائے کرام نے اس میں اختلاف کیا ہے، لیکن راجح اور احوط قول لزوم نذر کا ہے، لہٰذا مذکورہ شخص پر روزانہ سو مرتبہ درود شریف پڑھنا واجب ہوگا۔

والدّلیل علی ذلك:

ولو نذر أن يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم كل يوم كذا، لزمه، وقيل: لا. قال ابن عابدين: تحت قوله (لزمه) لأن من جنسه فرضاً وهو الصلوة عليه صلى الله عليه وسلم مرةً واحدة في العمر، وتجب كلما ذكر، وإنما هي فرض عملي، ومنه يعلم أنه لا يشترط كون الفرض قطعياً، وقوله (وقيل لا) لعل وجهه اشتراط كونه في الفرض قطعياً. (۱)

ترجمہ:

اور اگر کوئی یہ نذر مانے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر دن اتنی بار درود پڑھے گا تو یہ اس پر لازم ہوگا اور ایک قول یہ ہے کہ لازم نہیں۔ علامہ ابن عابدین "لزمہ" کے تحت فرماتے ہیں کہ اس کی جنس سے فرض موجود ہے اور وہ عمر بھر میں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا ہے اور جب بھی آپ ﷺ کا تذکرہ کیا جائے تو اس وقت واجب ہے اور یہ فرض عملی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض کا قطعی ہونا ضروری نہیں اور مصنفؒ کا یہ قول کہ بعض سے منقول ہے کہ یہ نظر درست نہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے نزدیک فرض کے لیے قطعی ہونا شرط ہو۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الایمان، مطلب في احكام النذر: ۵/ ۵۲۰، ۵۲۱

وجوبِ نذر کے لیے وقوعِ شرط

سوال نمبر(59):

ایک شخص نے نذر مانی ہے کہ اگر میری بیمار بھیڑ ٹھیک ہوجائے تو اس کو میں اگلے مہینے کی پانچ تاریخ کو اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کروں گا، لیکن بدقسمتی سے مذکورہ تاریخ آنے سے پہلے وہ مرگئی، ایسی حالت میں نذر کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

نذر میں جب کوئی کام شرط کے ساتھ مشروط کیا جائے تو شرط پائے جانے کی صورت میں ناذر پر اس کی ادائیگی واجب ہوگی اور شرط نہ پائے جانے کی صورت میں نذر لازم نہیں۔صورتِ مسئولہ میں چونکہ شرط موجود ہونے سے پہلے بھیڑ مرچکی ہے، اس لیے مذکورہ شخص پر نذر کی ادائیگی لازم نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

وإن كان معلقاً بشرط نحو أن يقول:إن شفي الله مرضي، أو ان قدم فلان الغائب، فللّٰه عليّ أن أصوم شهراً أو أصلي ركعتين أو أتصدق بدرهم ونحو ذلك، فوقته وقت الشرط، فما لم يوجدالشرط لايجب بالإجماع.(۱)

ترجمہ: اگر نذر کسی شرط کے ساتھ مشروط ہو، مثلاً یہ کہا ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے میری بیماری سے شفا دے دی، یا اگر وہ فلاں غائب شخص آگیا تو اللہ تعالیٰ کے لیے مجھ پر ایک ماہ روزے رکھنا واجب ہے، یا دو رکعت نفل پڑھوں گا یا ایک درہم صدقہ دوں گا یا اسی طرح کوئی نذر مان لی، تو اس نذر کی ادائیگی کا وقت وجودِ شرط کا وقت ہے، جب تک شرط نہیں پائی گی تو ایفائے نذر بالاجماع واجب نہیں۔

❁❁❁

(۱) بدائع الصنائع، کتاب النذر، فصل في حکم النذر:۶/۳۵۸

منذور گائے کی جگہ اس کی قیمت صدقہ کرنا

سوال نمبر(60):

ایک شخص نے نذر مانی ہے کہ اگر میرا بھانجا پیدا ہو جائے تو ایک گائے اللہ تعالیٰ کے نام پر صدقہ کروں گا بعد میں اس کا بھانجا پیدا ہو گیا۔اب یہ شخص گائے کی جگہ اس کی مروجہ قیمت فقراوغربا میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔تو کیا گائے کی جگہ اس کی قیمت ادا کرنے سے نذر ادا ہو جائے گی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کوئی شخص منذور چیز کی قیمت ادا کرنا چاہے تو ادا کر سکتا ہے،لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں اگر گائے صدقہ کرنے کی بجائے اس کی قیمت غربا و مساکین میں تقسیم کرنا چاہے تو گائے کی قیمت لگا کر اس کو فقرا میں تقسیم کرنے سے بری الذمہ ہو جائے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(نذر أن یتصدق بعشرۃ دراھم من الخبز،فتصدق بغیرہ جاز إن ساوی العشرۃ) کتصدقہ بثمنہ.(۱)

ترجمہ: کسی نے نذر مانی کہ وہ دس دراہم کی روٹی صدقہ کرے گا اور اس نے روٹی کے علاوہ کوئی دوسری چیز صدقہ کردی تو جائز ہے،اگر یہ چیز دس دراہم کی قیمت رکھتی ہو،جیسا کہ اس شخص کا پیسے (دس دراہم) صدقہ کرنا جائز ہے۔

❁❁❁

نذر روزوں کی ادائیگی کے دوران ناذر کا انتقال کر جانا

سوال نمبر(61):

ایک تاجر نے نذر مانی تھی کہ اگر میری تجارت اتنی ترقی کر جائے تو میں ایک مہینہ متواتر روزے رکھوں گا۔اب اس کی تجارت میں کافی ترقی ہوئی، لیکن بدقسمتی سے روزے شروع کرنے کے پانچویں دن وہ تاجر فوت

(۱) الدر المختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الأیمان: ۵/۵۲۵

ہوگیا، جب کہ اس نے فدیہ دینے کے متعلق کوئی وصیت نہیں کی ہے۔ اس کی یہ نذر ساقط ہوگی یا ورثا پر باقی ماندہ روزوں کا فدیہ دینا لازم ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جس شخص کے ذمے نذر روزے باقی ہوں، اگر وہ وصیت کر کے فوت ہوگیا تو اس کے ورثا پر اس کے ثلث مال سے فدیہ ادا کرنا واجب ہوگا، جب کہ وصیت نہ کرنے کی صورت میں وارثوں پر فدیہ وغیرہ دینا لازم نہیں۔ صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی متوفی نے روزوں کے فدیہ دینے کی وصیت نہ کی ہو تو ورثا پر فدیہ دینا لازم نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

(ولو مات وعليه صلوات فائتة، وأوصى بالكفارة، يعطى لكل صلوة نصف صاع من بر كالفطرة (وكذاحكم الوتر) والصوم، وإنما يعطى (من ثلث ماله)قال ابن عابدين: تحت قوله (يعطى) فإذا لم يوص فات الشرط، فيسقط في حق أحكام الدنيا للتعذر.(۱)

ترجمہ:

اگر آدمی مرجائے، ایسے حال میں کہ اس کے ذمہ فوت شدہ نمازیں ہوں اور وہ کفارہ کی وصیت بھی کرے تو ہر نماز کے بدلے گندم کا نصف صاع دیا جائے گا، صدقہ فطر کی طرح۔ اور یہی حکم وتر اور روزے کا ہے اور یہ میت کے ثلث مال میں سے دیا جائے گا۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ اگر وصیت نہ کی ہو تو شرط فوت ہوگئی لہٰذا دنیاوی احکام میں یہ ناممکن ہونے کی وجہ سے ساقط ہوجاتی ہے۔



منذور بھینس اگر بچہ جنے

سوال نمبر(62):

ایک شخص نے اللہ تعالیٰ کے نام پر بھینس کی نذر مانی تھی، ذبح کرنے سے پہلے اس کا بچہ پیدا ہوگیا تو کیا

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في اسقاط الصلاة عن الميت:۲/۵۳۲،۵۳۳

بھینس کے صدقہ کرنے کے ساتھ اس کا بچہ بھی صدقہ کرنا ضروری ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

چونکہ نذر کیے ہوئے جانور کے تمام اجزا کو صدقہ کرنا ضروری ہوتا ہے، اس لیے اگر کسی جانور کا بچہ پیدا ہو جائے تو یہ جانور کے اجزا میں شمار ہو کر اس کا صدقہ کرنا بھی ضروری اور واجب ہوگا۔

لہٰذا محررہ صورت میں بھینس کے صدقہ کے ساتھ اس کے بچے کو بھی صدقہ کرنا ضروری ہوگا یا تو اس کو بھی ذبح کر کے صدقہ کرے یا اس کو زندہ صدقہ کرے، البتہ اگر ذبح کرنے کی صورت میں اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر اس کو زندہ حالت میں صدقہ کرے۔

والدّلیل علی ذلک:

ولدت الأضحية ولدا قبل الذبح، يذبح الولد معها، وعندبعضهم يتصدق به بلاذبح.(١)

ترجمہ:

قربانی کے جانور نے ذبح ہونے سے پہلے بچہ جنا تو بچے کو بھی اس کے ساتھ ذبح کیا جائے گا اور بعض کے ہاں اس کو بغیر ذبح کے صدقہ کیا جائے گا۔

۞۞۞

نذرِ معین کا ضائع ہوجانا

سوال نمبر(63):

اگر کوئی شخص عیدالاضحیٰ کے دن متعین جانور کی نذر مانے۔ اور مقصود حاصل ہوجانے کے بعد وہ جانور مر جائے تو کیا مذکورہ شخص پر دوسرا جانور ذبح کرنا لازم ہے؟

بینوا توجروا

(١) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الاضحیة: ٩/٤٦٧

الجواب وباللہ التوفیق:

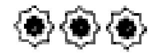
اگر متعین جانور کے صدقہ کی نذر مانی گئی ہو اور وہ شخص غریب ہو تو اس جانور کے مرجانے سے اس پر کوئی چیز واجب نہیں، تاہم اگر مذکورہ شخص مال دار ہو تو عید الاضحیٰ کے دن صاحبِ نصاب ہونے کے سبب قربانی واجب ہوگی، جب کہ نذر ادا کرنے سے ذمہ ساقط ہوگا، لہٰذا ایک قربانی کرنے سے ذمہ فارغ ہو جائے گا۔

والدّليل على ذلك:

(وكذا لو ماتت فعلى الغني غيرها لا الفقير)أي ولو كانت الميتة منذورة بعينها لما في البدائع:أن المنذورة لو هلكت، أو ضاعت تسقط التضحية بسبب النذر، غير أنه إن كان موسرا تلزمه أخرى بإيجاب الشرع ابتداءً لا بالنذر، ولو معسرا لا شيء عليه أصلا.(١)

ترجمہ:

اسی طرح اگر وہ مرجائے تو غنی پر دوسری قربانی ضروری ہے، فقیر پر نہیں، یعنی اگر بعینہٖ اس مردہ جانور کی نذر کی ہو، کیوں کہ بدائع میں ہے کہ اگر نذر کردہ جانور ہلاک ہو جائے یا ضائع ہو جائے تو نذر کی وجہ سے قربانی ساقط ہو جاتی ہے، البتہ اگر یہ شخص مال دار ہے تو اس پر دوسری قربانی بھی لازم ہوگی، کیوں کہ شرع نے اس پر ابتداءً یہ واجب کیا ہے، نذر کی وجہ سے نہیں۔ اگر غریب ہے تو اس پر سرے سے کچھ نہیں۔



منت والی چیز سے خود کھانا

سوال نمبر(64):

ایک شخص نے بکری کے گوشت کی نذر مانی ہے، جب کہ وہ خود غریب ہے تو کیا یہ شخص اس نذر کیے ہوئے گوشت میں سے خود کچھ کھا سکتا ہے؟

بيّنوا تؤجروا

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الاضحية: ٤٧١/٩

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کوئی شخص کسی چیز کی نذر مانے تو اس کا صدقہ کرنا واجب ہے اور اس کا مصرف صرف فقراء و مساکین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے نہ تو کوئی مال دار شخص کھا سکتا ہے اور نہ نذر کرنے والا خود کھا سکتا ہے، خواہ نذر کرنے والا فقیر ہو یا غنی، لہٰذا محررہ صورت میں ناذر کے لیے نذر کیے ہوئے گوشت سے کھانا درست نہیں۔

والدلیل علی ذلک:

نذر أن یضحي، ولم یسم شیئا علیه شاة ولا یأکل منها، وإن أکل علیه قیمتها. (۱)

ترجمہ:

اگر نذر مانے کہ قربانی کرے گا اور کسی چیز (متعین جانور) کا نام نہیں لیا تو اس پر بکری لازم ہے اور اس سے خود نہیں کھائے گا، اگر کچھ کھایا تو اس کی قیمت صدقہ کرے گا۔



بیٹے کی منت ماننا

سوال نمبر (65):

اگر کوئی شخص یہ نذر مانے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کے نام پر دوں گا تو کیا یہ نذر جائز ہے؟ اور اس کا پورا کرنا ضروری ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

لزوم نذر کے لیے فقہائے کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ منذور عبادتِ مقصودہ سے ہو اور اس کی جنس سے کوئی فرض یا واجب ہو تو ایسی نذر پوری کرنا واجب اور ضروری ہے۔

صورتِ مسئولہ میں بیٹے کو اللہ تعالیٰ کے نام پر دینے کی نذر مانی گئی ہے جو نہ عبادتِ مقصودہ سے ہے اور نہ اس کی جنس سے کوئی فرض یا واجب ہے، لہٰذا ایسی نذر ماننا درست نہیں اور اس کا پورا کرنا بھی واجب نہیں۔

---

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الأضحیة، الباب الثاني في وجوب الأضحیة بالنذر: ۲۹۵/۵

والدّلیل علی ذلك:

ومن نذر نذرا مطلقا أو معلقا بشرط، وكان من جنسه واجب، وهو عبادة مقصودة، ووجد الشرط، لزم الناذر. (۱)

ترجمہ:

اور جو کوئی مطلق نذر مانے یا کسی شرط کے ساتھ معلق نذر مانے اور اس کے جنس میں سے کوئی واجب پایا جاتا ہو اور یہ مقصودی عبادت بھی ہو اور شرط پائی جائے تو نذر ماننے والے پر اس کا پورا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

❁❁❁

نذر کی رقم مسجد کی تعمیر میں خرچ کرنا

سوال نمبر(66):

ایک شخص نے نذر مانی ہے کہ اگر میں امتحان میں کامیاب ہو گیا تو اتنی رقم اللہ تعالیٰ کے نام پر دوں گا۔ امتحان میں کامیابی کے بعد اب مذکورہ رقم مسجد کی تعمیر میں دینا چاہتا ہے۔ کیا نذر کی رقم مسجد کی تعمیر میں خرچ کرنا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

نذر صدقاتِ واجبہ میں سے ہے اور اس میں بنیادی شرط قبضہ اور تملیک ہے، چونکہ مسجد میں صرف کرنے سے تملیک کی شرط پوری نہیں ہوتی، اس لیے نذر کی رقم مسجد کی تعمیر میں لگانا جائز نہیں بلکہ فقرا اور غربا کی ملکیت میں دینے سے نذر کی ادائیگی درست ہو جائے گی۔

والدّلیل علی ذلك:

(أي مصرف الزكوة والعشر)...... وهو مصرف أيضاً لصدقة الفطر، والكفارة، والنذر، وغير ذلك من الصدقات الواجبة. (۲)

---

(۱) تنویر الابصار مع الدر المختار علی صدر رد المحتار۔ کتاب الایمان: ۵/۵۱۵، ۵۱۶

(۲) ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الزکاۃ، باب المصرف: ۳/۲۸۳

ترجمہ:

اور یہ زکوۃ وعشر کا مصرف صدقہ فطر، کفارہ اور نذر وغیرہ صدقات واجبہ کا مصرف بھی ہے۔ (یعنی جہاں عشر وزکوۃ دی جاسکتی ہے، وہاں دوسرے صدقات واجبہ بھی دی جاسکتی ہیں)

❁❁❁

منذور روزہ کی قضا

سوال نمبر(67):

اگر کوئی شخص معین دن کا روزہ رکھنے کی نذر مانے، لیکن کسی مجبوری یا بھول کی وجہ سے اس دن روزہ نہ رکھ سکے تو کیا ایسی صورت میں اس پر قضا روزہ رکھنا لازم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جب کوئی شخص عبادت مقصودہ کی نذر مانے تو اس کا ایفا لازمی اور ضروری ہے، لہٰذا اگر معین دن کا روزہ کسی مجبوری یا بھول جانے کی وجہ سے نہیں رکھا ہو تو دوسرے دنوں میں اس کی قضا کرنے سے ذمہ فارغ ہوجائے گا۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو نذر صوم شهر بعينه، وأفطر يوما منه لزمه قضاءه، ولا يلزمه الاستقبال.(۱)

ترجمہ:

اگر کسی معین مہینے کے روزوں کی نذر مانی اور ان میں ایک دن افطار کیا تو اس پر از سر نو پورے روزے رکھنے کی بجائے صرف ایک دن کی قضا لازم ہوگی۔

❁❁❁❁❁

❁❁❁

(۱) الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصوم، الفصل احادى عشر في النذور: ۳۰۶/۲

کتاب القصاص

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

اسلام کا قانونِ قصاص سماج کو جرائم سے حفاظت فراہم کرنے اور امن قائم کرنے میں نہایت مؤثر اور اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن کریم نے انتہائی بہترین پیرائے میں قصاص کو انسانی زندگی کا محافظ قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَلَكُم فِي القِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلبَابِ لَعَلَّكُم تَتَّقُونَ﴾(۱)

قصاص اس شخص کے لیے بھی ذریعہ حفاظت ہے جو جرم کا ارادہ رکھتا ہو کہ سزا کا خوف اس کو جرم سے اور جرم کے نتیجے میں پیش آنے والی سزا سے بچاتا ہے۔ اُس کے لیے بھی تحفظ کا ذریعہ ہے جس کے متعلق مجرم غلط قصد وارادہ رکھتا ہے اور پورے سماج کو بھی اس کے ذریعے تحفظ فراہم ہوتا ہے۔

انسان کی طبیعت میں موجود جذبہ انتقام کو قانونِ قصاص غیر معتدل ہونے سے بچاتا ہے تاکہ شعلہ انتقام میں جلے ہوئے لوگ ایک شخص کے قصور کی سزا بے قصور لوگوں کو نہ دیں، بلکہ اسلام کی پہلی نصیحت تو یہ ہے کہ:

﴿فَمَن عُفِيَ لَهُ مِن أَخِيهِ شَيءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالمَعرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيهِ بِإِحسَانٍ﴾(۲)

قاتل نے اگرچہ وقتی غلبہ شیطان کی وجہ سے قتل کر دیا، مگر در حقیقت وہ بھی تمہارا بھائی ہے اور تم کو اسی نظر سے اس کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے۔

قصاص کا لغوی معنی:

قصاص کا لفظ ''قَـــصَّ '' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے: ''دوسرے کا نقشِ قدم تلاش کرنا اور اس پر چلنا''۔ قصاص میں بھی یہی ہوتا ہے کہ بدلہ لینے والا قاتل ہی کی راہ پر چلتا ہے۔ عربی زبان میں قص کا معنی کاٹنا بھی آتا ہے، تاہم اس کا غالب استعمال قاتل کو قتل کرنے، جارح (زخمی کرنے والے) کو زخمی کرنے اور قاطع (کاٹنے والے) کو قطع کرنے میں ہوتا ہے۔(۳)

---

(۱) البقرة:۱۷۸ (۲) البقرة:۱۷۸ منتخب أز قاموس الفقه، مادة قصاص:٤/٤٠٥

(۳) محمد بن منظور الأفريقي، لسان العرب، مادة قصص:١١/٩٢-١٩٠، دار إحياء التراث العربي، الموسوعة الفقهية، مادة قصاص:٣٣/٢٥٩، وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية الكويت

اصطلاحی معنیٰ:

"القصاص أن يفعل بالفاعل الجاني مثل ما فعل."

ترجمہ: جنایت کرنے والے مجرم کے ساتھ وہی معاملہ کرنا جو اس نے کیا تھا، قصاص کہلاتا ہے۔

عربی زبان میں اس کو "قود" بھی کہتے ہیں۔(۱)

مشروعیتِ قصاص:

قرآنِ کریم سے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ O وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ O﴾(۲)

سنتِ نبوی سے:

" من قتل له قتيل فهو بخير النظرين إما أن يقتل وإما أن يفدي."(۳)

اسی طرح ربیعؓ بنت نضرؓ کے واقعہ میں بھی رسول اللہ ﷺ نے دانت کے بدلے دانت کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا:

"كتاب الله القصاص." (۴)

یعنی ان کے مابین قرآن مجید کے مطابق فیصلہ ہوگا جو کہ قصاص ہے۔

اجماعِ امت سے:

علامہ ابن قدامہؒ نے قصاص کی مشروعیت پر علماءِ اُمت کا اجماع نقل کیا ہے۔(۵)

عقل بھی اس کی مقتضی ہے کہ انسانی جان پر جنایت کرنے والے مجرم کو اتنی ہی سزا دی جائے، جتنا اس نے جرم کیا ہے، تا کہ جرائم کا راستہ روکا جا سکے۔

---

(۱) التعريفات للجرجاني، السيد الشريف، مادة قصاص، رقم (۱۱۳۸): ص ۱۲٤، دار المنار للطباعة والنشر

(۲) البقرة: ۱۷۹،۱۷۸ (۳) سنن ابن ماجة، أبواب الديات، باب من قتل له قتيل فهو بالخيار.........الخ: ص ۱۹۲

(٤) سنن ابن ماجة، أبواب الديات، باب القصاص في السنّ: ص ۱۹٤

(٥) الشرح الكبير على المغني، كتاب الجراح: ۹/۲۸۲، ۲۸۳

قصاص کا حکم:

نبی کریم ﷺ کے ارشاد مبارک کے مطابق مقتول کے ولی کے لیے تین امور میں اختیار ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے ان تینوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرسکتا ہے:

(۱) اگر قصاص کی شرائط پوری ہوں تو قصاص کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

(۲) قاتل سے کسی مال (دیت وغیرہ) پر صلح کرسکتا ہے۔

(۳) اور اس کے لیے قاتل کو معاف کرنا بھی جائز ہے۔(۱)

ان میں سے عفو افضل ہے، پھر صلح، پھر قصاص۔ اور یہ حکم قصاص فی النفس (قتل) اور قصاص فی ما دون النفس دونوں کے لیے ہے۔(۲)

اگر ولی قصاص کا مطالبہ کردے اور جملہ شرائط موجود ہوں تو قاضی کے لیے اس کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے۔(۳)

قصاص کے اسباب:

جرم جس درجے کا ہوگا، اسی درجے کا قصاص ہوگا، قتل کے بدل قتل ہوگا، قطع کے بدلے قطع، جسم کے زخم کے بدلے زخم ہوگا اور سر کے زخم کے بدلے سر کا زخم۔ یہی قرآن کا اصول ہے۔(۴)

قصاص فی النفس (قتل) کے لیے شرائط:

قصاص واجب ہونے کے لیے کچھ شرائط ہیں۔ ان میں سے بنیادی شرط یہ ہے کہ قصاص کے مستحقین قاتل کے خلاف قصاص کا دعویٰ کریں۔ دعوے کے بعد دیگر شرائط کی رعایت کرتے ہوئے قصاص کا فیصلہ کیا جائے گا۔(۵)

---

(۱) سنن ابن ماجة، أبواب الديات، باب من قتل له قتيل فهو بالخيار بين إحدىٰ ثلاث: ص ۱۸۸

(۲) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الجنايات: ۱۰/۱۹۵

(۳) الموسوعة الفقهية، مادة قصاص: ۳۳/۲۶۰، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير، الدسوقي، محمد عرفه شمس الدين، باب في الإدماء، قوله: وهذا لاينافي: ۴/۲۴۰، مكتبة الزهران

(۴) المائدة: ۴۵

(۵) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الجنايات، قبيل باب القود فيما دون النفس: ۱۰/۱۹۸

دیگر شرائط میں سے بعض قاتل سے متعلق ہیں، بعض مقتول سے اور بعض خود قصاص لینے کی کیفیت اور طریقۂ کار سے متعلق ہیں۔

قاتل سے متعلق شرائط:

(۱) قتل کرنے والا بالغ ہو، نابالغ قاتل اگرچہ ذی شعور ہو، اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

(۲) قتل کرنے والا عاقل اور دماغی اعتبار سے متوازن ہو، لہٰذا پاگل پر قصاص نہیں۔(۱)

(۳) قاتل نے قتل اپنے اختیار سے کیا ہو، حنفیہ کے ہاں اگر قاتل کو دوسرے شخص کی طرف سے خود اپنی موت کا یقین ہو تو یہ اکراہ ملجی ہے جس میں قصاص نہیں، تاہم طرفین کے ہاں اکراہ کرنے والے (مکرِہ) پر قصاص ہے۔(۲)

(۴) قاتل نے قتل عدوان اور ظلم کی نیت سے کیا ہو اور ارادہ بھی قتل ہی کا ہو، اگر ارادہ قتل کے بغیر محض تادیب کے لیے ہاتھ وغیرہ (جس سے قتل عام طور پر واقع نہ ہو) سے مارا تو اس میں قصاص نہیں، بلکہ دیت ہوگی۔

(۵) اسی طرح ہر وہ صورت جس میں ارادہ قتل مشتبہ اور مشکوک ہو، اس میں قصاص نہیں۔

☆...... قاتل کے لیے مرد ہونا، مسلمان ہونا یا آزاد ہونا شرط نہیں۔(۳)

☆...... قاتل اگر کسی حرام چیز کی وجہ سے نشے میں ہو تو بالاتفاق اس سے قصاص لیا جائے گا۔(۴)

(۶) قاتل حربی نہ ہو، اگر قاتل حربی ہو تو اس کا قتل ویسے بھی مباح ہے، دوسری بات یہ کہ اسلام کے احکام کا التزام بھی اس کے اوپر نہیں، البتہ اگر مسلمان ہو جائے تو نہ اس پر قتل ہے اور نہ قصاص۔(۵)

(۷) مقتول نے خود قاتل کو یہ نہ کہا ہو کہ مجھے قتل کر دو، اس صورت میں قصاص نہیں، بلکہ دیت ہے۔(۶)

(۸) اگر دو قاتل ایک آدمی کو مار دیں اور ان میں سے ایک قاتل پر انفرادی صورت میں قصاص نہ ہو، مثلاً بچہ اور بالغ مل

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، أما الذي يرجع إلى القاتل فخمسة: ۲۳۶/۱۰

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، أما الذي يرجع إلى القاتل فخمسة: ۲۴۰/۱۰

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، أما الذي يرجع إلى القاتل فخمسة: ۲۳۷/۱۰

(٤) مغني المحتاج، كتاب الجراح، فصل: قتل مسلماً...... : ۱۵/٤، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الديات، قُبيل فصل في الجنين: ۲٤۹/۱۰، الدسوقي، باب في الدماء: ۲۳۷/٤، مكتبة زهران

(٥) الدردير مع الدسوقي، باب في الدماء: ۲۳۸/٤، مغني المحتاج، كتاب الجراح، فصل: قتل مسلماً...... إلخ: ۱٥،۱٦/٤

(٦) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، وأما الذي يرجع إلى المقتول: ۲٤۷/۱۰

کر قتل کریں یا مجنون اور عاقل، عامد اور خاطی وغیرہ تو حنفیہ کے ہاں ان میں سے کسی پر بھی قصاص نہیں، البتہ عاقل بالغ اور عامد پر جو نصف دیت ہوگی، وہ ان کے اپنے مال سے ادا کی جائے گی اور بچے، مجنون اور خطا کار کی دیت عاقلہ پر ہوگی۔(۱)

مقتول سے متعلق شرائط:

(۱) مقتول قاتل کا جزو نہ ہو، چنانچہ بیٹا، بیٹی، پوتے، نواسے کے قتل پر باپ، دادا، نانا، نانی وغیرہ کو قصاصاً قتل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مذہب تمام فقہا کا ہے۔(۲)

(۲) مقتول قاتل کی ملک نہ ہو اور نہ اس میں ملکیت کا شبہ ہو، چنانچہ مالک کو اپنے غلام کے بدلے قصاص نہیں کیا جائے گا، البتہ شدید گنہگار ہونے کے ساتھ قاضی اس پر تعزیر عائد کرسکتا ہے۔(۳)

(۳) مقتول معصوم الدم ہو یعنی اس کا قتل کرنا مباح نہ ہو، چنانچہ کافر حربی کو قتل کرنے سے قصاص لازم نہیں ہوتا۔ اسی طرح مستأمن حربی کو قتل کرنے سے بھی قصاص لازم نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ ہمیشہ کے لیے معصوم الدم نہیں، تاہم امام ابو یوسفؒ اور دیگر فقہا کے ہاں مستأمن کو قتل کرنے سے قصاص واجب ہوگا۔ ان کے ہاں عصمۃ الدم ہونے کے لیے دوام اور ہمیشگی ضروری نہیں، بلکہ قتل کے وقت معصوم الدم ہونا ضروری ہے، البتہ مستأمن کو مستأمن کے بدلے بالاتفاق قصاص کیا جائے گا۔(۴)

(۴) مقتول دارالاسلام میں ہو، دارالحرب میں نہ ہو، اگر دارالحرب میں اسلام لانے کے بعد دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کی تو اس کے قتل سے قصاص لازم نہیں آتا۔(۵)

(۵) مقتول قاتل کے لیے معصوم الدم ہو، اگرچہ کسی اور کے لیے اس کا خون مباح ہو، لہٰذا اگر کسی قاتل کو مقتول کے ورثا کی بجائے کسی اور نے قتل کردیا تو اس پر قصاص لازم ہے۔ جہاں تک مرتد اور زانی محصن کی بات ہے تو وہ چونکہ حربی

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، وأما الذي يرجع إلى المقتول: ۱۰/۲۴۵

(۲) حاشیۃ بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، وأما الذي يرجع إلى المقتول فثلاثة أنواع: ۱۰/۲۴۱

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، وأما الذي يرجع إلى المقتول فثلاثة أنواع: ۱۰/۲۴۲-۲۴۵

(۴) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، وأما الذي يرجع إلى المقتول فثلاثة أنواع: ۱۰/۲۴۶، مغني المحتاج، کتاب الجراح، فصل قتل مسلماً: ۴/۱۴، الاختیار، کتاب الجنایات: ۵/۲۷

(۵) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، وأما الذي يرجع إلى المقتول فثلاثة: ۱۰/۲۴۸

کی طرح سب کے لیے مباح الدم ہیں، اس لیے اس کو قتل کرنے سے قصاص لازم نہیں۔(۱)

مقتول اور قاتل کے مابین مندرجہ ذیل چیزوں میں برابری ضروری نہیں، بلکہ عدمِ مماثلت کی صورت میں بھی قصاص کا حکم ہوگا، بشرطیکہ دوسرے شرائط موجود ہوں:

(۱) کمال ذات میں

(۲) سلامۃ الأعضاء میں

(۳) شرف اور فضیلت میں، لہٰذا صحت مند شخص کو اپاہج کے بدلے، عالم کو جاہل کے بدلے، عاقل کو مجنون کے بدلے، بالغ کو بچے کے بدلے، مرد کو عورت کے بدلے، آزاد کو غلام کے بدلے اور مسلمان کو ذمی کے بدلے قصاصاً قتل کیا جائے گا۔(۲)

(۶) مقتول کسی حق کی وجہ سے قتل نہ ہو، بلکہ ظلماً قتل ہو، کسی کو قصاصاً یا حداً یا تعزیراً قتل کرنے سے قصاص لازم نہیں۔ اسی طرح اپنی جان یا مال کی حفاظت کرتے ہوئے سارق یا غاصب یا ڈاکو کو قتل کرنے سے قصاص لازم نہیں آتا، اسی طرح استاد یا ڈاکٹر کی تادیب یا تطبیب سے اگر کوئی شخص مرجائے تو اس میں بھی قصاص نہیں، البتہ ضمان لازم ہوگا۔(۳)

(۷) مقتول باغی نہ ہو، اگر باغی ہو تو عادل شخص کو باغی کے بدلے قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ باغی کو قتل کرنا گویا اپنی جان اور مال کو محفوظ کرنا ہے۔(۴)

ولی القصاص کے لیے شرائط:

(۱) ولی الدم یا ولی القصاص قاتل کا بیٹا یا پوتا نہ ہو۔(۵)

(۲) مقتول کا ولی (ولی القصاص) معلوم ہو، اگر ولی مجہول ہو تو قصاص واجب نہیں۔(۶)

(۱) رد المحتار على هامش الدر المختار، كتاب الجنايات، فصل فيما يوجب القود ومالا يوجبه: ۱۰/۱۶۲، الموسوعة الفقهية، مادة قصاص: ۳۳/۲۶۳

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، وأما الذي يرجع إلى المقتول فثلاثة أنواع: ۱۰/۲۴۸، الاختيار، كتاب الجنايات: ۵/۲۷، ۲۶، الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الجنايات، فصل في مايوجب القود ومالا يوجبه: ۱۰/۷۵، ۱۷۴

(۳) الموسوعة الفقهية، مادة قصاص: ۳۳/۲۶۸

(۴) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، وأما الذي يرجع إلى المقتول فثلاثة أنواع: ۱۰/۲۴۶

(۵) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الجنايات، فصل في مايوجب القود ومالا يوجبه: ۱۰/۱۷۷

(۶) والتفصيل في البدائع، كتاب الجنايات، وأما الذي يرجع إلى ولي القتيل: ۱۰/۲۶۴

نفسِ قتل سے متعلق شرائط:

(۱) قصاص واجب ہونے کی ایک شرط خود قتل سے متعلق ہے کہ قتل براہِ راست (مباشرۃ) کیا گیا ہو۔ اگر قاتل نے کوئی ایسا سبب اختیار کیا جو مقتول کے لیے باعثِ قتل بن گیا تو یہ موجبِ قصاص نہیں، جیسے: کوئی شخص درمیانِ راہ کنواں کھودے اور کوئی شخص اس میں گر کر مر جائے تو اس پر قصاص واجب نہیں ہوگا۔(۱)

اسی طرح اگر چند افراد نے کسی شخص کے خلاف قتل کی گواہی دی جس کے نتیجے میں وہ قصاصاً قتل ہوگیا پھر یا تو انہوں نے جھوٹ کا اقرار کر کے رجوع کرلیا یا جس شخص کو مقتول قرار دیا تھا، وہ زندہ پایا گیا تو حنفیہ کے ہاں یہ قتل مباشرۃ نہیں، بلکہ قتل بالسبب ہے، اس لیے قصاص نہیں بلکہ دیت ہوگی۔ امام شافعیؒ کے ہاں اس صورت میں گواہوں پر قصاص ہے۔(۲)

البتہ حنفیہ کے ہاں اکراہ کی صورت میں قتل پر مجبور کرنے والا شخص (مکرِہ) اگرچہ مباشر نہیں، بلکہ مسبب ہے، لیکن طرفین کے ہاں اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔(۳)

ایک شخص کے قتل میں متعدد لوگوں کو قتل کرنا:

اگر ایک شخص کے قتل میں کئی لوگ عملاً شریک ہوں تو ائمہ اربعہ کے ہاں بالاتفاق ان تمام لوگوں سے قصاص لیا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے بدلے پانچ یا سات افراد کو قصاصاً قتل کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ اگر تمام اہلِ صنعاء بھی اس ایک شخص کے قتل میں شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کردیتا۔(۴)

مطالبہ قصاص کا حق کس کو ہے؟

جمہور فقہا کے ہاں قصاص کا حق اوّلاً اس شخص کو ہے جس پر ظلم ہوا ہے، لہٰذا مظلوم شخص اگر زخمی حالت میں موت سے قبل مجرم کو معاف کردے تو ورثہ کے لیے قصاص کا حق نہیں، تاہم قتلِ خطا میں یہ معافی ثلثِ دیت میں شمار ہوگی

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، وأما الذي یرجع إلی نفس القتل: ۲۶۳/۱۰

(۲) أیضاً

(۳) حاشیة (۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، وأما الذي یرجع إلی القاتل فخمسة: ۲۴۰/۱۰

(۴) السنن الکبری للبیهقي، کتاب الجنایات، جماع أبواب تحریم القتل، باب النفر یقتلون الرجل، رقم (۱۶۴۰۴): ۵۷/۱۲

الا یہ کہ ورثا اجازت دے دیں۔(۱)

اگر زخمی شخص موت سے قبل معافی نہ دے تو حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں یہ حق مقتول کے ورثا کا ہے، خواہ ایک ہوں یا زیادہ، مرد ہوں یا عورت، چھوٹے ہوں یا بڑے۔ مالکیہ کے نزدیک صرف عصبہ مرد قصاص کے مستحق ہیں؛ بیٹیاں، بہنیں یا شوہر قصاص کے حق دار نہیں۔(۲)

مستحقین قصاص میں سے اگر کوئی ایک شخص بھی قصاص کو معاف کر دے تو بالاتفاق دوسرے ورثا کو قصاص لینے کا حق نہیں ہوگا، البتہ اگر قاتل نے دو قتل کیے تھے تو ایک مقتول کے ورثا کی معافی کے باوجود دوسرے مقتول کے ورثا کو قصاص کا حق ہے۔(۳)

اگر ورثا میں سے بعض نابالغ ہوں تو امام ابو حنیفہؒ کے ہاں بالغ ورثا کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے، جب کہ صاحبین کے ہاں نابالغ کے بالغ ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔ امام صاحب کے ہاں حق قصاص ہر وارث کے لیے ابتداءً علی وجہ الکمال ثابت ہے، جب کہ صاحبین کے ہاں یہ میت سے وراثتاً ملی ہے، لہٰذا تمام شرکا اس میں برابر کے شریک ہوں گے۔(۴)

ولایتِ قصاص کے اسباب:

حق قصاص مندرجہ ذیل اسباب سے حاصل ہوتا ہے:

(۱) وراثت: ورثا میں سے ہر ایک کو قصاص کا حق حاصل ہے، البتہ اگر ان میں سے کوئی ایک بالغ شخص غائب ہو تو اس کی حاضری کے بغیر قصاص نہیں لیا جائے گا، کیوں کہ ممکن ہے کہ وہ قاتل کو معاف کر دے۔(۵)

---

(۱) بداية المجتهد، لابن رشد محمد القرطبي، كتاب القصاص، وأما القول في الواجب: ۲/۷۱۵، مكتبة نزار مصطفى الباز، بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في ما يسقط القصاص بعد وجوبه ومنها العفو، وأما حكم العفو: ۱۰/۲۹۱

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في بيان من يستحق القصاص: ۱۰/۲۶۹، ۲۷۰، الدسوقي، باب الدماء: ۴/۲۵۶، بداية المجتهد، كتاب القصاص، وأما القول في الواجب: ۲/۷۱۴

(۳) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في ما يسقط القصاص بعد وجوبه، ومنها العفو، وأما حكم العفو: ۱۰/۲۸۹، ۲۹۰، بداية المجتهد، كتاب القصاص، وأما القول في الواجب: ۲/۷۱۴

(۴) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في بيان من يستحق القصاص: ۱۰/۲۷۰، ۲۷۱

(۵) أيضا

(۲) اُبُوت: اگر چھوٹا بچہ قصاص کا ولی ہو تو اس کا باپ/ دادا اس کی طرف سے قصاص لے سکتا ہے۔(۱)

(۳) ملک مطلق: اگر قتل کے وقت مولیٰ کو مکمل ملک حاصل ہو تو قصاص لینے کا حق دار وہی ہوگا۔(۲)

(۴) ولاء: اگر دوسرا کوئی وارث نہ ہو تو مولی العتاقہ استیفائے قصاص کا حق دار ہوگا۔(۳)

(۵) سلطان: اگر مذکورہ اسباب میں سے کوئی بھی نہ ہو تو سلطان قصاص لینے کا حق دار ہوگا۔(۴)

قصاص لینے کا طریقہ:

حنفیہ کے ہاں قصاص صرف تلوار یا اس کے قائم مقام اسلحے (خنجر، چھری، نیزہ وغیرہ) کے ذریعے جائز ہے۔ جبکہ دیگر فقہا کے ہاں قاتل نے جو کیا تھا، اس کے ساتھ قصاص میں وہی کیا جائے گا۔ اگر اس سے نہ مرا تو سر کاٹ دیا جائے گا، البتہ اگر قاتل نے کسی گناہ کے ذریعے قتل کیا تھا (مثلاً: زنا، شراب پلانا وغیرہ) تو اب تلوار ہی اس کا علاج ہوگا۔(۵)

اُصولیین کے ہاں قصاص لیتے وقت سلطان اور امام سے اجازت لینا ضروری ہے، بلکہ اس کا حاضر ہونا بھی ضروری ہے، تاہم فقہا کے ہاں حدود میں امام کا ہونا تو ضروری ہے، قصاص میں ضروری نہیں۔ دراصل امام اور عدالت کی اجازت سے قصاص محض انتقام کے زمرے سے نکل کر معاشرتی اصلاح کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس میں اور بھی کافی سارے مصالح ہیں۔(۶)

مستحب یہ ہے کہ قصاص لیتے وقت دو آدمیوں کو اس کا گواہ بنا دیں۔(۷)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في من يلي استيفاء القصاص: ۲۷٤/۱۰

(۲) أيضاً

(۳) أيضاً: ۲۷٦/۱۰

(٤) أيضا

(٥) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الجنايات، فصل في مايوجب القود ومالا يوجبه: ۱۷۹/۱۰، بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في بيان مايستوفي به القصاص: ۲۷۸/۱۰، الدسوقي، باب الدماء: ۲٦٥/٤

(٦) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الجنايات، باب القود في مادون النفس: ۱۹۷/۱۰، ۱۹۸، مغني المحتاج، كتاب الجراح، فصل في مستحق القصاص ومستوفيه: ٤١/٤

(٧) الإنصاف، المرداوي، كتاب الجنايات، باب استيفاء القصاص، قوله: ولا يستوفى القصاص إلا بحضرة السلطان: ٤٨٧/٩، دار إحياء التراث العربي، مغني المحتاج، كتاب الجراح، فصل في مستحق القصاص ومستوفيه: ٤١/٤

سقوطِ قصاص کی صورتیں:

فقہائے کرام کے ہاں مندرجہ ذیل صورتوں میں قصاص واجب ہونے کے باوجود ساقط ہوجاتا ہے:

(۱) قصاص کا محل ہی باقی نہ رہے، جیسے: ملزم کی موت واقع ہوجائے یا قصاص فی مادون النفس میں جس عضو کو کاٹا جانا تھا، وہ تلف ہوجائے۔

اگر عضو کسی حادثہ یا بے گناہ معاملے میں ضائع ہوجائے تو حنفیہ کے ہاں قصاص کے ساتھ ساتھ دیت بھی ساقط ہوجائے گی، البتہ اگر عضو کسی جرم کی وجہ سے کٹ جائے تو قصاص اگر چہ ساقط ہوگا، لیکن دیت باقی رہے گی۔(۱)

(۲) مستحقین قصاص میں سے کوئی قاتل کو معاف کردے، البتہ عفو کے لیے چند شرائط ہیں:

(الف) معافی اس شخص کی طرف سے ہو جسے قصاص لینے کا حق تھا۔

(ب، ج) معاف کرنے والا عاقل اور بالغ ہو، البتہ جن لوگوں نے معاف نہیں کیا ہے، وہ اپنے حصے کے بقدر دیت کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔(۲)

(۳) مستحقینِ قصاص میں سے کوئی ایک یا سب قاتل سے مال پر صلح کرلیں۔ مال بقدر دیت بھی ہوسکتی ہے اور اس سے کم وبیش بھی۔(۳)

(۴) قاتل وراثت کے طور پر خود مستحق قصاص بن جائے یا اس کا بیٹا پوتا وراثت میں قصاص کے ولی بن جائیں۔(۴)

معافی یا صلح کرنے کے بعد قاتل کو مارنا:

اگر مقتول کے ورثا میں سے کسی نے قاتل کو معاف کردیا یا کسی نے مال پر صلح کرلیا تو اس کے بعد قاتل کو مارنا جائز نہیں۔ جس نے بھی اس کو مارا، اس پر قصاص واجب ہے۔(۵)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في بیان مایسقط القصاص بعد وجوبه: ۱۰/۲۸۳، ۲۸۴

(۲) أیضا: ۱۰/۲۸۴-۲۸۷

(۳) أیضا: ۱۰/۲۹۵

(٤) أیضا: ۱۰/۲۹٦، الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الجنایات، فصل في مایوجب القود ومالایوجبه: ۱۰/۱۷۷

(٥) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في بیان مایسقط القصاص بعد وجوبه، ومنها العفو، وأما حکم العفو: ۱/۲۸۸-۲۹۵

حاملہ عورت سے قصاص لینے کا طریقہ:

قاضی کے سامنے شرعی اصول کے مطابق اگر قصاص ثابت ہو جائے تو ولی قصاص کے لیے فوراً قصاص لینے کا حق ہے، البتہ اگر قتل کسی حاملہ عورت نے کیا ہو تو جب تک ولادت نہ ہو جائے، اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ شریعت مطہرہ کے مذکورہ حکم میں ہونے والے زندہ بچے کا تحفظ اولین مقصد ہے۔(۱)

قصاص فی مادون النفس یعنی اعضا میں قصاص کا حکم:

شریعتِ مطہرہ میں جس طرح انسانی جان کی حفاظت اور اس کا احترام لازم ہے۔ بالکل اسی طرح حکم اعضا کا بھی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص قصداً اور ارادتاً کسی انسان کا عضو تلف کر دے تو مخصوص شرائط کی موجودگی میں اس کا بھی وہی عضو قصاصاً تلف کیا جائے گا۔ اعضا میں قصاص کی مشروعیت بھی قصاص فی النفس کی طرح ادلۂ اربعہ سے ثابت ہے۔(۲)

اعضا میں عمد اور شبہ عمد دونوں برابر ہیں، کیوں کہ زخمی کرنے میں کسی اسلحے یا غیر اسلحے کی تمیز نہیں ہوتی۔(۳)

قصاص فی مادون النفس کی شرائط:

کچھ شرائط تو بالکل وہی ہیں جو قصاص فی النفس کے لیے تھے، مثلاً: جنایت کرنے والا عاقل، بالغ، متعمد اور مختار ہو، مجنی علیہ معصوم ہو، جنایت کرنے والے کا جز یا ملک نہ ہو اور جنایت بطور مباشرت ہو، نہ بطورِ تسبیب وتطبیب۔(۴)

چند مخصوص شرائط:

(۱) جانی اور مجنی علیہ کا نوع ایک ہو، یعنی دونوں مذکر یا مؤنث ہوں، لہٰذا عورت کے اعضا کے بدلے مرد کے

---

(۱) الدرالمختارمع رد المحتار، كتاب الحدود، مطلب في الكلام على السياحة:٦/٢١، مغني المحتاج، كتاب الجراح فصل في مستحق القصاص ومستوفيه:٤/٤٢، ٤٣، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير، باب في الدماء:٤/٢٦٠

(۲) الموسوعة الفقهية، مادة جناية على مادون النفس:١٦/٦٣، ٦٤

(۳) الدرالمختارمع ردالمحتار، كتاب الجنايات: ١٠/١٦٠

(٤) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في أحكام الشجاج:١٠/٣٩٩

اعضا کا قصاص درست نہیں، البتہ سر کے زخموں میں امام محمد کے ہاں مرد وعورت کے مابین قصاص جاری ہوسکتا ہے۔(۱)

(۲) اعضا میں قصاص کے لیے اتحاد فی المحلین شرط ہے، لہٰذا ہاتھ کے بدلے ہاتھ ہی کاٹا جائے گا، پاؤں نہیں۔(۲)

(۳) جن دو اعضا کی دیت اور منافع باہم مماثل ہوں، ان میں قصاص جاری ہوگا؛ لہٰذا:

☆...... بے کار (اپاہج) عضو کے بدلے صحیح عضو کا قصاص درست نہیں۔

☆...... کم انگلیوں والے ہاتھ کے بدلے کامل ہاتھ کا قصاص درست نہیں۔

☆...... دائیں ہاتھ کو بائیں یا دائیں پاؤں کو بائیں پاؤں کے بدلے قصاص کرنا درست نہیں۔

☆...... یہی حکم دانتوں، آنکھوں اور کانوں وغیرہ کا بھی ہے وکذا القیاس۔

☆...... مسلمان اور ذمی کے اعضا کا آپس میں قصاص درست ہے لتساویھما في الدیة و المنفعة.

☆...... البتہ غلام کے بدلے آزاد یا غلام کے بدلے دوسرے غلام کے اعضا کا قصاص درست نہیں، لاختلافھما في الدیة و المنفعة. (۳)

(۴) جانی اور مجنی علیہ دونوں آزاد ہوں۔(۴)

(۵) اعضا میں قصاص کے لیے حنفیہ کے ہاں عدد میں مماثلت بھی شرط ہے، لہٰذا اگر دو یا زیادہ افراد نے مل کر کسی کا ہاتھ کاٹا تو قصاص میں ان سب کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، بلکہ ان سب پر دیت ہوگی، اس لیے کہ ایک ہاتھ اور زیادہ ہاتھوں میں مماثلت فی الذات والمنافع والفعل کوئی بھی نہیں۔(۵)

(۶) قصاص ان اعضا میں لیا جائے گا جن میں مماثلت ممکن ہو اور تجاوز وتعدی کا خطرہ نہ ہو، لہٰذا جو اعضا جوڑ

---

(۱) الاختیار، کتاب الجنایات، فصل ولا یجري القصاص..........إلخ: ۵/ ۳۰، بدائع الصنائع، فصل في أحکام الشجاج: ۱۰/ ۴۲۶

(۲) بدائع الصنائع، فصل في أحکام الشجاج: ۱۰/ ۳۹۹،

(۳) الاختیار، کتاب الجنایات، فصل ولا یجري القصاص..........إلخ: ۵/ ۳۰، بدائع الصنائع، فصل في أحکام الشجاج: ۱۰/ ۳۹۹-۴۰۲

(۴) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في أحکام الشجاج: ۱۰/ ۴۶۶

(۵) الاختیار، کتاب الجنایات، فصل ولا یجري القصاص..........إلخ: ۵/ ۳۱، بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في أحکام الشجاج: ۱۰/ ۴۰۴

یا کسی خاص جگہ سے کاٹے جاسکتے ہوں، ان میں قصاص درست ہوگی، باقی میں قصاص کی بجائے دیت یا ارش واجب ہوگی۔(۱)

اس اصول کو مدنظر رکھ کر زبان اور ذکر میں قصاص درست نہیں، اس لیے کہ ان دونوں میں سکڑاؤ اور پھیلاؤ کی وجہ سے مماثلت ناممکن ہے، البتہ صرف حشفہ میں قصاص درست ہے۔(۲)

ہڈیوں میں مماثلت نہ ہونے کی وجہ سے قصاص درست نہیں، البتہ دانتوں میں درست ہے۔(۳)

(۷) جنایت بطور عدوان اور تعدی ہو، نہ کہ بطور حد، تعزیر، تطبیب، دفاع وغیرہ۔ اسی طرح جنایت مجنی علیہ کے حکم سے بھی نہ ہو۔(۴)

اگر جنایت کرنے والے کے عضو میں نقصان ہو تو کیا ہوگا؟

اگر جنایت کرنے والے نے جنایت درست عضو میں کی تھی، لیکن اس کا یہی عضو عیب دار تھا تو اس صورت میں مجنی علیہ کو اختیار ہے یا تو یہی عیب دار عضو قصاص میں کاٹ لے یا اس کے بدلے درست عضو کی دیت یا ارش لے لے۔ قصاص اور ضمان دونوں کا اختیار اس کو نہیں۔(۵)

سر اور چہرے کے زخموں کا بیان:

فقہا نے زخموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: ایک ''شجاج'' دوسرا ''جراح''۔ شجاج وہ زخم ہے جو سر اور چہرے کے کسی حصے میں ہو۔ حنفیہ کے ہاں ایسے زخم کی گیارہ صورتیں ہیں:

(۱) خارصة: جس میں چمڑا پھٹ جائے، لیکن خون نہ نکلے۔

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنايات، فصل في أحكام الشجاج: ۱۰/۴۰۱-۴۰۳، الاختيار، كتاب الجنايات، فصل ولا يجري القصاص: ۵/۳۱

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في أحكام الشجاج: ۱۰/۴۲۳، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الجنايات، باب القود في مادون النفس: ۱۰/۲۰۳، ۲۰۴

(۳) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الجنايات، باب القود في مادون النفس: ۱۰/۱۹۷-۱۹۹، الاختيار، كتاب الجنايات، فصل ولا يجري القصاص: ۵/۳۱

(۴) الموسوعة الفقهية، ملخص أز بدائع و ردالمحتار، مادة جناية على مادون النفس: ۱۶/۶۵

(۵) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في أحكام الشجاج: ۱۰/۴۰۲، الاختيار، كتاب الجنايات، فصل ولا يجري القصاص .... الخ: ۵/۳۱

(۲) دامعة: جس سے خون نکلے، مگر بہنے نہ پائے۔

(۳) دامیة: جس سے خون بہنے لگے۔

(٤) باضعة: جس سے گوشت کٹ جائے۔

(٥) متلاحمة: جس میں کسی قدر زیادہ گوشت کٹ جائے، مگر ہڈی کے قریب نہ پہنچے۔

(٦) سمحاق: جس میں گوشت کٹ جائے اور ہڈی کے اوپر کی باریک جھلی ظاہر ہو جائے۔ اس جھلی کو سمحاق کہتے ہیں۔

(٧) موضحة: جس میں مذکورہ جھلی پھٹ جائے اور ہڈی ظاہر ہو جائے۔

(٨) هاشمة: جس میں ہڈی ٹوٹ جائے۔

(٩) منقلة: جس میں ہڈی ٹوٹ کر اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔

(١٠) آمة: جو زخم دماغ کے اوپر کے غلاف تک پہنچے۔

(١١) دامغة: جو اس غلاف کو چاک کر کے اصل دماغ تک پہنچ جائے۔(۱)

آمہ اور دامغہ کے علاوہ مذکورہ باقی زخم چہرے کے کسی بھی حصے میں آسکتے ہیں۔(۲)

☆......ان زخموں میں سے موضحہ ایسا زخم ہے جس میں تمام فقہا کے ہاں بالاتفاق قصاص ہے۔ اس لیے کہ موضحہ میں مماثلت آسانی سے ممکن ہے۔ موضحہ سے اوپر والے زخموں میں عدم مماثلت کی وجہ سے بالاتفاق قصاص نہیں، بلکہ دیت یا ارش ہے، البتہ موضحہ سے نیچے زخموں میں حنفیہ کے راجح قول کے مطابق قصاص ہے۔ اس میں دوسرا قول ارش، یعنی حکومتِ عدل کا ہے۔(۳)

سر اور چہرے کے علاوہ زخموں کا حکم:

زخم کی دوسری قسم جراح ہے۔ اس میں وہ تمام زخم داخل ہیں جو سر اور چہرے کے علاوہ ہوں۔ یہ بنیادی طور پر دو طرح کے ہیں: جائفہ اور غیر جائفہ

جائفہ وہ زخم ہے جو جوف تک پہنچتا ہو، سینہ، پیٹ، پشت، پہلو، سرین وغیرہ جس راستے سے بھی پہنچ جائے۔

(۱) بدائع الصنائع کتاب الجنایات، فصل في الجناية على مادون النفس: ۳۹٦/۱۰

(۲) أيضا: ۳۹۸/۱۰

(۳) الاختیار، کتاب الدیات، فصل الشجاج عشرة: ٤۲/٥، الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الدیات، فصل في الشجاج: ۲٤۱/۱۰_۲٤۳

اس کے علاوہ ہاتھ، پاؤں اور گردن وغیرہ کے جو زخم ہیں، وہ غیر جائفہ ہیں۔(۱)

جراحات چاہے جائفہ ہوں یا غیر جائفہ، کسی میں بھی قصاص نہیں، اس لیے کہ ان میں مماثلت ممکن نہیں، جب کہ قصاص کا دارومدار ہی برابری پر ہے۔

البتہ اگر مجروح اس زخم سے مرجائے تو پھر قصاص فی النفس یا دیت (علی حسب الاحوال) ہوگی۔ جائفہ زخموں میں حنفیہ کے ہاں ثلثِ دیت ہے، جب کہ غیر جائفہ میں حکومتِ عدل ہے۔(۲)

کسی عضو کا اپنا مخصوص کام چھوڑ دینے کا حکم:

حنفیہ کے ہاں صرف آنکھ میں قصاص واجب ہوگی، اس طور پر کہ آنکھ میں گرم لوہا (سلائی) پھرا کر اس کی بینائی ختم کردی جائے گی۔ اس کے علاوہ منافع مثلاً: گویائی، شنوائی، سونگھنا، چلنا، چکھنا، عقل، صلاحیتِ جماع، صلاحیتِ ایلاد، بھوک، پیاس وغیرہ کے ختم ہونے سے قصاص لازم نہیں ہوتا، بلکہ پوری دیت واجب ہوگی۔(۳)

نوٹ:

قصاص میں نسب، قابلیت، تعلیم یا مال داری میں تساوی ضروری نہیں، بلکہ نفس انسانیت کے حوالہ سے دیکھا جائے گا، لہٰذا اعلیٰ نسب کا آدمی ایک معمولی حیثیت والے نسب کے آدمی کے بدلے قصاص ہوگا۔ ایسا ہی کند ذہن، جاہل اور غریب کے بدلے ذہین، تعلیم یافتہ اور مال دار سے قصاص لیا جائے گا۔

❁❁❁❁❁

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنايات، فصل في الجناية على مادون النفس: ۳۹۸،۳۹۷/۱۰

(۲) رد المحتار على هامش الدرالمختار، کتاب الديات، فصل في الشجاج: ۲۴۳/۱۰، بدائع الصنائع، کتاب الجنايات، فصل في أحكام الشجاج: ۴۲۶/۱۰

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الجنايات، فصل في أحكام الشجاج: ۴۲۰/۱۰، الموسوعة الفقهية، مادة جناية على مادون النفس: ۸۲/۱۶، الاختيار، کتاب الجنايات، فصل ولا يجري القصاص.........إلخ: ۳۱/۵

کتاب الدّیات

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

انسانی جان کے تقدس اور عظمت کو بحال رکھنے کے لیے شریعت میں قصاص کو مشروع کیا گیا ہے، تاہم قصاص کی شرائط کی عدم موجودگی میں جہاں قاتل قصاص سے بچ جاتا ہے، وہاں اُس پر مالی تاوان (دیت، ارش، تعزیر) کا بوجھ رکھ دیا گیا، تا کہ انسان کا خون رائیگاں نہ جائے اور جرائم کا تدارک ہو سکے۔

اسلام کا قانونِ دیت دوہرے فائدے پر مشتمل ہے، یعنی ایک طرف قاتل کی جان بچ جاتی ہے تو دوسری طرف مقتول کے اولیا کی بھی کسی قدر شنوائی ہو جاتی ہے جس سے دونوں خاندان مزید نقصان سے بچ جاتے ہیں۔(۱)

لغوی تحقیق:

دیات جمع ہے ''دِیَۃٌ'' کی۔ یہ اصل میں وِدْیٌ یا وَدْیٌ تھا، وَعدٌ اور وَزنٌ (عدۃٌ، زِنۃٌ) کی طرح، پھر فا کلمہ کو حذف کر کے آخر میں ''ۃ'' لگا دیا۔ اس کا معنی ہے مقتول کے وارث کو خون بہا دینا، ہلاک کرنا، بہانا وغیرہ۔(۲)

اصطلاحی تعریف:

دیت وہ مال ہے جو کسی آزاد انسان کی جان یا عضو کے بدلے جنایت کرنے والے پر لازم ہوتا ہے۔

الدية اسم لضمان يجب بمقابلة الآدمي أو طرف منه.(۳)

دیت کو عقل (بمعنی باندھنا، روکنا) بھی کہتے ہیں۔ چونکہ دیت کی وجہ سے خون بہنے سے رک جاتا ہے یا دیت کے اُونٹوں کو باندھ کر مقتول کے ورثا کے حوالے کیا جاتا ہے، اس لیے دیت کو عقل کہتے ہیں۔(۴)

---

(۱) الموصلي، عبدالله بن محمود، الاختيار لتعليل المختار، كتاب الديات: ۵/۳۵، دار المعرفة بيروت لبنان

(۲) المنجد، عربي أردو، مادة (ودى): ص: ۱۰۷۶، دار الإشاعت، محمد بن منظور الأفريقي، لسان العرب، مادة (ودى): ۱۵/۲۵۸، دار إحياء التراث العربي بيروت، الموسوعة الفقهية، مادة (ديات): ۲۱/۴۴

(۳) فتح القدير، كتاب الديات، ۹/۲۰۵، مكتبه حقانيه پشاور

(۴) الاختيار لتعليل المختار، كتاب الديات، باب المعاقل: ۵/۵۸

دیت کی مشروعیت:

قرآنِ کریم میں ہے:

﴿وَمَن قَتَلَ مُؤمِنًا خَطَأً فَتَحرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهلِهِ﴾(۱)

سنتِ نبوی ﷺ سے:

صحابیِ رسول عمرو بن حزمؓ کے ہاتھوں رسول اللہ ﷺ نے اہلِ یمن کو جو تفصیلی خط لکھ کر بھیجا تھا، اس میں دوسری تفاصیل کے ساتھ ساتھ دیات کی بھی پوری تفصیل لکھی گئی تھی۔(۲)

اجماع سے:

دیت کی مشروعیت اور وجوب پر اہلِ علم کا اجماع ہے اور عقل وحکمت بھی اس کی مشروعیت کا مقتضی ہے۔(۳)

اصطلاحات:

جسمانی نقصان پر فقہائے کرام کے ہاں جو مالی تاوان واجب ہوتا ہے، وہ تین طرح کا ہوتا ہے: دیت، ارش اور حکومتِ عدل

(۱) دیت: مکمل ہلاکت یا کسی ایسے نقصان کا تاوان دیت ہے جس کو شریعت نے قتل وہلاکت کے حکم میں رکھا ہو۔

(۲) اَرش: جزوی جسمانی نقصان پر شریعت کی طرف سے جو تاوان مقرر کیا جاتا ہے، وہ اَرش کہلاتا ہے۔

(۳) حکومتِ عدل: جس جسمانی نقصان کے متعلق شارع نے کوئی سزا مقرر نہیں کی ہو، بلکہ حاکم کو اختیار دیا ہو کہ وہ اہلِ رائے حضرات سے مشاورت کر کے اس کی سزا متعین کرے تو یہ مالی سزا ''حکومتِ عدل'' کہلاتی ہے۔(۴)

دیت واجب ہونے کے اسباب:

قتل کی مندرجہ ذیل صورتوں میں دیت واجب ہوتی ہے:

(۱) قتلِ خطا: مثلاً کسی اور شے کو نشانہ بنا رہا تھا اور گولی آدمی کو جا لگی۔ قتلِ خطا کی دیت عاقلہ پر تین سال میں واجب ہوتی ہے۔

---

(۱) النساء: ۹۲

(۲) سنن النسائي، كتاب القسامة والقود والديات، ذكر حديث عمرو بن حزم: ۲۰۱/۲

(۳) الاختيار لتعليل المختار، كتاب الديات: ۳۵/۵، المغني والشرح الكبير، كتاب الديات: ۴۸۱/۹، ۴۸۲

(۴) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الثامن في الديات: ۲۴/۶

(۲) قتلِ شبہ عمد: اس کی دیت بھی عاقلہ پر تین سال میں واجب ہوتی ہے، تاہم اونٹوں کے اعتبار سے اس دیت میں شریعت نے قاتل پر تغلیظ اور سختی کا حکم دیا ہے۔

(۳) قتل بالسبب میں بھی دیت واجب ہوتی ہے۔ یہ بھی عاقلہ کے ذمے ہوتی ہے۔

(۴) قتلِ عمد کی درج ذیل صورتوں میں بھی دیت واجب ہوگی:

(۱) تمام اولیا یا بعض اولیا قصاص معاف کر کے قاتل کے ساتھ دیت کی ادائیگی پر صلح کر لیں۔

(۲) کسی شبہ کی وجہ سے قصاص نہ لیا جا سکے، مثلاً: باپ یا دادا اپنے بیٹے یا پوتے کو قتل کر دیں یا دو ایسے آدمی مل کر قتل کریں جن میں سے ایک پر (عدمِ عقل، عدمِ بلوغ، عدمِ قصد وغیرہ کی وجہ سے) قصاص نہ ہو تو دوسرے سے بھی قصاص ساقط ہو کر دونوں پر دیت واجب ہوگی، اسی طرح بچہ یا پوتا وراثت میں اپنے دادا سے قصاص لینے کا مستحق بن جائے، ان تمام صورتوں میں قصاص کی جگہ دیت واجب ہوگی، مگر قاتل کے مال میں، نہ کہ عاقلہ کے مال میں سے۔

(۵) قتل کسی مجنون یا نابالغ نے کیا ہو، اکیلے کیا ہو یا کسی مکلف کے ساتھ مل کر کیا ہو۔(۱)

دیت واجب ہونے کی شرطیں:

(۱) مقتول یا زخمی شخص معصوم ہو یعنی شرعی نقطہ نظر سے قتل کیے جانے کا مستحق نہ ہو۔ چنانچہ حربی اور باغی کے قتل پر دیت واجب نہیں، اس لیے کہ ان کا خون معصوم نہیں، البتہ ذمی اور مستأمن معصوم الدم ہیں، اس لیے ان کے قتل کے بدلے دیت واجب ہوگی۔

(۲) مقتول یا زخمی شخص کا خون شریعت کی نگاہ میں قابلِ قیمت ہو، چنانچہ حربی اگر دار الحرب میں مسلمان ہو کر ہجرت نہ کرے اور غلطی سے کسی مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو قصاص کی طرح دیت بھی واجب نہیں، اس لیے کہ حنفیہ کے ہاں انسانی خون اس وقت قابلِ قیمت ہوتا ہے جب وہ دار الاسلام میں ہو۔(۲)

---

(۱) فتح القدير، كتاب الديات:۹/۲۰٤، الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الثامن في الديات:٦/٢٤، الموسوعة الفقهية، مادة(ديات):۲۱/٤٧_٥٧

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في بيان مايسقط القصاص بعد وجوبه، ومنها وجوب الدية، أما الشرائط: ۱۰/۳۰٥، ۳۰٤

البتہ قاتل پر کفارہ واجب ہوگا۔(۱)

اسلام، عقل اور بلوغ دیت کے وجوب میں نہ قاتل کے لیے شرط ہیں اور نہ مقتول کے لیے۔(۲)

قتل کے علاوہ جنایات، یعنی اعضاوغیرہ میں دیات کے لزوم کا خلاصہ:

اگر جنایت قتل سے کم درجے کی ہو تو خطا کی صورت میں اور قصاص کی شرائط پوری نہ ہونے کی صورت میں (اگرچہ عمد ہو) دیت واجب ہوتی ہے، البتہ یاد رہے کہ اگر مجنی علیہ عورت ہو تو اس کی دیت مرد کی دیت کی نصف ہوگی اور اگر مجنی علیہ غلام ہو تو مکمل دیت کی بجائے غلام کی مکمل قیمت واجب ہوگی اور نصف دیت کی بجائے نصف قیمت واجب ہوگی۔(۳)

قتل سے کم درجے کی جنایت تین طرح کی ہوسکتی ہے:

(۱) اعضا کا کٹ جانا یا الگ ہوجانا۔

(۲) سر اور چہرے کی زخمیں۔

(۳) منافع کا ختم ہوجانا۔

ان میں سے ہر ایک کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱) اعضا کا کٹ جانا یا الگ ہوجانا:

اس کی چند صورتیں ہیں:

(۱) جو اعضا انسان کے بدن میں ایک ایک ہیں، جیسے: ناک، زبان، آلہ تناسل یا حشفہ، ریڑھ کی ہڈی، پیشاب یا پاخانہ کا راستہ، سر اور داڑھی کے بال (بشرطیکہ دوبارہ نہ نکل سکیں) وغیرہ؛ ان تمام اعضا کے کاٹ دینے سے مکمل دیت واجب ہوگی۔

(۲) وہ اعضا جو انسانی جسم میں دو دو ہیں، جیسے: ہاتھ، پاؤں، کان، وغیرہ؛ ان میں اگر دونوں کاٹ دیے جائیں تو مکمل دیت واجب ہوگی، اگر کوئی ایک ضائع ہوجائے تو نصف دیت واجب ہوگی۔

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في بیان مایسقط القصاص بعد وجوبه، منها وجوب الکفارة، وأما الذی یرجع إلی المقتول: ۳۰۱/۱۰

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في بیان مایسقط القصاص، ومنها وجوب الدیة، أما الشرائط: ۳۰۵/۱۰

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل وأما الذی فیه دیة کاملة، وأما شرائط الوجوب: ۴۳۲،۴۳۱/۱۰

(۳)وہ اعضا جو جسم میں چار چار ہیں، جیسے: دونوں آنکھوں کی پلکیں اور پپوٹے، اگر چاروں ضائع ہو جائیں تو پوری دیت ہوگی اور اگر ایک ضائع ہو جائے تو چوتھائی دیت واجب ہوگی۔(۱)

(۴)وہ اعضا جو دس دس ہیں، جیسے: ہاتھ پاؤں کی انگلیاں تو ان میں اگر دس کے دس کاٹ دیے جائیں تو پوری دیت ہوگی، ورنہ ہر انگلی کے بقدر دیت کا دسواں حصہ واجب ہوگا۔

(۵)انسانی بدن میں صرف دانت ایسے ہیں جن میں پوری دیت سے بھی زیادہ واجب ہو سکتی ہے، اس لیے کہ ہر دانت پر پانچ اونٹ ہیں، یعنی دیت کا بیسواں حصہ، لہٰذا اگر اکیس دانت ضائع ہو جائیں تو پوری دیت سے بھی زیادہ تاوان واجب ہوگا۔(۲)

زخموں کی دیت:

چہرے اور سر کے زخموں میں سے حنفیہ کے ہاں آمہ میں تہائی دیت، منقلہ میں پندرہ اونٹ، ہاشمہ میں دس اونٹ اور موضحہ میں پانچ اونٹ کی دیت عمرو بن حزم کی حدیث سے ثابت ہے۔ دامغہ سے عموماً موت واقع ہوتی ہے، اس لیے اس میں پوری دیت ہوگی، البتہ اگر زندہ رہا تو ثلثِ دیت واجب ہوگی۔(۳)

جن زخموں میں قصاص، دیت اور شریعت کی طرف سے مقرر کردہ ارش نہیں، وہاں معاملہ قاضی کے حوالہ ہوگا، یعنی ''حکومتِ عدل'' پر فیصلہ ہوگا۔ چہرے اور سر کے علاوہ زخموں میں سے صرف جائفہ میں ثلثِ دیت ثابت ہے، باقی میں ''حکومتِ عدل'' پر فیصلہ ہوگا۔(۴)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل وأما الذی فیه دیة کاملة: ۱۰/۴۲۸، ۴۲۹

(۲) الاختیار لتعلیل المختار، کتاب الدیات، فصل (و في النفس الدیة): ۵/۳۷۔۳۹، الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الدیات: ۱۰/۲۲۳۔۲۲۸، الفقه الإسلامي وأدلته، القسم الخامس الفقه العام، الباب الثالث الجنایات وعقوباتها، الفصل الثاني، المبحث الأول، المطلب الأول، النوع الأول والثاني والثالث والرابع: ۷/۵۷۶۷۔۵۷۶۹

(۳) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الدیات، فصل في الشجاج: ۱۰/۲۴۰، ۲۴۱، بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، وأما الذي یجب فیه أرش مقدر وأما الشجاج: ۱۰/۴۴۰

(۴) الاختیار لتعلیل المختار، کتاب الدیات، فصل الشجاج عشرة: ۵/۴۲، ۴۱،

کن اشیا سے دیت ادا کی جائے؟

فقہائے کرام کے ہاں اونٹوں سے دیت کی ادائیگی میں مکمل اتفاق ہے، تاہم دوسری اشیا سے دیت کی ادائیگی میں کچھ تفصیل ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں دیت تین طرح کے اموال میں ادا کی جاسکتی ہے: اونٹ، سونا اور چاندی۔صاحبین کے ہاں چھ چیزوں میں سے دیت ادا کی جاسکتی ہے: اونٹ، سونا، چاندی، گائے، بکری اور کپڑے (جوڑے)۔حنفیہ کے راجح قول کے مطابق ان میں سے ہر ایک کی مقدار کچھ یوں ہوگی:

☆......اونٹوں میں سے دیت کی مقدار سو(۱۰۰) ہوگی۔

☆......سونے میں سے ایک ہزار دینار یا اس کے بقدر سونا۔

☆......دراہم میں سے دس ہزار درہم یا اس کے بقدر چاندی۔

☆......گایوں میں سے دوسو گائے۔

☆......بکریوں میں سے دو ہزار بکریاں۔ ☆......اور کپڑوں میں سے دوسو جوڑے۔(۱)

رائج الوقت اوزان کے مطابق درہم اور دینار کی مقدار:

موجودہ دور کے اعتبار سے ایک درہم کی مقدار 25.2 رتی یا 3.0618 گرام ہے، جب کہ دینار کی مقدار 4.5 ماشہ یا 4.374 گرام ہے۔یوں دیت کی کل مقدار چاندی کے اعتبار سے 2625 تولہ، یعنی 30.618 کلوگرام ہے۔(۲)

عورتوں اور غیر مسلموں کی دیت کا حکم:

عورت کی دیت مرد کی دیت کے مقابلے میں نصف ہوگی۔اس پر صحابہؓ کرام کا اجماع ہے۔حنفیہ اور شافعیہ کے ہاں تنصیفِ دیت کا یہ قاعدہ اعضا میں بھی جاری ہوگا۔(۳)

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات،فصل في بیان ما یسقط القصاص بعد وجوبه،ومنها وجوب الدیة،وأما بیان ما تجب منه الدیة: ۳۰۸/۱۰، ۳۰۹، الفتاوی الهندیة، کتاب الجنایات،الباب الثامن في الدیات: ۲۴/۶

(۲) مفتی محمد شفیع، اوزانِ شرعیہ، ص ۶۲،ضمیمہ از مولانا محمد اشرف قریشی،ادارۃ المعارف کراچی

(۳) الفتاوی الهندیة، کتاب الجنایات،الباب الثامن في الدیات: ۲۴/۶،محمد بن عبد الرحمن الدمشقي،رحمة الأمة، کتاب الجنایات،فصل وأجمعوا علیٰ..........الخ: ص ۲۷۱،دار الکتب العلمیة،بدائع الصنائع، کتاب الجنایات،فصل في بیان مایسقط القصاص بعد وجوبه،ومنها وجوب الدیة،وأمابیان مقدار الواجب من کل جنس: ۳۱۰/۱۰

ذمی، یعنی مسلمان ملک میں آباد غیر مسلم اور مستأمن (غیر مسلم مملکت سے اجازت کے ساتھ مسلم مملکت آنے والے غیر مسلم) کی دیت بھی حنفیہ کے نزدیک وہی ہے جو مسلمان کی ہے۔(۱)

دیتِ مغلظہ اور غیر مغلظہ کا فرق:

جرم کی شدت کے اعتبار سے مقررہ تعداد میں اضافے کے بغیر دیت کو گراں قیمت بنانا ''تغلیظ'' کہلاتا ہے۔ ایسا کرنا صرف اونٹنیوں میں ممکن ہے اور یہ تغلیظ صرف قتلِ عمد یا شبہ عمد میں ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ وابو یوسفؒ کے ہاں تغلیظ اس طرح ہوگی: 25 ایک سالہ (بنت مخاض) اونٹنیاں، 25 دو سالہ (بنت لبون)، 25 تین سالہ (حقہ) اور 25 چار سالہ (جذعہ) اونٹنیاں۔

جب کہ امام محمد رحمہ اللہ کے ہاں 30 حقے، 30 جذعے اور چالیس حاملہ اونٹنیاں ''تغلیظ'' ہے۔

قتل خطا اور قتل بالسبب میں دیت خفیف ہوتی ہے جس کی تفصیل یوں ہے: 20 ابن مخاض (یک سالہ اونٹ)، 20 بنت مخاض، 20 بنت لبون، 20 حقے، 20 جذعے۔(۲)

دیت کی ادائیگی میں عاقلہ کا تعاون:

خون بہا، یعنی دیت کی ادائیگی میں شریعت نے قاتل کے ناصرین اور پشت پناہوں پر بھی کچھ ذمہ داری ڈال دی ہے تاکہ وہ قاتل کے ساتھ تعاون کرنے کے علاوہ اس کو مزید جرائم سے بھی روک سکیں۔ یہی لوگ عاقلہ کہلاتے ہیں۔ عاقلہ میں سب سے پہلا درجہ اہل دیوان کا ہے۔ اس زمانے میں ہم اس کی تعبیر ہم پیشہ یا ایک محکمہ کے ملازمین سے کر سکتے ہیں۔

دراصل یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ تھا، اس لیے کہ اکثر جرائم میں ہم پیشہ لوگ خاندان والوں سے زیادہ جرم میں انسان کے لیے معاون ومشیر بنتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے اہل دیوان نہ ہوں یا ہوں، مگر تھوڑے ہوں تو اب اہل خاندان بھی عاقلہ میں سے شمار ہوں گے اور ان میں قرابت کے مراتب کو معیار بنایا جائے گا، تاہم اگر قریبی رشتہ دار

---

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في بيان مايسقط القصاص بعد وجوبه، ومنها وجوب الدية، وأمابيان مقدار الواجب من كل جنس: ۱۰/ ۳۱۰۔

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في بيان ما يسقط القصاص بعد وجوبه، ومنها وجوب الدية، وأمابيان مقدار الواجب من كل جنس: ۱۰/ ۳۰۹،۱۰، ورحمة الأمة، كتاب الديات: ص ۲۶۷

کم ہوں تو دور کے رشتہ دار بھی شامل رہیں گے۔(۱)

عاقلہ سے تعاون لینے کے لیے شرائط:

فقہائے کرام کے ہاں عاقلہ کو دیت کی ادائیگی میں شریک کرنے کے لیے درج ذیل شرائط ہیں:

(۱) قتل شبہ عمد، قتلِ خطا، شبہ خطا یا قتل بالسبب کی صورت میں ہو۔

(۲) دیت باہمی صلح کے ذریعے طے نہ ہو، اگر صلح کے ذریعے ہو تو وہ صلح کرنے والوں کی طرف سے ادا ہوگی۔

(۳) دیت ملزم کے اقرار و اعتراف سے واجب نہ ہو۔

(۴) قاتل غلام نہ ہو۔

(۵) قتل عمد کے مرتکب سے اگر کسی شبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہو جائے (مثلاً: اپنا بیٹا قتل کر دے) تو دیت خود اس کے مال سے ادا ہوگی، نہ کہ عاقلہ کے مال سے۔

(۶) بچہ اور مجنون اگر چہ عمداً قتل کریں، پھر بھی وہ قتلِ خطا کے درجے میں ہے، اس لیے دیت کی ادائیگی میں عاقلہ شریک رہیں گے۔(۲)

عاقلہ سے دیت لینے کی کیفیت:

عاقلہ سے دیت تین سال میں وصول کی جائے گی۔ ہر سال فی کس کے حساب سے ایک درہم وصول کیا جائے گا، تین سال میں ۳ یا ۴ درہم سے زیادہ وصول نہیں کیے جائیں گے۔ اگر عاقلہ کم ہوں تو دور کے قرابت دار اور تعلق دار بھی شامل کیے جائیں گے۔ عاقلہ میں خود قاتل بھی ایک فرد شمار کیا جائے گا، البتہ عورتیں، بچے اور پاگل (اگر قتل میں بالذات معاون نہ ہوں) تو وہ عاقلہ میں شمار نہیں ہوں گے۔ حنفیہ کے ہاں قتلِ عمد، اقرار اور صلح کی دیت اگر چہ

(۱) الفقه الإسلامي وأدلته، القسم الخامس الفقه العام، الباب الثالث الجنايات وعقوباتها، الفصل الأول، المبحث الثالث النوع الأول، المطلب الأول، خامساً، من هي العاقلة، وهل تتحمل الدية في العصر الحاضر: ۷/۵۷۲۷، ۵۷۲۸، بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في ما يسقط القصاص بعد وجوبه، ثم الكلام في العاقلة: ۱۰/۱۶-۳۱۴، قاموس الفقه، مادة ديت: ۴/۳۶۶

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في ما يسقط القصاص بعد وجوبه، وأما بيان من تجب عليه الدية: ۱۰/۳۱۱، ۳۱۲، الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الثامن في الديات: ۶/۲۴، الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الديات، فصل في الشجاج: ۱۰/۲۴۹

قاتل کے مال سے ادا ہوگی، لیکن قاتل کو بھی عاقلہ کی طرح تین سال کی مہلت دی جائے گی۔(۱)

قلیل جرمانے (ارش) میں عاقلہ کی شمولیت کس حد تک ہوگی؟

حنفیہ کے ہاں فی مادون النفس، یعنی اعضا میں دیت کے بیسویں حصے سے کم جو بھی ارش (حکومتِ عدل وغیرہ) ہوگی، وہ عاقلہ کی بجائے جنایت کرنے والے کے ذمے ہوگی۔ بیسویں حصے کے بقدر یا اس سے زیادہ مقدار میں عاقلہ شامل ہوں گے۔ بیسواں حصہ مردوں میں 500 درہم کے بقدر ہے، جب کہ عورتوں میں 250 درہم کے بقدر۔ امام شافعیؒ کے ہاں عاقلہ قلیل وکثیر سب کا ذمہ دار ہوتا ہے۔(۲)

دیت کی ادائیگی میں بیت المال کا کردار:

مندرجہ ذیل صورتوں میں دیت کی ادائیگی بیت المال سے ہوگی:

(۱) جس شخص کے عاقلہ نہ ہوں یا عاقلہ ہوں، لیکن ادائے دیت سے عاجز ہوں تو بیت المال سے دیت دی جائے گی۔(۳)

(۲) اگر قاضی یا سلطان کی غفلت سے کسی شخص کی جان یا عضو تلف ہوجائے تو دیت بیت المال کے ذمے ہوگی۔

(۳) شارع عام، عام بازار، جامع مسجد اور عمومی جگہوں میں پائے جانے والے مقتول کی دیت بھی بیت المال سے دی جائے گی۔(۴)

عاقلہ اور بیت المال نہ ہو تو دیت کس کے ذمے ہوگی؟

جس شخص کے عاقلہ نہ ہوں اور بیت المال بھی نہ ہو یا بیت المال ہو، لیکن دیت ادا کرنے سے قاصر ہو تو جمہور فقہا کے ہاں یہ دیت قاتل ہی کے ذمے رہے گی، ساقط نہیں ہوگی۔(۵)

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في مایسقط القصاص بعد وجوبه، ثم الکلام في العاقلة: ۳۱۴/۱۰-۳۱۶، الدر المختار مع رد المحتار، کتاب المعاقل: ۳۲۵/۱۰-۳۳۱، قاموس الفقه، مادة عاقله: ۳۶۶/٤

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في بیان الجنایة التي تتحملها العاقلة ومالا تتحملها ......: ۴۵۱/۱۰

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات، فصل في مایسقط القصاص بعد وجوبه، ثم الکلام في العاقلة: ۳۱۵/۱۰، الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب المعاقل: ۳۳۲/۱۰

(٤) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الدیات، باب القسامة: ۳۱۶/۱۰

(۵) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب المعاقل: ۳۳۲/۱۰

حکومتِ عدل متعین کرنے کا طریقہ:

وہ تمام زخم جو کسی بڑے نقصان کے بغیر دوبارہ ٹھیک ہو جائیں، ان میں حکومتِ عدل، یعنی قاضی کی طرف سے وضع کردہ تاوان ہے۔اسی طرح ہر وہ جزوی نقصان جس کے لیے شارع کی طرف سے مالی تاوان کی کوئی مقدار مقرر نہ ہو، اس میں تعزیر عدالت کے حوالہ ہوتی ہے کہ وہ مناسب تاوان کا تعیین کرے۔یاد رہے کہ قاضی کی طرف سے عائد کردہ تاوان جنایت کرنے والے کے ذمے ہوگا، نہ کہ عاقلہ کے ذمے۔(۱)

تاوان کے تعیین کے لیے فقہائے کرام نے چند طریقے پیش کیے ہیں:

(۱) غلام فرض کرکے زخمی شخص کی قیمت لگائی جائے اور پھر اس سے صحت یاب، غلام کی بھی قیمت لگائی جائے اور دونوں کی قیمت میں جو تفاوت ہو، وہ تاوان عائد کیا جائے۔

(۲) شارع نے جس زخم کی بابت تاوان متعین کیا ہے، اس زخم سے اُس زخم کی قربت دیکھ کر اس کی روشنی میں تعیین کیا جائے۔(۲)

(۳) زخم کے علاج میں ہونے والے مالی اخراجات، جن میں ادویہ، معالج کی فیس اور دوسرے تمام مصارف داخل ہیں، بطور حکومۃ (تاوان) واجب قرار دیے جائیں۔اور یہی تیسرا طریقہ موجودہ حالات کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔(۳)



(۱) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الدیات، فصل في الشجاج: ۲۴۸/۱۰ـ۲۵۰

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الجنایات في مایجب فیه الأرش غیر المقدر، أما تفسیر الحکومة: ۴۵۵/۱۰، رحمة الأمة کتاب الدیات، فصل أتفق الأمة......الخ: ص ۲۶۹

(۳) الدر المختار مع ردالمحتار، کتاب الدیات، فصل في الشجاج: ۲۴۹/۱۰، الفقه الأسلامي وأدلته، القسم الخامس الفقه العام، الباب الثالث الجنایات وعقوباتها، الفصل الثاني الجنایة علی مادون النفس، المبحث الأول، المطلب الرابع عقوبة الجراح، حکومة العدل وضابطها وتقریرها: ۵۷۶۸/۷

باب حدّ قطع الطریق

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

اسلامی نظامِ حکومت میں امام، قاضی اور ان کی طرف سے مقرر کردہ انتظامیہ کو عوام کی جان و مال اور عزت وآبرو کا محافظ قرار دیا گیا ہے۔ ریاستی اور معاشرتی امن وسکون کی اس چار دیواری میں شریعت کسی بھی قسم کی مداخلت کی قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی انفرادی یا اجتماعی قوت اس عوامی تحفظ وتقدس کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کرتی ہے، شریعت اس کو بہرصورت معاشرے کے لیے نمونہ عبرت بنا کر چھوڑتی ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت کے نظامِ عدل کی ان بنیادی اکائیوں میں سے ایک حدّ الحرابة یا حدّ قطع الطریق بھی ہے۔ قرآنی فرمان کے مطابق یہ سزا بنیادی طور پر معاشرے کے ان افراد کے لیے مختص کی گئی ہے جو ''ریاست کے اندر ریاست بنانے'' کے درپے ہوں جو اپنے ظالمانہ رعب ودبدبے کی بنا پر راہ چلتے ہوئے لوگوں کو اسلحہ کی نوک پر یرغمال بنا کر ان کی جان ومال پر دست درازی کرنے کو اپنا پیشہ بنا بیٹھے ہوں۔ قرآنِ کریم نے اس قبیح عمل کو ''اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ'' کا نام دے کر اس کے لیے سخت سزا مقرر فرمائی ہے۔ اسی طرح ارشادِ نبوی ﷺ ''من حمل علینا السلاح فلیس منا'' کی رو سے مسلمانوں پر اسلحہ اٹھانے والے شخص کو اسلام کی نسبت کرنا بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے۔(۱)

حرابة اور قطع الطریق کا لغوی معنیٰ:

حرابة یا تو حَرب سے ہے بمعنیٰ ''جنگ وجدال'' اور یا ''حَرَب'' سے ہے بمعنیٰ سلب واخذ۔(۲)

جب کہ قطع الطریق کا معنیٰ ہے، لوگوں کو راستہ چلنے سے روکنا یا ان کو راستے میں لوٹنا۔ اسی کو سرقہ کبریٰ بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ ایک طرف تو اس کے مفاسد عام ہیں اور دوسری طرف سزا کے اعتبار سے اس کا حکم بھی عام سرقہ سے بڑھ کر ہے۔(۳)

---

(۱) المائدة:۳۳، فتح الباري، کتاب الفتن، باب قول النبي ﷺ: "من حمل علينا السلاح فليس منا" رقم (۷۰۷۰): ۱۴/۵۱۷

(۲) لسان العرب، مادة حرب:۳/۱۰۰،۹۹

(۳) رد المحتار على الدر المختار، باب قطع الطريق:۶/۱۸۳

اردو زبان میں قطع الطریق کو، رہ زنی، ڈاکہ زنی یا ڈکیتی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔(۱)

اصطلاحی تعریف:

کسی ایک شخص یا جماعت کا اسلحہ لے کر، دار الاسلام میں فساد پھیلانے، خون بہانے، کسی کا مال چھیننے، عزت پر ہاتھ ڈالنے یا کھیتی و باغ جلانے کے اقدام کو قطع الطریق یعنی رہ زنی کہتے ہیں۔ اس میں یہ ضروری نہیں کہ تمام جماعت رہ زنی یا قتل میں بالذات شریک ہو، بلکہ بالذات مرتکبینِ جرم اور معاونین برابر کے سزاوار ہوں گے۔(۲)

علامہ سید سابق کے ہاں بچوں یا بچیوں کا اغوا، گھروں یا بینکوں کی ڈاکہ زنی، بدامنی اور فساد کی خاطر حکام پر حملہ کرنا اور کھیتوں یا جانوروں کو تلف کرنا بھی اس میں شامل ہے۔(۳)

مشروعیتِ حد:

قرآن کریم نے رہ زنی کو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ اور فساد قرار دے کر اس کی سزا بھی متعین فرمائی ہے۔(۴)

اسی طرح حدیثِ عرینین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرنہ پر حد قطع الطریق جاری فرمائی۔(۵)

حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث میں بھی حد قطع الطریق کی تین شقوں: قتل، تصلیب اور نفی کا تذکرہ ہے۔(۶)

اور قاطع الطریق پر حد جاری کرنے کے سلسلے میں فقہائے کرام کا اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے۔(۷)

---

(۱) القاموس الجدید، مادة قطع: ص ٧٥٤، وحید الزمان کیرانوي

(۲) فقه السنة، للسید السابق، الحرابة، تعریفها: ٥٢٣/٢، دار ابن کثیر، دمشق بیروت، بدائع الصنائع، کتاب قطاع الطریق، فصل في بیان قطع الطریق: ٣٦٠/٩

(۳) فقه السنة، للسید السابق، الحرابة، تعریفها: ٥٢٣/٢، دار ابن کثیر دمشق بیروت

(٤) المائدة: ٣٣

(٥) ابو داؤد، کتاب الحدود، باب ماجاء في المحاربة، رقم (٤٣٦٤: ٢/ ٢٥١)، رحمانیة

(٦) أبو دؤد، کتاب الحدود، باب الحکم في من ارتد، رقم ٤٣٥٣: ٢/ ٢٥٠، رحمانیه

(٧) الموسوعة الفقهیة، مادة حرابة: ١٥٤/١٧، بدایة المجتهد، کتاب الحرابة: ٨٠٩/٢، مکتبه نزار المصطفیٰ الباز، الریاض، المکة المکرمة

اصطلاحات:

(۱) قطع الطریق: رہزنی، ڈکیتی

(۲) قاطع الطریق: راہزن

(۳) مقطوع علیہ: جس کو لوٹا گیا ہو، متاثرہ شخص

(٤) مقطوع لہ: وہ مال جس کی وجہ سے رہزنی ہوگئی ہے۔

(٥) مقطوع فیہ: رہزنی کی جگہ اور مقام۔(۱)

قطع الطریق کی صورتیں:

فقہائے کرام نے رہزنی کی چار صورتیں ذکر کی ہیں:

(۱) صرف مال لینے کے ارادے سے حملہ آور ہوا ہو، تاہم مال لینے یا قتل وغیرہ کی نوبت نہیں آئی، صرف لوگوں کو ڈرایا دھمکایا۔

(۲) ڈرا دھمکا کر مال بھی لے لیا ہو، تاہم قتل کی نوبت نہ آئی ہو۔

(۳) کسی کو قتل کردے، لیکن مال لینے کی نوبت نہ آئی۔

(۴) قتل بھی کردے اور مال بھی لے لے۔

مذکورہ چاروں صورتیں "حرابة" یعنی رہزنی میں شمار ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص مال لوٹنے کی نیت سے خروج تو کرے، لیکن اس کو مذکورہ چار صورتوں میں کوئی بھی پیش نہ آئے تو وہ محارب نہیں ہوگا۔(۲)

قطع الطریق کا رکن:

اصطلاحی تعریف میں ذکر کردہ شرائط کے ساتھ کسی کو راستہ چلنے سے روکنا اس کا رکن ہے۔(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل في شروط حد قطع الطریق:۹/ ۳٦۰-۳٦۳

(۲) التشریع الجنائي الإسلامي لِ "عبدالقادر عودة"، الکتاب الخامس، الحرابة، رقم(٦۳۳):۲/ ٦۳۹، ٦۳۸، بدائع الصنائع، فصل في حکم الطریق:۹/ ۳٦٦

(۳) بدائع الصنائع، فصل في بیان رکن قطع الطریق:۹/ ۳٦۰

حدِ حرابہ واجب ہونے کی شرطیں:

یہ شرائط کچھ تو قاطع (راہزن) سے متعلق ہیں، کچھ مقطوع علیہ (متاثرہ شخص) سے، کچھ مقطوع لہ (لوٹے گئے مال) سے اور کچھ مقطوع فیہ یعنی مکان سے۔

راہ زن سے متعلق شرائط:

(۱) رہ زنی کرنے والا عاقل ہو۔

(۲) بالغ ہو۔

(۳) مرد ہو۔

اگر رہ زنی میں کوئی بچہ، پاگل یا عورت بھی شریک ہو جائے تو امام ابوحنیفہ و محمد رحمہما اللہ کے ہاں کسی پر بھی حد جاری نہ ہوگی، البتہ ائمہ ثلاثہ، امام ابو یوسف اور امام طحاوی کے ہاں عورت پر تو بہر صورت حد واجب ہوگی اور بچہ و مجنون اگر بذاتِ خود رہ زنی کرلیں اور باقی محض تعاون کے درجے میں شریک ہوں تو کسی پر بھی حد نہیں، البتہ اگر وہ لوگ بالذات شریک ہوں تو بچے کو چھوڑ کر باقی سب پر حد جاری ہوگی۔ یہی زیادہ مناسب ہے۔ حد جاری ہونے کے لیے آزاد ہونا کسی کے ہاں بھی شرط نہیں، غلام پر بھی حد جاری ہوگی۔ (۳)

(۴) رہ زنی کرنے والا احکاماتِ اسلام کا پابند ہو، یعنی مسلمان یا ذمی ہو، مستأمن پر حد جاری نہیں ہوگی، البتہ تعزیر ہوگی۔ (۴)

(۵) رہ زنی کرنے والے کے ساتھ اسلحہ یا اس کے قائم مقام کوئی چیز ہو، جیسے: لاٹھی، بڑے پتھر وغیرہ۔

(۶) رہ زنی کرنے والے کھلے عام جرم کا ارتکاب کریں۔ اگر خفیہ طور پر ہو تو یہ سرقہ ہے۔ اگر رعب و دبدبے کے بغیر

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل في شروط حد قطع الطريق: ۹/ ۳۶۰

(۲) التشريع الجنائي الإسلامي لِ "عبدالقادر عودة"، الكتاب الخامس، الحرابة، رقم (۶۲۳): ۲/ ۶۳۹، ۶۳۸، بدائع الصنائع، فصل في حكم الطريق: ۹/ ۳۶۶

(۳) بدائع الصنائع، كتاب قطاع الطريق، فصل في شروط حد قطع الطريق: ۹/ ۶۲، ۳۶۱، فقه السنة، الحرابة، شروط الحرابة: ۲/ ۵۲۵

(٤) الدر المختار مع ردالمحتار، كتاب السرقة، باب قطع الطريق: ۶/ ۱۸٤، الموسوعة الفقهية، مادة حرابة: ۱۷/ ۱۵۵

واردات کر کے بھاگ جائیں تو یہ انتہاب ہے، دونوں صورتوں میں حد قطع نہیں ہوگی۔(۱)

مقطوع علیہ کے لیے شرائط:

(۱) متاثرہ شخص مسلمان یا ذمی ہو، حربی یا مستامن نہ ہو۔

(۲) متاثرہ شخص کو لوٹے گئے مال میں ید صحیحہ حاصل ہو، یعنی وہ مال یا تو اس کا ذاتی ہو یا شرعاً اس کے زیر تصرف ہو، لہٰذا سارق (جس کا ہاتھ کاٹا گیا ہو) کا مال چھیننے سے حد واجب نہ ہوگی۔(۲)

قاطع اور مقطوع علیہ کے لیے مشترکہ شرط یہ ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ذورحم محرم رشتہ دار نہ ہوں۔(۳)

مقطوع لہ کے لیے شرائط:

جو مال لیا گیا ہو، اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ شرعاً و عرفاً متقوم ہو، اس میں قاطع کے لیے ملک یا شبہ ملک نہ ہو، محفوظ ہو، دس دراہم کے بقدر ہو یعنی راہ زنوں میں سے ہر ایک کو دس دراہم کے بقدر مل جائے۔ حسن بن زیاد رحمہ اللہ کے ہاں یہ نصاب بیس دراہم کے بقدر ہونا چاہیے۔(۴)

مقطوع فیہ یعنی مکان سے متعلقہ شرائط:

(۱) جس جگہ رہ زنی کا واقعہ پیش آیا ہو، وہ دارالاسلام، یعنی اسلامی مملکت ہو۔

(۲) رہ زنی کا مقام شہر سے باہر ہو یعنی کسی صحرا یا ایسے مقام میں ہو جہاں ان لوگوں کو رعب و دبدبہ حاصل ہو اور شہر سے شرعی سفر کے برابر دور ہو۔ دراصل شہر میں عام طور پر حکومت کی رٹ اور انتظام کارفرما ہوتی ہے اور کسی بھی وقت حکومت کے کارندے اس کو پکڑ سکتے ہیں، لہٰذا شہر یا حکومتی زیر انتظام علاقوں میں واردات قطع الطریق نہیں، بلکہ اختلاس ہے، یہ

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب السرقة، باب قطع الطريق:٦/١٨٧، المغني، كتاب قطاع الطريق، يشترط في المحاربين أن يكون معهم سلاح، الشرط الثاني والثالث، رقم(٧٣٢١): ١٠/٢٩٩، فقه السنة، الحرابة، شروط الحرابة:٢/٥٢٦، ٥٢٧

(٢) بدائع الصنائع، كتاب قطاع الطريق، فصل في المقطوع عليه:٩/٣٦٢، بدائع الصنائع، كتاب السرقة، فصل في المسروق منه:٩/٣٢٣، ٣٢٤

(٣) بدائع الصنائع، فصل في القاطع و المقطوع عليه:٩/٣٦٢

(٤) بدائع الصنائع، فصل في المقطوع له:٩/٣٦٣

قول صرف امام ابوحنیفہ ومحمد رحمہما اللہ کا ہے۔امام ابو یوسفؒ اور دیگر فقہاے کرام کے ہاں مصر وغیر مصر کی کوئی قید نہیں۔
دراصل امام صاحب کے دور میں شہری عوام اور شہری حکومت کو مکمل استحکام اور قوت حاصل تھی ،لہٰذا جن شہروں کی حالت
اس قسم کی ہو، وہاں یہ شرط معتبر ہوگی ،بصورتِ دیگر شہر وغیر شہر کے درمیان کوئی فرق نہیں۔(۱)

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شر پسندوں کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے مشائخ نے امام ابو یوسفؒ کی
رائے پر فتوی دیا ہے کہ شہر ہو یا بیرونِ شہر، راہ زن مسلح ہوں یا غیر مسلح (غیر مسلح ہونا فقط رات میں موجب حد ہے)، دن ہو
یا رات ؛ بہر صورت حد جاری ہوگی۔(۲)

قطع الطریق ثابت ہونے کے ذرائع:

دیگر حدود کی طرح راہ زنی کے ثبوت کے لیے بھی یا تو اقرار ہونا چاہیے یا دو عادل گواہوں کی گواہی۔قاضی محض
اپنے علم واطلاع کی بنا پر اس جرم کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔امام مالکؒ کے ہاں راہ زنی کے ثبوت کے لیے متاثرہ افراد (مقطوع
علیہم) کی شہادت بھی معتبر ہے۔(۳)

قطع الطریق (راہ زنی) کی سزا:

اس سلسلے میں بنیادی حیثیت اس آیت کی ہے:

﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ
يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ﴾ (٤)

ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے اور زمین میں فساد پھیلانے میں لگے رہتے ہیں، ان کی سزا
یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹے جائیں یا وہ ملک
سے نکال دیے جائیں۔

---

(١) بدائع الصنائع،فصل في المقطوع فيه:٩/٣٦٤

(٢) رد المحتار على هامش الدرالمختار،باب قطع الطريق:٦/٨٤،١٨٣

(٣) بدائع الصنائع،فصل في بيان مايظهر به القطع عند القاضي:٩/٣٦٦،بداية المجتهد،الباب الخامس بماذا تثبت الجناية:٢/٨١٦

(٤) المائدة:٣٣

مذکورہ آیت سے چار قسم کی سزائیں ثابت ہوتی ہیں: قتل، سولی پر چڑھایا جانا، اُلٹے ہاتھ پاؤں کاٹ دینا اور جلاوطن کرنا یا قید میں ڈالنا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ چاروں سزائیں چار قسم کے جرائم کے لیے ہیں۔

(۱) اگر اس نے صرف مال لینے پر اکتفا کیا ہو تو اس کے ہاتھ پاؤں اُلٹے کاٹ دیے جائیں یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں۔

(۲) اگر اس نے صرف قتل کیا ہو، مال نہ لیا ہو تو ایسا مجرم قتل کیا جائے گا۔

(۳) جس نے مال بھی لیا ہو اور قتل بھی کیا ہو تو اس کے بارے میں امیر کو اختیار ہے کہ ہاتھ پاؤں کاٹ کر پھر قتل کردے یا بغیر ہاتھ پاؤں کاٹے قتل کردے اور سادہ طور پر قتل کردیا جائے یا سولی پر چڑھا کر قتل کردیا جائے۔

(۴) اور اگر صرف ڈرایا دھمکایا ہو تو اسے قید کیا جائے گا اور سرزنش کی جائے گی۔

آئمہ ثلاثہ کے ہاں سزا دینے میں قاضی کو ان ہی صورتوں کو مدنظر رکھنا ہوگا، جب کہ امام مالکؒ کے ہاں قاضی کو مذکورہ چاروں سزاؤں میں ہر سزا کا اختیار ہے۔(۱)

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ "نفی من الأرض" سے مراد حنفیہ کے ہاں قید ہے، امام مالکؒ کے ہاں شرعی مقدارِ سفر کے بقدر جلاوطنی ہے۔ جب کہ امام احمدؒ کے ہاں اس کو مسلسل جلاوطن کرنا ہے تا کہ وہ کسی جگہ جم کر نہ رہ سکے۔(۲)

سولی دینے کی کیفیت:

امام ابویوسفؒ اور امام کرخیؒ سے منقول ہے کہ ایسے شخص کو زندہ سولی دی جائے گی، اس کے ہاتھ سولی کے تختہ سے باندھ دیے جائیں گے، پھر پیٹ یا سینہ میں نیزہ مار کر اسے قتل کردیا جائے گا۔ حنفیہ میں سے امام طحاویؒ اور آئمہ ثلاثہ کے ہاں قتل کرنے کے بعد ازراہِ عبرت سولی پر لٹکایا جائے گا، سولی کے تین دن تک لاش لٹکنے دی جائے گی تا کہ یہ عبرت خیز منظر جرائم پیشہ لوگوں کے لیے سامانِ عبرت وموعظت بن سکے۔(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع،فصل في حكم قطع الطريق:۹/۳٦٦

(۲) المغني،نفي المحاربين وتشريدهم،رقم (۷۳۲٦):۱۰/۳۰۷،بداية المجتهد،الباب الثالث في مايجب على المحارب:۲/۸۱٤،بدائع الصنائع،فصل في حكم قطع الطريق:۹/۳۷۰

(۳) الدر المختار مع رد المحتار،كتاب السرقة،باب قطع الطريق:٦/۸۷،۱۸٦،بدائع الصنائع،فصل في حكم قطع الطريق:۹/۳۷۰

قطع الطریق میں معافی یا سفارش کا حکم:

فقہائے کرام کے ہاں مذکورہ حد "حدود اللہ" میں سے ہے، اس لیے متاثرہ لوگوں کو معاف کرنے، بری کرنے، یا صلح کرنے سے یہ سزا معاف نہیں ہوسکتی، بلکہ خود امیر و قاضی کو بھی جرم ثابت ہونے کے بعد معاف کرنے کا حق نہیں۔(۱)

راہ زنی کے دوران کسی کو زخمی کرنے کا حکم:

اگر راہ زنی کے دوران کوئی شخص محض زخمی ہوا ہو اور اس راہ زنی کے بدلے راہ زن پر قتل، سولی یا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا جاری ہو جائے تو یہی سزا زخموں کے لیے بھی سمجھی جائے گی۔ اور اگر مذکورہ سزاؤں میں سے کوئی بھی سزا نافذ نہ ہو سکے یعنی رہ زنی کے دوران مال لینے یا قتل کی نوبت نہ آئی ہو یا مال لیا ہو، مگر نصاب سے کم ہو تو اس صورت میں زخم کے بدلے قصاص یا دیت واجب ہوگی اور مال کے بدلے ضمان واجب ہوگا۔(۲)

مال کا حکم:

مجرم پر حد کے اجرا کے بعد اگر لوٹا گیا مال بعینہٖ موجود ہو تو بالاتفاق مالک کو لوٹایا جائے گا، اگرچہ فی الوقت وہ مال کسی اور کے پاس ہو، اور اگر اس کے پاس سے ضائع ہو گیا ہو تو ضمان نہیں، البتہ اگر اس نے خود ہلاک کیا ہو تو دیانۃً اس پر ضمان ہے، قضاءً نہیں۔

اور اگر قاطع پر کسی وجہ سے حد جاری نہ ہو سکے تو وہ بہر صورت لوٹے گئے مال کا ضامن ہے۔ اگر بعینہٖ وہی مال موجود ہو تو وہی لوٹا دے، ورنہ اس کا تاوان ادا کر دے اگرچہ وہ خود ہلاک ہو گیا ہو۔(۳)

حد قطع الطریق کون جاری کرے گا؟

حد جاری کرنے کا حق صرف امام یا اس کے نائب کو ہے، مال کے مالکان اور مقتول کے اولیا کے مطالبے کا اس میں کوئی اعتبار نہیں، اس لیے کہ یہ حقوق اللہ میں سے ہے۔ البتہ امام شافعیؒ کے ہاں آقا اپنے غلام پر امام کی تولیت

(۱) بدائع الصنائع، فصل في صفات هذا الحكم: ۳۷۱/۹

(۲) الدر المختار على صدر ردالمحتار، كتاب السرقة، باب قطع الطريق: ۱۸۷/۶، ۱۸۸، بدائع الصنائع، فصل في صفات هذا الحكم: ۳۷۱/۹

(۳) الدر المختار مع ردالمحتار، كتاب السرقة، باب كيفية القطع وإثباته: ۱۸۰/۶، بدائع الصنائع، فصل في الحكم الذي يتعلق بالمال: ۳۷۵/۹

کے بغیر بھی حد جاری کرسکتا ہے۔(۱)

کن صورتوں میں حرابہ کی سزا معاف ہو جاتی ہے؟

شریعت میں جن جرائم پر سزائیں (حدود) مقرر کی گئی ہیں، ان میں اس جرم کی خاص بات یہ ہے کہ اگر گرفتاری سے پہلے مجرم تائب ہو جائے تو اس کی توبہ قبول کی جاتی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ﴾(۲)

مگر جو لوگ توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔

علامہ کاسانیؒ کے ہاں ایسی پانچ صورتوں میں حد ساقط ہو جاتی ہے۔

(۱) رہ زن جس شخص کے بارے رہ زنی کا اقرار کردے، وہ شخص رہ زنی کا انکار کردے کہ مجھے تو کسی نے نہیں لوٹا۔

(۲) جرم اقرار سے ثابت ہو اور مجرم اپنے اقرار سے منحرف ہو جائے۔

(۳) جرم پر جو شہادتیں پیش ہوگئی ہوں، خود وہ شخص ان کی تکذیب کردے جس کے ساتھ رہ زنی کا واقعہ پیش آنے کی گواہی دی گئی ہو۔

(۴) قاضی کے ہاں معاملہ پیش ہونے سے پہلے یا بعد میں راہ زن کا لوٹے گئے مال کا مالک بننا۔

(۵) گرفتاری اور قدرت سے پہلے راہ زن تائب ہو جائے۔(۳)

حد ساقط ہونے کے بعد راہ زن کے احکام:

(۱) اگر صرف مال لیا تھا تو وہ مال واپس کردے گا اور اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

(۲) صرف ڈرایا دھمکایا تھا تو قید کی سزا بھی نہ دی جائے گی۔

(۳) اگر قتل کا مرتکب تھا تو بطور حد کے قتل نہ کیا جائے گا، البتہ مقتول کے اولیا کی مرضی پر منحصر ہوگا، اگر وہ چاہیں تو بطور قصاص قتل کرلیں یا دیت لے لیں۔ہاں اگر قابو میں آنے کے بعد توبہ کرے تو پھر دنیوی احکام کے اعتبار سے اس کی توبہ معتبر نہیں ہوگی، بلکہ اس پر حد جاری کی جائے گی۔(۴)

❁❁❁

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل في بيان من يقيم هذا الحكم:۹/۳۷۲

(۲) المائدة:۳٤　　(۳) بدائع الصنائع، فصل في بيان مايسقط هذا الحكم:۹/۳۷۲

(٤) بدائع الصنائع، كتاب قطاع الطريق،فصل في حكم سقوط الحد بعد الوجوب:۹/۳۷۳،۳۷٤

باب حد الزنا

(مباحث ابتدائیہ)

تعارف اور حکمت مشروعیت:

اسلام میں عصمت وعفت اور پاک بازی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔اسی لیے اسلام نے اُن دروازوں کو بھی بند کرنے کی سعی کی ہے جو انسان کو بے حیائی اور بدکاری تک لے جاتے ہیں۔فرمانِ خداوندی ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾(۱)

زنا کے قریب بھی مت جاؤ، بلاشبہ یہ بڑی ہی بے حیائی کی بات اور بری راہ ہے۔

شریعت اسلامی میں اس کی اتنی مذمت کی گئی ہے کہ اس کو شرک اور قتل کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے۔(۲)اسی لیے شریعت نے تمام جرائم میں سخت ترین سزا زنا کی مقرر کی ہے جو غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے اور شادی شدہ کے لیے سنگساری (رجم) ہے۔

زنا کی فقہی تعریف:

زنا زندہ عورت کی شرم گاہ میں، اپنے اختیار کے ساتھ، دار الاسلام میں، ایسے شخص کے وطی کرنے کا نام ہے جس نے اپنے آپ پر احکام اسلام کا التزام کیا ہو، یعنی مسلمان ہوا ہو، ایسی عورت کے ساتھ جو نہ اس کی ملکیت ہو، نہ ملکیت کا شبہ ہو، نہ اس پر کسی درجہ میں حق ملکیت ہو، نکاح اور شبہ نکاح سے بھی عاری ہو، نیز نکاح اور ملکیت کا شبہ اشتباہ بھی نہ پایا جاتا ہو۔(۳)

تعریف کی رو سے درج ذیل صورتوں پر زنا کا اطلاق نہیں ہوگا، یعنی اِن صورتوں میں حد جاری نہیں ہوگی، اگر چہ شدید گناہ اور تعزیر اِن صورتوں میں بھی ہے۔قاضی اپنی صواب دید پر ان کو سخت سزا بھی دے سکتا ہے۔

(۱)اجنبی عورت سے غیر فطری راستہ سے صحبت کی جائے، لیکن صحیح قول کے مطابق اس میں بھی حد واجب ہوگی۔

(۲)زنا کرنے والا بچہ یا مجنون ہو۔اس صورت میں عورت پر بھی حد نہیں ہوگی۔

(۳)مرد یا جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو گناہ شدید ہے، مگر حد زنا نہیں۔

---

(۱) الاسراء: ۳۲　　(۲) الفرقان: ۶۸، ۶۹

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في سبب وجوبها: ۹/۱۷۸

(۴)مردہ عورت کے ساتھ بدکاری کرنے سے حد واجب نہیں ہوتی۔

(۵)اکراہ کے تحت زنا کرنے والے پر حدِ زنا نہیں۔

(۶)دارالحرب اور دارالبغی میں زنا سے حد واجب نہیں ہوتی۔

(۷)حربی مستأمن اگر دار الاسلام میں زنا کرلے تو امام ابو یوسفؒ کے ہاں اُس پر بھی ذمی کی طرح حد واجب ہوگی، تاہم امام ابوحنیفہؒ و محمدؒ کے ہاں اُس پر حد نہیں۔(۱)

(۸)عورت اس کی مملوکہ ہو یا اس میں ملکیت کا شبہ ہو۔

(۹)عورت اس کی منکوحہ ہو یا اس میں نکاح کا شبہ ہو۔(۲)

(۱۰)دواعی جماع کے ارتکاب پر حدِ زنا واجب نہیں۔زنا کے تحقق کے لیے کم از کم آلۂ تناسل کا کچھ حصہ (حشفہ یا اس کے بقدر حصہ) اندر داخل ہونا ضروری ہے۔(۳)

(۱۱)زنا کرنے والے کو زنا کی حرمت کا علم نہ ہو، تاہم یہ حکم اُس شخص کے لیے ہے جو ابھی مسلمان ہوا ہو یا مسلمانوں سے دور کسی صحرا وغیرہ میں رہتا ہو۔دارالاسلام میں رہنے والے شخص کے لیے یہ عذر نہیں بن سکتا۔(۴)

محارم سے نکاح کا حکم:

حنفیہ کے راجح قول کے مطابق محارم نسبیہ اور رضاعیہ سے نکاح، چار بیویوں کے ہوتے ہوئے پانچویں سے نکاح، اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے اُس کی بہن یا ماں سے نکاح کرنا موجبِ حد ہے۔اگرچہ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں یہاں کچھ نہ کچھ شبہ کی وجہ سے حد جاری نہیں ہوگی، بلکہ تعزیر ہوگی۔(۵)

(۱) خلاصة الفتاوى، كتاب الحدود، الفصل الثاني في الزنا:٤/٤٤٥، بدائع الصنائع، كتاب الحدود، فصل في سبب وجوبها:٩/١٨٣ـ١٨٨، الفتاوى الهندية، كتاب الحدود، الباب الثاني في الزنا:٢/١٤٣

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الحدود، فصل في سبب وجوبها:٩/١٨٩ـ١٩٠

(۳)الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الحدود، مطلب: أحكام الزنا و مطلب: الزنا شرعا لا تحقق بما يو جب الحد بل أعم: ٦/٥، الفتاوى الهندية، كتاب الحدود، الباب الثاني في الزنا:٢/١٤٣

(٤)الفتاوى الهندية، كتاب الحدود، الباب الثاني في الزنا:٢/١٤٣، الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الحدود، تحت قوله: وزاد في المحيط......الخ:٦/٨٠٧

(٥) بدائع الصنائع، كتاب الحدود، فصل في سبب وجوبها:٩/١٩٠، خلاصة الفتاوى، كتاب الحدود، الفصل الثاني في الزنا:٤/٤٤٥

زنا کا رکن:

حنفیہ کے ہاں مرد کے عضو کا عورت کے عضو کے ساتھ مل جانا (التقاء الختانین) اور کم از کم مرد کے آلہ تناسل کا کچھ حصہ (حشفہ یا مقطوع الحشفہ کے لیے اس کے بقدر) اندر داخل ہو جانا زنا کا رکن ہے۔(۱)

ثبوتِ زنا کے ذرائع اور ان کے لیے شرائط:

زنا کے ثبوت کے دو ذرائع ہیں: بیّنہ اور اقرار۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے پھر الگ الگ شرائط ہیں۔ نفسِ زنا اور زانی سے متعلق جو شرائط تھے، ان کا تذکرہ تعریف کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

شہادتِ زنا کی شرائط:

(۱) گواہ سب کے سب مرد ہوں۔

(۲) گواہی بلا واسطہ ہو، بالواسطہ اور سنی ہوئی گواہی معتبر نہیں اور نہ ہی حد شہادت علی الشہادت یا کتاب القاضی الی القاضی کا اعتبار ہے۔(۲)

(۳) چار مرد گواہ ہوں۔

(۴) تمام گواہوں کا ایک ہی مجلس میں گواہی دینا شرط ہے۔

(۵) گواہی میں تقادم نہ ہو، تقادم سے مراد یہ ہے کہ معاملہ پرانا اور قدیم نہ ہو گیا ہو۔ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں اس کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں، بلکہ قاضی کی صواب دید پر ہے۔ تاہم صاحبین کے ہاں ایک ماہ یا اس سے زیادہ کی مدت میں تقادم ہو جاتا ہے، یعنی اتنی مدت گزرنے کے بعد ان تین قسم کے مجرموں کے خلاف گواہی درست نہیں۔(۳)

(۶) شہادت میں تفصیل ہو، یعنی تمام گواہ زنا کی کیفیت بیان کریں گے کہ فلاں دن، فلاں وقت، فلاں جگہ، فلاں مرد نے فلاں عورت کی شرم گاہ میں آلۂ تناسل اس طرح داخل کیا جس طرح سرمہ دانی میں سلائی داخل کی جاتی ہے۔(۴)

(۷) مشہود علیہ زنا پر قادر ہو، لہٰذا مجبوب، یعنی مقطوع الذکر شخص کے خلاف شہادتِ زنا درست نہیں۔

(۸) مشہود علیہ اپنے دفاع پر قادر ہو، لہٰذا گونگے کے خلاف زنا کی شہادت درست نہیں۔

---

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الحدود، الباب الثاني في الزنا: ۱٤۳/۲

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في بیان ما تظهر به الحدود عند القاضي: ۲۲۹/۹

(۳) أيضاً: ۲۳۰/۹

(٤) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الحدود: ۹۰۸/٦

(۹) تمام گواہ ایک ہی وقت، ایک ہی زمان اور ایک ہی زنا کے متعلق گواہی دیں۔ اگر وہ ملزم کے متعلق الگ الگ واقعات کی گواہی دیں تو یہ گواہی معتبر نہیں، تاہم گواہوں پر بھی حدِ قذف واجب نہیں۔

(۱۰) قاضی تمام گواہوں سے زنا کی تعریف، وقت، مکان اور مزنیہ عورت کے متعلق پوچھے گا۔ ممکن ہے وہ کسی مغالطے میں پڑ کر کسی اور فعل کو زنا سمجھ بیٹھے ہوں۔(۱)

زنا کی شہادت کو چھپانا زیادہ مناسب اور بہتر ہے، تاہم اگر مجرم عادی ہو اور معاشرے کے لیے بگاڑ کا سبب بن رہا ہو تو اس صورت میں گواہی دینا بہتر ہے۔(۲)

اقرار کے لیے شرائط:

(۱) اقرار کرنے والا بالغ ہو۔

(۲) اقرار زبان کے ذریعے ہو، اشارے یا کتابت کے ذریعے اقرار معتبر نہیں۔

(۳) حنفیہ کے ہاں اقرار چار مرتبہ ہو۔

(۴) چار مختلف مجالس میں اقرار کرلے، ایک ہی جگہ چار مرتبہ اقرار کرنا موجبِ حد نہیں۔

(۵) اقرار چاروں مرتبہ قاضی کے سامنے ہو۔

(۶) اقرار کرتے وقت اس کے حواس درست ہوں۔ اگر کسی شخص نے نشے کی حالت میں زنا، چوری یا شراب نوشی کا اقرار کیا تو یہ درست نہیں، بخلاف قتلِ عمد اور حدِ قذف کے اقرار کے، اس لیے کہ یہ دونوں حقوق العباد میں سے ہیں۔

(۷) زنا کا اقرار کرنے والا زنا کے قابل ہو۔

(۸) جس کے ساتھ زنا کا اقرار کر رہا ہو، وہ گونگا نہ ہو، تاہم مزنیہ عورت (جس کے ساتھ زنا کا اقرار ہوا ہو) کو جاننا اور اُس کو مجلس میں حاضر کرنا ضروری نہیں۔ اسی طرح تقادم بھی کسی اقرار کے لیے مانع نہیں۔(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في بيان ما تظهر به الحدود عند القاضي:۹/۲۲۹۔۲۳۵، الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الحدود:۶/۸۔۱۰، الشرح الصغير على المغني، لابن عكرمة، موفق الدين عبد الله بن أحمد، كتاب الحدود، إذا قذف بالغ حراً مسلماً أو حرة مسلمة(رقم:۷۲۰۹):۱۰/۱۹۲۔۱۹۴، المكتبة المكة المكرمة التجارية، الفتاوى الهندية، كتاب الحدود، الباب الخامس في الشهادة على الزنا والرجوع عنها:۲/۱۵۲،۵۳

(۲) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الحدود: ۶/۱۰

(۳) بدائع الصنائع، كتاب الحدود، فصل في بيان ماتظهر به الحدود عند القاضي:۹/۲۳۶۔۲۳۹

حدِ زنا:

اسلام نے زنا کی سزا میں محصن اور غیر محصن، یعنی شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کا فرق کیا ہے۔ زنا کرنے والا اگر غیر شادی شدہ آزاد (مرد یا عورت) ہو تو اُس کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور اگر غلام (مرد یا عورت) ہو تو نصف، یعنی پچاس کوڑے لگائے جائیں گے۔ اور اگر وہ محصن، یعنی شادی شدہ ہو تو اس کو سنگسار (رجم) کیا جائے گا۔ فقہائے کرام کے ہاں احصانِ رجم کے لیے درج ذیل امور ضروری ہیں:

(۱) زنا کرنے والا عاقل ہو۔ (۲) بالغ ہو۔ (۳) مسلمان ہو۔ (۴) آزاد ہو۔

(۵) کسی عورت سے نکاحِ صحیح ہو گیا ہو۔ (۶) منکوحہ سے بطریقہ شرعی دخول ہو گیا ہو۔

(۷) منکوحہ سے ہم بستر ہوتے وقت دونوں (شوہر، بیوی) حریت، عقل، بلوغ اور اسلام کی حالت میں ہوں۔

ان شرائط میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو تو ایسے شخص کو سنگسار نہیں کیا جائے گا۔(۱)

کوڑے لگانے کا طریقہ:

کوڑہ گرہ دار نہ ہو، مناسب حجم اور ضخامت کا ہو، بدن کے نازک اعضا (چہرہ، شرم گاہ اور سر) کو چھوڑ کر الگ الگ اعضا پر مناسب طریقے سے مارا جائے، مرد کو کھڑا کر کے صرف شلوار میں جب کہ عورت کو مناسب اور باپردہ کپڑوں میں بٹھا کر مارا جائے۔(۲)

رجم کرنے کا طریقہ:

عورت کے لیے سینے تک گڑھا کھود دیا جائے اور اس میں بٹھا کر رجم کیا جائے۔ مرد پر کھڑے کھڑے سزا جاری ہوگی۔ باندھنے، گھڑا کھودنے یا لٹانے کی ضرورت نہیں۔ رجم کھلی فضا میں لوگوں کے سامنے کرنا مناسب ہے۔ پتھر مارنے کی ابتدا گواہوں سے ہوگی، پھر قاضی سے، اس کے بعد دوسرے لوگ ماریں گے۔ یہاں تک کہ مر جائے۔ اگر گواہوں نے بغیر عذر کے پتھر مارنے سے انکار کر دیا یا وہ غائب ہو گئے تو اس صورت میں رجم ساقط ہو جائے گا۔(۳)

❁❁❁❁❁

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الحدود، الباب الثالث في كيفية الحدود وإقامته:۲/۱٤٥، بدائع الصنائع، كتاب الحدود، فصل في الإحصان:۹/۱۹٦، الدر المختار على صدرود المحتار، كتاب الحدود:٦/۱۳-۱۷

(۲) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الحدود:٦/۱۷، ۱۸

(۳) بدائع الصنائع، فصل في شرائط جواز إقامتها:۹/۲٦۰، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الحدود:٦/۱۳-۱۹

باب حدّ السرقة

(مباحثِ ابتدائیه)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

شریعتِ مطہرہ میں انسانی جان کی طرح مال کو بھی تحفظ اور احترام حاصل ہے۔قرآن کریم نے ناجائز طریقوں سے ایک دوسرے کا مال کھانے سے منع فرمایا ہے۔(۱)اِن ناجائز طریقوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ مالک کی رضامندی سے مال حاصل کیا جائے،لیکن حصول کا طریقہ شریعت کے مخالف ہو،مثلاً:سود،جوا وغیرہ۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حاصل کیا جائے۔اس صورت میں اگر مالک سے چھپا کر کوئی طریقہ اختیار کیا جائے تو سرقہ ہے اور اگر علانیہ طور پر زبردستی لے لے تو غصب ہے۔شریعتِ مطہرہ میں ہر ایک کے لیے الگ الگ حکم ہے،تاہم مالک کی رضامندی کے بغیر کسی کے مال چھپانے پر ہاتھ کاٹنے کی جو سزا ہے،اس کو حدِ سرقہ کہتے ہیں۔

سرقہ کی لغوی تحقیق:

سرقہ کا لغوی معنی ہے کسی سے کوئی چیز چھپا کر لے لینا یا حیلہ اور دھوکہ کر کے کوئی چیز حاصل کر لینا۔(۱)

اصطلاحی تعریف:

فقہائے کرام نے سرقہ کی حرمت کے اعتبار سے اس کی الگ تعریف کی ہے اور اس پر واجب ہونے والی حد کے اعتبار سے الگ تعریف کی ہے۔ہر ایک ملاحظہ ہو:

حکم (حرمت) کے اعتبار سے سرقہ کی تعریف:

"هو أخذ الشيء من الغير علىٰ وجه الخفية بغير حق سواء كان نصابا أم لا."

دوسرے کا مال ناحق طریقے سے،چھپا کر لے لینا،چاہے نصابِ سرقہ کے برابر ہو یا نہ ہو۔

شرعی حد کے اعتبار سے حکم:

"هي أخذ مكلف، ناطق، بصير عشرة دراهم أو مقدارها، مقصودة بالأخذ، ظاهرة الإخراج، خفيةً، من صاحب يد صحيحة، مما لا يتسارع إليه الفساد، في دارالعدل

(۱) لسان العرب،مادة سرق:۲٤٦/٦، البحرالرائق،أول كتاب السرقة: ٨٤/٥،دار الكتب العلمية بيروت

من حرز، بمرة واحدة، لا شبهة ولا تاويل فيه".(۱)

سرقہ مکلف (عاقل بالغ)، گویائی پر قادر اور بینا شخص کا دس دراہم یا اس کی مقدار میں مال بالارادہ لے لینا ہے، (اس طور پر کہ) اپنے محفوظ مکان سے ظاہری طور پر باہر لے جایا گیا ہو، خفیہ طور پر ہو، ایسے شخص سے چھپا کر لیا گیا ہو جس کو جائز اور شرعی حق ملکیت یا تصرف حاصل ہو، ایسی چیز ہو جو جلدی خراب نہ ہو، (واردات مذکورہ) دارالاسلام میں ہو، باقاعدہ محفوظ مال ہو، (نصاب کے بقدر مال کو) ایک ہی مرتبہ میں اپنے مکان سے باہر لایا گیا ہو اور اس مال میں چھپانے والے کے لیے نہ ملکیت کا شبہ ہو اور نہ کسی تاویل کی گنجائش ہو۔

کتاب السرقہ کی اصطلاحات:

(۱) سرقہ: چوری کرنا (۲) سارق: چوری کرنے والا

(۳) مسروق: چوری شدہ چیز

(۴) مسروق منہ: جس شخص سے چوری کی جائے

(۵) مسروق فیہ: جس جگہ چوری کی جائے۔(۲)

سرقہ سے ملتی جلتی اصطلاحات اور ان کا حکم:

(۱) اختلاس: یعنی کسی کا مال عیاناً اچک کر بھاگ جانا۔

(۲) انتہاب: یعنی غلبۃً اور قہراً کھلے عام کسی کا مال زبردستی لے لینا۔ انتہاب عموماً پوری جماعت کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

(۳) خیانت: امانت، عاریت یا قرض وغیرہ سے انکار کرنا یا اس میں خرد برد کرنا۔

مذکورہ تینوں صورتوں میں درج ذیل حدیث کی رو سے قطع ید کا حکم نہیں ہوگا:

ليس على خائن ولا منتهب ولا مختلس قطع.(۳)

---

(۱) الدرالمختار على صدر رد المحتار، كتاب السرقة:٦/١٣٧ـ١٤٣، البحرالرائق، كتاب السرقة:٥/٨٤

(۲) بدائع الصنائع، كتاب السرقة، حاشية (۱):٩/٣٧٥، الموسوعة الفقهية، مادة(سرقة):٢٤/٢٩٣ـ٢٩٥

(۳) سنن الترمذي، أبواب الحدود عن رسول الله ﷺ، باب ما جاء في الخائن والمختلس والمنتهب:١/٤٠١، الدرالمختار على صدر رد المحتار، كتاب السرقة:٦/١٥٦، الاختيار للموصلي، عبدالله بن محمود، كتاب السرقة: ٤/١٠٨، الهداية مع فتح القدير، كتاب السرقة، باب ما يقطع فيه ومالا يقطع: ٥/١٣٦

(٤)حرابة یا قطع الطریق: ڈاکہ زنی، یعنی اسلحے اور دبدبے کا سہارا لے کر راستے پر چلنے والے لوگوں کو زدوکوب کرنا اور ان سے مال چھین لینا۔اس کا حکم سرقہ سے زیادہ سخت ہے جس کی تفصیل قرآن کریم میں موجود ہے۔(۱)

(٥)غصب: کھلے عام کسی کا حق دبانا یا کوئی چیز ظلماً لے لینا غصب کہلاتا ہے۔اس کے احکام بھی سرقہ سے الگ ہیں۔

(٦)نبش: قبروں سے کفن چوری کرنا۔امام ابوحنیفہؒ و محمدؒ کے ہاں اس پر حدسرقہ کا اطلاق نہیں ہوگا، بخلاف جمہور فقہاء کے، ان کے ہاں یہ بھی سرقہ شمار ہوگا۔(۲)

(٧)نشل یا طرّ: کمالِ مہارت کے ساتھ جاگتے ہوئے شخص کا جیب کترنا یا اس سے سامان نکالنا۔اس کا حکم بھی جمہور فقہا کے ہاں سرقہ کی طرح قطع ید کا ہے۔تاہم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں اس کی چند صورتیں ہیں، جن میں بعض ایسی صورتیں بھی ہیں، جن میں قطع ید نہیں۔(۳)

ثبوتِ سرقہ کے ذرائع:

تمام حدود کی طرح حدسرقہ کے ثبوت کے لیے بھی دو ہی ذرائع ہیں: اقرار اور بینہ۔گواہی میں دو عادل مرد گواہ بلاواسطہ اور بالذات سارق کے خلاف چوری کی گواہی دیں گے، جب کہ عاقل بالغ شخص کے ایک مرتبہ اقرار سے بھی حد سرقہ واجب ہوتی ہے۔امام ابو یوسفؒ و احمدؒ کے ہاں دو علیحدہ مجلسوں میں دو مرتبہ اقرار ضروری ہے۔تاہم یاد رہے کہ تقادم کی صورت میں گواہی کا اعتبار نہیں ہوگا، البتہ اقرار تقادم کے باوجود بھی معتبر ہے۔(۴)

حدسرقہ کا رکن:

حنفیہ کے ہاں سرقہ کا رکن خفیہ طور پر کسی چیز کو اٹھانا ہے۔جمہور فقہا کے ہاں سارق، مسروق منہ، مال مسروق

(۱)المائدة: ۳۳، بدائع الصنائع، کتاب قطاع الطریق، فصل في بیان رکن قطع الطریق: ۹/ ۳۶۰

(۲) شمس الدین السرخسي، المبسوط، کتاب السرقة: ۹/ ۱۵۹، بدائع الصنائع، کتاب السرقة، فصل في ما یرجع إلی المسروق: ۹/ ۳۰۸، رحمة الأمة، لمحمد بن عبد الرحمن الدمشقي، کتاب السرقة، فصل: ص۲۹۳، دار الکتب العلمیة

(۳)المبسوط، کتاب السرقة: ۹/ ۱۶۰، ۱۶۱، الهدایة مع الفتح القدیر، کتاب السرقة، فصل في الحرز والأخذ منه: ۵/ ۱۵۰، ۱۵۱، المغني، باب القطع في السرقة، فصل: سرقات مختلفة وأحکامها، رقم (۷۲۷۱): ۱۰/ ۲۵۷، بدائع الصنائع، کتاب السرقة فصل في ما یرجع إلی المسروق: ۹/ ۳۰۸

(۴)الهدایة مع فتح القدیر، کتاب السرقة، قبیل باب ما یقطع فیه وما لا یقطع: ۵/ ۱۲۵، ۱۲۶، بدائع الصنائع، کتاب السرقة، فصل في ما تظهر به السرقة: ۹/ ۳۲۵، ۳۲۶، البحر الرائق، کتاب السرقة، تحت قوله: (فیقطع إن أقر مرة أو شهد رجلان): ۵/ ۸۷، ۸۸

اور صفت اَخذ چاروں سرقہ کے ارکان ہیں۔ مأل اورانجام دونوں اقوال کا ایک ہی ہے۔(۱)

حدِ سرقہ کے لیے شرائط:

یہ شرائط چار قسم کی ہیں: سارق سے متعلق، مالِ مسروق سے متعلق، مسروق منہ (مالک) سے متعلق اور مسروق فیہ (مکانِ سرقہ) سے متعلق۔

سارق سے متعلق شرائط:

(۱) چوری کرنے والا عاقل ہو۔

(۲) بالغ ہو۔

(۳) گویائی پر قادر ہو۔

(۴) بینا، یعنی صاحبِ بصارت ہو۔(۲)

(۵) نشے میں نہ ہو۔ جمہور فقہا کے ہاں اگر کوئی شخص حد سے بچنے کے لیے نشے کو ڈھال بنا کر چوری کرنے کا عادی بن رہا ہو تو سداًللذرائع اس پر حد جاری ہوگی، البتہ بغیر نیت وارادے کے نشے میں چوری کرلی تو حد واجب نہیں۔(۳)

(۶) سارق وہ شخص ہو جس نے اپنے آپ کو احکامِ اسلامی کا پابند بنایا ہو، چنانچہ مسلمان اور ذمی پر بالاتفاق حد واجب ہوگی، البتہ مستأمن پر امام ابوحنیفہ ومحمدؒ کے ہاں حد نہیں ہوگی، امام ابویوسفؒ اور جمہور فقہا کے ہاں واجب ہوگی۔(۴)

(۷) چوری کرنے والا بااختیار ہو، مکرَہ نہ ہو۔(۵)

(۸) چوری مجبوری اور اضطراری حالت میں نہ کی ہو، مثلاً: اگر وہ چوری نہ کرتا تو ہلاک ہوجاتا۔(۶)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب السرقة، فصل في ركن السرقة:۹/۲۷۵، الموسوعة الفقهية، مادة سرقة:۲۴/۲۹۵

(۲) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب السرقة:۶/۱۴۰

(۳) الموسوعة الفقهية، مادة سرقة:۲۴/۲۷۶

(٤) الشرح الكبير على المغني، باب القطع في السرقة، مسألة حكم مالو أخرج النباش...، رقم (۷۲۹۵):۱۰/۲۷۶

(٥) بدائع الصنائع، کتاب الإكراه، أما بيان مايقع عليه الإكراه:۱۰/۱۱۲

(٦) المغني، باب القطع في السرقة، حكم من سرق في المجاعة، رقم(۷۳۰۷):۱۰/۲۸٤، المبسوط، للسرخسي، کتاب السرقة:۹/۱٤۰

(۹) چوری کرنے والے کو چوری کی حرمت کا علم ہو (یعنی کوئی صحرائی مسلمان یا نومسلم نہ ہو) یہ بھی علم ہو کہ میں جو کچھ اُٹھا رہا ہوں کسی اور کا ہے اور یہ اُٹھانا بھی چوری کے طریقے پر ہو، نہ کہ عاریت یا دوستی میں بے تکلفی کے طور پر، تاہم ان تمام باتوں کا علم قرائن سے ہوگا۔(۱)

☆ سارق کے لیے مرد ہونا، آزاد ہونا یا مسلمان ہونا شرط نہیں۔(۲)

☆ مسروقہ سے متعلق شرائط:

(۱) مسروقہ چیز عرفاً مال ہو، یعنی اس کی مالیت میں کوئی کمی یا شبہ نہ ہو، لہٰذا عرف میں جن چیزوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہو، بلکہ مباح سمجھے جاتے ہوں، جیسے: گھاس، مچھلی، پرندے وغیرہ تو ان کے چرانے سے حد واجب نہیں ہوگی، تاہم ان اشیا میں عرف ہی پر فیصلہ ہوگا۔(۳)

(۲) مال شرعاً متقوم ہو، لہٰذا شراب چرانے سے حد واجب نہیں ہوتی۔(۴)

(۳) مال محفوظ ہو، یعنی عرف میں حفاظت کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہوں، وہ موجود ہوں، لہٰذا مسجد کے دروازے یا عوامی جگہوں سے چوری کرنا موجبِ حد نہیں۔(۵)

(۴) اس مال کا لینا مقصود ہو، لہٰذا جو چیز تابع کی حیثیت سے چوری ہو جائے، اس کے بدلے ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، مثلاً: دس درہم سے کم قیمت کا کپڑا چرا رہا تھا، چرانے کے بعد اس میں اتفاقاً سونا چاندی نکل آیا، البتہ اگر عرف میں اس چیز کے اندر دراہم و دنانیر ہی رکھے جاتے ہوں تو اب ہر صورت میں قطع ید کا حکم ہوگا۔(۶)

---

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة سرقة: ۲۹۷/۲٤، ۲۹۸

(۲) الدرالمختار على صدرردالمحتار، كتاب السرقة: ۱۳۷/٦، بدائع الصنائع، كتاب السرقة، فصل في شروط الركن قبيل فصل فيما يرجع إلى المسروق: ۲۸٤/۹

(۳) بدائع الصنائع، كتاب السرقة، فصل في ما يرجع إلى المسروق: ۲۸٤/۹، الهداية مع فتح القدير، كتاب السرقة، باب ما يقطع فيه ومالا يقطع: ۱۲۸/٥

(٤) بدائع الصنائع، فصل في مايرجع إلى المسروق: ۲۹۲/۹، الدر المختار على صدرردالمحتار، كتاب السرقة: ۱٤۲/٦

(٥) الهداية مع فتح القدير، باب مايقطع فيه وما لا يقطع: ۱۳۲/٥، فصل في الحرز و الأخذ منه: ۱٤٦/٥، بدائع الصنائع، كتاب السرقة، فصل في مايرجع إلى المسروق: ۳۰۰/۹، الدرالمختار مع رد المحتار، كتاب السرقة: ۱٤۲/٦، ۱٤۳

(٦) الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب السرقة، ۱٤۱/٦، بدائع الصنائع، كتاب السرقة، فصل في ما يرجع إلى المسروق: ۳۲۱/۹، فتح القدير، كتاب السرقة، باب مايقطع فيه وما لا يقطع: ۱۳٥/٥

(۵) وہ مال دیر تک باقی رہ سکتا ہو، جلد خراب ہونے والی اشیاء، درخت پر لگے ہوئے پھل اور کھیت میں موجود فصل کی چوری موجب حد نہیں۔(۱)

(۶) مال کو محفوظ مکان سے نکالا ہو، اگر اسی جگہ کوئی چیز کھالی یا نگل لی تو حد واجب نہیں، البتہ ضمان ہوگا۔(۲)

(۷) مال میں سارق کو کسی قسم کی شرکت یا ملک کا شبہ نہ ہو، لہٰذا بیت المال یا شرکت کے مال سے چوری کرنا موجبِ حد نہیں۔(۳)

(۸) مال چوری ہوتے وقت اور حد جاری ہوتے وقت دونوں صورتوں میں نصابِ سرقہ کے بقدر ہو۔(۴)

(۹) نصاب کے بقدر مال کو ایک ہی مرتبہ چوری کر کے باہر نکالے، اگر ایک ہی جگہ سے متعدد افعال کے ذریعے بقدرِ نصاب چوری کی تو قطع ید نہیں۔(۵)

مسروق منہ سے متعلقہ شرائط:

(۱) جس شخص سے مال چوری ہو، اس کا مال پر قبضہ شرعاً درست ہو۔ قبضہ سے مراد جائز تصرف کا حق ہے، لہٰذا مستودع، مستعیر، مستاجر، مضارب، قابض علی سوم الشراء، مرتهن، متولی وقف، والد، وصي سب کو اصل مالک کی طرح سارق سے خصومت کا حق ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص سے غصب یا سود کا مال چوری ہوا یا سارق سے (قطع ید نہ ہونے کی صورت میں) کسی اور نے چوری کا مال چرالیا تو ان سب کو مطالبہ حد کا حق حاصل ہے، اس لیے کہ ان تینوں پر غصب شدہ، سود میں لیا گیا اور چوری شدہ مال مضمون اور قابلِ تاوان ہے۔(۶)

(۲) مال کا اصل مالک معلوم ہو اور اُس کی طرف سے دعوائے حد اور خصومت پائی جائے، چاہے مقدمہ اقرار کے ذریعے چل رہا ہو یا گواہی کے ذریعے۔

(۱) الدر المختار، کتاب السرقة، ۱٤۲/٦، فتح القدیر، کتاب السرقة، باب ما یقطع فیه وما لا یقطع: ۱۳۰/٥، ۱۳۱

(۲) الدر المختار، کتاب السرقة: ۱٤۱/٦، الهدایة مع فتح القدیر، کتاب السرقة، فصل في الحرز و الأخذ منه: ۱٤۷/۷

(۳) الهدایة مع فتح القدیر، کتاب السرقة، باب ما یقطع فیه و ما لا یقطع: ۱۳۸/٥، ۱۳۹، بدائع الصنائع، کتاب السرقة، فصل في ما یرجع إلی المسروق: ۲۹۲/۹

(٤) بدائع الصنائع، کتاب السرقة، فصل في ما یرجع إلی المسروق: ۳۲۱/۹

(٥) الدرالمختار علی صدرِ رد المحتار، کتاب السرقة: ۱٤۳/٦

(٦) الدرالمختار علی صدر رد المحتار، کتاب السرقة: ۱٤۲/٦، فتح القدیر، کتاب السرقة، فصل في کیفیة القطع و إثباته: ۱٥۹/٥ ـ ۱٦۲، بدائع الصنائع، کتاب السرقة فصل في المسروق منه، وفصل في ما تظهر به السرقة: ۳۲۳/۹ ـ ۳۲٤

(۳) ہاتھ کاٹتے وقت مسروق منہ بذاتِ خود موجود ہو۔(۱)

(۴) مسروق منہ سارق کے اصول وفروع، زوج یا ذورحم محارم میں سے نہ ہو۔(۲)

(۵) مسروق منہ معصوم المال، یعنی مسلمان یا ذمی ہو، حربی یا مستامن سے چوری کرنا موجبِ حد نہیں۔(۳)

مکانِ سرقہ (مسروق فیہ) سے متعلقہ شرط:

جس جگہ چوری کی گئی ہو، وہ دارالاسلام ہو، لہٰذا اگر مسلمان تاجروں نے دارالحرب یا دارالبغی میں ایک دوسرے سے چوری کرلی یا مسلمانوں نے دھاوا بول کر دارالحرب میں لوٹ مار یا چوری کی یا حربیوں نے مسلمانوں کے لشکر میں چوری کی تو کسی پر بھی حد جاری نہیں ہوگی، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے اموال میں اباحت اور غنیمت کا گمان ہوتا ہے۔(۴)

سرقہ کی مقدار:

حنفیہ کے ہاں سرقہ کی مقدار دس دراہم یا اس کے بقدر کسی چیز کا چرانا ہے۔(۵)

موجودہ دور کے حساب سے دس درہم کی مقدار ۳۱،۵ ماشہ چاندی یا ۳۰،۶۱۸ گرام چاندی ہے۔(۶)

سرقہ کی سزا:

سرقہ کی سزا خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (۷)

---

(۱) الهداية مع فتح القدير، كتاب السرقة،فصل في كيفية القطع و إثباته:٥/١٥٨،١٥٩

(۲) الهداية مع فتح القدير، كتاب السرقة،فصل في الحرز و الأخذ منه:٥/١٤٢،١٤٣، البحر الرائق، كتاب السرقة،فصل في الحرز:٥/٩٦

(۳) الموسوعة الفقهية،مادة سرقة:٢٤/٣٠٦،المبسوط، كتاب السرقة:٦/١٨١

(٤) بدائع الصنائع، كتاب السرقة،فصل في المكان المسروق فيه:٩/٣٢٤،٣٢٥

(٥) بدائع الصنائع، كتاب السرقة،فصل في ما يرجع إلى المسروق:٩/٣١٥

(٦) مفتی محمد شفیع،اوزانِ شرعیہ، رائج الوقت اوزان کے مطابق نقشہ(ضمیمہ مولانا أشرف قریشي):ص:٦٢،ادارة المعارف کراچی

(۷) مائدہ:۳۸

ترجمہ: چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو، یہ ان کے عمل کی سزا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت ہے۔ اللہ تعالیٰ غالب حکمت والے ہیں۔

اہلِ سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پہلی دفعہ سرقہ میں ماخوذ شخص کا دایاں ہاتھ گٹوں سے کاٹا جائے گا اور ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ خون تھم جائے۔ جو شخص دوسری بار اس جرم میں ماخوذ ہو اس کا بایاں پاؤں ٹخنوں سے کاٹا جائے گا۔ اس پر بھی سب کا اتفاق ہے۔(۱)

اگر اس کے بعد تیسری اور چوتھی دفعہ پھر چوری میں پکڑا جائے تو حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک اب مزید ہاتھ پاؤں نہیں کاٹے جائیں گے، جب کہ مالکیہ اور شافعیہ کے ہاں تیسری دفعہ بایاں ہاتھ اور چوتھی مرتبہ دایاں پاؤں کاٹ دیا جائے گا۔ حنفیہ کے ہاں یہ حکم یا تو سیاست اور مصلحت پر مبنی ہے اور یا منسوخ ہے۔(۲)

وہ اسباب جن کی وجہ سے حد سرقہ ساقط ہو جاتی ہے:

(۱) جس شخص کا بایاں ہاتھ پہلے سے کٹا ہوا ہو، اس کا دایاں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

(۲) جس شخص کا دایاں پاؤں کٹا ہوا ہو یا مفلوج ہو، اُس کا بھی دایاں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اور نہ دوبارہ چوری میں دوسرا پاؤں کاٹا جائے گا، بلکہ قید کی سزا دی جائے گی۔(۳)

(۳) سارق خود اقرار کرلے، لیکن مسروق منہ اس کی تکذیب کرلے کہ تم نے مجھ سے چوری نہیں کی ہے۔

(۴) مسروق منہ گواہوں کے متعلق جھوٹ کی نسبت کرے کہ یہ دونوں گواہ جھوٹے ہیں، میرا مال چوری نہیں ہوا۔

(۵) سارق خود اپنے اقرار سے رجوع کرے۔(۴)

(۶) مسروق منہ قطع ید سے قبل مسروق کو ہبہ کردے یا اس کو فروخت کردے یا اُس کو میراث میں مل جائے۔(۵)

(۷) مال مسروق کی قیمت قطع ید سے قبل نصاب سے کم پڑ جائے۔

---

(۱) رحمة الأمة، ص: ۲۹٤

(۲) الدر المختار مع ردالمحتار، کتاب السرقة، باب کیفیة القطع و إثباته: ٦/ ۱۷۰، ۱۷۱، الهداية مع فتح القدير، کتاب السرقة، فصل في کیفیة القطع وإثباته: ٥/ ۱٥۲، ۱٥۳

(۳) الدرالمختار مع ردالمحتار، باب کیفیة القطع و اثباته: ٦/ ۱۷۱، ۱۷۲، المبسوط، کتاب السرقة: ۹/ ۷۷، ۱۷٦

(٤) بدائع الصنائع، کتاب السرقة، فصل في حکم السرقة: ۹/ ۳٥٤

(٥) رحمة الأمة، کتاب السرقة، فصل: ص ۲۹٦

(۸) گواہی سے قطع ید ثابت ہونے کے بعد چور اس مال میں اپنی ملکیت کا دعوی کرے۔(۱)

(۹) مال کا اصل مالک (مسروق منہ) قطع ید کے وقت غائب ہو جائے۔(۲)

(۱۰) قاضی تک معاملہ پہنچ جانے سے قبل مسروق منہ اس کو معاف کر دے یا سارق اس کو مسروقہ مال واپس کر دے۔(۳)

مالِ مسروق کا حکم:

اگر سارق پر کسی وجہ سے حد سرقہ جاری نہ ہو سکے تو اس صورت میں وہ بہر حال مالِ مسروق کا ضامن ہے۔ اگر مالِ مسروق بعینہٖ موجود ہے تو وہی لوٹا دے اور اگر ضائع ہو گیا ہو (قصداً یا خطئاً) تو اس کا ضمان ادا کرنا واجب ہے۔(۴)

اور اگر چور پر سزا نافذ ہو جائے تو اس صورت میں اگر مالِ مسروق موجود ہو تو اسے مالک کو واپس کیا جائے گا اور اگر اس کے پاس سے ضائع ہو گیا تو ضمان نہیں، البتہ اگر اس نے خود ہلاک کیا ہو تو قضاءً کچھ بھی نہیں، البتہ دیانتاً، یعنی اخلاقی اعتبار سے مالک کو تاوان ادا کرنا چاہیے۔(۵)

حد سرقہ نافذ نہ ہونے کی صورت میں تعزیر:

جن صورتوں میں چوری کی سزا، یعنی حد نافذ نہ ہو، ان صورتوں کے بارے میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ سزا سے بالکل بری ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر سزا کا استحقاق کسی وجہ سے مشکوک ہو کر حد جاری نہ ہو سکے تو تعزیر کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔ قاضی اپنی صواب دید سے جرم کی نوعیت کو دیکھ کر مناسب اور معقول سرزنش کر سکتا ہے۔ جرائم کا راستہ

(۱) فتح القدير، كتاب السرقة، فصل في كيفية القطع واثباته: ٥/١٦٣_١٦٥، البحر الرائق، كتاب السرقة، فصل في كيفية القطع واثباته: ٥/١٠٨

(٢) الهداية مع فتح القدير، كتاب السرقة، فصل في كيفية القطع واثباته: ٥/١٦٣_١٦٥، الأختيار، كتاب السرقة: ٤/١٠٥

(٣) الهداية مع فتح القدير، كتاب السرقة، فصل في كيفية القطع واثباته: ٥/١٦٢، بدائع الصنائع، كتاب السرقة، فصل في حكم السرقة: ٩/٣٥٥، الموسوعة الفقهية، ماده سرقة: ٢٤/٣٤٢

(٤) بدائع الصنائع، كتاب السرقة، فصل في حكم السرقة: ٩/٣٥٧

(٥) الدر المختار مع ردالمحتار، كتاب السرقة، باب كيفية القطع اثباته: ٦/١٨٠، فتح القدير، كتاب السرقة، فصل في كيفية القطع واثباته: ٥/١٦٨، ١٦٩، الطرابلسي، علاؤ الدين، معين الحكام، فصل في عقوبة السرقة: ص ٢٢٤

روکنے کے لیے قاضی کو تعزیر کا اختیار حاصل رہتا ہے۔(۱)

چند اہم احکام کا تذکرہ:

☆......قرآن مجید چوری کرنے پر حد واجب نہیں۔(۲)

☆......میزبان کے گھر سے، حمام سے، باجازت داخل ہونے والے گھر سے اور مشترکہ اور عمومی جگہ سے چوری کرنا موجب حد نہیں۔(۳)

☆......اگر کسی چیز کی چوری میں کئی لوگ شریک ہوں اور مال مسروق میں سے سب کو نصاب کے بقدر مل سکتا ہو تو ان سب پر حد جاری ہوگی، البتہ اگر ان کے ساتھ کوئی بچہ، پاگل یا مالک کا ذی رحم محرم بھی ہو تو کسی پر بھی حد جاری نہیں ہوگی۔(۴)

☆......ایک ہی شخص اگر متعدد چوریاں کرے تو اس کے بدلے صرف ایک ہی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ پھر اگر تمام مالکان کے دعوے سے اس کا ہاتھ کاٹا گیا ہو تو چور پر ان کے لیے مسروقہ مال کا تاوان بھی نہیں، البتہ اگر کسی ایک کے دعوے سے ہاتھ کاٹا جائے تو باقی کے لیے مال کا تاوان اس کے ذمہ واجب ہوگا۔(۵)



(۱) الهداية مع فتح القدير، كتاب السرقة، باب مايقطع فيه ومالايقطع: ١٣٢/٥

(۲) الدرالمختار، كتاب السرقة: ١٦٣،١٦٢/٦، البحرالرائق، كتاب السرقة، فصل في الحرز: ٩٧/٥

(۳) الدرالمختار على صدررد المحتار، كتاب السرقة: ١٦٣،١٦٢/٦، البحرالرائق، كتاب السرقة، فصل في الحرز: ٩٧/٥

(٤) بدائع الصنائع، كتاب السرقة، فصل في شروط الركن: ٢٨٣/٩، البحرالرائق، كتاب السرقة، تحت قوله: (ولو جمعاً والأخذ بعضهم قطعوا إن أصاب لكل نصابٌ: ٨٩/٥، المغني، باب القطع في السرقة، حكم اشتراك الجماعة في سرقة قيمتها ثلاثة دراهم، رقم (٧٣١٤): ٢٩٠،٢٨٩/١٠

(٥) المبسوط، كتاب السرقة، ١٧٧/٩، الهداية مع فتح القدير، كتاب السرقة، فصل في كيفية القطع وإثباته قبيل باب ما يحدث السارق في السرقة: ١٧١/٥

باب حد القذف

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

عزت وناموس انسان کے امتیازات میں سے ہے، اس لیے اسلام نے انسانی عفت وعصمت کی حفاظت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ زنا اور اس کی طرف لے جانے والے اسباب پر بھی حرمت کا حکم لگا دیا گیا، تاکہ کسی کی عصمت وحیا پر حرف نہ آنے پائے۔ دوسری طرف اس برائی کی اتنی مذمت بیان کی گئی کہ کسی پاک دامن شخص کے ساتھ اس لفظ (زنا) کو جوڑنا قرآن کی رو سے فسق، سببِ لعنت اور موجبِ عذاب قرار دیا گیا۔(۱) اور معاشرے کے ان غیر ذمہ دار اور بے ہودہ گو لوگوں کے لیے بھی سخت سزا مقرر کی گئی جو کسی پاک دامن آدمی کے دامن کو داغ دار کرنے کے درپے ہوں اور اس پر نا کردہ گناہ کی تہمت لگاتے ہوں۔ فقہ اسلامی میں اسی سزا کا نام "حدِ قذف" ہے۔

لغوی اور اصطلاحی تحقیق:

قذف کا لغوی معنی ہے "پھینکنا"۔ تہمت باندھنے میں بھی ایک شخص دوسرے شخص پر گناہ اور عیب جوئی کے تیر پھینکتا ہے۔ گالی دینے اور برا بھلا کہنے کو بھی قذف کہتے ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں مخصوص گالی یعنی "کسی پر زنا کی تہمت لگانے" کا نام قذف ہے۔(۲)

حدِ قذف کا سبب اور حکم:

کسی پر زنا کی تہمت لگانا حدِ قذف کا سبب ہے۔ ائمہ ثلاثہ اور حنفیہ میں سے صاحبین کے ہاں کسی پر عمل قومِ لوط کی تہمت لگانے سے بھی حدِ قذف واجب ہوتی ہے۔ ان حضرات کے ہاں حدود کے باب میں یہ عمل قبیح اور زنا ایک ہی حکم میں ہیں۔ قذف کی حرمت قرآن، حدیث اور اجماع تینوں سے ثابت ہے۔(۳)

---

(۱) النور: ٤، ٢٣

(۲) الاختيار لتعليل المختار، كتاب الحدود، باب حد القذف: ٤/٩٣

(۳) الاختيار حواله بالا، بدائع الصنائع، كتاب الحدود، فصل في حد القذف: ٩/٢١٦، المغني مع الشرح الكبير، فصل وإن تحاكم مسلم أو ذمي، حكم مالو قذف بالغ حرامسلماً: ١٠/١٩٢، وأحكام القذف بعمل قوم لوط: ١٠/٢٠٠، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الحدود، باب الوطئ الذي يوجب الحد والذي لا يوجبه: ٦/٤٢، ٤٣

باب القذف سے متعلقہ اصطلاحات:

(۱) قذف......: تہمتِ زنا یا تہمتِ عمل قومِ لوط۔

(۲) قاذف......: تہمت لگانے والا۔

(۳) مقذوف......: جس شخص پر تہمت لگائی جائے۔

(۴) مقذوف فیہ......: وہ جگہ جہاں تہمت لگائی جائے۔

(۵) مقذوف بہ......: وہ گالی یا تہمت جس کی وجہ سے حد واجب ہوتی ہے۔(۱)

تہمت لگانے کی مختلف صورتیں:

تہمت کے الفاظ تین قسم کے ہیں: صریحی، کنائی اور تعریضی

(الف) اگر لفظ میں تہمتِ زنا کے معنی کے علاوہ کسی اور معنی کا احتمال نہ ہو تو صریحی ہے۔

(ب) اگر تہمتِ زنا کے لیے وضع ہونے کے باوجود کسی اور معنی کا احتمال ہو تو کنائی ہے۔

(ج) اگر لفظ خود تہمت کے لیے وضع نہ ہو، بلکہ متکلم نے اپنے زعم میں ان الفاظ سے تہمت لگانے کا ارادہ کیا ہو تو تعریضی ہے۔

فقہائے کرام کے ہاں قذفِ صریح میں بالاتفاق حدِ قذف واجب ہوگی، بشرطیکہ دوسرے شرائط موجود ہوں۔ شرائط نہ ہوں تو تہمت لگانے والے کو تعزیری سزا دی جائے گی۔ اس کے علاوہ باقی دونوں قسموں (کنایہ، تعریض) میں حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں حد تو نہیں، البتہ تعزیر ہوگی تاکہ آئندہ کوئی عصمت دری کے ارتکاب کی جرأت نہ کرسکے۔(۲)

حدِ قذف کی شرائط:

ان میں سے کچھ شرائط مقذوف سے متعلق ہیں، کچھ قاذف سے اور کچھ دونوں سے، کچھ نفسِ قذف سے اور کچھ مقذوف فیہ سے۔

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في شروط الوجوب:۹/۲۱۷۔۲۲۹

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في مایرجع إلیهما:۹/۲۲۱، الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الحدود، باب حد القذف:۶/۸۲، ۱۳۳، کشاف القناع:۶/۱۳۹۔۱۴۱

مقذوف سے متعلق شرائط:

(۱)مقذوف محصن ہو یعنی عاقل، بالغ، آزاد، مسلمان اور پاک دامن ہو، یعنی کبھی زنا سے متہم نہ ہو۔

(۲)مقذوف (مرد ہو یا عورت) معلوم ہو، مبہم انداز سے تہمت لگانا موجب حد نہیں۔(۱)

(۳)مقذوف نے قاذف کی تہمت کے بعد خود زنا کا اقرار نہ کیا ہو۔

(۴)مقذوف کی طرف سے قاذف پر حد جاری کرنے کا مطالبہ بھی موجود ہو، اس لیے کہ حد قذف میں اگرچہ حق اللہ غالب ہے، مگر بندے کا حق بھی متعلق ہوگیا ہے، اس لیے کہ حد سرقہ کی طرح اس میں بھی دعویٰ شرط ہے۔(۲)

☆......تہمت جس شخص پر لگائی جائے اس کا زندہ ہونا شرط نہیں، مردے پر تہمت لگانے والے شخص پر بھی حد واجب ہوگی۔(۳)

قاذف سے متعلقہ شرائط:

(۱)تہمت لگانے والا اس شخص کا باپ، دادا، نانا وغیرہ نہ ہو۔

(۲)بالغ ہو۔

(۳)دعوائے زنا کو چار گواہوں کے ذریعے ثابت نہیں کر پایا ہو۔(۴)

(۴)تہمت لگانے والا خود مقذوفہ عورت کا شوہر نہ ہو، اگر شوہر ہو تو حد قذف سے بچنے کے لیے اس پر لعان واجب ہوگا۔(۵)

مقذوف اور قاذف کے لیے مشترکہ شرط:

تہمت لگانے والا اس شخص کا باپ، دادا، ماں، نانا وغیرہ نہ ہو۔(۶)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في شروط الوجوب: ۲۲۰،۲۱۷/۹

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في شروط صفات الحدود: ۲۴۹/۹، الموسوعة الفقهية، مادة قذف: ۱۴/۳۳

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في مایرجع إلى المقذوف: ۲۲۱/۹

(٤) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في شروط وجوب......: ۲۱۷/۹

(٥) الموسوعة الفقهية، مادة قذف: ۱٤/۳۳

(٦) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في مایرجع إلیهما جمیعاً: ۲۲۱/۹

مقذوف بہ، یعنی تہمت اور گالی سے متعلق شرطیں:

(۱) زنا کی صریح تہمت ہو یا کسی کو اس کے شرعی باپ کے نسب سے منفی کرے۔(۱)

(۲) زنا کی نسبت کچھ اس طرح کرے کہ قابلِ تصور ہو، مثلاً: اگر یہ کہہ دے کہ فلاں نے تیری ران کے ساتھ زنا کیا ہے تو اس گالی سے حد واجب نہیں ہوگی۔

مقذوف فیہ، یعنی مکانِ قذف سے متعلق شرائط:

تہمت دارالاسلام میں لگائی گئی ہو، نہ کہ دارالحرب میں، اس لیے کہ دارالحرب میں اسلامی قوانین کا اجرا ممکن نہیں۔(۳)

نفسِ قذف سے متعلق شرط:

تہمت لگانا کسی شرط کے ساتھ مشروط نہ ہو، جیسے یوں کہے کہ اگر فلاں کام ہوگیا تو فلاں زناکار ہوگا وغیرہ۔(۴)

حدِ قذف ثابت ہونے کے ذرائع (اقرار یا گواہی):

(۱) حدِ قذف یا تو دو عادل مرد گواہوں کی گواہی سے ثابت ہوگی جو بلاواسطہ اصالتاً گواہی دے کر یہ کہیں کہ فلاں نے فلاں پر ہمارے سامنے زنا کی تہمت لگائی تھی اور وہ اس کو چار گواہوں کے ذریعے ثابت نہ کرسکا۔

(۲) اور یا خود تہمت لگانے والا تہمت کا اقرار کرلے (اگرچہ ایک مرتبہ ہو) کہ ہاں میں نے فلاں پر زنا کی تہمت لگائی تھی اور میں اس میں جھوٹا تھا۔ ایک مرتبہ تہمت لگانے کا اقرار کرنے کے بعد اس سے رجوع ممکن نہیں، اس لیے کہ اب اس سے بندے (مقذوف) کا حق متعلق ہوگیا۔ اسی طرح تقادم، یعنی زیادہ وقت گزرنے کے باوجود اگر مقذوف قاضی سے مطالبہ کردے کہ قاذف پر حد لگائی جائے تو اس کو یہ حق حاصل ہے۔(۵)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في مایرجع إلی المقذوف به: ۲۲۱/۹

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في مایرجع إلی المقذوف به: ۲۲۶/۹

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في مایرجع إلی المقذوف فیه: ۲۲۹/۹

(٤) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في مایرجع إلی نفس القذف: ۲۲۹/۹

(٥) الاختیار لتعلیل المختار، کتاب الحدود، باب حد القذف: ۹۳/٤

حدِ قذف کی مقدار:

تمام فقہاء کے ہاں حدِ قذف آزاد مرد وعورت کے لیے اسی (۸۰) کوڑے ہیں، جب کہ غلام کے لیے چالیس کوڑے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (النور:۴) سے ثابت ہے۔ آزاد شخص اگر کسی غلام پر تہمت لگائے تو دنیا میں اس پر کوئی حد نہیں، البتہ آخرت کے اعتبار سے وہ سخت گنہ گار ہے۔(۱)

حدِ قذف میں دعویٰ کرنے کا حق کس کو ہے؟

جس شخص پر تہمت لگائی گئی ہو، اگر وہ بذاتِ خود زندہ ہو تو تہمت لگانے والے کے خلاف صرف وہی دعویٰ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اگر قدرت رکھنے کے باوجود اس نے دعوائے قذف نہیں کیا اور مر گیا تو اب ورثہ کے لیے دعویٰ قذف کا حق نہیں، اس لیے کہ حنفیہ کے ہاں حدود میں وراثت جاری نہیں ہوتی، تاہم اگر تہمت کسی مُردے پر لگائی گئی ہو تو اب اس کے اصول وفروع سب کو دعویٰ قذف کا حق حاصل ہوگا، اس لیے کہ اب تہمت اور عار ان ہی لوگوں کی طرف راجع ہوگی۔(۲)

تہمت لگانے والے کو معاف کرنے کا حکم:

حنفیہ کے ہاں قذف کا جرم ثابت ہونے کے بعد مقذوف کے لیے نہ تو تہمت لگانے والے کو معاف کرنا جائز ہے اور نہ پیسے وغیرہ لے کر اس سے صلح کرنا جائز ہے، اس لیے کہ یہ حقوق اللہ میں سے ہے اور حقوق اللہ کا دار ومدار مفادِ عامہ اور مصالحِ کثیرہ پر ہوتا ہے، لہٰذا دعویٰ کرنے کے اعتبار سے اگرچہ بندے کو اختیار ہے، مگر ساقط کرنے میں اس کا کوئی اختیار نہیں۔(۳)

حدِ قذف میں تداخل:

حدِ قذف کی سزا میں تداخل کا قاعدہ جاری ہوتا ہے یعنی اگر کسی شخص نے ایک ہی شخص پر متعدد بار زنا کی تہمت

---

(۱) الجامع لأحکام القرآن للقرطبي، تفسیر سورة النور آیة ٤، ص:٦/١٧٤

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في صفات الحدود:٩/٢٤٩، الهدایة مع فتح القدیر، کتاب الحدود، باب حد القذف:٤/٩٥

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في صفات الحدود:٩/٢٤٨، ٢٤٩، الهدایة مع فتح القدیر، کتاب الحدود، باب حد القذف:٤/٩٥

لگائی تو ایک ہی حد تمام تہمتوں کے لیے کافی ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر کئی افراد پر تہمت لگائی ہو، تب بھی ایک ہی حد کافی ہوگی۔ ہاں اگر ایک دفعہ سزا پانے کے بعد اب کسی اور شخص پر تہمت لگائے تو دوبارہ حد جاری ہوگی۔(۱)

حدقذف کب ساقط ہوگی؟

(۱) مقذوف خود قاذف کی تصدیق کرے کہ ہاں واقعی تم اپنی تہمت میں سچے ہو۔

(۲) جس شخص پر تہمت لگائی گئی ہو، وہ تہمت کا انکار کردے کہ فلاں نے تو مجھ پر تہمت ہی نہیں لگائی۔

(۳) جس شخص پر تہمت لگائی گئی ہو، وہ اس بات کا اعلان کردے کہ میں نے فلاں شخص کے خلاف تہمت لگانے کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے جو دو گواہ پیش کیے تھے، وہ دونوں جھوٹے تھے۔

(۴) گواہان میں سے کسی کی گواہی کی اہلیت حد جاری ہونے سے پہلے ختم ہو جائے، جیسے کوئی گواہ پاگل ہو جائے، مرتد ہو جائے یا فاسق قرار دیا جائے۔

(۵) مقذوف کی طرف سے پیش کردہ گواہان حد جاری ہونے سے پہلے اپنے بیان سے رجوع کرلیں۔(۲)

(۶) مقذوف نے خود قذف کا دعویٰ تو کرلیا، مگر حد جاری ہونے سے پہلے وہ مرگیا۔(۳)

(۷) جس شخص پر تہمت لگائی گئی ہو، حد جاری ہونے سے پہلے اس کا صفتِ احصان زائل ہو جائے، یعنی زنا کرلے یا مرتد و پاگل ہو جائے۔(۴)

❁❁❁❁❁

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في صفات الحدود:۹/۲٤۸، الموسوعة الفقهية، مادة قذف:۳۳/۲۰، ۲۱

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في شرائط جواز إقامتها:۹/۲٦۰۔۲۷۰

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في من يملك الخصومة ومن لا يملكها:۹/۲٤٦

(٤) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الحدود، باب القذف:٦/۸۳

مسائل کتاب القصاص والدیات والحدود

قاتل کو جیل سے چھڑوانا

سوال نمبر(68):

ایک شخص نے قتل کیا۔اب کہتا ہے کہ مقتول کو میں نے اپنے دفاع میں قتل کیا ہے۔اگر میں اسے قتل نہ کرتا تو وہ مجھے جان سے مار رہا تھا۔اب قاتل جیل میں ہے۔کیا قاتل کے بھائی اس کو جیل سے چھڑا سکتے ہیں؟شرعاً گناہ گار یا مجرم تو نہیں ہوں گے۔شرعی مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اسلام امن وسلامتی کا دین ہے جو انسانی جان کے تحفظ کا درس دیتا ہے اور ناحق کسی ایک جان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے۔

مسئولہ صورت میں اگر قاتل نے اپنے دفاع میں مقتول کو ایسی حالت میں قتل کیا ہو کہ مقتول نے قاتل پر اسلحہ تان رکھا تھا یا کوئی جان لیوا چیز اُٹھا کر اس کو جان سے مارنے کا عزم کیا تھا اور مذکورہ قاتل نے کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا اور اس کے پاس اُسے قتل کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں تھا تو ایسی صورت میں مقتول مباح الدم ہو کر اس کا قتل جائز تھا،اس لیے اگر قاتل نے اس کو قتل کیا تو اس کو اب جیل سے چھڑانا جائز ہے۔تاہم دفاعی اقدام کے بارے میں اطمینان ضروری ہے کہ واقعی دفاعی اقدام تھا یا نہیں؟ورنہ ظالم سے تعاون کرنا بھی ظلم ہے،اگر محض توہمات یا صرف دھمکی کی وجہ سے قتل کیا ہو تو چونکہ ایسی صورت میں قتل جائز نہیں تھا،اس لیے قاتل کو جیل سے رہا کرنا ''تعاون علی الاثم'' ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾.(۱)

ترجمہ: نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو،اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

(۱) المائدۃ/۲

إذا شهر علی رجل سلاحا، فقتله، أو قتل غیره دفعاعنه،فلایجب بقتله شيء، ولا یختلف بین أن یکون باللیل أوالنهار،في المصرأوفي خارج المصر.(۱)

ترجمہ:

جب کوئی شخص کسی پر اسلحہ تان لے اور وہ یا کوئی اور اس کو دفع کرنے کے لیے قتل کرے تو اس کے قتل سے کچھ لازم نہیں ہوتا، چاہے دن ہو یا رات، شہر ہو یا شہر سے باہر، جہاں بھی ہو۔

❁❁❁

قتلِ عمد میں مال پر صلح کرنا

سوال نمبر(69):

ایک شخص کو پولیس آفیسر نے عمداً بلا جرم قتل کیا۔ اب یہ پولیس اپنے کیے پر نادم ہے اور دیت دینے کے لیے تیار ہے۔ قتل عمد کی صورت میں کتنی دیت وصول کی جاسکتی ہے؟ قتل خطا میں جو دیت لازم ہوتی ہے، کیا اس سے زیادہ وصول کرنا شرعاً درست ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

قتلِ عمد کی صورت میں قصاص لازم ہوتا ہے۔ مال یا دیت لازم نہیں ہوتی، البتہ اگر مقتول کے ورثا مال پر مصالحت کرنا چاہیں تو بھی جائز ہے۔ پھر صلح میں مال کی مقدار فریقین کی رضامندی پر موقوف ہے، اس میں قتل خطا کی دیت سے زیادہ یا کم مقرر کرنا بھی جائز ہے، کیوں کہ یہ مال قصاص کے بدلے میں ہے، کسی مال کے بدلے میں نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

قوله تبارك وتعالی ﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ﴾ نزل في الصلح عن دم العمد، فیدل علی جواز الصلح، وسواء کان بدل الصلح قلیلا أو کثیرا،من جنس الدیة أو من خلاف جنسها، حالاأو مؤجلا ...... ونحو ذلك، بخلاف الصلح من الدیة علی أکثر مماتجب فیه الدیة أنه لایجوز؛لأن المانع من

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الجنایات،الباب الثاني فیمن یقتل قصاصاً ومن لایقتل: ۷/٦

الجواز هناك تمكن الربا، ولم يوجد ههنا ؛لأن الربا يختص بمبادلة المال بالمال، والقصاص ليس بمال.(۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (ترجمہ:) ''جس کو بھائی کی طرف سے کچھ معاف کردیا جائے'' قتلِ عمد سے صلح کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لہٰذا یہ صلح کے جواز پر دلالت کرتی ہے، چاہے بدلِ صلح قلیل ہو یا کثیر، جنسِ دیت سے ہو یا خلافِ جنس، نقد ہو یا کسی مقررہ مدت پر وغیرہ۔۔۔۔ بخلاف اس کے کہ جن صورتوں میں دیت لازم ہوتی ہے، ان میں دیت سے زیادہ پر صلح کیا جائے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ اس میں ربا لازم ہوتا ہے اور قصاص کی صورت میں ربا لازم نہیں آتا، اس لیے کہ ربا وہاں لازم آتا ہے جہاں مال کا مال سے تبادلہ ہو اور قصاص چونکہ مال نہیں (اس لیے اس میں ربا لازم نہیں آتا۔)

❁❁❁

باپ کو قتل کرنے سے قصاص کا وجوب

سوال نمبر (70):

ایک شخص اپنے بیٹے کو کسی کام سے روکتا ہے، لیکن وہ نہیں رُکتا، یہاں تک کہ والد اپنے بیٹے کے قتل کے درپے ہوجاتا ہے، لیکن بیٹا پہلے وار کر کے باپ کو قتل کر دیتا ہے۔ اب اس مسئلہ کا شرعی حل کیا ہوگا؟ بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی بھی مسلمان کو ناحق قتل کرنا جرم ہے خاص کر اپنے باپ کو قتل کرنا تو بہت زیادہ سنگین گناہ ہے، اس لیے حکومت وقت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جرم ثابت ہونے پر بیٹے پر قصاص جاری کرے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ويقتل الولد بالوالد لعدم المسقط. (۲)

ترجمہ: اور قصاص ساقط کرنے کی کوئی وجہ نہ ہونے کی بنا پر باپ کے بدلے بیٹے کو قتل کیا جائے گا۔

❁❁❁

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الجنايات، فصل وامابيان مايسقط القصاص: ۱۰/۲۹۵

(۲) الهداية، کتاب الجنايات، باب مايوجب القصاص: ٥٥٨/٤

متعدد قاتلوں کا ایک شخص کو قتل کرنا

سوال نمبر (71):

بسا اوقات کسی شخص کو ناحق مارنے کے لیے تین، چار افراد شریک ہوتے ہیں جو یکے بعد دیگرے اس پر گولی چلادیتے ہیں، اس میں معلوم نہیں ہوسکتا کہ کس فرد کی گولی سے یہ شخص ہلاک ہوا؟ ایسی صورت میں قصاص سب سے لیا جائے گا یا اس فرد کو معلوم کرنا ضروری ہے جس کی گولی سے یہ شخص قتل ہوا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

قتل کرنے والے افراد چاہے جتنے بھی ہوں، ناحق قتل کی صورت میں سب کو قصاصاً قتل کیا جائے گا، تاہم قصاص لینا حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کہ سب قاتلوں کو گرفتار کرکے ان سے قصاص لے لے۔

والدّلیل علی ذلک:

لوقتل جماعة واحداً يقتلون به قصاصاً، وإن لم يكن بين الواحد والعشرة مماثلة لوجود المماثلة في الفعل ......لأن القتل لايوجد عادة إلاعلى سبيل التعاون والاجتماع، فلولم يجعل فيه القصاص لانسد باب القصاص.(١)

ترجمہ: اگر ایک جماعت کسی ایک شخص کو قتل کرے تو سب کو قصاصاً قتل کیا جائے گا، اگرچہ ایک اور دس افراد میں مماثلت نہیں، لیکن فعل میں مماثلت کی وجہ سے یہ حکم ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ قتل عادتاً تعاون اور اجتماع کے بغیر ثابت نہیں ہوتا، اب اگر اس صورت میں قصاص لازمی نہ ٹھہرایا جائے تو قصاص کا باب بند ہوجائے گا۔

❁❁❁

زانی اور زانیہ کا قتل

سوال نمبر (72):

ایک شخص نے اپنی بھابھی کو غیر مرد کے ساتھ بستر پر زنا کرتے پایا۔ اس مرد کے ساتھ اس عورت کے پہلے سے

(١) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، في بيان شرائط وجوب القصاص: ٢٦١/١٠

مراسم بھی تھے،اس شخص نے دونوں کوقتل کیا،اس پر گواہ موجودنہیں ہیں۔کیااس دوہرے قتل کی پاداش میں اس شخص پر قصاص ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

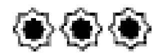
اگر چہ شریعت ایسے وقت میں شخصی طور پر کسی کوقانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اقدامِ قتل کا مرتکب بنے،تاہم جب کسی نے موقع واردات (زنا کرتے وقت) پر کسی کوقتل کیا تو شرعاً یہ شخص موجب قصاص نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

رجل رأی رجلامع امرأة یزني بها، أو یقبلها،أو یضمها إلی نفسه، وهي مطاوعة، فقتله، أو قتلهما لاضمان علیه.(۱)

ترجمہ:

ایک شخص نے کسی کوایک عورت کے ساتھ زنا کرتے یاتقبیل کرتے یاعورت کواپنے ساتھ لگاتے دیکھااور عورت بھی راضی تھی،پس اس شخص نے اس کوقتل کیایادونوں کوقتل کیا تواس شخص پر کوئی ضمان نہیں۔



شارعِ عام پر مردہ لاش کامل جانا

سوال نمبر(73):

شارع عام پر مردہ لاش ملے اور قاتل معلوم نہ ہوتو لاش کی دیت کس پر ہوگی؟شریعت کی رُو سے وضاحت فرمائیں۔

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

امن وامان قائم کرنا حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ملکی حالات کو سازگار بنائے تاکہ عوام سکون اور چین کی زندگی گزار سکیں۔جرائم،قتل اور ڈاکہ زنی کے انسداد کے لیے ٹھوس اقدامات

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحدود، باب التعزیر، مطلب یکون التعزیر بالقتل: ۱۰۸/۶

کرے اور جہاں قتل اور ڈکیتی کی واردات ہو جائیں، وہاں عدالتی تحقیقات کر کے اصل مجرم کا کھوج لگا کر مظلوم کو اس کا حق دلائے۔

مسئولہ صورت میں بھی اگر مذکورہ شخص اپنی طبعی موت نہ مرا ہو اور کسی نے قتل کیا ہو تو عدالت تحقیقات کر کے اصل مجرم کو پکڑے اور اس سے مظلوم کو حق دلوائے، تاہم اگر اصل مجرم تک رسائی نہ ہو سکے تو عدالت حکومت کے خزانے سے دیت مقتول کے ورثا کو دلوائے۔

والدلیل علی ذلک:

وإن وجد في المسجد الجامع، أو الشارع الأعظم، فلاقسامة فيه، والدية على بيت المال. (۱)

ترجمہ:

اگر لاش جامع مسجد یا شارع عام میں ملی تو اس میں قسامت نہیں، اور دیت بیت المال پر لازم ہوگی۔

❁❁❁

رمی جمرات یا دیگر مواقع حج میں قتل کی ذمہ داری

سوال نمبر(74):

حج کی ادائیگی کے دوران رمی جمرات یا دیگر موقعوں پر ازدحام کی وجہ سے بعض حجاج کرام روندے جانے کے باعث جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کے قتل کا ذمہ دار کون ٹھہرے گا؟ دیت کی ذمہ داری کس پر آئے گی؟ نیز کفارہ کی صورت کیا ہوگی؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی نفسِ محترمہ کے قتل کی صورت میں قاتل اس کی جان کے ضیاع کا سبب بنتا ہے، لہٰذا مقتول کے تقدس اور اس کے قتل کی نوعیت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے قاتل پر قصاص، دیت، کفارہ اور حرمان ارث جیسی سزائیں لاگو کر دی جاتی ہیں تاکہ آئندہ نفسِ محترمہ کی تضییع کا سدباب ہو، البتہ جہاں کسی اجتماعی حادثہ کے پیش نظر قاتل کی تعیین ممکن نہ ہو، وہاں پر دیت وغیرہ کی ذمہ داری بیت المال پر پڑتی ہے۔

(۱) الهداية، كتاب الديات، باب القسامة: ٤/٦٢٧

مسئولہ صورت میں رمی الجمرات کے موقع پر ہجوم میں شہید ہونے والے حجاج کرام کے قاتل کی تعیین ممکن نہیں ہوتی، لہٰذا ہجوم اور ازدحام میں شریک ہونے والے لوگ مقتول کے قتل کا مرتکب شمار نہیں ہوتے، کیونکہ ارتکاب کرنے والے کی تعیین مشکل ہے۔زیادہ سے زیادہ اس کے قتل کے لیے سبب کا درجہ رکھتے ہیں اور دیت وکفارہ قتل کے مرتکب پر آتا ہے،سبب بننے والے پر نہیں لہٰذا اِن پر دیت وکفارہ نہیں۔جب کہ دیت اس صورت میں بیت المال سے ادا کی جائے گی۔

والدّلیل علی ذلک:

وإن وجد في المسجد الجامع، أو الشارع الأعظم، فلاقسامة فیه، والدیة علی بیت المال.(۱)

ترجمہ: اگر لاش جامع مسجد یا شارع عام میں ملی تو اس میں قسامت نہیں،اور دیت بیت المال پر لازم ہوگی۔

الکفارة جزاء مباشرة القتل، فلاتجب بالتسبب.(۲)

ترجمہ: کفارہ قتل کی مباشرت کی سزا ہے،لہٰذا سبب بننے والے پر کفارہ نہیں)۔

❁❁❁

گاڑی کے ذریعے کسی کو قصداً قتل کرنا

سوال نمبر(75):

ایک ڈاٹسن ڈرائیور نے ایک لڑکے کو ڈاٹسن سے ٹکر ماری۔جب لڑکا اُٹھ کھڑا ہوا تو اس نے دوبارہ اس کو زور سے ٹکر ماری، پھر تیسری بار یوں کیا،یہاں تک کہ لڑکے کی جان لے لی۔کیا یوں گاڑی کے ذریعے سے کسی کی جان لینا قتل عمد میں آتا ہے یا قتل خطا میں؟اور قاتل کی سزا کیا ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عموماً گاڑی سے ہونے والا قتل،قتل خطا کے حکم میں ہوتا ہے،لیکن اگر کوئی شخص قصداً وعمداً گاڑی سے کسی کو قتل کرے،جیسا کہ مسئولہ صورت میں ذکر ہے تو چونکہ گاڑی نہ آلہ قتل ہے اور نہ قتل کے لیے استعمال ہوتی ہے،اس وجہ سے

---

(۱) الهدایة، کتاب الدیات، باب القسامة: ٦٢٧/٤

(۲) المبسوط، کتاب الدیات، باب جنایة الراکب: ١٨٩/٢٦

اس قتل کو قتل عمد میں شمار نہیں کیا جائے گا، البتہ قتل خطا کی بجائے یہ قتل شبہ بالعمد میں شمار ہوگا اور قتل شبہ بالعمد میں اگرچہ قصاص نہیں، لیکن عاقلہ پر دیت مغلظہ اور خود قاتل پر کفارہ لازم ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

وشبه العمد عند أبي حنيفةؒ: أن يتعمد الضرب بما ليس بسلاح، ولا ما أجري مجرى السلا..........وموجب ذلك على القولين الإثم......والكفارة......والدية المغلظة على العاقلة.(۱)

ترجمہ:

اور قتل شبہ عمد امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ عمداً کسی کو ایسی چیز سے مارا جائے جو نہ آلہ قتل ہو اور نہ اس کے قائم مقام ہو۔۔۔۔اس میں (قاتل پر) گناہ۔۔۔اور کفارہ ہے۔۔۔۔اور عاقلہ پر دیت مغلظہ واجب ہوتی ہے۔

❁❁❁

ایکسیڈنٹ کا قتل

سوال نمبر(76):

ایک شخص رکشہ ڈرائیور ہے۔ایک دن اپنے بچوں کو لے کر رکشہ میں جا رہا تھا، اچانک رکشہ کو پیچھے سے ایک گاڑی نے ٹکر ماری، وہ شخص مرگیا۔کیا مذکورہ قتل قتلِ خطا ہے؟اور گاڑی والے سے دیت کا مطالبہ جائز ہے یا نہیں؟ کیوں کہ رکشہ ڈرائیور کے بچے محتاج اور غریب ہیں اور کیا دیت لینے سے شہادت تو ضائع نہیں ہوگی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

ایکسیڈنٹ کا قتل جاری مجریٰ خطا کے زمرے میں شمار ہوتا ہے جس میں قاتل پر کفارہ اور اس کے عاقلہ پر دیت لازم ہوتی ہے، لیکن آج کل انتظامیہ کی طرف سے عاقلہ سے دیت وصول کرنے کا کوئی انتظام نہیں اور عاقلہ کی ذمہ داری قاتل پر ڈالنا بھی صحیح نہیں، اس وجہ سے قاتل پر صرف کفارہ لازم ہوگا۔

تاہم لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لیے یتیم بچوں کی خیر خواہی کو مدنظر رکھتے ہوئے گاڑی والوں سے کچھ لینے میں کوئی حرج نہیں، البتہ مصالحت کے طور پر جو رقم طرفین کی رضامندی سے مقرر کی جائے اس کی مقدار دیت کی

(۱) الهداية، كتاب الجنايات: ٤/٥٥٥

مقدار سے کم ہونی چاہیے۔حادثاتی موت سے بندہ کو شہادتِ اُخروی کا اجر ملتا ہے اور ورثا کے دیت لینے یا نہ لینے سے ان شاء اللہ اُس اجر میں کمی نہیں ہوگی۔

والدّلیل علی ذلک:

(و)الرابع (ماجرى مجراه) مجرى الخطأ (كنائم انقلب على رجل فقتله) قال ابن عابدين: أو كان على دابة، فأوطئت إنسانا فقتله مثل النائم.(١)

ترجمہ:

قتل کی چوتھی قسم جاری مجری خطا ہے، جیسے سویا ہوا کسی شخص پر کروٹ بدلے اور اس کو قتل کرے یا کوئی سوار ہو اور اُس کی سواری کسی کو روند کر قتل کرے تو یہ بھی سونے والے کی طرح قتل جاری مجری خطا ہے۔

إذا اصطلحا قبل القضاء والرضا إن اصطلحا على مال فرض في الدية إن كان المصالح عليه أكثر من الدية، فإنه لا يجوز ......وإن وقع الصلح على أقل ......فإنه يجوز.(٢)

ترجمہ:

جب قضا اور رضا سے پہلے صلح ہو تو اگر صلح اُسی مال پر ہو جو دیت میں مقرر ہے تو جس مال پر صلح کیا گیا ہو، اگر وہ دیت سے زیادہ ہو تو جائز نہیں۔۔۔۔اور اگر صلح مقدارِ دیت سے کم پر ہو تو جائز ہے۔

❁❁❁

قتلِ خطا میں دیت لینا بہتر ہے یا صلح

سوال نمبر(77):

ایک شخص دوسرے ساتھی کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر سڑک پر سفر کر رہا تھا۔ان کا سفر اپنی سڑک کے بائیں طرف پر جاری تھا۔سڑک پر سامنے سے ایک بس آرہا تھا، اس بس کے پیچھے سوزوکی چلی آرہی تھی، وہ سوزوکی بس سے اُورٹیک کر رہی تھی کہ اسی اثنا میں موٹر سائیکل سوار کے بالکل سامنے آگئی اور حادثہ ہو گیا۔موٹر سائیکل کا ڈرائیور تو بچ گیا، لیکن اس کے پیچھے سوار شخص شدید زخمی ہو گیا، اس کی ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹ گئی اور سر بھی پھٹ

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الجنايات: ١٦١/١٠

(٢) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب السادس في الصلح: ٢٠/٦

گیا۔ایسی صورت میں اس حادثہ کا ذمہ دار کون ہوگا؟ دیت کی وصولی کی کیا صورت ہوگی؟ اس حادثہ کا کیا حل ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

ڈرائیور دوران سفر گاڑی سے کسی کو مارے یا زخمی کردے تو اس پر ضمان لازم ہوگا اور دیت عاقلہ سے لی جائے گی جس کی وصولی شرعی حاکم یا قاضی کے بغیر ممکن نہیں۔موجودہ دور میں مذکورہ سہولت کی عدم دستیابی کے پیش نظر صلح کرنا زیادہ مناسب ہے،لہٰذا مسئولہ صورت میں مقامی معتمد علما کا سہارا لے کر صلح کرانا بہتر رہے گا۔

والدّلیل علی ذلک:

وإن كان صاحب الدابة راكبا على الدابة، والدابة تسير إن وطئت بيدها أو برجلها، يضمن وعلى عاقلته الدية.(١)

ترجمہ:

اور اگر جانور کا مالک سوار ہو اور جانور چل رہا ہو، اور ہاتھ یا پاؤں سے کسی کو روند ڈالے تو سوار ضامن ہوگا اور اس کے عاقلہ پر دیت لازم ہوگی۔

❁❁❁

ایکسیڈنٹ میں ڈرائیور پر دیت کا ایک مسئلہ

سوال نمبر(78):

ایک مقدمہ کے سلسلہ میں، میں ایک وکیل کو اسلام آباد ساتھ لے گیا۔واپسی پر ایکسیڈنٹ ہوا۔ایک گاڑی ہماری گاڑی سے ٹکرا کر ہماری گاڑی کھڈے میں جاگری، اور وہ وکیل مرگیا۔وکیل کی بیوی نے عدالت میں مقدمہ دائر کیا ہے اور 12,00,000 بارہ لاکھ روپے کا مطالبہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ وکیل کا باپ ۵ے سال کی عمر میں فوت ہوا تھا، اگر میرے شوہر کو یہ حادثہ پیش نہ آتا تو وہ مزید ۲۵ سال تک اتنا کما سکتا تھا، لہٰذا مجھے اتنی رقم ادا کی جائے۔کیا شریعت کی رُو سے اس کا یہ مطالبہ درست ہے؟ اور وکیل کی بیوی دیت کا مطالبہ کس سے کرے گی؟

بینوا توجروا

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الثاني عشر في جناية البهائم: ٦/ ٥٠

الجواب وباللہ التوفیق:

موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں اور نہ ہی عمرالشل شرعاً معتبر ہے، اس لیے والد کی عمر پر بیٹے کی عمر قیاس کرنا اور یہ کہنا کہ بیٹے کی عمر بھی اتنی ہوتی اگر حادثہ پیش نہ آتا، نصوص شرعیہ کے سراسر خلاف ہے۔ البتہ ایکسیڈنٹ کی اس صورت میں عورت ٹکر مارنے والی گاڑی کے ڈرائیور پر دیت کے مطالبہ کے لیے مقدمہ دائر کرسکتی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

﴿وَلَن يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا﴾ (۱)

ترجمہ: اور ہرگز اللہ تعالیٰ ڈھیل نہ دے گا کسی جی کو جب وقت مقرر آ پہنچے۔

الراكب ضامن لما وطئت الدابة، وما أصابت بيدها، أو رجلها أو رأسها أو كدمت أو خبطت. (۲)

ترجمہ:

جب سواری کسی کو روندے یا ہاتھ (آگے والے ٹانگوں سے) یا پاؤں یا سر سے کسی کو مارے یا دانت سے کاٹے تو سوار ضامن ہوگا۔

❁❁❁

بعض ورثا کا قاتل کو معاف کرنے سے قصاص اور دیت

سوال نمبر (79):

زید قتل ہوا، اس کے ورثا میں بعض نے قاتل کو معاف کیا، جب کہ بعض معاف کرنے پر آمادہ نہیں۔ کیا اس صورت میں قاتل سے قصاص ساقط ہوا یا نہیں؟ اور معاف نہ کرنے والے ورثا اپنے حصہ کی دیت کا مطالبہ کرسکتے ہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

قصاص لینا تمام ورثا کا اجتماعی حق ہے، لہٰذا بعض ورثا کے معاف کرنے سے یہ حق ساقط ہوجاتا ہے، تاہم حق دیت باقی ورثا کا ثابت رہتا ہے۔

(۱) المنافقون/۱۱

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الثاني عشر في جناية البهائم: ٦/ ٥٠

مسئولہ صورت میں اگر واقعی صورت حال ایسی ہو کہ بعض ورثا معاف کرتے ہوں اور بعض نہیں تو قصاص ساقط ہو گیا، البتہ حقِ دیت صرف معاف کرنے والے وارث کے حصہ کے بقدر ساقط ہوگا، جب کہ باقی ورثا حقِ دیت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

إن صالح أحد الشركاء من نصيبه على عوض، أو عفا سقط حق الباقين عن القصاص، وكان لهم نصيبهم من الدية، ولا يجب للعافي شيء من المال. (١)

ترجمہ: اگر شرکا میں سے کسی ایک نے (قاتل سے) اپنے حصہ پر کسی عوض کے ساتھ مصالحت کی یا اپنا حصہ معاف کیا، تو قصاص باقی شرکا کے حق میں بھی ساقط ہوا، اگر چہ باقی شرکا کے لیے ان کے حصہ کے بقدر دیت ہوگی اور معاف کرنے والے کے لیے مال دیت کا کچھ حصہ واجب نہیں۔

❁❁❁

قتلِ خطا میں دیت کی ایک صورت

سوال نمبر(80):

ایک شخص سرکاری کالج کا بس ڈرائیور ہے۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کے بس کی ٹکر سے ایک شخص ہلاک ہوا، قتل خطا کی وجہ سے اس پر دیت تو واجب ہے جو اہل دیوان (ادارہ، انجمن یا تنظیم) یا عاقلہ کو ادا کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ شخص نہایت مفلس ہے، اب اس کی دیت سرکاری ادارہ ادا کرے گا یا عاقلہ؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عاقلہ پر دیت کا بوجھ ڈالنے میں بنیادی کردار باہمی تناصر کا ہے۔ آج کل یونین، ادارے اور جماعتیں باہمی تناصر کے حوالے سے کردار ادا کرتے رہتے ہیں، اس لیے عاقلہ کی واضح شکل ان میں نمایاں ہے، تاہم جہاں کہیں یہ سہولت نہ ہو تو پھر اس میں حکومت کو ذمہ دار ٹھہرانا ذریعہ ادائیگی ہے، لیکن عاقلہ کی موجودگی میں حکومت کو ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرانا بھی درست نہیں۔

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب السادس في الصلح والعفو: ٢١/٦

والدّلیل علی ذلک:

والحاصل أن العبرة في هذا للتناصر وقيام البعض بأمرالبعض. (١)

ترجمہ: اور حاصل یہ کہ اس میں اعتبار باہمی امداد اور ایک دوسرے کے کام آنا ہے۔

وذكر في كتاب الولاء: أن بيت المال لايعقل من له عشيرة أو وارث. (٢)

ترجمہ:

کتاب الولاء میں ذکر ہے کہ جس کا خاندان یا وارث ہو تو بیت المال اس کا عاقلہ نہیں۔

❁❁❁

قتلِ خطا فی القصد کی ایک صورت

سوال نمبر(81):

مفتیان کرام کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو فریقین کے مابین فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ اس دوران ایک فریق کی گولی ایک راہ گیر کو لگی جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی جس شخص کی گولی لگی ہے، وہ شخص بھی معلوم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ قتل کی کون سی قسم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئولہ صورت میں راہگیر کا قتل خطا فی القصد کے زمرے میں آتا ہے اور قتل خطا میں قاتل پر کفارہ اور اس کے عاقلہ پر دیت لازم آتی ہے، لیکن آج کل شرعی قانون نہ ہونے کی بنا پر عاقلہ سے دیت وصول کرنا مشکل ہے اور عاقلہ کی ذمہ داری قاتل پر عائد ہونا بھی درست نہیں۔

اس لیے مسئولہ صورت میں قاتل پر صرف کفارہ لازم ہوگا چنانچہ قاتل مسلسل دو ماہ روزے رکھے گا۔ البتہ مصالحت کی صورت میں جو رقم دی جاتی ہے، وہ صرف قاتل پر لازم ہوگی، تاہم دیگر رشتہ دار اپنی طرف سے بطور تبرع و احسان اس میں تعاون کر سکتے ہیں۔

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب السادس في المعاقلة: ٨٣/٦

(٢) أيضا: ٨٤/٦

والدّلیل علی ذلک:

عن محمد رحمه الله تعالی: إذا تعمدت شیئا من إنسان، فأصبت شیئا آخر منه، سوی ماتعمدته، فهوعمد محض، وإن أصبت غیره یعني غیر ذلك الإنسان فهو خطاء. (۱)

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جب انسان کے کسی عضو کا قصد کرے، لیکن اس قصد کے علاوہ کسی اور عضو کو مارے تو یہ عمد ہے اور اگر اس انسان کے علاوہ کسی اور کو مارے تو یہ خطا ہے۔

الخطاء: فإنه علی نوعین، خطاء في القصد ......وهو أن یرمي شخصا ظنه صیدا أو حربیا، فإذا هومسلم. (۲)

ترجمہ: قتل خطا دو قسم پر ہے۔۔۔خطا في القصد: وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو شکار یا حربی سمجھ کر مارے، حالانکہ وہ مسلمان شخص ہو۔

کل أرش وجب بالصلح فهو في مال القاتل. (۳)

ترجمہ: ہر وہ تاوان جو صلح سے واجب ہوجائے، وہ قاتل کے مال میں سے ہوگا۔



قصاص اور دیت کے مستحق ورثا

سوال نمبر(82):

قصاص اور دیت کے شرعاً کون سے اقربا مستحق ہوتے ہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جن افراد کے لیے مقتول کی میراث میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حصہ مقرر ہے۔ان جملہ ورثا کو مقتول کے قصاص اور دیت کا استحقاق حاصل ہے۔

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الجنایات، الباب الاول في تعریف الجنایة: ٦/٣

(۲) تبیین الحقائق، کتاب الجنایات: ٧/٢١٦

(۳) الفتاوی الهندیة، کتاب الجنایات، الباب الثامن في الدیات: ٦/٢٤

والدّلیل علی ذلك:

ویستحق القصاص من یستحق میراثه علی فرائض الله تعالی، یدخل فیه الزوج والزوجة، وکذا الدیة. (۱)

ترجمہ: قصاص اور دیت کے وہ افراد مستحق ہوتے ہیں جو اس کے میراث کے مستحق ہوں، ان حصوں کے مطابق جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیے ہیں اس میں شوہر اور بیوی بھی شامل ہیں۔

❁❁❁

بالغ ورثا کا قصاص معاف کرنا

سوال نمبر (83):

ایک شخص نے کسی کو قتل کیا۔ مقتول کے اولیا میں بالغ اور نابالغ افراد ہیں۔ کیا بالغ اولیا نابالغ کی طرف سے قصاص و دیت معاف کر سکتے ہیں یا یہ ان کے دائرہ اختیار میں نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مقتول کے ورثا جب چھوٹے بڑے مشترک ہوں تو بڑے ورثا کو چھوٹے ورثا کے بلوغ سے پہلے قصاص لینے کا حق شرعاً حاصل ہے، تاہم اگر بڑے ورثا میں سے کوئی مقتول کو قصاص معاف کرے تو مقتول سے قصاص ساقط ہو جائے گا اور ان ورثا کی طرف سے دیت بھی معاف متصور ہوگی، کیوں کہ ان کو دیت لینے کا بھی اختیار باقی نہیں رہتا، البتہ دیت میں چھوٹے ورثا کا حق بدستور باقی رہے گا۔ بڑے ورثا اس کے معاف کرنے کے مجاز نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

ولو کانت الورثة صغارا و کبارا، کان للکبار ولایة استیفاء القصاص قبل بلوغ الصغار في قول أبي حنیفةؒ. (۲)

---

(۱) الفتاوی الخانیة علی هامش الفتاوی الهندیة، کتاب الجنایات، فصل فیمن یستوفي القصاص: ۴۴۲/۳

(۲) أیضاً

ترجمہ: اور اگر مقتول کے ورثا کچھ چھوٹے اور کچھ بڑے ہوں تو امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق چھوٹوں کے بلوغ سے قبل بڑوں کو قصاص لینے کا حق حاصل ہے۔

إن صالح أحد الشركاء من نصيبه على عوض، أوعفا سقط حق الباقين عن القصاص، وكان لهم نصيبهم من الدية، ولا يجب للعافي شيء من المال. (۱)

ترجمہ:

اگر شرکا میں سے کسی ایک نے (قاتل سے) اپنے حصہ پر کسی عوض کے ساتھ مصالحت کی یا اپنا حصہ معاف کیا، تو قصاص باقی شرکا کے حق میں بھی ساقط ہوگا، البتہ باقی شرکا کے لیے ان کے حصہ کے بقدر دیت ہوگی اور معاف کرنے والے کے لیے مال دیت کا کچھ حصہ واجب نہیں۔

❁❁❁

کروٹ کے نیچے بچہ مرجانے پر کفارہ

سوال نمبر(84):

ایک نومولود بچہ جو تقریباً چالیس دن کا ہو، نیند کی حالت میں والدہ کے کروٹ کے نیچے آکر مرجائے تو کیا یہ قتل خطا میں آتا ہے؟ کیا اس میں دو ماہ لگاتار روزے رکھنا ہوں گے یا استغفار کافی ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی بچے کا سوئے ہوئے انسان کے کروٹ کے نیچے دب کر مرجانا شرعاً قتل خطا نہیں کیونکہ سونے والے کا قصد اس میں شامل نہیں ہوتا۔ یہ قتل جارمجری خطا متصور ہوتا ہے، البتہ یہ قتل خطا کے حکم میں ہے۔ اس میں اگرچہ قاتل پر گناہ نہیں، تاہم قاتل پر کفارہ اور عاقلہ پر دیت لازم ہے۔ کفارہ یہ ہے کہ عورت مسلسل دو ماہ روزے رکھے، درمیان میں ماہواری اس تسلسل میں مخل متصور نہیں ہوگی اور اس کے عاقلہ پر دیت بھی ہے، لیکن آج کل عاقلہ سے دیت وصولی کا مسئلہ دشوار ہے، لہٰذا کفارہ ہی کافی متصور ہوگا۔

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب السادس في الصلح والعفو: ٢١/٦

والدّلیل علی ذلك:

(ماجری مجراه کنائم انقلب علی رجل فقتله)......(وموجبه)......(الکفارة والدیة علی العاقلة) قال ابن عابدینؒ:فحکمه حکم الخطاء في الشرع.(۱)

ترجمہ:

اور قتل جاری مجری، جیسے سویا ہوا شخص کسی پر کروٹ بدلے اور اس کو قتل کر ڈالے، اس میں کفارہ اور عاقلہ پر دیت ہے۔ابن عابدینؒ فرماتے ہیں: شریعت میں اس کا حکم قتل خطا جیسا ہے۔

(وکفارتهما) أي الخطاء وشبه العمد (عتق قن مؤمن، فإن عجز عنه، صام شهرین ولاء، ولا إطعام فیهما).(۲)

ترجمہ:

قتل خطا اور شبہ عمد میں کفارہ مومن غلام کا آزاد کرنا ہے، اگر قاتل اس سے عاجز ہو تو دو مہینے مسلسل روزے رکھے اور مساکین کو کھانا کھلانا ان دو قسموں کی دیت میں شامل نہیں (لہٰذا اس سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا)۔

❁❁❁

شوہر کا بیوی کو مارنے سے بیوی کا حمل ضائع ہونا

سوال نمبر(85):

ایک شخص نے بیوی کو مارا پیٹا، بیوی کا حمل تھا، تقریباً بیس دن بعد اس عورت کے مردہ بچہ کا اسقاط ہوا۔کیا اس صورت میں خاوند پر کچھ کفارہ لازم آتا ہے؟ یاد رہے کہ اس سے قبل بھی اس عورت کا از خود ایک بچہ ساقط ہوا تھا۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

بیوی کو مارنے کی وجہ سے حمل ضائع ہونے کی صورت میں دیکھا جائے گا، اگر ضائع شدہ بچہ کے اعضا ظاہر نہ ہوئے ہوں تو کچھ لازم نہیں اور اگر اعضا بن گئے ہوں تو اگر اسقاط کے بعد مر گیا ہو تو دیت اور کفارہ لازم ہوگا، البتہ

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الجنایات: ۱۰/۱۶۱

(۲) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الدیات: ۱۰/۲۳۱،۲۳۲

مردہ ساقط ہوا ہوتو قاتل کے عاقلہ پر غرہ (دیت کا نصف عشر) لازم ہوگا۔

مسئولہ صورت میں بچے کا طبعی موت سے مرجانے کا بھی احتمال ہے،لہٰذا اس کی تحقیق ماہرین سے کی جائے، طبعی موت کے ثبوت کے بعد کچھ لازم نہیں ہوگا،البتہ اگر مار کی وجہ سے موت واقع ہوئی ہوتو اعضا کے عدم ظہور کی صورت میں کچھ لازم نہیں اور ظہورِ اعضا کی صورت میں اسقاط کے بعد مرا ہوتو دیت جب کہ مردہ ساقط ہوا ہوتو غرہ لازم ہوتا ہے۔ تاہم دور حاضر میں عاقلہ اور غرہ کا تعیین مشکل ہے، نیز اس کا حصول بھی حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے جو وہ ادا نہیں کرتی،اس لیے ایسی صورت میں کفارہ ادا کیا جائے جو کہ مستحب ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

(فلو ضرب بطن امرأته، فألقت ابنه میتا، فعلی عاقلة الأب غرة، ولا یرث منها)......(ولا کفارة فی الجنین) عندنا وجوبا بل ندبا.(١)

ترجمہ:

اگر بیوی کے پیٹ پر وار کیا اور اس نے مردہ بچہ جنا تو باپ کے عاقلہ پر غرہ ہوگا اور میراث بھی نہیں لے گا۔۔۔اور جنین کے اسقاط کی صورت میں ہمارے نزدیک وجوبی طور پر کفارہ نہیں، بلکہ مستحب ہے۔

❁❁❁

دیت کی شرعی مقدار چاندی کے حساب سے

سوال نمبر(86):

جناب مفتی صاحب! چاندی کے حساب سے دیت کی شرعی مقدار کیا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

دیت کی شرعی مقدار چاندی کے حساب سے دس ہزار درہم یا اس کی قیمت ہے۔ایک درہم کی مقدار 25.2 رتی ہے،جو گراموں کے حساب سے 3.0618 گرام کا وزن بنتا ہے،اب دس ہزار (درہم) کو 3.0618 (فی گرام) میں ضرب دیں تو اس سے 30618 گرام بنتے ہیں، پھر مروج تولہ کا حساب معلوم

(١) تنویر الابصار مع الدرالمختار، کتاب الدیات، فصل فی الجنین: ١٠/٢٥٢۔٢٥٤

کریں تو وہ 11.664 گرام فی تولہ ہے (اوزان شرعیہ مصنفہ مفتی محمد شفیع کے مطابق) اس پر 30618 گرام کو تقسیم کریں تو اس سے 2625 تولے بن جاتے ہیں۔ لہٰذا چاندی میں یہی دیت ادا کرنی ہوگی، البتہ اگر قیمت کے ذریعے دیت دینی ہو تو اس دن چاندی کی قیمت کا اعتبار ہوگا، یعنی 2625 تولے چاندی کی جتنی قیمت بنتی ہے، وہ دیت میں ادا کی جائے گی۔

10 ہزار درہم کی مقدار تولے کے حساب سے

ایک درہم = 25.2 رتی = 3.0618 گرام

گرام کے اعتبار سے چاندی میں دیت کی مقدار = 10000×3.0618=30618 گرام

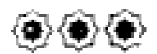
فی تولہ چاندی = 11.664 گرام

تولہ کے اعتبار سے مقدار = 30618 ÷11.664=2625 تولہ

والدّلیل علی ذلک:

وکل دیة وجبت بنفس القتل، یقتضی من ثلاثة أشیاء...... من الإبل مائة، ومن العین ألف دینار ومن الورق عشرة آلاف.(۱)

ترجمہ: ہر دیت جو نفس کے قتل کرنے سے واجب ہوتی ہے، اس کی ادائیگی تین چیزوں سے ہوگی.... سو اونٹ سے یا ایک ہزار سونے کے دینار سے یا دس ہزار چاندی کے درہم سے۔



تمام دانت توڑنے کی دیت

سوال نمبر(87):

اگر ایک شخص دوسرے شخص کے سارے بتیس دانت گرادے تو اُس پر کتنی دیت لازم ہوگی؟ چاندی یا پاکستانی کرنسی کے اعتبار سے اس کی مقدار کی وضاحت فرمائیں۔ بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفیق:

قصداً کسی کے دانت گرانے سے دانتوں کے بقدر قصاص لازم ہوتا ہے اور خطا کی صورت میں دانتوں کے

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الجنایات، الباب السابع في اعتبار حالة القتل: ٦/ ٢٤

بقدر دیت لازم ہوتی ہے۔ ایک دانت کی دیت پانچ سو درہم ہے، لہٰذا تمام بتیس دانت خطاءً گرانے کی صورت میں دراہم کے اعتبار سے دیت کی مقدار سولہ ہزار (16,000) درہم بنتی ہے۔

ایک دانت کی دیت گرام کے اعتبار سے 1530.9 گرام اور تولہ کے اعتبار سے 131.25 تولہ بنتی ہے۔ پھر بتیس کو 131.25 میں ضرب دینے سے 4200 تولہ حاصل ہوتا ہے، یعنی 4200 تولہ چاندی پورے بتیس دانتوں کی دیت بنتی ہے، البتہ اگر قیمت کے ذریعے دیت دینی ہو تو اس دن چاندی کی قیمت کا اعتبار ہوگا، یعنی 4200 تولے چاندی کی جتنی قیمت بنتی ہے، وہی قیمت دیت میں ادا کی جائے گی۔

16 ہزار درہم کی مقدار تولے کے حساب سے

ایک درہم = 25.2 رتی = 3.0618 گرام

ایک دانت کی دیت = 1530.9 گرام = 131.25 تولہ

گرام کے اعتبار چاندی میں دانتوں کی دیت کی مقدار = 16000×3.0618 = 48988.8 گرام

فی تولہ چاندی = 11.664 گرام

تولہ کے اعتبار بتیس دانتوں کی دیت کی مقدار = 48988.8 ÷ 11.664 = 4200 تولہ

والدّلیل علی ذلک:

(وفي كل سن خمس من الإبل) أو خمسون ديناراً، (أو خمس مائة درهم). لقوله عليه الصلاة والسلام "في كل سن خمس من الإبل" يعنى نصف عشر ديته لو حرا و نصف عشر قيمته لو عبدا. فإن قلت: تزيد حينئذ دية الأسنان كلها على دية النفس بثلاثة أخماسها. قلت: نعم ولا بأس فيه لأنه ثابت بالنص على خلاف القياس(۱)

ترجمہ: ہر دانت میں پانچ اونٹ یا پچاس دینار یا پانچ سو درہم دیت واجب ہے۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ "ہر دانت میں پانچ اونٹ (بطورِ دیت) لازم ہیں" یعنی آزاد آدمی ہو تو اس کی دیت کا بیسواں حصہ اور غلام ہو تو اُس کی قیمت کا بیسواں حصہ۔ اگر آپ کہیں کہ اِس طرح تو پھر تمام دانتوں کی دیت آدمی کی پوری دیت سے 3/5 حصے زائد ہوجائے گی۔ تو میں کہتا ہوں کہ ہاں، زائد ہوجائے گی لیکن اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ نص سے خلاف القیاس ثابت ہے۔ (اور جو خلاف القیاس ثابت ہو اُس میں قیاس کو کوئی دخل نہیں ہوتا)

(۱) الدر المختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الدیات: ۲۳۷/۱۰

قتل کی نسبت مباشر کی طرف

سوال نمبر(88):

سواریوں کی گاڑی حسب معمول سواریوں کو لے کر شہر سے گاؤں کی طرف جارہی تھی۔ راستہ میں موسلا دھار بارش شروع ہوئی، برساتی نالے ابل پڑے، گاڑی میں بیٹھے مرد سواریوں نے ڈرائیور کو چلنے کا مشورہ دیا۔ راستہ میں گاڑی نالے میں پھنس گئی اور دو خواتین اور ایک بچہ موقع پر ہلاک ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے افراد کا تاوان کس پر ہوگا سواریوں پر یا ڈرائیور پر؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعت کی رُو سے یہ قتلِ خطا کے قبیل سے ہے، اس لیے قصاص لازم نہ ہوگا، بلکہ دیت لازم ہوگی اور شرعاً فعل کی نسبت مباشر کی طرف کی جاتی ہے، نہ کہ مسبب کی طرف، اس لیے مذکورہ صورت میں مباشر یعنی ڈرائیور کے عاقلہ سے دیت وصول کی جائے گی۔ مسبب، یعنی مشورہ دینے والے سواریوں پر کچھ لازم نہیں آتا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إذا اجتمع المباشر والمتسبب، یضاف الحکم إلی المباشر. (۱)

ترجمہ: جب کسی کام میں مباشر اور مسبب جمع ہو جائیں تو حکم کی نسبت مباشر کی طرف ہوگی۔

❁❁❁

حدود کے اجرا کی اتھارٹی (اختیار)

سوال نمبر(89):

شریعت نے زنا کی گواہی کے لیے چار عادل مردوں کی گواہی شرط قرار دی ہے، لیکن جناب مفتی صاحب اگر کوئی شخص محارم کے ساتھ کسی کو زنا کرتے رنگے ہاتھوں پائے تو کیا اس وقت گواہوں کو ڈھونڈتا پھرے گا؟ اگر کسی نے طیش میں آکر ان کو قتل کر دیا تو کیا اس شخص کو قصاصاً قتل کیا جائے گا؟

بیّنوا تؤجروا

(۱) شرح المجلة لسلیم رستم باز،المادة / ۹۰: ص/۵۹

الجواب وباللہ التوفیق:

جرائم کے انسداد اور روک تھام کے لیے اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں یہ انفرادی اور ذاتی طور پر عمل میں نہیں لائی جاسکتیں۔ بالخصوص حدود اور قصاص کا معاملہ تو بہت نازک ہے۔ اس لیے اس کا اجرا کسی ثالث یا جرگہ کمیٹی کے دائرہ اختیار سے بھی باہر ہیں۔

جرائم میں سے زنا کے ثبوت کے لیے حاکم وقت کے ہاں چار گواہوں کی گواہی ضروری ہے۔ ایسے الزامات میں ناقص گواہی بھی کافی نہیں، البتہ اگر کسی نے غیرت میں آ کر ایسے موقع پر زانی اور مزنیہ کو قتل کیا تو شرعاً اس پر قصاص واجب نہیں۔ بالخصوص جہاں فواحش کے روک تھام میں دوسرے ذرائع کارگر ثابت نہ ہوں، تاہم اس میں یہ ضروری ہے کہ عین زنا کرتے ہوئے پائے جائیں، چنانچہ اگر موقع ہاتھ سے نکل جائے تو اس کے بعد صرف انتقامی جذبہ میں ایسے الزامات میں قتل کرنے کی انفرادی اجازت نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ عدالت سے رجوع کیا جائے۔

والدّلیل علی ذلک:

لو كان مع امرأته، وهو يزني بها أو مع محرمه، وهما مطاوعان قتلهما جميعا.(۱)

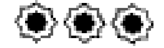
ترجمہ:

اگر کوئی اپنی بیوی یا محرم کے ساتھ کسی کو اس حال میں دیکھے کہ وہ دونوں رضامندی سے زنا کر رہے ہوں تو ان دونوں کو قتل کرنا جائز ہے۔

ويقيمه كل مسلم حال مباشرة المعصية......وأما بعده فليس ذلك لغير الحاكم.(۲)

ترجمہ:

اور ہر مسلمان معصیت (زنا) کے دوران زانی پر تعزیر جاری کر سکتا ہے، البتہ معصیت کرنے کے بعد حدود کا اجرا حاکم کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔



(۱) تنویر الابصار مع الدر المختار، کتاب الحدود، باب التعزیر: ۱۰۸/۶

(۲) تنویر الابصار مع الدر المختار، کتاب الحدود، باب التعزیر: ۱۱۱/۶

ڈاکو کو قتل کرنا

سوال نمبر(90):

کیا ڈاکو کو حیلہ بہانہ سے کسی جگہ بلا کر قتل کرنا شرعاً درست ہے؟ تاکہ لوگ اس کے شر سے محفوظ ہو جائیں، اس کا قاتل شرعاً مجرم شمار ہوگا یا نہیں؟ اور قاتل پر قصاص جاری کیا جائے گا یا نہیں؟ نیز اس کی بھی وضاحت فرمائیں کہ ڈاکو سے برآمد شدہ ساز و سامان اسلحہ وغیرہ کس کا حق ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ حدود جاری کرنے کا اختیار حاکم اور قاضی کے پاس ہے۔ عام فرد حدود جاری نہیں کر سکتا، ہاں جان و مال کو ضیاع سے بچانے کے واسطے احتیاطی تدابیر کی جا سکتی ہیں۔

چنانچہ صورتِ مسئولہ میں ڈاکو کو قتل کرنا عوام کے لیے جائز نہیں، لہٰذا کسی ڈاکو کو حیلہ بہانہ سے بلا کر قتل کرنے والا قاتل شمار ہوگا اور اس سے قصاص کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اور جہاں تک اُس سے برآمد شدہ مال اور سامان کا تعلق ہے تو اگر اس سے دوسروں کے حقوق وابستہ ہوں تو ان کو لوٹایا جائے، ورنہ میراث کا حصہ رہے گا۔

والدّلیل علی ذلك:

وإذا حبس رجل بتهمة قطع الطريق، فقتله رجل قبل أن يثبت عليه شيء، ثم قامت البينة على فعله، وجب القصاص على القاتل. (١)

ترجمہ:

اگر راہ زنی کی تہمت میں کوئی محبوس ہو جائے اور اُس پر جرم ثابت ہونے سے پہلے کوئی اسے قتل کرے، پھر بعد میں اس کے جرم پر گواہ پیش ہوں تو قاتل پر قصاص واجب ہے۔

إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له، لكن إذا علم المالك بعينه، فلا شك في حرمته، ووجوب رده عليه. (٢)

(١) الفتاوى التاتارخانية، كتاب السرقة، الفصل الرابع عشر في المتفرقات: ١٥٠/٥

(٢) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما: ٣٠١/٧

ترجمہ:

جب وارث کو معلوم ہو جائے کہ مورث کی کمائی حرام تھی تو اس کے لیے میراث حلال ہے، لیکن اگر مالک متعین طور پر معلوم ہو تو پھر اس کے حرام ہونے اور اصل مالک کو لوٹانے میں کوئی شک نہیں۔

❁❁❁

ظن اور شبہ کی وجہ سے حدود ساقط ہو جانا

سوال نمبر(91):

ایک شخص کے ہاں چوری ہوئی، چور معلوم نہیں ہے۔ یہاں ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ چور کو کتاب یا ناخن کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس طریقہ سے چور کو معلوم کر کے اس کو سزا دینا شرعاً درست ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ میں اثباتِ جرم کے لیے طریقہ کار متعین ہے۔ اگر مجرم خود اقرار کرے تو ثبوتِ جرم میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ جب کہ انکار کی صورت میں مدعی گواہ پیش کرے گا۔ گواہ نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کے لیے یمین کا راستہ متعین ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آپ سے دعویٰ دفع کرے گا۔

چوری کا تعلق چونکہ حدود سے ہے اور حدود شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں اس لیے کتاب یا ناخن وغیرہ سے چور معلوم کرنے کے طریقوں کا سہارا لینا بے سود ہے۔ یہ سب وہمیات ہیں جو جرم کے اثبات کے لیے ہرگز کافی نہیں۔ شرعاً ایسے جاہل عاملوں کی باتوں پر یقین کرنا جائز نہیں چہ جائیکہ ان کی وہمی باتوں پر حدود کا اجرا کیا جائے۔

والدّلیل علی ذلک:

...قوله عليه السلام: "ادرؤا الحدود بالشبهات" ثم الشبهة نوعان: شبهة في الفعل وتسمى شبهة اشتباه، وشبهة في المحل وتسمى شبهة حكمية ......والحد يسقط بالنوعين لإطلاق الحديث.(١)

ترجمہ: حضور ﷺ کا ارشاد ہے "حدود کو شبہات کی وجہ سے ٹال دیا کرو" شبہ دو قسم پر ہے: شبہ فی الفعل اور اس کو شبہ

(١) الهداية، كتاب الحدود، باب الوطئ الذي يوجب الحدود: ٢/٥٠٥

اشتباہ بھی کہتے ہیں اور شبہ فی المحل اس کو شبہ حکمیہ بھی کہتے ہیں اور حدود دونوں قسموں میں حدیث کے اطلاق کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے۔

❁❁❁

جس زانی کی بیوی فوت ہو چکی ہو اس کی سزا

سوال نمبر(92):

ایک شخص کی بیوی چھ سات ماہ قبل فوت ہو چکی ہو یا اس کو طلاق دے دی ہو، اور پھر وہ کسی عورت کے ساتھ زنا کا ارتکاب کرے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے، حد یا رجم؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام نے احصان کے لیے جو شرائط تحریر فرمائی ہیں، من جملہ ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ زانی نے نکاح صحیح میں بیوی کے ساتھ جماع کیا ہو، پھر خواہ زنا کے وقت اس کی بیوی زندہ ہو یا مر چکی ہو، اس کے نکاح میں ہو یا طلاق ہو چکی ہو، بہر حال وہ محصن شمار ہوگا، چنانچہ ایسا شخص اگر زنا کرے اور اس کا احصان اور زنا مسلمان حاکم یا قاضی کی عدالت میں ثابت ہو تو اس کو رجم کی سزا دی جائے گی۔

والدلیل علی ذلک:

(و) اعلم أنه (لایجب بقاء النکاح لبقائه) أي الإحصان ؛ فلو نکح في عمره مرة، ثم طلق وبقي مجردا وزنی رجم.قال ابن عابدینؒ تحت قوله(ثم طلق)عبارة الدرر: ثم زال النکاح، وهي أعم لشمولها زوال النکاح بموتها أو ردتها أو نحوذلك.(۱)

ترجمہ: اور جان لو کہ احصان کی بقا کے لیے نکاح کی بقا ضروری نہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص زندگی میں ایک مرتبہ نکاح کر چکا ہو پھر بیوی کو طلاق دے کر اکیلا رہ چکا ہو اور اس نے زنا کیا تو رجم کیا جائے گا۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ: زوال نکاح عام ہے چاہے نکاح موت سے زائل ہو یا ردت سے یا کسی اور وجہ سے۔

❁❁❁

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحدود، باب الوطئ الذي یوجب الحد،مطلب شرائط الاحصان: ۶/۲۴،۲۵

زانی کا زانیہ کے شوہر کو قتل کرنا

سوال نمبر(93):

ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ گھر میں کسی شخص کو دیکھا۔اجنبی شخص کو دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہوئے اس نے کلہاڑی لے کر اس پر وار کیا۔اجنبی شخص نے بارہا اس کو روکا تا کہ اس کو سمجھائے کہ اس کی بیوی بدکار ہے اور یہ اس کو سمجھانے آیا تھا، بہر حال وہ ایک نہیں مان رہا تھا اور پے در پے وار کیے جا رہا تھا۔آخر کار اس اجنبی شخص نے دفاع میں اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔شریعت کی رُو سے اس قتل کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کوئی شخص بیوی کے ساتھ اپنے گھر میں کسی غیر محرم کو بدکاری کرتے ہوئے پائے اور اس کو قتل کرے تو اس کا قتل شرعاً معاف ہے۔

مسئولہ صورت میں اگر شوہر نے اجنبی شخص کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہو اور پھر اس اجنبی پر کلہاڑی سے وار کیا ہو تو یہ وار کرنا اس کے لیے درست تھا، اور زانی کو دفاعاً اس کو قتل کرنا جائز نہیں تھا۔البتہ اس اجنبی قاتل کو قصاصاً قتل کرنا حکومت وقت کی ذمہ داری ہے اور اگر شوہر نے اجنبی کو زنا کرتے ہوئے نہیں دیکھا، بلکہ صرف گھر میں پایا تو اس کا قتل شرعاً درست نہیں تھا البتہ اس کا مارنا اور زخمی کرنا جائز تھا، لہٰذا اگر اجنبی کو یقین ہوا ہو کہ گھر کا مالک مجھے جان سے مارنا چاہتا ہے اور اپنے دفاع میں اُسے گولی مار کر ہلاک کیا ہو تو شبہ کی وجہ سے قاتل سے قصاص لینا جائز نہیں، تاہم اس صورت میں دیت آئے گی، لیکن اگر اجنبی کو یقین تھا کہ گھر کا مالک مجھے قتل نہیں کر پائے گا، صرف مجھے زخمی کرنے کے درپے ہے اور پھر بھی اس نے دفاعاً قتل کیا ہو تو قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا وجد رجلا مع امرأة لاتحل له قبل أن يزني بها فهذا لايحل قتله إذاعلم أنه ينزجر بغير القتل...... أما إذا وجده يزني بها فله قتله مطلقا.(۱)

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحدود، باب التعزیر،مطلب یکون التعزیر بالقتل: ۱۰۸/٦

ترجمہ:

جب کوئی شخص کسی کو بیوی کے ساتھ پائے تو اسے زنا سے قبل قتل کرنا جائز نہیں، بشرطیکہ اس کو معلوم ہے کہ قتل کے بغیر منع ہو جائے گا۔۔۔۔البتہ اگر زنا کرتے ہوئے پایا تو اس کے لیے اس زانی کا قتل کرنا جائز ہے۔

❁❁❁

ہاتھ کٹنے کے بعد چوری شدہ مال کا ضمان

سوال نمبر(94):

ایک شخص نے چوری کی جس کی سزا میں اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔کیا حد کے بعد چوری کردہ مال کا بھی ضامن ہوگا یا نہیں؟تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر چوری شدہ مال بعینہٖ موجود ہو تو اصل مالک کو واپس کیا جائے گا،خواہ چور نے کسی کو فروخت کیا ہو یا ہبہ کیا ہو۔اور اگر وہ چوری شدہ مال ہلاک ہو چکا ہو تو ایسی صورت میں قضاءً چور پر حد کے اجرا کے بعد ضمان نہیں،لیکن دیانۃً اس کی قیمت مالک کو لوٹانا ضروری ہے،اگرچہ اس میں چور کا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

(وترد العين لو قائمة) وإن باعها أووهبها لبقائها على ملك مالكها (ولا فرق)في عدم الضمان (بين هلاك العين واستهلاكها في الظاهر) من الرواية ؛ لكنه يفتى بأداء قيمتهاديانة. (۱)

ترجمہ:

اگر چوری شدہ چیز بعینہٖ موجود ہو تو مالک کو لوٹایا جائے گا،اگرچہ چور نے اُسے فروخت کیا ہو یا ہبہ کیا ہو،کیوں کہ مالک کی ملک میں باقی ہے اور ہلاک اور استہلاک دونوں صورتوں میں عدم ضمان میں ظاہراً کوئی فرق نہیں ہے،لیکن دیانتاً اس کی قیمت ادا کرنے کا فتویٰ دیا جائے گا۔

---

(۱) الدرالمختار علی صدرردالمحتار، کتاب السرقۃ، باب کیفیۃ القطع واثباتہ: ۱۷۹/۶، ۱۸۰

حدِ سرقہ کی مقدار گراموں میں

سوال نمبر (95):

حدِ سرقہ میں مال مسروقہ کی مقدار دراہم کے لحاظ سے تو دس درہم ہے، لیکن چونکہ موجودہ دور میں عموماً سونا چاندی تولہ یا گراموں کے لحاظ سے فروخت ہوتا ہے اس لیے مہربانی فرما کر گراموں کے حساب سے مقدار کی تعیین فرمائیں۔

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مالِ مسروقہ کی مقدار دس درہم ہو تو جرم ثابت ہونے پر سارق کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ گرام کے اعتبار اس کی مقدار 30.618 گرام بنتی ہے، جب کہ تولہ کے اعتبار 2.625 تولہ چاندی ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

وإذا سرق العاقل البالغ عشرة دراهم، أومايبلغ قيمته عشرة دراهم مضروبة من حرز لاشبهة فيه، وجب عليه القطع.(۱)

ترجمہ: جب عاقل بالغ دس درہم یا اس کی قیمت کے برابر محفوظ چیز کی چوری کرے، جس میں شبہ نہ ہو تو چور کا ہاتھ کاٹنا واجب ہے۔

❁❁❁

حدود زواجر ہیں یا سواتر؟

سوال نمبر (96):

ایک شخص پر جب دنیا میں حد جاری ہو جائے تو کیا اس سے اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے یا آخرت کا عذاب بھی اس کو دیا جائے گا؟ شریعت کی رُو سے وضاحت فرمائیں۔

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

حدود احناف کے ہاں زواجر ہیں، سواتر نہیں، لہٰذا حدود سے گناہ معاف نہیں ہوتا، بلکہ آخرت کی سزا مجرم پر

(۱) الهداية، كتاب السرقة: ۲/ ۵۲۴

باقی رہتی ہے، تاہم اگر مجرم حد جاری ہونے کے ساتھ صدقِ دل سے توبہ بھی کرے تو آخرت کے عذاب سے بھی خلاصی کی اُمید کی جاسکتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کفر اور ارتداد جیسے سخت گناہوں کو بھی توبہ اور اسلام قبول کرنے سے معاف فرمادیتے ہیں تو اُمید ہے کہ جو مجرم صدقِ دل سے توبہ کرے اس کو بھی معاف فرمائیں گے۔

والدّلیل علی ذلك:

(الحد عقوبة مقدرة وجبت حقا لله تعالى) زجرا...... وليس مطهرا عندنا، بل المطهر التوبة.

قال ابن عابدينؒ: رجل شرب الخمر وزنى ثم تاب ولم يحد في الدنيا هل يحدله في الآخرة؟ قال:الحدود حقوق الله تعالى إلاأنه تعلق بها حق الناس وهو الإنزجار، فإذا تاب توبة نصوحا أرجوأن لايحد في الآخرة، فإنه لايكون أكثر من الكفر والردة، وإنه يزول بالإسلام والتوبة.(١)

ترجمہ: حد اللہ تعالیٰ کے حق کی وجہ سے زجراً مقرر کردہ واجب سزا ہے...... ہمارے نزدیک یہ گناہ سے پاک کرنے والا نہیں، بلکہ پاک کرنے والا توبہ ہے۔ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ: ’’اگر ایک شخص نے شراب پی اور زنا کیا، پھر توبہ کیا اور دنیا میں اس پر حد جاری نہ ہوا تو کیا آخرت میں اس کو حد ہوگا؟‘‘ کہتے ہیں کہ حدود اگرچہ حقوق اللہ ہیں، لیکن اس کے ساتھ حق الناس بھی متعلق ہے جو دوسروں کو ڈرانا ہے۔ چنانچہ جب بندہ سچی توبہ کرے تو امید ہے کہ آخرت میں سزا نہ ہوگی، کیوں کہ یہ فعل کفر اور ارتداد سے زیادہ سخت نہیں، جب کہ کفر وارتداد بھی توبہ سے زائل ہوجاتے ہیں (تو زنا اور شراب پینا بھی توبہ سے معاف ہوسکتے ہیں)۔

❁❁❁

قاضی نہ ہونے کی صورت میں قاتل کو قصاصاً قتل کرنا

سوال نمبر(97):

کیا مقتول کے ورثا قاتل کو ازخود قتل کرنے کے شرعاً مجاز ہیں؟ اگر نہیں تو جس علاقہ میں قاضی نہ ہو وہاں مقتول کے ورثا کے لیے قاتل کو قصاصاً قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

کسی شخص کے قتل کیے جانے پر مقتول کے ورثا کو قصاص لینے کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز ہے، البتہ اجرائے حدود وقصاص کا اختیار صرف حاکم یا اس کی طرف سے مقرر کردہ نائب کو حاصل ہے۔ جہاں کہیں قاضی وغیرہ موجود نہ ہو، وہاں

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الحدود، مطلب التوبة تسقط الحد قبل سقوطه: ٦/٣، ٤

پر بھی عوام کو قصاص لینے کا حق حاصل نہیں، لہٰذا حکومتِ وقت کے ذریعہ سے اجرائے قصاص کی ممکنہ کوشش کی جائے، بصورت دیگر صلح کر لینا بہتر رہے گا۔

والدّلیل علی ذلک:

وأما شرائط جواز إقامتها فمنها ما يعم الحدود كلها ومنها ما يخص البعض دون البعض. أما الذي يعم الحدود كلها فهو الإمامة: وهو أن يكون المقيم للحد هو الإمام أو من ولاه الإمام. (۱)

ترجمہ: حدود کے قیام کے جواز کی جو شرائط ہیں، اُن میں سے کچھ تمام حدود کو شامل ہیں اور کچھ بعض حدود کے ساتھ خاص ہیں۔ جو شرط تمام حدود کو شامل ہے وہ امامت ہے۔ اس شرط کا مقصد یہ ہے کہ حد کو قائم کرنے والا حاکم یا اس کا مقرر کردہ شخص ہو۔

لم يسمح الشرع للأفراد أن يطبقوا القصاص بأنفسهم، وإنما حصر تطبيق القصاص وإقامة الحدود بولاة الأمور؛ لأن الله سبحانه خاطب جميع المؤمنين بالقصاص، ولا يتهيأ للمؤمنين جميعا أن يجتمعوا على القصاص، فأقاموا السلطان مقام أنفسهم في إقامة القصاص وغيره من الحدود. (۲)

ترجمہ: شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ لوگ خود قصاص کو نافذ کریں، بلکہ قصاص اور حدود کا نفاذ صرف حکمرانوں کے پاس ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو قصاص لینے کے حکم میں مخاطب کیا اور تمام مسلمانوں کا قصاص لینے میں جمع ہونا ممکن نہیں، پس انہوں نے حدود اور قصاص میں حاکم کو اپنا قائم مقام بنالیا۔

زانیہ عورت کا علاج کرنے والی لیڈی ڈاکٹر کو قتل کرنا

سوال نمبر (98):

ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس زانیہ عورتیں اسقاطِ حمل کرانے آتی ہیں۔ اسقاطِ حمل کو اپنا پیشہ بنا کر یہ لیڈی ڈاکٹر کافی رقم کماتی ہے جس سے زنا کو فروغ مل رہا ہے۔ کیا شرعاً ایسی لیڈی ڈاکٹر کو قتل کرنا درست ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حدود وقصاص کا نفاذ حاکم یا اس کا نائب کر سکتا ہے۔ ہاں شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے وعظ ونصیحت کرنا

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل واما شرائط جواز اقامتها: ۹/۲۵۰

(۲) د. وهبة الزحيلي، تفسير المنير، البقرة، الآية: ۱۷۸، ۱۷۹: ج۲/ص۱۰۹

ہر خاص وعام کے لیے جائز ہے۔مسئولہ صورت میں لیڈی ڈاکٹر کا قتل یا اسے سزا دینا عوام الناس کے لیے قطعاً جائز نہیں، بلکہ اس کو حکمت وبصیرت سے سمجھایا جائے، نہ ماننے کی صورت میں حکومت کے ہاں استغاثہ کیا جائے۔

والدّلیل علی ذلك:

وأما شرائط جواز إقامتها فمنها ما يعم الحدود كلها ومنها ما يخص البعض دون البعض. أما الذي يعم الحدود كلها فهو الإمامة: وهو أن يكون المقيم للحد هو الإمام أو من ولاه الإمام. (۱)

ترجمہ: حدود کے قیام کے جواز کی جو شرائط ہیں،اُن میں سے کچھ تمام حدود کو شامل ہیں اور کچھ بعض حدود کے ساتھ خاص ہیں۔جو شرط تمام حدود کو شامل ہے وہ امامت ہے۔اس شرط کا مقصد یہ ہے کہ حد کو قائم کرنے والا حاکم یا اس کا مقرر کردہ شخص ہو۔

❁❁❁

رشتہ دار چور کا ہاتھ کاٹنا

سوال نمبر(99):

اگر ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار سے چوری کرے تو کیا چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں؟ بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ نے اثباتِ جرم کے بعد چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم لگایا ہے تاکہ لوگوں کے اموال محفوظ ہوں اور چوری جیسے مذموم جرائم کا انسداد ہو۔البتہ جہاں کہیں چوری کے جرم میں شبہ کا امکان ہو تو وہاں "الحدود تندرء بالشبہات" کی بنا پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ رشتہ دار اگر ذی رحم محرم (بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، ماموں، خالو، خالہ، باپ، بیٹا) یا شوہر اور بیوی ہوں تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ان رشتہ داروں کے علاوہ باقی رشتہ داروں سے چوری کرنے کی صورت میں ہاتھ کاٹا جائے گا،تاہم یاد رہے کہ اجراء حدود حکومت وقت کی ذمہ داری ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

(ومن سرق من أبويه) وإن عليا (أو ولده) وإن سفل (أو ذي رحم محرم منه) كالأخ، والأخت، والعم، والخال، والخالة، والعمة (لايقطع)...(وإذاسرق أحدالزوجين من مال الآخر......لم يقطع).(۲)

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الحدود،فصل واماشرائط جوازاقامتها:۹/ ۲۵۰

(۲) فتح القدير، کتاب السرقة، باب مايقطع فيه ومالايقطع، فصل في الحرز والاخذ منه: ۵/ ۱۴۲،۱۴۳

ترجمہ: جس شخص نے اپنے ماں باپ سے یا جوان سے اوپر درجے کے ہیں (دادا، دادی) سے چوری کی یا اپنی اولاد (بیٹا، بیٹی) سے یا جوان سے درجے میں نیچے ہوں (جیسے پوتا پوتی) سے چوری کی یا اپنے کسی ذی رحم محرم رشتہ دار جیسے بھائی، بہن چچا، ماموں، خالہ، پھوپھی سے چوری کی تو اس چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔۔۔اسی طرح اگر میاں بیوی میں سے کسی ایک نے دوسرے سے چوری کی تو بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

❁❁❁

غیر مسلم ممالک میں موجب حد جرائم سے تزکیہ کا طریقہ کار

سوال نمبر(100):

ایک شخص غیر مسلم ملک میں رہتا ہے۔ اگر اس سے ایسے جرم کا ارتکاب ہو جائے جس پر شرعاً حد جاری ہوتی ہو، تو غیر مسلم ملک میں رہتے ہوئے اس کے تزکیہ کا کیا طریقہ ہوگا؟ بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

حدود کے اجرا کے لیے قوتِ نافذہ کا ہونا ضروری ہے اور نفاذ کے لیے مسلمان حاکم یا اس کے نائب کا ہونا ضروری ہے۔ انفرادی طور پر اس پر عمل کرنا ممکن نہیں۔

لہٰذا غیر مسلم ممالک میں موجب حد جرائم سے تزکیہ توبہ ہی سے ممکن ہے، جیسے کفارہ کے لیے حد کے اجرا کے ساتھ خالص توبہ ضروری ہے ایسے ہی جہاں کہیں حد کا اجرا ممکن نہ ہو، وہاں توبہ سے تزکیہ حاصل ہو جائے گا۔

والدّلیل علی ذلک:

رجل أتی بفاحشة ثم تاب وأناب إلی اللہ تعالیٰ، فإنه لایعلم القاضي بفاحشته لإقامة الحد علیه؛ لأن الستر مندوب إلیه.(۱)

ترجمہ:

ایک شخص گناہ کرے، پھر توبہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، تو وہ قاضی کو اپنا گناہ نہ بتلائے کہ اس پر حد جاری کرے، کیوں کہ گناہ پر پردہ ڈالنا مستحب ہے۔

❁❁❁❁❁

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحدود، مطلب التوبة تسقط الحد قبل سقوطه: ٤/٦

کتاب التعزیر

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

ایک ایسے صالح اور مثالی معاشرے کی تشکیل اسلامی قوانین کا خاصہ ہے، جہاں انسانی جان، مال، عزت، نسل اور عقل کو مکمل تحفظ حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان امور پر دست درازی کرنے والے شخص کے لیے شریعت میں سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں، تاہم کچھ جرائم ایسے بھی ہیں جن کے لیے شریعت میں کوئی سزا خاص طور پر مقرر نہیں کی گئی ہے، بلکہ ان کا معاملہ قاضی کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ حالات اور کیفیات کو سامنے رکھ کر جو سزا مناسب سمجھے، اس کو نافذ کرے۔ فقہ کی اصطلاح میں ایسی سزا کو "تعزیر" کہتے ہیں۔

لغوی تحقیق:

تعزیر کا لغوی معنی روکنا اور دفع کرنا ہے۔ سزا کے ذریعے بھی چونکہ انسان گناہ اور معصیت سے رک جاتا ہے اور معاشرہ جرائم پیشہ عناصر کی دست درازیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو تعزیر کہتے ہیں۔ (۱)

علامہ حصکفیؒ کے ہاں تعزیر کا معنی تادیب ہے، جب کہ علامہ شامیؒ کے ہاں اس کا اطلاق تفخیم و تعظیم پر بھی ہوتا ہے۔ (۲)

اصطلاحی تحقیق:

فقہ کی اصطلاح میں تعزیر ان جرائم کی سزا کا نام ہے جن میں شریعت کی طرف سے نہ تو مقررہ حد ہو اور نہ کفارہ وغیرہ، لہٰذا جن گناہوں میں حدود کسی شبہ یا فقدانِ شرائط کی وجہ سے نافذ نہ ہو سکیں، ان میں مرتکبِ جرم کو ویسے ہی نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ کسی قدر سرزنش ضرور کی جائے گی۔ (۳)

---

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة تعزير: ۲۵٤/۱۲

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الحدود، باب التعزير: ۱۰۳/٦

(۳) بدائع الصنائع مع الحاشية(۱)، كتاب الحدود، فصل في التعزير: ۲۷۰/۹، رحمة الأمة، محمد بن عبد الرحمن الدمشقي، كتاب السرقة، باب التعزير: ص ۳۰۱، دار الكتب العلمية بيروت، الأحكام السلطانية، الماوردي، محمد بن علي الباب التاسع عشر في أحكام الجرائم، الفصل السادس في التعزير: ص ۲۳٦

مشروعیت:

تعزیر کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے، مثلاً: قرآن میں نافرمان بیوی کو مناسب سرزنش کی اجازت دی گئی ہے۔(۱)

اسی طرح حدیث میں دس سال کے بچے کو نماز نہ پڑھنے پر مارنے کا ذکر ہے۔(۲)

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: کوئی کسی کو یہودی یا مخنث کہے تو اسے بیس کوڑے مارے جائیں۔(۳)

تعزیر، حدود اور قصاص میں فرق:

(۱) حدود اور قصاص کے اثبات کے بعد قاضی کے لیے شریعت کی طرف سے مقرر کردہ سزا کا اجرا واجب ہے، کمی بیشی کا اختیار اس کو نہیں، جب کہ تعزیر میں وہ حالات کو دیکھ کر بذاتِ خود کمی بیشی پر فیصلہ کر سکتا ہے۔

(۲) حدود میں ثابت ہونے کے بعد عفو، شفاعت اور اسقاط نہیں ہوتا، جب کہ تعزیر میں جرم ثابت ہونے کے باوجود اگر قاضی شفاعت یا عفو میں مصلحت سمجھے تو قبول کر سکتا ہے، البتہ اگر تعزیر سے کسی بندے کا حق متعلق ہو اور وہ تعزیر کا مطالبہ کر رہا ہو تو پھر قاضی کو عفو کا اختیار نہیں۔

(۳) حدود و قصاص صرف گواہی اور اقرار سے ثابت ہوتے ہیں، جب کہ تعزیر شہادتِ سماعی، قسم اور عورتوں کی گواہی سے بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

(۴) حدود شبہات سے ساقط ہوتے ہیں، بخلاف تعزیر کے۔

(۵) حدود میں اقرار کے بعد رجوع درست ہے، جب کہ تعزیر میں اقرار کرنے کے بعد رجوع درست نہیں۔

(۶) حدود نابالغ بچے پر جاری نہیں ہو سکتے، بخلاف تعزیر کے۔

(۷) حدود تقادم (زیادہ وقت گزرنے) کی وجہ سے ساقط ہوتے ہیں، بخلاف تعزیر کے۔

(۸) حدود امام کے ساتھ خاص ہیں، جب کہ تعزیر ہر صاحبِ جاہ کے لیے جائز ہے۔

(۹) حدود میں مجرم کے خلاف گواہی ہونے تک اس کو قید میں رکھا جا سکتا ہے، بخلاف تعزیر کے۔(۴)

---

(۱) النساء:۳۴۔ (۲) المستدرك للحاكم، النيسابوري، محمد بن عبدالله، كتاب الصلوة، باب في مواقيت الصلوة، رقم(۷۰۸): ۳۱۲/۱۔ (۳) سنن الترمذي، أبواب الحدود، باب ماجاء في من يقول للآخر يامخنث: ۴۰۳/۱

(۴) بدائع الصنائع، كتاب الحدود، فصل في صفة التعزير، وفصل في بيان مايظهر به: ۲۷۳،۲۷۴/۹، رد المحتار على هامش الدر المختار، كتاب الحدود، باب التعزير: ۱۰۳/۶

تعزیر کے خاص مقاصد:

تعزیر کا بنیادی مقصد جرائم پیشہ عناصر کی حوصلہ شکنی ہے، اس لیے تعزیرات کو زواجر بھی کہتے ہیں، تاہم اس میں قاضی کے لیے خوب سوچ سمجھ کر اقدام کرنا چاہیے، اس لیے کہ فقہا کے ہاں تعزیر محض تعذیب، اتلاف اور مارنے پیٹنے کا نام نہیں، بلکہ یہ تو تادیب، تطہیر اور تہذیب کے لیے ہوتا ہے۔(۱)

تعزیر ثابت ہونے کے اسباب:

تعزیر ہر اس جرم سے ثابت ہوتا ہے جس میں شریعت کی طرف سے مقرر کردہ سزا نہ ہو، چاہے وہ حقوق اللہ میں سے ہو، جیسے: نماز، روزے اور زکوٰۃ وغیرہ میں سستی اور کوتاہی، یا حقوق العباد میں سے ہو، جیسے: کسی مسلمان کو بلاوجہ تکلیف دینا یا اس کی جان، مال اور عزت وآبرو پر دست درازی کرنا۔(۲)

تعزیر کا حکم:

حنفیہ و مالکیہ کے ہاں اگر قاضی کو غالب گمان یہ ہو کہ مجرم تعزیر کے بغیر راہِ راست پر نہیں آرہا تو اس کے لیے تعزیر واجب ہے، البتہ اگر کسی دوسرے طریقے سے سدھرنے اور راہ راست پر آنے کی گنجائش ہو تو پھر واجب نہیں، بلکہ مشروع ہے۔(۳)

تعزیر کی حد:

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں تعزیر کی زیادہ سے زیادہ حد ۳۹ کوڑے ہیں، یعنی جہاں سے حدود کا ادنیٰ مرتبہ شروع ہوتا ہے، وہیں پر تعزیر کا اعلیٰ مرتبہ ختم ہوجاتا ہے اور حد کا سب سے کم مرتبہ ۴۰ کوڑے ہیں جو غلام پر حدِ شرب اور حدِ قذف میں جاری ہوتے ہیں۔ جمہور کا یہ قاعدہ حدیثِ مبارک ''من بلغ حداً في غير حد فهو من المعتدين'' سے ثابت ہے۔(۴)

---

(۱) تبيين الحقائق، كتاب الحدود، باب حد القذف، فصل في التعزير:۳/۶۳۳، الأحكام السلطانية، الباب التاسع عشر في أحكام الجرائم، الفصل السادس في التعزير: ص ۲۳۶، المغني، التعزير يكون بالضرب والحبس، رقم (۷۳۷۵):۱۰/۳۴۳

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الحدود، فصل في التعزير، أسباب وجوبه:۹/۲۷۰

(۳) رحمة الأمة، كتاب السرقة، باب التعزير: ص ۳۰۱، المغني، مسئلة و فصول في التعزير، رقم (۷۳۷۶):۱۰/۳۴۳

(۴) السنن الكبرى للبيهقي، أبي بكر أحمد بن الحسين، كتاب الأشربة، جماع أبواب صفة السوط، باب ماجاء في التعزير، رقم (۱۸۰۷۵):۱۳/۱۴۶

امام ابو یوسفؒ کے ہاں ۷۵ یا ۷۹ کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ امام مالکؒ کے ہاں شرعی حد کی مقدار سے زیادہ مارنے کی بھی گنجائش ہے۔(۱)

مجرم کے اعتبار سے تعزیر کے مراتب:

علامہ کاسانی اور دوسرے مشائخ حنفیہ نے لوگوں کے اعتبار سے تعزیر کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) تعزیر اشراف الاشراف: یعنی معاشرے کے خاص لوگ جو کہ فقہاء اور علمی مقام کے لوگ ہوتے ہیں، ان کی تعزیر کے لیے صرف یہ کافی ہے کہ قاضی ان کی طرف اپنا قاصد بھیج دے کہ آپ حضرات جس فعل کا ارتکاب کر رہے ہیں، یہ آپ کے مناسب نہیں۔

(۲) تعزیر الاشراف: اہل حکومت اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز لوگوں کی تعزیر یہ ہے کہ ان کو عدالت میں بلا کر ان سے بالمشافہ بات چیت کی جائے کہ آپ ایسا نہ کریں، یہ نامناسب ہے۔ ان دونوں اقوال کا مرجع یہ حدیث مبارک ہے:

أقيلوا ذوي الهيآت عثراتهم، إلا حداً من حدود الله.(۲)

صاحب مروت لوگوں سے ان کی لغزشوں کے بارے میں عفو اور تسامح کرو، سوائے اللہ تعالیٰ کی حدود کے (یعنی حدود اللہ کے نفاذ میں ان کی کوئی تخصیص نہیں ہوگی)

(۳) تعزیر الاوساط: عام لوگوں کی تعزیر عدالت میں پیشی اور معمولی قید کے بقدر ہے۔

(۴) تعزیر الاخساء: معاشرے کے بدنام اور خسیس لوگوں کی تعزیر سخت سرزنش، قید اور مار پیٹ تک بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر تعزیر سے کسی بندے کا حق متعلق نہ ہو تو اس میں قاضی کے لیے سفارش اور معافی کی بھی گنجائش ہے یعنی مکمل طور پر چشم پوشی سے کام لیا جاسکتا ہے۔(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في قدر التعزير: ۹/۲۷۱، رحمة الأمة، کتاب السرقة، باب التعزير: ص ۳۰۱، الأحكام السلطانية، الباب التاسع عشر ...... الفصل السادس في التعزير: ص ۲۳۶

(۲) السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الأشربة، جماع أبواب صفة السوط، باب الإمام يعفو عن الهيئات، رقم (۱۸۱۲۱): ۱۲/۱۶۱

(۳) بدائع الصنائع، كتاب الحدود، فصل في قدر التعزير: ۹/۲۷۱، الأحكام السلطانية، الباب التاسع عشر في أحكام الجرائم، الفصل السادس في التعزير: ص ۲۳۶، ۲۳۷، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الحدود، باب التعزير: ۶/۱۰۴، ۱۰۵

تعزیر کے لیے شرائط:

تعزیر کے ثبوت کے لیے صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ ہے عقل، لہٰذا کسی بھی مرد یا عورت، آزاد یا غلام، مسلمان یا کافر، بالغ یا عاقل نابالغ پر تعزیر جاری ہوسکتی ہے، اس لیے کہ تعزیر میں تادیب اور تہذیب کا پہلو بھی ہے۔(۱)

تعزیر کا طریقہ:

تعزیر لاٹھی یا کوڑے کے ذریعے کی جائے گی۔تعزیر میں مارنے کی کیفیت دوسری حدود سے سخت ہوگی۔
بعض فقہاء کے ہاں تعزیر میں نازک اعضا کے علاوہ کسی ایک عضو کو بھی مسلسل مارا جاسکتا ہے۔(۲)
علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں کہ ہاتھ سے کسی کے چہرے یا گردن کو مارنا ایک مسلمان کی توہین ہے، لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔(۳)

تعزیر کی وجہ سے موت واقع ہونے کا حکم:

اگر قاضی بذاتِ خود تعزیر نافذ کررہا ہو تو حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے ہاں تعزیر سے موت واقع ہونے کی صورت میں اس پر کوئی ضمان نہیں، البتہ اگر استاد یا والد کسی بچے یا شاگرد کو تادیباً مار دے اور اس کی موت واقع ہوجائے تو امام ابوحنیفہؒ وامام شافعیؒ دونوں کے ہاں اس پر ضمان واجب ہوگی۔(۴)

تعزیر کی مختلف صورتیں:

تعزیر میں کوڑے مارنے، برا بھلا کہنے اور قید کرنے پر سب کا اتفاق ہے، البتہ فقہاءِ کرام کے ہاں جرم سے باز نہ آنے کی صورت میں اور چند دیگر خاص صورتوں میں قاضی کو درج ذیل سزائیں دینے کی بھی اجازت ہے:(۵)
(۱) جلاوطن کرنا یا قید کرنا (۲) تین دن تک کسی درخت وغیرہ سے لٹکانا (۳) بقدرِ ستر کپڑے چھوڑ کر باقی کپڑے نکالنا (۴) گدھے پر بٹھا کر لوگوں میں اس کے گناہ کا اعلان کرانا (۵) سر منڈوانا (۶) چہرہ کالا کرنا (۷) قتل کرنا

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في شروط وجوب التعزير:۹/۲۷۰
(۲) بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل في صفة التعزير:۹/۲۷۳
(۳) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الحدود، باب التعزير:۶/۱۰۵
(٤) رحمة الأمة، کتاب السرقة، باب التعزير:ص/۳۰۱
(٥) الأحكام السلطانية، الباب التاسع عشرفي أحكام الجرائم، الفصل السادس في التعزير:ص۲۳۶ـ۲۳۹، الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الحدود باب التعزير:۶/۱۰۵ـ۱۰۷

مالی تعزیر:

تعزیر کے باب میں سب سے اہم مسئلہ تعزیر مالی کا ہے۔ائمہ ثلاثہ اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ کے علاوہ باقی سب فقہا کے ہاں تعزیر مالی جائز نہیں۔علامہ ابن عابدین شامیؒ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے جواز والے قول کو ضعیف اور غیر مفتیٰ بہ قرار دے کر اس کو ظالم حکمرانوں کے لیے ناجائز ٹیکس اور غصب کے لیے دروازہ قرار دیا ہے۔علامہ شامیؒ نے بزازیہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ امام تعزیر میں مال لے سکتا ہے،لیکن خود استعمال نہیں کر سکتا، بلکہ مجرم کی توبہ اور اصلاح کے بعد اس کو واپس لوٹا دے گا۔ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ امام اگر مجرم کی توبہ سے ناامید ہو جائے تو خیر کے کام میں اس کو استعمال کرے،تاہم تمام بحث کا خلاصہ آخر میں انہوں نے یوں پیش کیا ہے:

والحاصل أن المذهب عدم التعزير بأخذ المال.(۱)

اگر چہ فقہائے احناف میں سے اکثر ائمہ کے ہاں تعزیر بالمال جائز نہیں لیکن چونکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے اس کا جواز منقول ہے اور موجودہ دور میں جب کہ ملکی و بین الاقوامی سطح پر مالی جرمانے بکثرت رائج ہو چکے ہیں اور ان پر تعامل ہو چکا ہے،اور دیگر شرعی سزاؤں کے فقدان کی وجہ سے اصلاحِ معاشرہ کے لیے اس کی ضرورت بھی محسوس کی جاتی ہے،تو ان حالات میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول سے استفادہ کرتے ہوئے اس کے جواز کی گنجائش دینا مناسب معلوم ہوتا ہے،البتہ اِس سے حاصل شدہ رقم مفادِ عامہ میں خرچ کی جانی چاہیے۔علامہ علاؤالدین طرابلسیؒ اس نقطۂ نظر کی شدت سے حمایت کرتے ہیں،آپ فرماتے ہیں:

ويجوز التعزير بأخذ المال وهو مذهب أبي يوسف، و به قال مالك، ومن قال أن العقوبة المالية منسوخة فقد غلط على مذاهب الأئمة نقلاً و استدلالاً. (۲)

❁❁❁❁❁

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الحدود باب التعزير،مطلب في التعزير بأخذ المال:۶/۱۰۵،۱۰۶

(۲)علاؤالدين علي بن خليل الطرابلسي ،معين الحكام ، فصل التعزير لا يختص بفعل معين، مسئلة: يجوز التعزير بأخذ المال: ص ۲۳۱، مكتبة القدس كانسي روڈ كوئٹه

مسائل کتاب التعزیر

(تعزیر سے متعلق مسائل)

ٹریفک پولیس کا مالی جرمانہ لگانا

سوال نمبر(101):

موجودہ دور ایجادات کا دور ہے۔ ہر شہر اور ہر بازار میں ٹریفک حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس بے ہنگم ٹریفک میں حکومتِ افغانستان نے انسانی جانوں کی حفاظت کی خاطر اور ایکسیڈنٹ کی روک تھام کے لیے ایک قانون نافذ کیا ہے تاکہ لوگ احتیاط کو بروئے کار لا کر ڈرائیونگ کریں، اس قانون میں مختلف دفعات ہیں اور بحمداللہ یہ قانون کسی حد تک کامیاب بھی ہے اس قانون کے دفعہ نمبر "۸۰" کے بارے میں شرعی حوالہ سے جواب مطلوب ہے۔ مادہ نمبر۸۰ درج ذیل ہے:

"ٹریفک پولیس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے پر مالی جرمانہ (پرچی) لگایا جائے گا۔ یہ مالی جرمانہ پھر بینک کے ذریعہ سے بیت المال میں جمع کیا جاتا ہے۔"

کیا مذکورہ دفعہ میں بیان کردہ مالی جرمانہ کا شرعی جواز موجود ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ نے نظام عالم کی بقا کے لیے جرائم کی بیخ کنی کے واسطے مختلف نوعیت کے جرائم پر مختلف سزائیں تجویز کی ہیں، البتہ بعض جرائم کی سزا شریعت نے قطعی طور پر بیان کی ہے جن میں کسی کو رد و بدل کرنے کا قطعاً اختیار نہیں جسے حدود کہتے ہیں اور سزا کی دوسری قسم تعزیر ہے جس میں حاکم وقت کو مملکت کے نظام کو منظم کرنے کے واسطے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ملکی امور کے تحفظ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حالات کا ادراک کر کے ایسی تعزیری سزائیں مقرر کرے جو شرعی اصولوں سے متصادم نہ ہوں۔ تعزیر کے سلسلہ میں تعزیر بدنی کے جواز پر فقہاے کرام کا اتفاق ہے، البتہ تعزیر بالمال (مالی جرمانہ لگانا) میں فقہاے کرام کا اختلاف ہے۔ اکثر فقہاے کرام عدم جواز کے قائل ہیں، تاہم متاخرین

فقہائے کرام تعزیر بالمال کے جواز کے قائل ہیں۔ مالی سزا کے جواز پر ترمذی شریف کی درج ذیل حدیث دلالت کرتی ہے:

عن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من وجدتموه غلّ في سبيل الله، فأحرقوا متاعه، قال صالح: فدخلت على مسلمة ومعه سالم بن عبدالله، فوجد رجلا قد غلّ، فحدّث سالم بهذا الحديث، فأمر به، فأحرق متاعه، فوجد في متاعه مصحف، فقال سالم: بع هذا، وتصدق بثمنه. (۱)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس کو تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیانت کرنے والا پاؤ تو اس کے مال کو جلادو۔ صالح کہتے ہیں کہ میں مسلمہ کے ہاں گیا، اُن کے پاس سالم بن عبداللہ بھی تھے، انہوں نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے پایا تو سالم نے یہ حدیث بیان کی۔ تو حکم دیا گیا اور اس کے مال کو جلا دیا گیا۔ اس کے سامان میں ایک مصحف (قرآن کریم) بھی پایا گیا تو سالم نے فرمایا: اس کو بیچ دو اور اس کی قیمت کو صدقہ کرو۔

اس حدیث کی روشنی میں فقہائے کرام نے یہ استدلال کیا ہے کہ جرم کی سزا میں مجرم سے مال لینا اور اس کو صدقہ کرنا ثابت ہے۔ اس حدیث کی سند میں اگرچہ علمائے کرام نے کلام کیا ہے، تاہم جو فقہائے کرام عدم جواز کے قائل ہیں، ان کے پاس استدلال کے طور پر کوئی صریح حدیث نہیں پائی جاتی، اسی بنا پر امام ابو یوسفؒ کی رائے تعزیر بالمال کے جواز کی ہے۔ معین الحکام میں ہے:

یجوز التعزیر بأخذ المال، وهو مذهب أبي يوسفؒ وبه قال مالكؒ. ومن قال: أن العقوبة المالية منسوخة، فقد غلط على مذاهب الآئمة نقلا واستدلالاً، وليس بسهل دعوى نسخها، وفعل الخلفاء الراشدين وأكابر الصحابة لها بعد موته ﷺ مبطل لدعوى نسخها، والمدّعون للنسخ ليس معهم سنة ولا إجماع يصح دعواهم. (۲)

ترجمہ: تعزیر بالمال جائز ہے، امام ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ عقوبت مالیہ منسوخ ہے، وہ نقلاً اور استدلالاً مذاہب آئمہ کے بارے میں غلطی کا شکار ہیں اور نسخ کا دعویٰ آسان بھی نہیں، کیونکہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ کا اس کو کرنا دعویٰ نسخ کو باطل کرتا ہے اور نسخ کے مدعیوں کے پاس سنت اور اجماع کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۱) الجامع الترمذي، ابواب الحدود، باب ماجاء في الغال مايصنع به: ۱/ ۴۰۳

(۲) معين الحكام: ص/ ۲۳۱

مذکورہ بالاعبارات کی روشنی میں مالی تعزیر کی گنجائش نکلتی ہے۔موجودہ حالات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بعض انتظامی امور میں مالی تعزیر مقرر کی جائے، کیوں کہ ہر جرم پر بدنی سزا سے لوگ مشقت میں پڑ جائیں گے جو تنفیر کا سبب بنے گا اور بسا اوقات بدنی سزا سے کسی جرم کی روک تھام نہیں ہوسکتی لیکن مالی سزا کی بدولت روک تھام ہو جاتی ہے۔اکثر اسلامی ممالک کے قوانین میں تعزیر بالمال شامل ہے،لہٰذا ٹریفک قوانین میں خلاف ورزی کرنے والوں پر تعزیر بالمال کی صورت میں مالی جرمانہ لگانا جائز ہے۔

❁❁❁

بدمعاش کو تعزیراً قتل کرنا

سوال نمبر(102):

ایک شخص نے اُجرتی قاتلوں کے ذریعے کئی افراد کے قتل سے اپنے ہاتھوں کو رنگا ہے۔تمام لوگ اس کے ظلم اور بربریت سے تنگ آچکے ہیں، یہاں تک کہ اب ایک مشہور اور جید عالمِ دین بھی اس کے تیر کا شکار ہوا جس سے اسلامی اقدار پائے مال ہوئے۔کیا علاقہ کے بااثر افراد یا کمیٹی قصاصاً یا تعزیراً ایسے شریر لوگوں کو قتل کرنے کا شرعاً اختیار رکھتے ہیں؟اسی طرح کیا ان کے املاک کو شرعاً تلف کرنا درست ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

عام مسلمان کا قتل گناہِ کبیرہ ہے، جب کہ کسی عالمِ دین کو ظلماً قتل کرنا قہرِ خداوندی کو کھلی دعوت دینے کے مترادف ہے، تاہم ایسی صورت میں قاتل کو قصاصاً یا تعزیراً قتل کرنا ثالث یا جرگہ/کمیٹی کے اختیار سے باہر ہے، ایسے فیصلوں میں حاکمِ وقت کا سہارا لینا شرعاً ضروری ہے۔

علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

إن الحد لایلیه إلاالإمام.(۱)

ترجمہ: حد امام حاکم ہی قائم کرسکتا ہے۔

نیز یاد رہے کہ جب کوئی کسی کو اجرت دے کر قتل کرائے تو اجرت دینے والا مسبب کے درجہ میں ہوتا ہے

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحدود، باب التعزیر، مطلب یکو التعزیر بالقتل: ۱۰۹/۶

ایسی صورت میں مباشر کی موجودگی میں مسبب سے قصاص لینا جائز نہیں۔ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے:

إذا اجتمع المباشر والمتسبب، یضاف الحکم إلی المباشر. (۱)

ترجمہ: جب کسی کام میں مباشر اور مسبب جمع ہو جائیں تو حکم کی نسبت مباشر کی طرف ہوگی۔

تاہم جہاں کہیں علاقائی طور پر فواحش، ظلم اور بربریت کے انسداد کے لیے دیگر ذرائع کارگر ثابت نہ ہوں تو زعمائے علاقہ یا کسی مختار کمیٹی کو تعزیر بالمال کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ کہ ایسے جرائم کی بیخ کنی کے لیے مجرم کا گھر جلایا جائے یا علاقہ بدر ہونے پر مجبور کیا جائے۔

والدلیل علی ذلک:

سمعت من ثقة أن التعزیر بأخذ المال إن رأی القاضي ذلك أو الوالي جاز. (۲)

ترجمہ: میں نے ثقہ (معتمد) افراد سے سنا ہے کہ تعزیر بالمال اگر قاضی یا والی مقرر کرے تو جائز ہے۔

❁❁❁

تادیباً شاگرد کی پٹائی کرنا

سوال نمبر (103):

طالب علم شاگرد کی تادیباً پٹائی کرنا استاد کے لیے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اولاد یا شاگرد کو تادیباً مارنے کی رخصت پائی جاتی ہے، لیکن اس مار پٹائی میں شفقت کا جذبہ مضمر ہوتا ہے، یعنی اس سے طالب علم کو صرف تنبیہ ہو کر اصلاح ہو جاتی ہے، کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ تاہم موجودہ دور میں عالمی سطح پر بچوں کی مار پیٹ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، اِس تادیب کو تعذیب سمجھتا ہے اور بدنامی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے اس لیے بچوں کو جسمانی سزا کی رخصت سے استفادہ کی بجائے اس سے جان بچانا بہتر ہے۔ نیز زمانے میں انصاف کے تقاضے پورے کرنا بھی مشکل ہے، اس لیے ''سدالذرائع'' کے ضابطہ کو سامنے رکھتے ہوئے

---

(۱) شرح المجلة لسلیم رستم باز، المادة / ۹۰: ص/۵۹

(۲) البحرالرائق، کتاب الحدود، باب حد القذف، فصل في التعزیر: ۶۸/۵

بھی بچوں کے مارنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

اور جہاں بچے کی اصلاح مقصود ہو تو جسمانی سزا کی بجائے کوئی اور تادیبی سزا دی جائے، مثلاً: طالب علم پر چھٹی بند کرنا، نوافل پڑھوانا، قرآن کی تلاوت کرنے پر مجبور کرنا، ورزش کروانا، وغیرہ، یہ ایسی تادیبی کارروائی ہے جس میں بچے کی بہتر طریقے سے اصلاح ہو سکتی ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

درء المفاسد أولى من جلب المنفعة. أي إذا تعارضت مفسدة ومصلحة يقدم دفع المفسدة على جلب المصلحة، فإذا أراد شخص مباشرة عمل ينتج منفعة له، ولكنه من الجهة الأخرى يستلزم ضرراً مساوياً لتلك المنفعة أو أكبر منها يلحق بالآخرين، فيجب أن يقلع عن إجراء ذلك العمل درءً للمفسدة المقدم دفعها على جلب المنفعة. (١)

ترجمہ: مفاسد کو ختم کرنا منفعت حاصل کرنے سے بہتر ہے، یعنی جب فساد اور منفعت کا تعارض ہو تو فساد کے دفع کرنے کو منفعت حاصل کرنے پر مقدم رکھا جائے گا۔ چنانچہ جب کوئی شخص کسی ایسے کام کے کرنے کا ارادہ کرے جس کے نتیجہ میں اسے نفع حاصل ہوتا ہو لیکن دوسری طرف لوگوں کو اس نفع کے برابر یا اس سے زیادہ نقصان بھی پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ضروری ہے کہ اس نقصان سے بچنے کے لیے اس کام کو چھوڑا جائے۔

طالب علم پر کھانا یا وظیفہ بند کرنا

سوال نمبر (104):

طلبہ کرام کو مدرسہ کے قواعد وضوابط کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں اور اسباق وغیرہ سے غیر حاضری پر تعزیر اور سزا دینا، خواہ کھانا بند کرنے کی شکل میں ہو یا وظیفہ بند کرنے کی شکل میں ہو، جائز ہے یا نہیں؟ بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مدرسہ کے قواعد وضوابط کو پائے مال کرنا اور اسباق سے غیر حاضر رہنا جرم ہے اور جس جرم کے لیے شرعی حد نہ ہو، اس میں تعزیر دی جا سکتی ہے، لہٰذا مہتمم مدرسہ یا ناظم مدرسہ کے لیے زجر اور تخویف کی خاطر تعزیر دینا مرخص ہے، خواہ تعزیر کھانے بند کرنے کی صورت میں ہو یا وظیفہ بند کرنے کی صورت میں۔ کیونکہ تعزیر دینا صرف حاکم اور

(١) درر الحكام في شرح مجلة الأحكام، المادة / ٣٠ ص: ٤١/١

قاضی سے مختص نہیں بلکہ کسی محکمہ یا ادارہ کے ذمہ دار فرد مثلاً: مہتمم، ناظم وغیرہ کو بھی یہ حق حاصل ہے۔

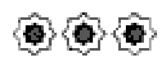
والدّلیل علی ذلك:

لیس فی التعزیر شيء مقدر بل مفوض إلی رأي الإمام: أي من أنواعه، فإنه یکون بالضرب وبغیره.(۱)

ترجمہ: تعزیر میں کوئی سزا مقرر نہیں، بلکہ یہ امام کے اختیار میں ہے، یعنی تعزیر کے اقسام مختلف ہیں، کبھی مار پیٹ کے ساتھ اور کبھی اس کے علاوہ بھی۔

قال ابن عابدینؒ: وزاد بعض المتأخرین أن الحدّ مختص بالإمام، والتعزیر یفعله الزوج والمولی، وکل من رأی أحدا یباشر المعصیة.(۲)

ترجمہ: بعض متاخرین فرماتے ہیں کہ حد امام سے مختص ہے، البتہ تعزیر شوہر، آقا اور ہر وہ شخص دے سکتا ہے جو کسی کو معصیت میں مبتلا پائے۔



سگریٹ نوشی پر جرمانہ لگانا

سوال نمبر(105):

زید اور عمرو کے مابین دوستانہ تعلقات ہیں۔ عمرو سگریٹ پینے کا عادی تھا جس دن عمرو نے سگریٹ نوشی ترک کی، زید نے خوش ہوکر اس کو انعام دیا اور کہا کہ اگر آئندہ سگریٹ نوشی کی تو جرمانہ ہوگا۔ عمرو نے رضامندی کا اظہار کیا۔ کیا اس کے لیے اپنے دوست (عمرو) سے جرمانہ وصول کرنا جائز ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جب دوسرے ذرائع کارگر ثابت نہ ہوں تو شرعاً کسی مصلحت کے پیش نظر مالی جرمانہ لگانا مرخص ہے۔ لہٰذا مسئولہ صورت میں سگریٹ نوشی پر مالی جرمانہ وصول کرنا درست رہے گا، تاہم اس مالی جرمانہ کا استعمال

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الحدود، مطلب في التعزیر بالمال: ۱۰۶/۶

(۲) أیضاً: ۱۰۳/۶

زید کے لیے درست نہیں، بلکہ مصلحت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عمرو کی اصلاح ہو جانے پر اس کا مال اس کو لوٹایا جائے اور یا باہمی طور پر کسی مناسب جگہ صدقہ کریں۔

والدّلیل علی ذلک:

ومعنى التعزير بأخذالمال على القول به، إمساك شيء من ماله عنده مدة لينزجر، ثم يعيده ...... إذلا يجوز لأحد من المسلمين أخذمال أحد بغير سبب شرعي.(١)

ترجمہ: اورتعزیر بالمال کے معنی یہ ہیں کہ اس کے مال سے کوئی چیز حاکم کچھ مدت تک پاس رکھے تاکہ اس کو زجر حاصل ہو، پھر واپس کرے۔۔۔۔کیوں کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ کسی کا مال بغیر شرعی سبب کے ہڑپ کرے۔

❁❁❁

تعزیری سزا کی تحدید اور مساجد میں تعزیری اشیا کا استعمال

سوال نمبر(106):

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند نوجوانوں نے کسی اخلاقی تنازع کی بنیاد پر مسجد میں ایک آدمی کو پیٹا، تین سال بعد فریقین میں صلح ہوئی۔ مارنے والے فریق نے بطور راضی نامہ دو دنبے اور ایک لاکھ روپے دوسرے فریق کے حوالہ کیے۔ دوسرا فریق مارنے والے فریق کو اس شرط پر معاف کرتا ہے کہ مسجد کی ہتک کا جرمانہ بھی دینا ہوگا جو مسجد کے مصارف میں خرچ کیا جائے گا، چنانچہ پچاس ہزار روپے وصول کیے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ مقاماتِ مقدسہ، مساجد، مدارس اور علمائے دین کی ہتک کی صورت میں یا اسی طرح دیگر جرائم کی روک تھام کے لیے مالی جرمانہ از روئے شریعت درست ہے؟ اور اس کو مسجد وغیرہ میں صَرف کرنا درست ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جرائم کے انسداد کے لیے بعض جرائم کی سزا شرعاً متعین ہے، مثلاً: چوری کرنے، زنا کرنے، شراب پینے، پاک دامن عورت پر بہتان لگانے کی سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر جرائم کی روک تھام کے حوالے سے سزا حاکم وقت کے سپرد کی گئی ہے کہ وہ حسبِ مصلحت جرم اور مجرم کی نوعیت کا ادراک کرکے سزا تجویز کرے جس کو تعزیری سزا سے موسوم کیا

---

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الحدود، فصل في التعزير: ٢/ ١٦٧

گیا ہے۔ تعزیر میں کوئی قولی یا فعلی سزا متعین نہیں، حسب مصلحت افراد کی نوعیت اور حالات سے بدلتی رہتی ہے جو شخص خلاف شرع امور پر اصرار کرتا ہے، اس کی برادری کو اس پر تعزیر کا حق حاصل ہے، کیوں کہ بوقت ارتکاب معصیت ہر مسلمان مرتکب معصیت پر تعزیر قائم کرنے کا مجاز ہے، تاہم معصیت کے بعد شوہر، ولی، باپ یا حاکم کو تعزیری سزا کا حق حاصل ہے۔

تعزیری سزا کی کئی صورتیں ہیں: قید کرنا، گوشمالی، سخت کلامی اور مار پٹائی وغیرہ۔ تعزیر مختلف افراد اور مختلف حالات کے مطابق دی جاتی ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

ليس في التعزير شيء مقدر بل مفوض إلى رأي الإمام: أي من أنواعه، فإنه يكون بالضرب وبغيره.(۱)

ترجمہ: تعزیر میں کوئی سزا مقرر نہیں، بلکہ یہ امام کے اختیار میں ہے، یعنی تعزیر کے اقسام مختلف ہیں، کبھی مار پیٹ کے ساتھ اور کبھی اس کے علاوہ بھی۔

قال ابن عابدينؒ: وزاد بعض المتأخرين أن الحد مختص بالإمام، والتعزير يفعله الزوج والمولى، وكل من رأى أحدا يباشر المعصية.(۲)

ترجمہ: بعض متاخرین فرماتے ہیں کہ حد امام سے مختص ہے، البتہ تعزیر شوہر، آقا اور ہر وہ شخص دے سکتا ہے، جو کسی کو معصیت میں مبتلا پائے۔

تاتارخانیہ میں ہے:

قد يكون التعزير بالحبس، وقد يكون بالصفع، وتعريك الأذن، وقد يكون بالكلام العنيف، وقد يكون بالضرب.(۳)

ترجمہ: تعزیر کبھی قید، کبھی گوشمالی اور کبھی سخت کلامی اور کبھی پٹائی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

جہاں کہیں علاقائی سطح پر فواحش اور ظلم وستم کے انسداد کے لیے کوئی دوسرا قابل عمل واصلاحی طریقہ موجود نہ ہو، تو پھر بااثر اشخاص یا کسی خود مختار کمیٹی کو بقول امام ابو یوسفؒ "تعزیر بالمال" کی راہ اختیار کرنے کی گنجائش ہے، لیکن مالی جرمانہ کے جواز کا مطلب یہ ہے کہ مجرم سے مال لیا جائے کچھ مدت تک جتنا مناسب ہو، اپنے پاس رکھا جائے، جب

(۱) ردالمحتار على الدر المختار، كتاب الحدود، مطلب في التعزير بالمال: ۱۰۶/۶

(۲) ردالمحتار على الدر المختار، كتاب الحدود، مطلب في التعزير بالمال: ۱۰۳/۶

(۳) الفتاوى التاتارخانية، كتاب الحدود، الفصل الثامن في التعزير: ۹۸/۵

مجرم جرم سے توبہ کرے تو واپس کیا جائے۔ یاد رہے کہ اس رقم کو مسجد، مدرسہ یا کسی اور نیک کام میں صَرف کرنا جائز نہیں، خاص کر مسجد کا معاملہ نہایت سنگین ہے، اس میں کسی ایسے مال کا خرچ کرنا جائز نہیں جس میں دینے والے کے اخلاص کی نیت کارفرما نہ ہو، جبری طور پر جو مال کسی سے لیا جاتا ہے، اس میں جبر واکراہ کا اثر ہوتا ہے، اس لیے یہ مال کسی صورت میں مسجد میں خرچ نہیں کیا جاسکتا، البتہ اگر مالک خود برضا ورغبت اس کی اجازت دے تو پھر اس کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

ومعنى التعزير بأخذالمال على القول به، إمساك شيء من ماله عنده مدة لينزجر، ثم يعيده ......

إذلايجوز لأحد من المسلمين أخذمال أحد بغير سبب شرعي.(١)

ترجمہ:

تعزیر بالمال کے معنی یہ ہیں کہ اس کے مال سے کوئی چیز حاکم کچھ مدت تک اپنے پاس رکھے تاکہ اس کو زجر حاصل ہو، پھر اُسے واپس کرے.... کیوں کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ کسی کا مال بغیر شرعی سبب کے ہڑپ کرے۔

❁❁❁

راہزن کو قتل کرنا

سوال نمبر(107):

کوئی راہزن (قاطع الطریق) جو برسرِ عام رہزنی کرتا ہو۔ حکومتِ وقت بھی اس کو نہ روکتی ہو۔ کیا عوام ایسے شرپسند اور موذی شخص کو اپنے تئیں قتل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

راہزن کو اس کے غلط فعل سے روکنا اور اس کو تعزیراً سزا دینا، حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے۔ منع نہ ہونے پر حکومتِ وقت فساد کی روک تھام کے لیے ایسے شخص کو تعزیراً وسیاستاً قتل بھی کرسکتی ہے۔ لیکن عوام کے لیے راہزن کو قتل کرنا، ہرگز جائز نہیں، عوام کو چاہیے کہ حکمت وبصیرت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا راستہ اختیار کر کے ترغیب وترہیب سے کام لیں، یا پھر اس کو فعل بد سے روکنے کے لیے اتفاق واتحاد سے ترکِ موالات کی راہ اختیار کریں۔

---

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الحدود، فصل في التعزير: ١٦٧/٢

والدلیل علی ذلك:

(ویکون)التعزیر (بالقتل)......وفي الشامیة: أن للإمام قتل السارق سیاسة: أي إن تکرر منه......

(وعلی هذا) القیاس (المکابر بالظلم وقطاع الطریق ...... وجمیع الظلمة).(۱)

ترجمہ:

اور تعزیر کبھی قتل کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے،شامی میں ہے: حاکم چور کو سیاستاً قتل کر سکتا ہے،یعنی اگر وہ چوری بار بار کرے،اسی طرح علانیہ طور پر ظلم کرنے والے،راہزنوں اور تمام ظلم کرنے والوں (کو بھی تعزیراً حاکم قتل کر سکتا ہے)۔

❁❁❁

مجرم کو جلاوطن کرنا اور اُس سے مال لینا

سوال نمبر(108):

قبائلی علاقوں میں عام طور پر لوگ جرگہ سسٹم کے تحت فیصلہ کرتے ہیں۔اس کی شرعی حیثیت کیا ہے،مثلاً قتل کی صورت میں قاتل کو جلاوطن کرتے ہیں اور ساتھ ہی کچھ مالی جرمانہ وصول کر کے تمام گاؤں والوں کے لیے کھانے کا پروگرام کراتے ہیں۔

اگر ایسا فیصلہ نہ کیا جائے تو مقتول کے ورثا انتقامی کارروائی میں قاتل کے دوسرے رشتہ دار افراد کو بھی قتل کرتے ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ طویل ہوتا جاتا ہے اور باہمی قتل وقتال کی فضا بن جاتی ہے جو کہ مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہے اور مذکورہ بالا فیصلہ کی صورت میں طرفین قتل وقتال اور دشمنی سے بچ جاتے ہیں یہ بھی مشاہدے اور تجربہ سے عملاً ثابت ہے۔کیا اس قسم کے فیصلوں میں جلاوطنی یا مالی جرمانہ لگانا شرعاً جائز ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

ہر انسانی معاشرہ میں کچھ خاص رسم ورواج پائے جاتے ہیں،شریعت کی رُو سے ضروری ہے کہ رسم ورواج کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھا جائے،اگر شریعت سے متصادم نہ ہو اور عرف میں راسخ ہو تو اسے برقرار رکھنے میں کوئی حرج

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الحدود، باب التعزیر: ۱۰۷/۶۔۱۰۹

نہیں، اور اگر شریعت سے متصادم ہو تو اُسے چھوڑنا ضروری ہوگا۔

مسئولہ صورت میں جنگ وجدال ختم کرنے اور فریقین میں صلح کرانے اور آئندہ قتل وقتال کی روک تھام کے لیے مجرم کو جلاوطن کرنے میں تو کوئی حرج نہیں، البتہ رقم لے کر اس سے گاؤں کے سب امیر وغریب لوگوں کو کھانا کھلانے میں چونکہ طیب نفس نہیں ہوتا اور تعزیر بالمال کی یہ صورت درست بھی نہیں اس لیے اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

والدّلیل علی ذلک:

قوله: (ويكون بالنفي عن البلد) ومنه مامر من نفي الزاني البكر، ونفي عمر رضي الله عنه نصر بن حجاج لافتتان النساء بجماله. وفي النهر عن شرح البخاري للعيني: أن من آذى الناس ينفى عن البلد. (۱)

ترجمہ: اور تعزیر کبھی جلاوطنی کی صورت میں ہوتی ہے، جیسے غیر شادی شدہ زانی کی جلاوطنی کے بارے میں گزرا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصر بن حجاج کو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے جلاوطن کیا تھا کیونکہ عورتیں اس کے حسن سے فتنہ میں مبتلا ہوتی تھیں۔ نہر نامی کتاب میں علامہ عینی کی شرح بخاری شریف سے نقل کیا ہے کہ جو لوگوں کو اذیت پہنچاتا ہو اُسے جلاوطن کیا جائے۔

❁❁❁

قبائلی علاقہ جات میں تعزیر بالمال کی ایک صورت

سوال نمبر (109):

دو مسلمانوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا۔ زعمائے جرگہ نے فیصلہ کے لیے کئی تدبیریں کیں، لیکن کارگر ثابت نہ ہوئیں، بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ جس نے ظلم کیا تھا، اس کے ذمہ دو دنبے اور چاول رکھے اور کچھ رقم لے کر مظلوم کو دی اور دنبے اور چاول پکا کر جرگے والوں کو کھلائے گئے۔ کیا شرعاً ایسا جرمانہ لگانا جائز ہے؟ ہمارے علاقے میں عموماً اس طریقہ سے جرمانہ لگایا جاتا ہے۔ تفصیل سے وضاحت مطلوب ہے۔ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

انسدادِ جرائم، ظالم کو ظلم سے روکنے اور معاشرہ میں امن وسلامتی کو فروغ دینے کے لیے تعزیر بالمال کی مختلف صورتیں رائج ہیں، ان میں ایک صورت یہ ہے کہ ظلم کے سدباب کے لیے ظالم کی کوئی چیز تلف کی جائے، اس کی گنجائش ہے۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحدود، باب التعزیر: ۶/۱۱۰

دوسری صورت یہ ہے کہ ظالم سے مال لے کر مظلوم کو دیا جائے، شریعت اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ جرمانے کی صورت میں ظالم سے مال اپنے لیے یا کسی دوسرے کے لیے حاصل کیا جائے، اس صورت میں شریعت اس اقدام کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی، جو مال جرمانے کی صورت میں لیا گیا ہے، اگر مظلوم کو دینے کی صورت نہ ہو تو مفاد عامہ میں خرچ کرے۔

مسئولہ صورت میں جب ظلم کرنے والے پر جرمانہ دنبے اور چاول کی صورت میں لگا کر لوگوں کو کھلایا جائے، اگر ان جانوروں کو مسلمان ذبح کرے اور غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ ہوں، تو اگرچہ اس میں طیبِ خاطر کا تصور بہت کم ہوتا ہے، لیکن اس شخص کے فتنے کا ختم ہونا اچھے جذبہ کی آب یاری کرتا ہے۔ اس معمولی مال پر دشمنی کا ختم ہونا یا ظالم کا مظلوم کے دروازے پر جا کر کھانا کھلانے کے باوجود اس میں طیب خاطر نہ ہونا بخل کی نشانی ہے۔ گویا کہ دلالتاً اذن ہوا، اس کی مثال اس بخیل میزبان کی طرح ہے جس کے ہاں اس کے طیب خاطر کے بغیر خوراک جائز ہوتی ہے۔

والدّليل على ذلك:

لو ضافه أمير فذبح عندقدومه، فإن قصد التعظيم لاتحل وإن أضافه بها، وإن قصدالإكرام تحل وإن أطعم غيرها.(١)

ترجمہ: اگر امیر کسی کا مہمان بن جائے، تو اُس کے آنے کے وقت (جانور کو) ذبح کیا جائے، اگر اِس ذبح سے مقصد اُس کی تعظیم ہو تو جائز نہیں اور اگر مقصد اکرام ہو تو جائز ہے، اگرچہ دوسروں کو کھلایا جائے۔

سمعت من ثقة أنّ التعزير بأخذ المال إنّ رأى القاضي ذلك أو الوالي جاز. (٢)

ترجمہ: میں نے ثقہ (معتمد) شخص سے سنا ہے کہ تعزیر باخذ المال اگر قاضی یا والی مقرر کرے تو جائز ہے۔

❁❁❁

بروقت بجلی کا بل جمع نہ کرنے پر حکومت کا مالی جرمانہ وصول کرنا

سوال نمبر(110):

ماہانہ سوئی گیس یا بجلی بل مقررہ تاریخ پر ادا نہ کرنے کی وجہ سے حکومت جرمانہ لگاتی ہے۔ کیا شریعت کی رُو سے

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الذبائح: ٩/٤٤٩

(٢) البحرالرائق، كتاب الحدود، باب حد القذف، فصل في التعزير: ٥/٦٨

یہ جرمانہ لگانا جائز ہے؟ بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

حکومتِ وقت انتظامی حوالہ سے کسی مصلحت کے پیشِ نظر تعزیر بالمال کی مجاز ہے، تاہم مسئولہ صورت میں تعزیر بالمال کے علاوہ جواز کی یہ صورت بھی بن سکتی ہے کہ حکومت کی طرف سے بجلی کی قیمت کی مقررکردہ وقت پر ادائیگی کے لیے ایک قیمت مقرر ہو اور تاخیر کی صورت میں بجلی کی قیمت میں اضافہ کیا جائے اور شرعاً یہ جائز ہے کہ نقد کی بجائے اُدھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کیا جائے۔

والدّلیل علی ذلک:

سمعت من ثقة أن التعزير بأخذ المال إن رأى القاضي ذلك، أو الوالي جاز.(١)

ترجمہ: میں نے ثقہ (معتمد) افراد سے سنا ہے کہ تعزیر بالمال اگر قاضی یا والی مقرر کرے، تو جائز ہے۔

ولأن للأجل شبها بالمبيع الايرى أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل.(٢)

ترجمہ: کیونکہ میعاد مبیع کے مشابہ ہے، کیا نہیں دیکھتے کہ میعاد کی وجہ سے ثمن میں اضافہ کیا جاتا ہے۔

❀❀❀

گستاخِ رسول کا قتل

سوال نمبر(111):

گستاخِ رسول کو قتل کرنا کیسا ہے؟ اگر کوئی شخص اس کو قتل کرے تو کیا قاتل مجرم شمار ہوگا؟ بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ گستاخِ رسول دائرہ اسلام سے خارج ہے اور اس کی سزا قتل ہے، تاہم اس کو سزا دینا حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے، حدود اور تعزیرات کا قیام عوام کے دائرہ اختیار میں نہیں۔ ہاں معصیت کے دوران (گستاخی کرتے وقت) کسی نے قتل کیا تو قاتل مجرم نہیں، البتہ اگر کسی گستاخِ رسول کو گستاخی کرنے کے بعد کسی نے قتل کیا تو دیانتاً عنداللہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں، تاہم قضاءً حکومتِ وقت کے لیے مجرم ہوگا۔

---

(١) البحرالرائق، كتاب الحدود، باب حد القذف، فصل في التعزير: ٦٨/٥

(٢) الهداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية: ٧٨/٣

والدلیل علی ذلک:

من نقض مقام الرسالة بقوله بأن سبه ﷺ أو بفعله بأن بغضه بقلبه قتل حدا كمامر التصريح به، لكن صرح في أخر الشفاء بأن حكمه كالمرتد. (١)

ترجمہ: جو شخص مقامِ رسالت کی قول سے گستاخی کرے، بایں طور کہ حضور ﷺ کو گالی دے یا فعل سے گستاخی کرے بایں طور کہ قلبی بغض رکھے، تو اس کو حد کے طور پر قتل کیا جائے گا جیسا کہ اس کی تصریح گزر چکی ہے، لیکن شفاء میں تصریح ہے کہ اس کا حکم مرتد کی طرح ہے۔

ويقيمه كل مسلم حال مباشرة المعصية...... وأما بعده فليس ذلك لغير الحاكم.(٢)

ترجمہ: اور ہر مسلمان معصیت کے دوران تعزیر جاری کرسکتا ہے۔۔۔البتہ معصیت کرنے کے بعد اس کا اجرا حاکم کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔

❁ ❁ ❁

نصابِ حد سے کم چوری میں تعزیراً سزا دینا

سوال نمبر(112):

چوری جب نصاب سے کم ہو تو تعزیر دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اور کیا چور کے ساتھ راضی نامہ یا مصالحت بصورتِ معافی ہوسکتی ہے، جب کہ چوری کا نصابِ حد بھی پورا نہ ہو، نیز موجودہ دور کے حوالہ سے چوری کا نصابِ حد کتنا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جہاں کہیں چوری نصابِ حد سے کم ہو تو قاضی یا حاکم چور کو تعزیر دینے کا مجاز ہے تاکہ دوسرے لوگوں کے حق میں مفید ثابت ہو۔ ابوالحسن الماوردیؒ لکھتے ہیں:

وهكذا يقول في التعزير بسرقة مالايجب فيه القطع.(٣)

ترجمہ: اور اسی طرح اس سرقہ میں بھی تعزیر لازم کی جاسکتی ہے جس میں ہاتھ کاٹنا لازم نہ ہوتا ہو۔

---

(١) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الجهاد، باب المرتد: ٦/ ٣٧١

(٢) تنويرالابصار مع الدرالمختار، كتاب الحدود، باب التعزير: ٦/ ١١١

(٣) الاحكام السلطانية، الباب التاسع عشر في احكام الجرائم، الفصل السادس في التعزير: ص/ ٢٣٧

یاد رہے کہ قاضی یا حاکم تعزیر میں عفو کا مجاز ہے، بشرط یہ کہ حق العبد نہ ہو، البتہ حق العبد ہو تو دیگر عام حقوق کی طرح اس میں مصالحت جائز ہے، چنانچہ علی الماوردیؒ لکھتے ہیں:

ولو تعلق بالتعزير حق لآدمي كالتعزير في الشتم والمواثبة، ففيه حق المشتوم والمضروب وحق السلطنة للتقويم والتهذيب، فلايجوز لولي الأمر أن يسقط بعفوه حقّ المشتوم والمضروب، وعليه أن يستوفي له حقه من تعزير الشاتم والضّارب، فإن عفا المضروب والمشتوم كان ولي الأمر بعد عفوهما على خياره في فعل الأصلح من التعزير تقويما والصفح عنه عفوا فإن تعافوا عن الشتم والضرب قبل الترافع إليه سقط التعزير الآدمي.(١)

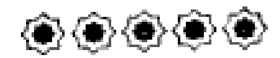
ترجمہ: اگر تعزیر حق العباد کے لیے ہو جیسے سب وشتم اور حملے پر تو ان میں ایک تو مشتوم اور مضروب کا حق ہے اور دوسرا اصلاح تہذیب کے اعتبار سے سلطنت کا حق ہے، حاکم حق مشتوم یا مضروب کو معاف نہیں کر سکتا، اگر وہ معاف کر دے تو حاکم کو اختیار ہے کہ حق سلطنت کو معاف کر دے یا سزا دے، اگر مرافعہ سے قبل شتم وضرب میں بیچ بچاؤ اور معافی کر لیں تو حق عبد ساقط ہو جاتا ہے۔

جہاں تک نصاب حد سرقہ کا تعلق ہے تو اس کی مقدار دس دراہم یا دس دراہم کی قیمت کے برابر کوئی چیز ہے۔ ایک درہم گرام کے اعتبار سے 3.0618 گرام کا ہوتا ہے، اس اعتبار سے دس گرام کی مقدار 30.618 اور تولہ کے اعتبار سے 2.52 تولہ بنتا ہے۔

ومن جملة ذلك أن يكون المسروق عشرة دراهم فصاعدا أو مايبلغ قيمته عشرة دراهم فصاعداً وتعتبر عشرة دراهم مضروبة.(٢)

ترجمہ:

من جملہ شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ مسروقہ مال دس دراہم یا اس سے زیادہ ہو یا ایسی چیز ہو جس کی قیمت دس درہم یا اس سے زیادہ ہو اور دس ڈھلے ہوئے دراہم کا اعتبار ہوگا۔



(١) الاحكام السلطانية، الباب التاسع عشر في احكام الجرائم، الفصل السادس في التعزير: ص/٢٣٧، ٢٣٨

(٢) الفتاوى التاتارخانية، كتاب السرقة، الفصل الثاني في الشرائط التي لابد منها لوجوب القطع: ١١٢/٥

باب الدّعویٰ

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

مدنی الطبع ہونے کے ناطے انسانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ میل جول اور معاملات کرنا ایک فطری امر ہے جس کے بغیر ان کی زندگی ادھوری اور بے مقصد ہے۔ باہمی معاملات اور رشتوں ناطوں میں ضرور ایسی صورتیں سامنے آتی ہیں جن میں ایک شخص دوسرے کے حقوق میں کمی بیشی یا سستی وکوتاہی سے کام لے، اس لیے شریعت کی جانب سے اس کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے حق کو ثابت کرنے کے لیے قاضی کے سامنے دعویٰ پیش کرے، تاہم جب تک گواہی، اقرار یا قسم سے انکار کے ذریعے دعوی کو استحکام حاصل نہ ہو، قاضی اس پر فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اسلام کے نظامِ قضا میں اس باب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

دعویٰ کی لغوی تحقیق:

لغت میں دعوی کے کئی معانی ہیں، مثلاً: طلب، مطالبہ، تمنا، دعا، زعم اور گمان وغیرہ۔(۱)

علامہ حصکفیؒ کے ہاں دعوی ایسے قول کا نام ہے جس سے انسان دوسرے پر اپنا حق واجب کرتا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ: دعوی عرف میں اس قول کو کہتے ہیں جو ابھی تک دلائل وبراہین سے ثابت نہ ہوسکا ہو۔ اسی تناظر میں مسیلمہ کذاب کو تو مدعیٔ نبوت کہنا درست ہے، لیکن نبی کریم ﷺ کو مدعیٔ نبوت کہنا درست نہیں، کیونکہ ان کی نبوت پہلے سے دلائل اور براہین سے ثابت تھی۔(۲)

اصطلاحی تحقیق:

شریعت کی اصطلاح میں دعوی قاضی کے سامنے وہ قابلِ قبول بات ہے جس کے ذریعے دعوی کرنے والا کسی دوسرے پر اپنے حق کو ثابت کرنا چاہے یا کسی دوسرے کو اپنے جائز حق سے دور رکھنا چاہے۔

"قول مقبول عند القاضي يقصد به طلب حق قبل غيره أو دفعه عن حق نفسه".(۳)

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة دعوى: ۲۰/ ۲۷۰، وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية كويت

(۲) الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الدعوى: ۱۱/ ۵۳٤

(۳) بدائع الصنائع، حاشية كتاب الدعوى: ۸/ ۴۰۹، الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الدعوى: ۱۱/ ۵۳۵، ۳٦

مشروعیت:

دعویٰ کی مشروعیت بنیادی طور پر سنتِ نبوی علیہ السلام سے ہے۔ ارشاد ہے:

"البينة على المدعي واليمين على المدعىٰ عليه".

ترجمہ: گواہی پیش کرنا مدعی کے ذمے ہے اور قسم کھانا مدعیٰ علیہ کے ذمے ہے۔(۱)

اصطلاحات:

(۱) مدعی: دعویٰ کرنے والا۔

(۲) مدعیٰ علیہ: جس کے خلاف دعویٰ کیا جائے۔

(۳) مدعیٰ بہ: جس چیز کے متعلق دعویٰ کیا جائے۔

دعویٰ کرنے کا حکم:

اگر دعویٰ کرنے والے کو یہ یقین ہو کہ میں اپنے دعوے میں جھوٹا ہوں پھر بھی دعویٰ کرنے لگے تو یہ سراسر حرام اور ناجائز ہے، البتہ اگر کسی کو غالب گمان ہو کہ وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو اس کے لیے دعویٰ کرنا مباح اور جائز ہے، تاہم اگر اس کو یقین ہو کہ مدعیٰ علیہ میرا حق دے رہا ہے، انکار نہیں کر رہا، مگر اپنا زور دکھانے اور اس کو نیچا دکھانے کی خاطر دعویٰ کرلے تو یہ بھی حرام اور ناجائز ہے۔(۲)

مدعی کی طرف سے دعویٰ پیش کرنے کے بعد اولاً قاضی دعویٰ سنے گا، اگر دعویٰ صحیح اور قابلِ پیروی ہو تو مدعیٰ علیہ کو بلایا جائے گا اور اس سے جواب طلبی کی جائے گی، اگر وہ اقرار کرلے تو معاملہ ختم، البتہ مدعی کے مؤقف سے انکار کی صورت میں یا تو مدعی گواہ پیش کرے گا یا گواہ پیش نہ کرنے کی صورت میں مدعیٰ علیہ سے قسم لی جائے گی، اگر وہ قسم سے ایک مرتبہ انکار کرے یا بغیر عذر خاموش رہے تو قاضی اس کے خلاف فیصلہ کرے گا۔(۳)

---

(۱) السنن الكبرىٰ، أبوبكر أحمد بن حسين البيهقي، كتاب الدعاوي والبينات، باب نمبر(۱۱) البينة على المدعي، رقم (۲۰۸۰۷): ۳۹۴/۱۵

(۲) الموسوعة الفقهية، مادة دعوى، الحكم التكليفي: ۲۷۱/۲۰

(۳) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الدعوى: ۵۵۱/۱۱-۵۷۷-۵۸۶

دعویٰ کارکن:

حنفیہ کے ہاں دعویٰ کارکن ایسا قول ہے جس کے ذریعے دعویٰ کرنے والا مقدمہ کے دوران حق کو اپنی طرف یا اپنے مؤکل ووصی کی طرف منسوب کرے۔ گویا رکن میں تین چیزیں ضروری ہیں: قول یعنی تلفظ، اپنی طرف حق کی نسبت اور قاضی کی مجلس۔ تلفظ اور مجلس قاضی کو بعض فقہا نے شرائط میں سے شمار کیا ہے۔ (۱)

دعویٰ کا سبب:

دعویٰ کا سبب وہ تمام حقوق ہیں جن پر نوع انسانی کی بقا موقوف ہو، یعنی مناکحات، بیوعات اور اموال وغیرہ۔ (۲)

مدعی اور مدعیٰ علیہ کے تعیین کے اصول:

اسلام کے قانونِ قضا کی اساس پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد پر ہے کہ ثبوت پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے ورنہ پھر مدعیٰ علیہ کے ذمے قسم کھا کر اپنی براءت ظاہر کرنا ہے۔ گویا مدعی اور مدعیٰ علیہ کی شناخت اور تعیین پر ہی مقدمے کے فیصلے کا مدار ہے، اسی لیے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان کس طرح امتیاز کیا جائے گا۔

علامہ طرابلسیؒ نے قاضی شریح کا واقعہ نقل کیا ہے کہ جب وہ قاضی بنا دیے گئے تو ان کو خیال تھا کہ اس ذمہ داری کو انجام دینا اس کے لیے مشکل نہیں، مگر جب پہلا مقدمہ آیا تو ان کو مدعی اور مدعیٰ علیہ کی پہچان کرنا بھی مشکل ہوگیا۔ (۳)

اسی طرح سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں:

"أيما رجل عرف المدعي من المدعىٰ عليه لم يلتبس عليه مايحكم بينهما". (٤)

جس شخص نے مدعی اور مدعیٰ علیہ کو پہچان لیا تو اس پر فیصلہ خلط ملط نہیں ہوگا جو وہ ان دونوں کے مابین کرنا چاہتا ہے۔

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الدعوی: ٥٤١/١١

(۲) بدائع الصنائع، حاشية كتاب الدعوى: ٤٠٩/٨، فتح القدير، كتاب الدعوى: ١٤٣/٧، مكتبه حقانيه پشاور

(۳) معين الحكام، علاؤ الدين على بن خليل طرابلسي، القسم الثاني في بيان المدعي من المدعى عليه: ص ٦١، ٦٢

(٤) الموسوعة الفقهية، مادة دعوى: ٢٧٦،٧٧/٢٠، نقلاً عن المقدمات الممهدات: ٣١٨/٢

اس سلسلے میں فقہائے کرام نے چند اصول وضع کیے ہیں:

(۱) جو کسی شے کو اپنی طرف منسوب کرے اور اس کو اس انتساب کی حاجت بھی ہو، وہ مدعی ہے۔ چنانچہ ملکیت کے مقدمہ میں جس کا قبضہ قائم ہوگا، وہ مدعیٰ علیہ ہوگا اور دوسرا فریق مدعی، کیوں کہ قابض کو اپنی ملکیت کے اظہار کی حاجت نہیں، اس کو تصرف پہلے ہی سے قائم ہے۔

(۲) مدعی وہ ہے جو دعویٰ سے دست بردار ہو جائے تو اس پر مقدمہ نہ چلے اور مدعیٰ علیہ وہ ہے کہ وہ اپنا دعویٰ ترک کرے، پھر بھی مقدمہ کی کارروائی کی جائے۔ بالفاظِ دیگر دعویٰ چھوڑنے کے بعد جس شخص پر قاضی کی طرف سے کوئی جبر اور زور نہ ہو، وہ مدعی ہے اور دوسرا مدعیٰ علیہ ہے۔

(۳) مدعی وہ ہے جو کسی امرِ غیر ظاہر کو ثابت کر کے امر ظاہر کی نفی کرنا چاہتا ہو۔

(۴) مدعی وہ ہے جو ملکیت یا حق کو اپنے لیے ثابت کرتا ہو اور مدعیٰ علیہ وہ ہے جو اس کی نفی کرتا ہو۔

(۵) جو دوسرے کے زیرِ قبضہ شے کی اپنے متعلق خبر دے، وہ مدعی ہے اور جو خود اپنے زیرِ قبضہ شے کی اپنے متعلق خبر دے وہ مدعیٰ علیہ ہے۔

(۶) مدعی وہ ہے جس کا استحقاق بجز دلیل ہی سے ثابت ہو، مدعیٰ علیہ وہ ہے جس کا استحقاق محض اس کے قول سے ثابت ہو جائے۔

(۷) جس کی بات ظاہر کے خلاف ہو، وہ مدعی ہے اور جس کی بات ظاہر حال کے مطابق ہو، وہ مدعیٰ علیہ ہے۔

(۸) جو منکر ہوگا وہ مدعیٰ علیہ ہوگا اور فریق آخر مدعی ہوگا۔(۱)

دعویٰ کی صحت کے لیے شرائط:

(۱) دعویٰ قول کے ذریعے ہو، البتہ معذور اور اخرس کے لیے کتابت کے ذریعے دعویٰ کرنا جائز ہے۔(۲)

(۲) دعویٰ کرنے والا اور جس کے خلاف دعویٰ کیا جا رہا ہے، دونوں عاقل و بالغ ہوں۔

(۱) معین الحکام، علاؤ الدین علي بن خلیل طرابلسي، القسم الثاني في بیان المدعي من المدعیٰ علیه: ص ٦١، بدائع الصنائع، کتاب الدعوی، فصل في بیان حد المدعي و المدعیٰ علیه: ٤١٦/٨، الهدایة مع فتح القدیر، کتاب الدعوی: ١٤٤/٧-١٤٦، المغني، موفق الدین ابن قدامة، کتاب الدعاوي و البینات: ١٦٣/١٢، المکتبة التجاریة مکة المکرمة

(۲) ردالمحتار علی هامش الدرالمختار، کتاب الدعوی: ٥٣٥/١١

(۳) جس چیز کے متعلق دعویٰ کیا جارہا ہے، وہ ہر طرح سے معلوم ومتعین ہو، کسی شک وشبہ کی گنجائش اس میں نہ ہو۔

(۴) غیر منقولی اشیا اور جائیداد کے دعوے میں مدعی کو یہ وضاحت بھی کرنی ہوگی کہ ابھی اس پر فریقِ مخالف کا قبضہ ہے۔

(۵) امام ابوحنیفہؒ کے ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر مدعی کو کوئی عذر نہ ہو تو وہ خود ہی اپنا دعویٰ پیش کرے، البتہ صاحبین کے ہاں باوجود قدرت کے، وکیل کی وساطت سے دعویٰ پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہاں اگر مدعیٰ علیہ توکیلِ دعویٰ پر راضی ہو تو پھر بالاتفاق وکالۃً دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔

(۶) دعویٰ قاضی کی مجلس میں قاضی کے سامنے پیش کیا جائے۔

(۷) دعویٰ میں تناقض یا تضاد نہ ہو۔

(۸) کسی ایسی بات کا دعویٰ نہ کر رہا ہو جو خلافِ عقل اور خلافِ مشاہدہ ہو، مثلاً: اپنے سے زیادہ عمر والے شخص کے بارے میں بیٹے ہونے کا دعویٰ کرے۔

(۹) حنفیہ کے ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دعویٰ کی پیروی اور سماعت کے وقت مدعیٰ علیہ حاضر ہو، البتہ اگر مدعیٰ علیہ کسی اور شہر میں ہو اور مدعی مطالبہ کرے کہ یہ مقدمہ دوسرے شہر کی عدالت میں منتقل کیا جائے تو ٹھیک ہے، تاہم اگر غائب کا وکیل، وصی، وارث یا دعوے میں شریک دوسرا مدعیٰ علیہ حاضر ہو تو یہ قضا علی الغائب شمار نہیں ہوگی، اسی طرح میراث اور نفقہ کے مال میں بھی ضرورت کے وقت غائب شخص کے خلاف فیصلہ کرنا درست ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے ہاں غائب کے خلاف فیصلہ کرنا درست ہے، چاہے وہ میراث اور نفقہ سے متعلق ہو یا دوسرے حقوق سے متعلق ہو۔(۱)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں کہ غائب شخص کے خلاف سماعتِ دعویٰ اور فیصلہ کی مرافعت کا مقصود ممکنہ بے انصافی اور ظلم کا سدِّ باب ہے، لیکن بہت سے مواقع پر اس کی وجہ سے مظلوموں پر انصاف کا دروازہ بند ہوکر رہ جاتا ہے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ ملزمین اس سے آگاہ ہوں کہ ان کی عدم حاضری کی صورت میں ان پر مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا، ان کی جرأت اور بڑھ جائے گی، اس لیے حقیقت یہ ہے کہ دوسرے فقہا کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے غائب شخص کے خلاف بھی دعویٰ کی سماعت کی جائے گی۔(۲)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الدعوی، فصل في الشرائط المصححة للدعوى:۸/۴۱۱-۴۱۶، رد المحتار علی هامش الدرالمختار، کتاب الدعوی، شعر أيا طالبا..........:۱۱/۵۴۲، رد المحتار، کتاب الدعوی:۱۱/۵۴۴-۵۵۱

(۲) قاموس الفقه، خالد سيف الله رحماني، مادة دعوى:۳/۴۲۲، زم زم پبلشرز

(۱۰) دعویٰ کے ذریعے خصم، یعنی مدعیٰ علیہ پر کوئی چیز لازم کیا جارہا ہو۔ ایسا نہ ہوتو دعویٰ فاسدہ ہے، مثلاً: ایک شخص دعویٰ کرے کہ میں فلاں کا وکیل ہوں تو یہ دعویٰ عبث اور بے فائدہ ہے، وہ کہہ دے گا کہ چلو تم وکیل تھے، لیکن اب میں نے معزول کردیا۔(۱)

دعویٰ کی اقسام:

دعویٰ کی دو قسمیں ہیں: دعویٰ صحیحہ اور دعویٰ فاسدہ۔

اگر دعویٰ میں تمام شرائط موجود ہوں تو یہ دعویٰ صحیحہ کہلاتا ہے اور جس دعوے میں مذکورہ شرائط موجود نہ ہوں، مثلاً: خصم حاضر نہ ہو، مدعیٰ بہ مجہول ہو یا دعویٰ سے کوئی چیز لازم کرنا مقصود نہ ہو تو یہ دعویٰ فاسدہ کہلاتا ہے۔

دعویٰ صحیحہ کی سماعت قاضی پر واجب ہے، جب کہ فاسدہ کی سماعت اس پر واجب نہیں۔(۲)

حکم کے اعتبار سے دعویٰ کی اقسام:

اس اعتبار سے کہ دعویٰ پر کیا اثر مرتب ہوگا؟ علامہ طرابلسیؒ نے اس کی سات قسمیں لکھی ہیں:

(۱) قاضی دعویٰ نہیں سنے گا اور نہ اس کی وجہ سے مدعی پر کچھ لازم ہوگا۔ یہ اس وقت ہوگا جب دعویٰ فاسد ہو۔

(۲) قاضی دعویٰ کی سماعت نہیں کرے گا اور مدعی کی تادیب بھی کی جائے گی جب اہل دین وصلاح پر ایسا دعویٰ کرے جو ان سے متعلق نہ ہو۔

(۳) قاضی دعویٰ کی سماعت کرے گا، مدعی کے لیے ثبوت پیش کرنے کی بھی گنجائش ہو، مگر قاضی مدعیٰ علیہ کو جوابِ دعویٰ کا مکلف نہ کرسکے، جیسے: نابالغ اور سفیہ ومجنون کے خلاف دعویٰ۔

(۴) قاضی دعویٰ سنے گا اور مدعیٰ علیہ کو جواب دہی کا پابند بھی کرے گا، مگر کچھ شرطوں کے ساتھ، جیسے: کوئی شخص جس مکان یا زمین پر قابض ہو، اس کے بارے میں کوئی اور شخص دعویٰ کرے کہ وہ اس کا مالک ہے۔

(۵) دعویٰ سنا جائے، شہادت بھی پیش کی جاسکتی ہو، مگر اس کے مطابق فوری حکم جاری نہ کرے، جیسے: ایک عورت دعویٰ

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الدعوی: ۱۱/ ۵۵۰

(۲) معین الحکام، علاؤ الدین علي بن خليل طرابلسي، القسم الثالث في ذكر الدعاوي وأقسامها، الفصل الأول في الدعوى الصحيحة: ص ۶۳، فتح القدير، كتاب الدعوى: ۷/ ۱۴۳، ولمزيد التفصيل فليراجع الموسوعة الفقهية، مادة دعوى: ۲۰/ ۲۸۱-۲۸۴

کرے کہ اس کے شوہر نے اس کو تین طلاق دے دی ہے، گواہان بھی پیش کردے، مگر شوہر کو انکار ہو تو قاضی ابھی شہادت کی سماعت نہ کرے گا، نہ ہی اس عورت کو شوہر کے مکان سے باہر نکالے گا، بلکہ کسی قابلِ اعتماد خاتون کو مامور کرے گا جو اس عورت کی حفاظت کرے اور شوہر کو اس سے روکے رکھے، پھر قاضی ان گواہان کے اعتماد و اعتبار کی بابت تحقیق کرے گا اور اس کے بعد گواہی کی سماعت کرے گا۔

(۶) قاضی دعویٰ کی سماعت کرے، مدعی کو اس پر گواہان پیش کرنے کا موقع دے اور مدعیٰ علیہ کو جواب کا پابند کرے، اکثر مقدمات میں یہی عمل ہوتا ہے۔

(۷) قاضی دعویٰ کی سماعت کرے، لیکن مدعی کو اپنے دعوی کی صحت پر گواہان پیش کرنے کا موقع نہ دے، بلکہ اس کو گواہی کی سماعت کے بغیر ہی ضامن قرار دے، جیسے: کوئی شخص اپنے خلاف امانت کے دعویٰ کا انکار کردے، پھر انکار کے بعد وہ خود دعویٰ کرے کہ میں نے تو امانت لوٹا دی تھی تو اب اس کے اس دعویٰ پر گواہی کی سماعت بھی نہ کی جائے گی اور اس کو اس امانت کا ذمہ دار گردانا جائے گا۔(۱)

قسم دلانے کا طریقہ:

مدعیٰ علیہ اگر مسلمان ہو اور اس کے بارے میں یہ گمان نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ پر جرأت کرکے جھوٹی قسم کھائے گا تو اس سے بغیر تغلیظ کے قسم لی جائے گی اور اگر وہ جھوٹے قسم کا عادی ہو اور قسم کھانے کی پرواہ نہیں کرتا تو قسم لینے میں تغلیظ سے کام لیا جائے گا، مثلاً: اس سے کہا جائے گا کہ اس رب کریم پر قسم کھاؤ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ سب کچھ دیکھنے والا اور جاننے والا ہے۔ ان جیسی صفات سے قسم کو مؤکد کرنا تغلیظ کہلاتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے ڈر کر صحیح بات کا اظہار کردے۔

حنفیہ کے ہاں مسلمان سے قسم لینے میں زمان یا مکان کی تغلیظ جائز نہیں، اسی طرح طلاق اور عتاق کی قسم بھی جائز نہیں، البتہ جو شخص قسم کی پرواہ نہ کرے، اس سے لینے میں گنجائش ہے۔

اگر حالف کافر ہو تو اہل کتاب یا مشرک ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے نام پر قسم لی جائے گی، تاہم ان کی کتاب کی طرف اشارہ کرکے قسم لینا یا ان کی عبادت گاہوں میں لے جاکر قسم لینا جائز نہیں، کیوں کہ اس میں ان کے دین کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔(۲)

(۱)معین الحکام، علاؤ الدین علي بن خلیل طرابلسي، الفصل الثاني في تقسیم الدعاوي: ص٦٧

(۲)بدائع الصنائع، کتاب الدعوی، فصل في بیان کیفیة الیمین: ٨/٤٣٤

مدعیٰ علیہ کا قسم سے انکار کرنا:

حنفیہ کے ہاں اگر مالی معاملہ میں مدعیٰ علیہ قسم سے انکار کردے تو اس کے خلاف فیصلہ کردیا جائے گا، تاہم مناسب یہ ہے کہ قاضی اس سے کہے کہ میں تم کو تین مرتبہ اللہ کی قسم دیتا ہوں، تم قسم کھالو، ورنہ تمھارے خلاف فیصلہ کردوں گا، اس کے بعد بھی وہ انکار کرے تو فیصلہ کردے۔

امام شافعیؒ کے ہاں اس صورت میں مدعی سے قسم لے لے۔ حنفیہ کے ہاں اس صورت میں بطورِ صلح قسم لینے کی گنجائش موجود ہے، لیکن بطورِ قضا اس کی اجازت نہیں۔(۱)

البتہ اگر دعویٰ قصاص فی النفس کا ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے ہاں قسم سے انکار کی صورت میں قصاص یا دیت کا فیصلہ نہیں ہوگا، بلکہ اس کو قید میں ڈالا جائے گا، یہاں تک کہ یا تو اقرار کرے اور یا قسم کھا کر انکار کرلے۔

اور اگر معاملہ قصاص فی مادون النفس یعنی قتل سے کم قصاص کا ہو تو عمد کی صورت میں قصاص کا فیصلہ کردے اور خطا کی صورت میں دیت کا فیصلہ کردے۔ صاحبین کے ہاں دونوں صورتوں میں قصاص کا فیصلہ نہیں ہوگا، بلکہ ارش یا دیت کا فیصلہ ہوگا۔

اسی طرح اگر دعویٰ سرقہ کا ہو تو نکول، یعنی قسم سے انکار کی صورت میں مال کا فیصلہ ہوگا، نہ کہ قطع ید کا، البتہ دعویٰ قذف سے نکول کی صورت میں حدّ جاری کرنے یا تعزیر کرنے میں حنفیہ کے اقوال باہم مختلف ہیں۔(۲)

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

---

(۱) لسان الحکام، الفصل الثاني في الدعاوی والبینات: ص ۱۳

(۲) بدائع الصنائع، فصل في حکم أدائه: ۸/۴۳۸۔۴۴۱

مسائل کتاب دعوی

مدعیٰ علیہ کا ناجائز قسم اُٹھانا

سوال نمبر(113):

ہمیں دادا کی طرف سے ایک قطعہ اراضی موروثہ ملی ہے جو کہ کاہی افغانستان میں واقع ہے۔تیس سال سے ہمارے دادا کے نام بابت میراث چل رہی ہے اور جمیع محاصل ہمیں مل رہے ہیں۔حکومتی دستاویزات میں بھی ہمارے دادا کے نام پر ہے۔اب ہمارے بعض رشتہ داروں نے اس میں شراکت کا دعویٰ کیا ہے، حالانکہ وہ نہ ہمارے دادا کے ذوی الفروض ہیں، نہ عصبات اور نہ ذوی الارحام ہیں۔اب سوال یہ کہ فیصلہ کے وقت ہم (مدعیٰ علیہ فریق) لاعلمی پر قسم اُٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

تیس سال کی مدت کا گزرنا ترکہ میں شراکت کے دعویٰ کے ناقابل سماعت ہونے کے لیے کافی نہیں۔تیس سال تک دعویٰ قابلِ سماعت ہوتا ہے،البتہ حق شرکت کا ثبوت باقاعدہ گواہان کی گواہی سے ممکن ہے۔

مسئولہ صورت میں اگر واقعی حسبِ بیان فریق مدعیٰ کا مورث کے ساتھ قرابت کا کوئی ایسا رشتہ نہیں جس کی وجہ سے اس کے میراث میں استحقاق ثابت ہو اور نہ ہی ملکیت کے اور طرق مثلاً خرید، ہبہ، وصیت وغیرہ سے حق ثابت کرسکیں تو مدعیٰ علیہ فریق (مورث کے پوتے) مذکورہ زمین میں بلاشرکت غیرا پنے حق کے ثبوت کے لیے ازروئے شرع عدم علم پر قسم اُٹھا سکتے ہیں کہ ہمیں قطعاً علم نہیں کہ مدعیٰ فریق اس میں شریک ہے۔

یاد رہے کہ ناجائز دعویٰ کی نفی اور اپنے جائز حق کے اثبات کے لیے قسم کھانے پر بحکم شرعی "البینة علی المدعي واليمين على من أنكر" (مدعیٰ پر گواہ اور مدعیٰ علیہ پر قسم ہے) کی رُو سے گناہ گار نہیں ہوں گے۔

والدّلیل علی ذلك:

(و)التحليف(على فعل غيره)يكون (على العلم)أي أنه لايعلم أنه كذلك، لعدم علمه بمافعل غيره ظاهرا.(١)

---

(١) الدرالمختار على صدرردالمحتار، كتاب الدعوى: ٨/٣٠٠

ترجمہ:

اور قسم کسی غیر کے فعل پر اُٹھانا علم پر ہوگا، یعنی (مدعیٰ علیہ) کہے گا کہ وہ علم نہ ہونے کی بنا پر جانتا نہیں کہ فلان (مورث) نے ظاہرا وہ کام کیا ہے۔

(ومن ورث عبدا وادعاه آخر يستحلف على علمه)لأنه لاعلم له بما صنع المورث، فلايحلف على البتات. (۱)

ترجمہ:

جو شخص کسی غلام کا وارث ہوا اور دوسرے نے اس پر دعویٰ کیا تو اس سے اس کے علم پر قسم لی جائے گی کیونکہ اس کو مورث کے کیے ہوئے کا کوئی علم نہیں۔ اس لیے اس سے قطعی قسم نہیں لی جائے گی۔

❁❁❁

کسی شخص پر رقم خرچ کرنے کا دعویٰ

سوال نمبر(114):

ایک شخص نے دوسرے پر دعویٰ کیا ہے کہ میں نے فلاں معاملہ میں تیری طرف سے تیرے کہنے پر اتنا خرچ کیا ہے۔ اب مجھے یہ رقم دے دو۔ مدعیٰ علیہ انکار کرتا ہے اور مدعی سے کہتا ہے کہ میں نے تمہیں خرچ کرنے کا نہیں کہا تھا۔ اگر تم کہتے ہو کہ کہا تھا تو میں اتنی رقم قرآن پاک پر رکھ کر دیتا ہوں، اگر تو سچا ہے تو اس کو اُٹھالے۔ جناب مفتی صاحب! اس مسئلہ کا شرعی حل کیا ہے۔ مذکورہ کام ''قرآن پاک پر رقم رکھ کر لینا'' شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

بيِّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ جب کوئی شخص کسی معاملہ میں دوسرے شخص کے کہنے یا اجازت سے خرچ کرے تو خرچ کرنے والا رجوع کا حق رکھتا ہے، البتہ اگر اس کے حکم اور اجازت کے بغیر خرچ کرے تو ایسی صورت میں شرعاً خرچ کرنے والا رجوع اور مطالبہ کا حق نہیں رکھتا، تاہم اگر وہ شخص خرچ شدہ رقم واپس کرے تو یہ تبرع ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں خرچ کرنے والا اذن واجازت کا مدعی ہے، جب کہ دوسرا شخص اِس سے انکار کرتا ہے۔ اب اس مدعی

(۱) الهداية، كتاب الدعوى، باب اليمين، فصل في كيفية اليمين والاستحلاف: ۲۱۶/۳

پر شرعاً گواہوں کے ذریعہ اثبات دعویٰ ضروری ہے۔اگر وہ شرعاً معتبر دو گواہوں کی گواہی سے دعویٰ ثابت کر سکا تو مدعیٰ علیہ کے ذمہ خرچ شدہ رقم مدعی کے حوالہ کرنا ضروری ہوگا، تاہم اگر گواہ نہ ہوں تو پھر مدعیٰ علیہ قسم اُٹھائے گا کہ میں نے اجازت نہیں دی نہ ہی رقم خرچ کرنے کا کہا تھا۔اگر قسم کھالے تو مدعی کا دعویٰ رد ہو جائے گا۔لیکن اگر مدعیٰ علیہ حلف سے انکار کرے تو نکول کی وجہ سے مدعیٰ علیہ کے ذمہ خرچہ کی ادائیگی لازم ہوگی۔

نیز یاد رہے کہ شرعاً قسم صرف مدعیٰ علیہ پر ہوتی ہے، مدعی پر نہیں۔آج کل معاشرہ میں جو رواج ہے کہ قرآن پاک پر رقم رکھ کر مدعی کو اُٹھانے کے لیے کہا جاتا ہے اور اس کو مدعی کی طرف سے قسم تصور کیا جاتا ہے۔اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں نہ ہی یہ قسم شرعاً معتبر ہے، کیوں کہ مدعی کے ذمہ شرعاً قسم نہیں، بلکہ گواہ پیش کرنا ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

البینة علی المدعي والیمین علی من المنکر.(۱)

ترجمہ: مدعی پر گواہ اور انکار کرنے والے پر قسم ہے۔

وتجوز الکفالة بأمر المکفول عنه وبغیر أمره،فإن کفل بأمره رجع بماأدی علیه،وإن کفل بغیر أمره لم یرجع بمایؤدیه؛لأنه متبرع بأدائه.(۲)

ترجمہ:

اور کفالہ جائز ہوتا ہے،مکفول عنہ کے حکم سے بھی اور بغیر اس کے حکم کے بھی،پس اگر کفیل نے مکفول عنہ کے حکم سے کفالت کی ہو تو کفیل نے جو کچھ ادا کیا وہ مکفول عنہ سے لے گا اور اگر کفیل نے مکفول عنہ کے حکم کے بغیر کفالت کی ہو تو جو کچھ ادا کیا ہے،اس کو واپس نہیں لے سکتا کیوں کہ (اس صورت میں) کفیل ادائیگی میں احسان کرنے والا ہے۔

❁❁❁

پلاٹ پر استحقاق کا دعویٰ

سوال نمبر(115):

ایک شخص نے کسی سے پلاٹ خریدا، پھر پلاٹ کے ارد گرد چار دیواری بھی کی۔اس کے بعد ایک شخص آیا اور

(۱) شرح المجلة لسلیم رستم باز،المادة/۷۶: ص/۵۱

(۲) الهدایة، کتاب الکفالة، ضروب الکفالة: ۳/۱۲۴

دعویٰ کیا کہ مذکورہ پلاٹ میرے اور بائع کے درمیان مشترک تھا۔اب اگر مشتری پلاٹ واپس کرنا چاہے تو قیمتِ خرید کا اعتبار ہوگا یا مارکیٹ ویلیو کا؟ نیز مشتری پورا پلاٹ واپس کرے گا یا صرف اُس شریک کے حصہ کے برابر نصف پلاٹ واپس کرے گا؟ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مسلمان کے مال کا تحفظ شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے،لہٰذا شریعتِ مطہرہ نے کسی کو دوسرے کے مال میں ایسے تصرف کا حق نہیں دیا ہے جس میں اصل مالک کی رضامندی شامل نہ ہو۔

صورتِ مسئولہ میں اگر اس پلاٹ میں واقعی مدعی نصف حصہ کا مستحق ہے تو پھر بائع کے بیع کا تصرف اس کے اپنے حصے تک محدود رہے گا،دوسرے شریک کے حصہ میں اس کی بیع نافذ نہ ہوگی۔مشتری کو اختیار ہے کہ نصف پلاٹ کی قیمت بائع سے واپس لے کر اس پلاٹ میں اُس دوسرے شخص کے ساتھ شریک رہے یا اگر چاہے تو پورے پلاٹ کی قیمت بائع سے لے کر بیع کو فسخ کردے۔یاد رہے کہ دونوں صورتوں میں پلاٹ کی قیمتِ خرید کا اعتبار ہوگا اور اُس کے گرد مشتری نے جو چاردیواری کی تھی اُس کے مارکیٹ ویلیو کا اعتبار ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

فشرکة الأملاك: العین یرثها رجلان، أو یشتریانها، فلایجوز لأحدهما أن یتصرف في نصیب الأخر إلا بإذنه، وکل واحد منهما في نصیب صاحبه کالأجنبي. (۱)

ترجمہ:

شرکتِ املاک یہ ہے کہ کسی چیز کے دو آدمی وارث بنیں یا دونوں اُسے خرید لیں۔اس میں ایک شریک کے لیے جائز نہیں کہ دوسرے کے حصہ میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی تصرف کرے،اس میں ہر شریک دوسرے کے حصہ میں اجنبی کی طرح ہے۔

ولو شری أرضا فبنی، أو زرع أو غرس، فاستحق یرجع المشتري بثمنه علی بایعه ویسلم بناءه، وزرعه، وشجره إلیه، فیرجع بقیمتها مبنیا قائما یوم سلمها إلیه. (۲)

(۱) الهدایة، کتاب الشرکة: ۶۰۵/۲

(۲) شرح المجلة لخالد الاتاسي، احکام الاستحقاق بعد احکام الربا: ۴۶۲/۲

ترجمہ:

اور اگر زمین خرید لی اور اس میں تعمیر کی یا فصل بوئی یا درخت لگائے، پھر اس کا مستحق نکل آیا تو مشتری بائع سے اس کے ثمن کا رجوع کرے گا اور وہ تعمیر، فصل اور درخت بائع کو دے دے گا اور جس دن حوالہ کیا اُس دن آباد حالت میں اس کی جو قیمت بنتی ہے وہ بائع مشتری کو دے گا۔

❁❁❁

دونوں مدعیوں کے پاس گواہ ہوں تو مستحق کون؟

سوال نمبر(116):

اگر ایک زمین پر دو آدمیوں کا دعوی ہو، ان میں سے ہر ایک ملک کا دعوی کر رہا ہو کہ یہ زمین میں نے فلاں سے خریدی ہے اور دونوں کے پاس زمین کے خریدنے کے گواہ موجود ہوں اور زمین ایک مدعی کے قبضہ میں ہو تو اس زمین کا فیصلہ کس مدعی کے بارے میں کیا جائے گا؟ شرعی رہنمائی فرمائیں۔

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر زمین کی خریداری ایک بائع سے مبرہن یا مسلم ہو اور جس کے قبضہ میں ہو، اس کی تاریخ خرید دوسرے مدعی کی تاریخ سے مقدم ہو یا تاریخ خرید دونوں کی معلوم نہ ہو یا تاریخ خرید دونوں کی ایک ہو یا صرف ایک کی تاریخ معلوم ہو تو پھر ان صورتوں میں جس کے قبضہ میں ہے، اس کے حق میں گواہوں سے فیصلہ کیا جائے گا، تاہم اگر دوسرے مدعی کی تاریخ خرید مقدم ہو تو بینہ پیش کرنے کی صورت میں زمین کا فیصلہ اسی کے حق میں کیا جائے گا۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا ادعی کلاهما بأنهما تلقیا الملك من شخص واحد ترجح بینة ذی الید......لأن یده الثابتة لاتنقضي بالشك، ثم إن هذا إذا لم یورخا،أوإذا أرخ أحدهما فقط،أوإذا أرخا واستوی تاریخهما، أوکان تاریخ ذی الید أسبق، أمالو کان تاریخ الخارج أسبق، فبینة الخارج أولیٰ.(۱)

(۱) شرح المجلة لسلیم رستم باز، تحت المادة /۱۷۵۷: ص/۱۱۱۹

ترجمہ:

جب مدعیان دعویٰ کریں کہ ان میں سے ہر ایک کو شخص واحد کی ملکیت ملی ہے تو پھر قبضہ والے کے بینہ کو ترجیح ہوگی، کیوں کہ اس کا قبضہ ثابت ہے، اس لیے شک کی وجہ سے اس کو نہیں توڑا جاسکتا، تاہم یہ بات تب ہے کہ جب دونوں کی تاریخ یا کسی ایک کی تاریخ معلوم نہ ہو یا دونوں کی تاریخ خرید مساوی یا پھر قبضہ والے کی تاریخ پہلے ہو۔ اگر خارج کی تاریخ خرید پہلے ہو تو خارج کے گواہ بہتر ہیں (اس لیے اس کے گواہ پیشگی خریداری پر دلیل ہیں)۔

❁❁❁

قبضہ والے کے حق میں فیصلہ کی ایک صورت

سوال نمبر(117):

دو آدمیوں نے ایک قطعہ زمین پر ملکیت کا دعویٰ کیا۔ اِن میں سے ایک زمین پر قابض ہے۔ قاضی نے اِس قابض شخص کے گواہوں کی گواہی سن کر اس کے حق میں فیصلہ کیا۔ مدعی ثانی کے پاس گواہ نہیں تھے۔ کیا قاضی کا مذکورہ فیصلہ ازروئے شریعت درست ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صورتِ مسئولہ میں اگر مدعیان کا دعویٰ ملک ایک بائع سے ہو اور قبضہ والے کے پاس اثباتِ دعویٰ کے لیے باقاعدہ گواہان موجود ہوں تو قاضی کا قبضہ والے کے گواہان پر فیصلہ کرنا شرعاً درست ہے۔ بالخصوص جب کہ خارج گواہان کے پیش کرنے سے بھی قاصر ہو۔

والدّلیل علی ذلک:

وإذاعجز أحدهما عن الإثبات وأثبت الأخر، حكم له بان ذلك العقار ملكه بالاستقلال. (١)

ترجمہ:

اور جب ایک مدعی اثبات دعویٰ سے عاجز آجائے (بایں طور کہ گواہ پیش نہ کرسکے) اور دوسرا ثابت کرے تو زمین کا فیصلہ (جس کے پاس گواہ موجود ہیں) اُس کے لیے کیا جائے گا کہ یہ مستقل اس کی ملک ہے۔

(١) الهداية، كتاب الشركة: ٦٠٥/٢

إذا ادعی کلاهما بأنهما تلقیاالملك من شخص واحد ترجح بینة ذی الید. (۱)

ترجمہ:

جب دونوں دعوی کریں کہ ان کو ملکیت ایک شخص سے ملی ہے تو قبضہ والے کے گواہ کو ترجیح دی جائے گی۔

❁❁❁

تقسیم کے بعد دوبارہ تقسیم کا دعوی کرنا

سوال نمبر(118):

خاندان کے سربراہان کی موجودگی میں بھائیوں کے مابین ان کی رضامندی سے مشترک زمین تقسیم کی گئی۔ دس سال بعد ایک بھائی کہتا ہے کہ سابقہ تقسیم غلط ہے، حالانکہ تقسیم کے بعد سب نے اپنے اپنے حصہ میں مالکانہ تصرفات کیے ہیں، اب تک منافع بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔ کیا اس بھائی کا دعوی شرعاً قابل سماعت ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر واقعی گزشتہ تقسیم باہمی رضامندی سے ہوئی ہو اور پھر سب شرکا نے مالکانہ تصرفات بھی کیے ہوں تو اب بلاوجہ تقسیم کو غلط قرار دینے کا دعوی ناقابل سماعت ہے۔ تقسیم حسب سابق برقرار رہے گی، دوبارہ تقسیم کی ضرورت نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

وإذا ادعی أحدالشرکاء غلطا في القسمة لاتعاد القسمة بمجرد دعواه.(۲)

ترجمہ:

اور جب شرکا میں سے کوئی ایک تقسیم میں غلطی کا دعوی کرے تو صرف اس کا دعوی کرنے سے تقسیم کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔

❁❁❁

(۱) شرح المجلة لسلیم رستم باز، تحت المادة: ۱۷۵۸:ص/۱۱۱۹

(۲) الفتاوی الخانیة علی هامش الهندیة، کتاب القسمة، فصل في قسمة الدار والعقار: ۱۵۲/۳

دعوی ترک کرنے والے مورث کے ورثا کا دعوی

سوال نمبر(119):

پندرہ سال تک ایک شخص کی زمین دوسرے آدمی کے پاس رہی۔اس دوران اس نے کسی قسم کا دعوی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ فوت ہوا۔اب اس کا وارث مدعی بن کر دعوی کرتا ہے، جب کہ اصل مدعیٰ علیہ بھی فوت ہوا ہے اس کی اولاد زندہ ہے۔کیا دعوی ترک کرنے والے مالک کی موت کے بعد اس کی اولاد شرعاً دعوی کا استحقاق رکھتے ہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئولہ صورت میں اگر دعوی ترک کرنے والے مالک نے مدعیٰ علیہ کے تصرف پر علم کے باوجود دعوی نہیں کیا ہو تو اس کی موت کے بعد ورثا کا دعوی شرعاً قابلِ سماعت نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

رجل تصرف زمانا في أرض، ورجل آخر رأى الأرض والتصرف، ولم يدع ومات على ذلك، لم تسمع بعد ذلك دعوىٰ ولده فتترك في يد المتصرف.(١)

ترجمہ:

ایک آدمی ایک قطعہ زمین میں کچھ عرصہ تک تصرف کرتا رہا، دوسرا آدمی زمین اور اس کے تصرف کو دیکھتا رہا اور دعوی نہیں کیا، پھر اسی حال میں فوت ہوا تو اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے کا دعوی شرعاً نہیں سنا جائے گا چنانچہ اسے تصرف کرنے کے والے کے قبضہ میں چھوڑ دیا جائے گا۔

❁❁❁

مشتری کے وعدہ سے ورثا کا انکار

سوال نمبر(120):

ایک شخص نے مشتری کو زمین اس شرط کے ساتھ فروخت کی کہ جب بھی تم اس زمین کو فروخت کروگے تو

(١) الفتاوى تنقيح الحامدية، كتاب الدعوى: ٢/ ١٥

ہمیں ہی فروخت کروگے۔ مشتری نے اس بیع کو بمع شرط قبول کیا۔ اب بائع اور مشتری دونوں اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مشتری کے ورثا نے وہ زمین فروخت کی۔ اب بائع کے ورثا نے ان پر دعوی کیا کہ تم لوگ اس زمین کو ہمارے علاوہ کسی اور کے ہاتھ فروخت نہیں کرسکتے، کیوں کہ تمہارے والد نے ہمارے والد سے معاہدہ کیا تھا۔ واضح رہے کہ مشتری کے ورثا کو نہ اس معاہدہ کا علم ہے اور نہ ہی بائع کے ورثا کے پاس کوئی تحریری ثبوت ہے۔ کیا مشتری کے ورثا اس زمین کو بائع کے ورثا کے ہاتھ فروخت کرنے کے شرعاً پابند ہوں گے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

ایجاب وقبول کے بعد جب مشتری مبیع پر قبضہ کرے اور بائع ثمن وصول کرے تو بیع تام ہو جاتی ہے۔ بیع تام ہونے کے بعد جس طرح بائع ثمن میں جملہ تصرفات کا اختیار رکھتا ہے۔ اسی طرح مشتری بھی مبیع میں جملہ تصرفات کا مجاز ہے۔

مسئولہ صورت میں بائع کی یہ شرط کہ جب بھی زمین فروخت کروگے تو ہمیں ہی فروخت کروگے، اگرچہ مشتری نے منظور کی ہو، لیکن یہ صرف ایک وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اگرچہ مشتری کا اخلاقی فریضہ تھا، تاہم اس کی موت کے بعد پس ماندہ ورثا کے لیے ضروری نہیں، لہٰذا مذکورہ زمین کی خرید وفروخت میں مشتری کے ورثا خود مختار ہیں جہاں چاہیں فروخت کرسکتے ہیں۔ بائع کے ورثا پر فروخت کرنے کے پابند نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

البیع ینعقد بالإیجاب والقبول...... وإذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع، ولا خیار لواحد منهما إلا من عیب أوعدم رؤیة.(۱)

ترجمہ:

بیع ایجاب وقبول کے ساتھ منعقد ہو جاتی ہے۔۔۔۔ اور جب ایجاب وقبول حاصل ہو تو بیع لازم ہو جاتی ہے اور بائع اور مشتری میں سے کسی کو رجوع کرنے کا اختیار نہیں، البتہ خیارِ عیب یا خیارِ رؤیت کی وجہ سے اختیار باقی رہتا ہے۔

(۱) الهدایة، کتاب البیوع: ۳/۱۹-۲۰

ولو كان لايقتضيه العقد ولامنفعة فيه لأحد لايفسده، وهو الظاهر من المذهب كشرط أن لا يبيع المشتري الدابة المبيعة. (١)

ترجمہ: اور اگر شرط ایسی ہو کہ عقد اس کا تقاضا نہیں کرتا اور اس میں کسی کا نفع بھی نہیں تو وہ عقد کو فاسد نہیں کرے گی۔ یہی ظاہر مذہب ہے۔ جیسے یہ شرط کہ مشتری خریدے ہوئے جانور کو فروخت نہیں کرے گا۔

❁❁❁

طویل مدت کے بعد ملکیت کا دعویٰ

سوال نمبر (121)

بائع و مشتری کے درمیان ایک کمرہ کا معاملہ ہوا۔ اسٹامپ پیپر پر ان سمیت چھ گواہوں کے دستخط ثبت ہیں۔ اب چالیس سال کی طویل مدت گزرنے کے بعد بائع کی اولاد مدعی بن کر دعویٰ کر رہی ہے۔ اس معاملہ کے گواہوں میں اب ایک باقی ہے۔ باقی پانچ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ کیا ان گواہوں کی اولاد جن کو والدین کی زبانی اس معاملہ کا علم ہو، ان کی گواہی شرعاً معتبر ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مفتیٰ بہ قول کے مطابق جب کسی معاملہ پر چھتیس سال سے زائد کا عرصہ گزرا ہو اور اس دوران مشتری کے مالکانہ تصرفات سے کسی نے سروکار نہیں رکھا ہو تو بعد ازاں طویل مدت کے بعد بائع کی اولاد کا ملکیت کا دعویٰ شرعاً غیر معتبر ہے۔ نیز گواہ پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہوتی ہے، نہ کہ مدعیٰ علیہ کی۔

والدّلیل علی ذلک:

إذاترك الدعوى ثلاثاً وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوى، ثم ادعى، لاتسمع دعواه؛ لأن ترك الدعوى مع التمكن يدل على عدم الحق ظاهرا. وفي جامع الفتوىٰ عن فتاوىٰ العتابيّ قال المتأخرون من أهل الفتوىٰ: لاتسمع الدعوىٰ بعد ست وثلاثين سنة. (٢)

(١) الهداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد: ٦١/٣

(٢) ردالمحتارعلى الدرالمختار، كتاب القضاء، مطلب إذا ترك الدعوى ثلاثاً وثلاثين سنة لاتسمع: ١١٧/٨

ترجمہ:

جب کوئی تینتیس سال تک دعوی ترک کردے اور دعوی سے مانع بھی کوئی نہ ہو۔ پھر دعویٰ کرے تو اس کا دعوی مسموع نہ ہوگا، کیوں کہ قدرت کے باوجود دعوی ترک کرنا بظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا حق نہیں بنتا۔ اور جامع الفتوی میں فتاویٰ العتابی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ متاخرین اہل فتوی فرماتے ہیں کہ چھتیس سال بعد دعویٰ قابلِ سماعت نہیں ہوتا۔

❁❁❁

شرکت کا معاہدہ کیے بغیر نفع ونقصان کا دعویٰ کرنا

سوال نمبر(122):

دو فریق جو آپس میں رشتہ دار ہیں، پہلے کاروبار میں شریک تھے، گھر میں بھی اکٹھے رہتے تھے۔ بعد میں باہمی چپقلش اور تنازعات کی وجہ سے جدائی آئی، لیکن کاروباری شراکت کا مسئلہ حل نہ ہوا۔ فریق اول کہتا ہے کہ کئی بار مسئلہ کے حل کے لیے ہم نے فریق ثانی سے رجوع کیا، لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس دوران تقریباً دس سال کا عرصہ بیت گیا۔ فریقین علیحدہ طور پر مستقل الگ الگ کاروبار کرتے رہے۔ اس دوران فریقین کے آپس میں کاروباری روابط کوئی نہیں تھے۔ اب فریق ثانی کو اپنے کاروبار میں خسارہ ہوا ہے تو وہ فریق اول پر دعوی کرتا ہے کہ ہم سب کاروبار میں شریک ہیں، لہٰذا تمہیں بھی نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ کیا فریق ثانی کا دعوی شرعاً جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عقدِ شرکت کے لیے شریکین کا باقاعدہ معاہدہ ضروری ہے۔ معاہدہ کے بعد شریکین ایک دوسرے پر نفع ونقصان میں شریک ہونے کا دعوی کر سکتے ہیں۔

صورتِ مسؤلہ میں فریقین کے مابین باقاعدہ معاہدہ کے فقدان کی وجہ سے فریق ثانی کا فریق اول پر دعوی کرنا شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ذکر کردہ حالات کے پیشِ نظر فریق ثانی اپنے کاروبار میں خسارہ کا خود ذمہ دار ہے، صرف خاندانی قرابت وشرکت یا بعض دوسرے معاملات میں شرکت سے ہر لین دین اور ہر کاروبار میں شرکت ثابت نہیں ہوسکتی، لہٰذا فریق ثانی کا دعوی شرعاً درست نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

رجلان اشترکا شرکة عنان في تجارة علی أن یشتریا و یبیعا بالنقد والنسیئة، فاشتری أحدھما شیئا من غیر تلك التجارة کان له خاصة.(١)

ترجمہ: دو شخص تجارت میں شرکت عنان کے طور پر اس شرط کے ساتھ شریک ہوئے کہ دونوں نقد وادھار خرید و فروخت کریں گے، پھر ایک شریک نے اس تجارت کے علاوہ کچھ خریدا تو یہ اس شریک کے لیے خاص ہوگا۔

❀❀❀

شریعت کی بجائے انگریزی قانون پر فیصلہ کرنے کا مطالبہ کرنا

سوال نمبر(123):

جناب مفتی صاحب! فریقین کے مابین کسی معاملہ پر تنازع ہے۔ مدعیٰ علیہ تنازع کا فیصلہ شرعی حوالہ سے کرنا چاہتا ہے، جب کہ مدعی شریعت کو چھوڑ کر انگریزی قانون یا مشران کے جرگہ پر مصر ہے، حالانکہ وہ اچھے برے سب کو خوب سمجھتا ہے۔ کیا یہ شریعت سے کھلی روگردانی یا خروج نہیں؟ اور کیا انگریزی قانون سے مفادات کا حصول کسی چیز کو حلال کرسکتا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

دعویٰ میں بنیادی کردار مدعی کا ہوتا ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مدعی اپنے حق کی دادرسی کے لیے شریعت مطہرہ کا سہارا لے۔ شرعی قانون کے ہوتے ہوئے دنیاوی مفادات کے تحفظ کے لیے دوسرے قانون کا سہارا لینا ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔ شریعت کی چوکھٹ کو چھوڑ کر کسی اور جگہ انصاف طلب کرنا مسلمان کو کبھی زیب نہیں دیتا، تاہم اگر مدعی نے اپنے حق کے حصول کے لیے شرعی قانون کی بجائے کسی انگریزی قانون کا سہارا لے لیا تو اس سے اس کو کافر یا منکرِ شریعت ٹھہرانا بھی درست نہیں۔ البتہ یہ یاد رہے کہ اگر شریعت کی رو سے کسی کا حق نہیں بنتا اور انگریزی قانون کی رو سے وہ مالک بن جائے تو ایسی چیز اس کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ بحیثیت مدعی و مدعیٰ علیہ طرفین اپنا فیصلہ قرآن وحدیث کی روشنی میں حل کریں اور اسی پر قانع رہیں۔

(١) الفتاوی الھندیة، کتاب الشرکة، الباب الثالث في شرکة العنان: ٣٢٥/٢

والدّلیل علی ذلک:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾.(۱)

ترجمہ: (اے نبی ﷺ) آپ کے رب کی قسم! وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے، جب تک آپ ﷺ کو آپس کے جھگڑوں میں منصف نہ بنائیں، پھر ان کے دل میں آپ ﷺ کے فیصلہ سے کچھ ناراضگی (بھی) پیدا نہ ہو اور (اس کو) بخوشی قبول کرلیں۔

❁❁❁

تقسیم فسخ کرنے کا دعوی

سوال نمبر(124):

دو بھائیوں کو ترکہ ملا۔ بڑے بھائی نے اپنی مرضی سے ترکہ میں اچھا مال الگ کر کے ردی قسم کا مال چھوٹے بھائی کو دے دیا، چھوٹا بھائی اس وقت اس پر قطعاً راضی نہ تھا، تاہم بھائی کی وفات کے بعد اب بھتیجوں سے کہتا ہے کہ تمہارے والد نے تقسیم صحیح نہیں کرائی تھی، اب دوبارہ تقسیم کرو۔ کیا شرعاً اس کا دعوی مسموع ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر مشترکہ تقسیم پر چھتیس سال سے زائد کا عرصہ گزرا ہو اور تقسیم کے بعد فریقین اپنے اپنے حصوں پر قابض ہو کر اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے ہوں اور ایک دوسرے پر کسی قسم کا دعوی نہیں کیا ہو یا کوئی ایک فریق وفات پاچکا ہو تو اس کے بعد تقسیم میں غلطی کا دعوی کرنا شرعاً معتبر نہیں۔

مسئولہ صورت میں اگر دعوی ترک کرنے والے بھائی نے دوسرے بھائی کے تصرفات پر علم کے باوجود اس کی زندگی میں دعوی نہیں کیا ہو تو اس کی موت کے بعد ورثا پر دعوی شرعاً قابلِ سماعت نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

إذاترك الدعوى ثلاثاً وثلاثين سنة، ولم يكن مانع من الدعوى، ثم ادعى، لاتسمع دعواه؛ لأن

---

(۱) النساء/٦٥

ترك الدعوى مع التمكن يدل على عدم الحق ظاهرا. وفي جامع الفتوىٰ عن فتاوىٰ العتابيّقال المتأخرون من أهل الفتوىٰ: لاتسمع الدعوىٰ بعد ست وثلاثين سنة.(۱)

ترجمہ: جب کوئی تینتیس سال تک دعوی ترک کردے اور دعوی سے مانع بھی کوئی نہ ہو۔ پھر دعوی کرے تو اس کا دعوی مسموع نہ ہوگا، کیوں کہ قدرت کے باوجود دعوی ترک کرنا بظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا حق نہیں بنتا۔ اور جامع الفتوی میں فتاویٰ العتابی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ متاخرین اہل فتوی فرماتے ہیں کہ چھتیس سال بعد دعویٰ قابلِ سماعت نہیں ہوتا۔

رجل تصرف زمانا في أرض، ورجل آخر رأى الأرض، والتصرف، ولم يدع ومات على ذلك، لم تسمع بعد ذلك دعوى ولده، فتترك في يد المتصرف.(۲)

ترجمہ　ایک آدمی ایک قطعہ زمین میں کچھ عرصہ تک تصرف کرتا رہا، دوسرا آدمی زمین اور اس کے تصرف کو دیکھتا رہا اور دعوی نہیں کیا، پھر اسی حال میں فوت ہوا تو اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے کا دعوی شرعاً نہیں سنا جائے گا چنانچہ اِسے تصرف کرنے کے والے کے قبضہ میں چھوڑ دیا جائے گا۔ ❁❁❁

مصالحت کے ذریعہ حق سے دست برداری کے بعد دعوی کرنا

سوال نمبر(125):

ایک عورت کا انتقال ہوگیا، اس کی موروثی جائیداد پر اس کا بھائی قابض تھا۔ مرحومہ کی اولاد نے اپنے ماموں سے مطالبہ کیا، پہلے تو اس نے انکار کیا، بعد میں مصالحت پر راضی ہوا اور گیارہ جریب زمین کی رقم ان کو دی، اب ورثا دوبارہ دعوی کرتے ہیں کہ ماموں نے ہمارا حق (والدہ کی جائیداد) پورا نہیں دیا۔ مرحومہ کی جائیداد اس سے زیادہ تھی۔ کیا اس صورت میں ورثا کا اپنے ماموں سے مزید جائیداد کا مطالبہ کرنا جائز ہے؟ اور ان کا دعوی مصالحت کے بعد جائز ہے یا نہیں؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

صورتِ مسئولہ میں اگر ماموں نے مرحومہ کے ورثا کو یہ رقم مصالحت کے طور پر دی ہو اور ورثا اس کے بدلے تمام حقوق اور جملہ دعاوی سے دست بردار ہوئے ہوں تو پھر ان کو دوبارہ کسی حق کے دعوی کا استحقاق نہیں رہا البتہ اگر ورثا

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب القضاء، مطلب إذا ترك الدعوى ثلاثاً وثلاثين سنة لاتسمع: ۸/۱۱۷

(۲) تنقيح الحامدية، كتاب الدعوى: ۲/ ۱۵

صرف گیارہ جریب زمین کے حق میں دست بردار ہوئے ہوں اور مرحومہ کی بقیہ جائیداد کے بارے میں دست برداری نہ ہوئی ہوتو پھر بقیہ جائیداد کے بارے میں ورثا کا دعوی شرعاً معتبر ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا أبرأ واحد آخرمن دعوى متعلقة بأمر كان ذلك إبرائا خاصا، فلاتسمع بعد ذلك دعواه التي تتعلق بذلك الأمر، ولكن له أن يدعي بما يتعلق بغير ذلك الأمر من الحقوق. (۱)

ترجمہ: جب کوئی شخص دوسرے کے حق میں کسی خاص کام سے متعلق دعوی سے دست بردار ہوجائے تو یہ دست برداری اسی کام سے خاص ہوگی، چنانچہ پھر اسی کام سے متعلق اس کا دعویٰ شرعاً مسموع نہیں ہوگا، البتہ اس حق کے علاوہ کسی دوسرے حق کا دعوی کرنے کا اس کو اختیار حاصل ہے۔

❀❀❀

باپ کوادائیگی کے واسطے رقم دے کر بعد میں مکان پر ملکیت کا دعوی کرنا

سوال نمبر(126):

ایک شخص نے ایک مکان خریدنے کا ارادہ کیا، لیکن فی الحال اس کے پاس نقد رقم موجود نہیں تھی، اس کی بیٹی نے اس شخص کی جگہ رقم دے کر باپ کے نام خرید لیا۔ باپ اس مکان اور دیگر مکانات کا کرایہ بیٹی کو دیتا رہا۔ چنانچہ تین سال تک وہ لیتی رہی۔ اس دوران اس کا باپ فوت ہوا۔ تقسیم جائیداد کے دوران یہ لڑکی کہنے لگی کہ یہ مکان میرا حق ہے اور میں ہی اس کے کرایہ کی حق دار ہوں، کیوں کہ یہ میں نے خریدا ہے۔ والد کی کوئی تحریر اس کے حق میں موجود نہیں۔ باقی رشتہ دار اس کی ملکیت سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کرایہ یہ وصول کرتی رہی ہے، یہ اس کو قرض کے عوض مل رہا تھا برائے کرام اس مسئلہ کا شرعی حل بیان فرمائیں۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئولہ صورت میں ذکر کردہ تفصیل سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ باپ نے بیٹی سے رقم بطور قرض لی ہے اور مکان باپ کی ملکیت ہے اور اب میراث کا حصہ ہے، تاہم اگر بیٹی مدعیہ بن کر ملکیت کا دعوی کرتی ہے تو شرعاً اس پر گواہ پیش کرنا ضروری ہے جو یہ گواہی دیں کہ اس کے باپ نے مکان اسی کے لیے خریدا تھا۔ اگر اس بات پر گواہ پیش

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز،الكتاب الثاني عشر في الصلح والابراء: المادة/ ١٥٦٤، ص/ ٨٥١

نہ کر سکی تو دیگر ورثا (مدعی علیہ) قسم اُٹھائیں گے کہ یہ مکان اس لڑکی کی ملکیت نہیں، بلکہ ان کے والد کی ملکیت ہے۔اس صورت میں گھر والد کا شمار ہوگا اور اس کی رقم باپ کے ذمہ قرض شمار ہوگی، لہٰذا جتنا کرایہ وصول کیا ہے، اس کو منہا کر کے باقی رقم والد کی میراث سے وصول کرے گی۔

والدّلیل علی ذلك:

البینة علی المدعی والیمین علی المنکر.(۱)

ترجمہ: مدعی پر گواہ اور انکار کرنے والے پر قسم ہے۔

❁❁❁

دعوی کی صورت میں کثیر افراد کو قسم دینا

سوال نمبر(127):

ایک شخص نے کسی پر چوری کا دعوی کیا۔مدعی کے پاس گواہ نہیں۔اب فیصلہ جرگہ والوں کے پاس گیا ہے۔ زعمائے جرگہ کہتے ہیں کہ مدعی کے پاس گواہ نہیں تو مدعی علیہ کے خاندان میں سے دس آدمی یا بیس آدمی قسم اُٹھائیں گے۔ کیا جرگہ والوں کا مذکورہ فیصلہ شرعاً درست ہے؟ مدعی بھی مدعی علیہ کے خاندان والوں کی قسم پر اصرار کرتا ہے۔

بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مدعی کا دعوی اگر کئی لوگوں پر ہو تو ان سب سے حلف لینا اس کا حق بنتا ہے اور جائز بھی ہے اور اگر دعوی فقط ایک شخص پر کیا ہو، باقی افراد پر نہ ہو تو اس صورت میں صرف مدعی علیہ کو قسم دی جائے گی، نہ کہ خاندان کے دیگر افراد کو، البتہ اگر مدعی علیہ کو چوری سے انکار پر قسم دی جائے اور باقی خاندان والوں کو اس اعتبار سے قسم دی جائے کہ ان کو چوری کا علم نہیں ہے، تو شرعاً یہ درست ہے، کیوں کہ اس صورت میں خاندان والے بھی مدعی علیہ بنتے ہیں اور مدعی علیہ سے قسم لینا شرعاً درست ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

إذا أراد الرجل أن یحلف علی فعل نفسه یحلف علی البتات یعني یحلف علی القطع، بأن هذا

(۱) شرح المجلة لسلیم رستم باز، المادة /۷٦: ص/٥۱

الشيء، كذا أوليس بكذا، أما إذا أراد أن يحلف على فعل غيره يحلف على عدم العلم، يعني يحلف على عدم علمه بذلك الشيء، بأن يقول: واللّٰه لا أعلم ...... أوليس لي علم بذلك.(١)

ترجمہ: جب آدمی اپنے فعل پر قسم کھانے کا ارادہ کرے تو یقینی قسم اُٹھائے گا، قسم میں قطعی طور پر کہے گا کہ یہ چیز یوں ہے یا نہیں ہے، اور اگر دوسرے کے کسی فعل پر قسم کا ارادہ ہو تو عدم علم پر قسم اُٹھائے گا، یعنی اس چیز کے عدم علم پر قسم اُٹھائے گا یوں کہے گا کہ اللہ کی قسم میں نہیں جانتا۔۔۔۔یا مجھے اس چیز کے بارے میں علم نہیں ہے۔

❁❁❁

چوری کا برآمد شدہ مال رکھنے والے پر دعوی کرنا

سوال نمبر(128):

ایک شخص سے چوری ہوئی۔ چور معلوم نہیں تھا۔ کچھ عرصہ بعد ایک شخص کے ہاں وہ مال برآمد ہوا۔ مدعی کو کسی اور پر شک تھا۔ اب مال کسی اور کے پاس نکل آیا۔ کیا اب مدعی اس شخص سے مخاصمہ کر سکتا ہے؟ اگر یہ شخص مال کو اپنا سمجھے یا کسی کی امانت کہے تو شرعاً مدعی اپنے مال کی وصولی کے لیے کس کے خلاف دعوی دائر کرے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفیق:

مسئولہ صورت میں مالِ مسروق جس سے برآمد ہوا ہے، اگر وہ کہے کہ یہ مال میرے پاس امانت، رہن، اجارہ کے طور پر ہے، اور اس پر گواہی بھی پیش کرے تو اس صورت میں یہ شخص اصل مدعی کا خصم نہیں بن سکتا ہے، بشرطیکہ یہ شخص دھوکہ باز اور حیلہ گر معروف نہ ہو، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا دعویٰ معتبر نہ ہوگا۔

اور اگر وہ قابض شخص دعویٰ کرے کہ یہ مال میرا اپنا ہے تو وہ اس پر گواہ پیش کرے گا، اور گواہ پیش کرنے کی صورت میں اس قابض کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی۔

تاہم اگر مدعی اس پر غصب یا چوری کا دعوی کرے تو پھر قابض کے گواہ معتبر نہ ہوں گے بلکہ مدعی سے گواہوں کا مطالبہ ہوگا ورنہ مدعیٰ علیہ قسم کھائے گا۔

(١) شرح المجلة لسليم رستم باز، الكتاب الخامس عشر في البينات و التحليف، الفصل الثالث في التحليف: المادة ١٧٤٨، ص/١١٠١

والدّلیل علی ذلک:

ادعی رجل عبدا في يد رجل أنه له، فقال ذو اليد:هو لفلان الغائب وديعة عندي، أو عارية أو إجارة، أو رهن، أو غصب، وأقام على ذلك بينة...... اندفعت خصومة المدعي عنه. وقال أبو يوسف:إن كان ذو اليد صالحا تندفع عنه الخصومة إذا أقام البينة، وإن كان معروفا بالحيل، لم تندفع الخصومة عنه بإقامة البينة.(١)

ترجمہ: ایک آدمی کے پاس غلام پر کسی شخص نے دعوی کیا کہ یہ میرا ہے۔جس کے قبضہ میں ہے،اس نے کہا کہ یہ فلاں کی میرے پاس ودیعت، عاریت، اجارہ، رہن یا غصب ہے اور اس پر گواہ بھی پیش کیے۔۔۔۔تو مدعی کی خصومت اس سے دفع ہو جائے گی۔امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جس کے قبضہ میں ہے، اگر وہ صالح آدمی ہو اور گواہ پیش کرے تو خصومت دفع ہو جائے گی اور اگر حیلہ گر مشہور ہو تو بینہ کے باوجود خصومت اُس سے دفع نہ ہوگی۔

وإن قال المدعي: غصبته مني أو سرقته مني، لاتندفع الخصومة، وإن أقام ذو اليد البينة على الوديعة.(٢)

ترجمہ: اور اگر مدعی کہے کہ تو نے یہ چیز مجھ سے غصب کی ہے یا چوری کی ہے تو خصومت ختم نہیں ہوگی، اگر چہ جس کے قبضہ میں ہے،اس چیز کے ودیعت ہونے پر بینہ بھی پیش کرے۔

۞۞۞

مشتبہ شخص کو مجرم ٹھہرانا

سوال نمبر(129):

ایک کمرہ سے لاش ملی، اسی کمرے میں ایک دوسرا شخص سویا ہوا تھا۔کیا اس شخص کو قاتل ٹھہرا کر مجرم قرار دیا جاسکتا ہے؟ حالانکہ وہ شخص قتل سے انکار کرتا ہے۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

دعوی کے اثبات کے لیے مدعی کو شرعاً دو عادل گواہ پیش کرنا لازم ہوتا ہے، بصورت دیگر مدعی علیہ کو قسم دی

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الدعوى، الباب السادس فيماتندفع به الدعوى: ٤/ ٤٤

(٢) فتح القدير، كتاب الدعوى، باب التحالف: ٧/ ٢٢٦

جاتی ہے۔ مسئولہ صورت میں اگر مشتبہ شخص قتل کا اقرار نہیں کرتا اور قتل کے گواہ بھی موجود نہیں تو پھر اس کو قسم دی جائے گی اگر وہ قسم اُٹھائے تو بری الذمہ ہوگا۔ جب کہ قسم سے انکار کی صورت میں اُسے قید کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ یا تو اقرار کرلے اور یا قسم کھائے۔

والدّلیل علی ذلک:

البينة على المدعي واليمين على المنكر.(١)

ترجمہ: مدعی پر گواہ اور انکار کرنے والے پر قسم ہے۔

فإن كان في النفس فعند أبي حنيفة لا يقضى فيه لا بالقصاص ولا بالمال لكنه يحبس حتى يقر أو يحلف أبدا. (٢)

ترجمہ: اگر دعویٰ قصاص فی النفس کا ہو تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں نکول (قسم سے انکار) پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا، نہ قصاص کا اور نہ ہی مال کا۔ البتہ مدعیٰ علیہ کو قید کیا جائے گا یہاں تک کہ اقرار کرے اور یا قسم کھالے۔

❁❁❁

جائیداد دوسرے کے نام کرنے سے ملکیت کا استحقاق

سوال نمبر(130):

سائل نے ایک قطعہ اراضی خریدی تھی، لیکن مذکورہ اراضی پر شفیع کے شفعہ کے ڈر سے سائل نے زمین تین ناموں پر خریدی جس میں والد محترم بھی شامل تھے۔ زمین سائل نے اپنی ذاتی رقم سے خریدی تھی اور خریدنے کے وقت سے اب تک اراضی سائل ہی کے قبضہ میں بھی ہے۔ نیز والد محترم نے بھی اپنی حیات میں بذریعہ اسٹامپ پیپر سائل کی ملکیت کا اقرار کیا ہے، وہ اسٹامپ پیپر بطورِ ثبوت اب تک موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ والد کے نام پر لی گئی اراضی میں دیگر ورثا کا حق بنتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سرکاری کاغذات میں جائیداد کسی کے نام پر ہونے سے شرعاً ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔ تاہم ملکیت کے لیے

---

(١) شرح المجلة لسليم رستم باز، المادة /٧٦: ص/٥١

(٢) بدائع الصنائع، كتاب الدعوى، فصل في حكم الامتناع عن تحصيل اليمين:

نشانی اور علامت کے طور پر سرکاری کاغذات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ملکیت کے لیے اسباب ملک کا ہونا ضروری امر ہے۔اسباب ملکیت جس کے حق میں موجود ہوں، وہی مالک متصور ہوگا۔

مسئولہ صورت میں اگر واقعی سائل نے زرخرید قطعہ اراضی پڑوس یا کھاتہ دار شریک کے شفعہ سے بچنے کے لیے والد کے نام خریدی ہو اور والد بھی اس کا مقر ہو کر ایام صحت میں اسٹامپ پیپر پر تحریری بیان دے کر بیٹے کی ملکیت کا اقرار کر چکا ہو تو پھر یہ جائیداد صرف اسی بیٹے کی ملکیت متصور ہوگی جس نے رقم دے کر جائیداد خریدی ہے۔دوسرے ورثا کی ذمہ داری ہے کہ وہ حالات کا علم ہونے کے بعد سرکاری کاغذات میں درستگی میں تعاون کریں۔

والدّلیل علی ذلك:

أن المدعي في دعوى الاستحقاق قدم عقد شراء سنداً لملكيته، فذلك لايكفي، إذيجب أن يثبت أيضا أنه اشترى من مالك، حتى تكون الملكية قد انتقلت إليه. (١)

ترجمہ: استحقاق کے دعوی میں مدعی کا خریداری کے کاغذات پیش کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ اس نے مالک سے خریداری کی ہے یہاں تک کہ ملکیت اس کی طرف منتقل ہوئی ہے۔

❁❁❁

اسٹامپ پیپر بطورِ ثبوت پیش کرنا

سوال نمبر(131):

میں نے عرصہ نو، دس سال سے قطعہ اراضی ساٹھ مرلہ بعوض 12750 روپے پاکستانی خریدی ہے اور اس بیع کا باقاعدہ اسٹامپ پیپر ہوا ہے جس پر بائع (بیچنے والے) اور گواہ کے دستخط موجود ہیں۔اب بائع اور گواہ انکاری ہیں، شرعی حل تحریر فرمائیں۔

بيّنوا تؤجروا

(١) عبدالرزاق احمد السنهوري، الوسيط، طرق اثبات الملكية في دعوى الاستحقاق: ٦٠٣/٨، داراحياء التراث

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کسی قطعہ اراضی میں دعویٰ ملکیت کے ثبوت کے لیے مدعا علیہ کی تصدیق اور اقرار ضروری ہے۔ بصورت دیگر مدعی کو گواہ پیش کرنا ضروری ہے، اگر مدعی اس سے عاجز ہے تو مدعا علیہ کو قسم دی جائے گی۔

مسئولہ صورت میں مدعی کو اپنی ملکیت ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ گواہ پیش کرنے چاہیے، محض تحریری اسٹامپ سے دعوی کا اثبات نہیں ہوتا، جب دستخط کرنے والے گواہ گواہی سے انکار کریں تو اس صورت میں مدعی علیہ کو قسم دی جائے گی۔

والدّلیل علی ذلک:

احد أسباب الحكم أيضاً اليمين أو النكول عنه، فإذا أظهر المدعي العجز عن إثبات دعواه حلف المدعى عليه بطلبه......فإن حلف المدعى عليه قضي له، وإن نكل قضي عليه.(١)

ترجمہ: حکم کے اثبات کے اسباب میں ایک سبب یمین یا اس سے انکار ہے۔ پس جب مدعی اثبات دعوی سے عجز کا اظہار کرے تو اس کے مطالبہ پر مدعی علیہ کو قسم دی جائے گی، اگر قسم اُٹھائے تو اس کے حق میں فیصلہ ہوگا، ورنہ انکار کی صورت میں اس کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا۔

❁❁❁

عرصہ دراز گزرنے سے حق کا ساقط ہونا

سوال نمبر(132):

دو افراد کے مابین جائیداد کا تنازعہ چل رہا ہے۔ مدعی علیہ مدعی سے کہتا ہے کہ چونکہ تم نے اس زمین کا پچاس سال تک دعوی نہیں کیا، لہٰذا فقہائے کرام کے قول کے مطابق اب یہ تیرا حق نہیں بنتا۔ کیا کسی زمین کی ملکیت اور حق مرورِ زمانہ سے ختم ہو جاتا ہے اور جو شخص زمین پر متصرف اور قابض ہے، اس کی ملکیت اس پر ثابت ہو جاتی ہے؟ کیا صرف طویل مدت تک خاموش رہنا سقوطِ حق کا باعث بن سکتا ہے؟

بیّنوا توٴجروا

(١) شرح المجلة لسليم رستم باز، الكتاب الخامس عشر في البينات والتحليف، الفصل الثالث في التحليف: المادة/١٧٤٢:ص/١٠٩٣

الجواب وباللہ التوفیق:

جو چیز جس شخص کی ملکیت ہو، وہ اس کا مالک رہتا ہے۔ مرور زمانہ سے اس کا حق کبھی ساقط نہیں ہوتا۔ زمانہ گزرنے کی وجہ سے کسی کی چیز اپنے لیے حلال سمجھنا درست نہیں۔ مقبوضہ چیز طویل مدت گزرنے کے باوجود واجب الادا رہے گی۔ البتہ فقہائے کرام نے اجتماعی اور انتظامی مصلحت کی بنا پر چھتیس سال گزرنے کے بعد دعوی کے سقوط کا قول فرمایا ہے، نہ کہ حق کے سقوط کا، لہٰذا مرور زمانہ سے حق ساقط نہیں ہوتا البتہ طویل مدت تک کسی عذر کے بغیر دعوی نہ کرنے سے حقِ دعوی ساقط ہو جاتا ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

إن مرورالزمان في اصطلاح الفقهاء عبارة عن منع سماع الدعوىٰ بعد أن تركت مدة معلومة، وهـذا المنع غير قياسي ؛لأن الحق لايسقط بتقادم الزمان …… قال في تنقيح الحامدية: ثم اعلم أن عدم سماع الدعوىٰ بعد مضي ثلاثين سنة أوبعد الإطلاع على التصرف، ليس مبنيا على بطلان الحق في ذلك، وإنماهو مجرد منع للقضاة عن سماع الدعوى مع بقاء الحق لصاحبه، حتى لو أقربه الخصم يلزمه.(١)

ترجمہ: فقہائے کرام کی اصطلاح میں مرور زمان سے مراد ''معلوم مدت تک چھوڑنے کے بعد سماعِ دعویٰ کی ممانعت ہے'' اور یہ منع غیر قیاسی ہے، کیوں کہ حق زمانہ کے گزرنے سے ساقط نہیں ہوتا۔۔۔۔ تنقیح الحامدیہ میں ہے: جان لو کہ تیس سال کے بعد یا تصرف کی اطلاع ملنے کے بعد دعوی کا غیر مسموع ہونا حق کے بطلان پر مبنی نہیں ہے، بلکہ یہ تو صرف قاضیوں کو سماعِ دعوی سے منع کرنا ہے اگرچہ صاحبِ حق کا حق باقی رہتا ہے، چنانچہ اگر خصم اس کا اقرار کرے تو اس کو دینا لازم ہے۔



فروخت شدہ زمین پر میراث کا دعوی

سوال نمبر (133):

ایک عورت نے آج سے پچاس سال قبل اپنی زمین فروخت کی تھی۔ فروختگی کے وقت اس کی بیٹی اور پوتی زندہ

(١) شرح المجلة لسليم رستم باز،الكتاب الرابع عشر في الدعوى، الباب الثاني في مرور الزمان: ص/٩٨٣

تھی۔اب بیٹی بقید حیات نہیں، تاہم اُس کے دو بیٹے ہیں، یعنی اب بیچنے والی عورت کے دونواسے اور ایک پوتی زندہ ہے۔یہ لوگ اس بیچی گئی زمین پر دعوی کرتے ہیں کہ مذکورہ زمین ہمارا موروثی حق ہے۔کیاان کادعوی شرعادرست ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جوکوئی مرد یاعورت کسی پرکوئی چیز فروخت کرے اور فروختگی مبرہن اور مسلم ہوتو بائع کی موت کے بعد اس میں ورثا کے ارث کا استحقاق باقی نہیں رہتا۔لہٰذا مسئولہ صورت میں جب مرحومہ نے اپنی زمین فروخت کی تھی اور مشتری عرصہ دراز سے مالکانہ تصرفات کے ساتھ قابض ہےتو اب مرحومہ کے کسی وارث کا دعوائے ملکیت درست نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

رجل باع عقارا، وابنه وامرأته أو بعض أقاربه حاضر يعلم به، ووقع القبض بينهما، وتصرف المشتري زمانا،ثم ان الحاضر عند البيع ادعى على المشتري أنه ملكه، ولم يكن ملك البائع وقت البيع، اتفق المتأخرون من مشائخ سمر قند على أنه لاتصح هذه الدعوى، ويجعل سكوته كالإفصاح بالإقرار أنه ملك البائع.(۱)

ترجمہ: ایک شخص نے زمین فروخت کی، اس کا بیٹا، بیوی یا دیگر رشتہ دار موجود تھے اور انہیں اس کا علم بھی تھا، پھر مشتری نے قبضہ ان کے سامنے کیا اور مشتری ایک زمانہ تک تصرف کرتا رہا، پھر بیع کے وقت حاضرین میں سے کسی ایک نے مشتری پر دعوی کیا کہ یہ زمین میری ملکیت ہے اور بیع کے وقت بائع کی ملک نہیں تھی۔متاخرین مشائخ سمرقند اس پر متفق ہیں کہ یہ دعوی درست نہیں اور بیع کے وقت اس کا سکوت اِس بات کا واضح اقرار شمار ہوگا کہ یہ زمین بائع کی ملک میں تھی۔

قال المتأخرون من أهل الفتوى: لاتسمع الدعوىٰ بعد ست وثلاثين سنة.(۲)

ترجمہ: متاخرین اہل فتوی فرماتے ہیں کہ چھتیس سال بعد دعوی قابلِ سماعت نہیں ہوتا۔

❁❁❁❁❁

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الدعوى، الباب الاول، الفصل الثالث فيمايتعلق بدعوى العقار: ۱۲/٤

(۲) شرح المجلة لخالد الاتاسي، كتاب الدعوى، الباب الثاني في مرورالزمان تحت المادة: ۱٦٦۳: ۱۷۷/٥

کتاب الوکالۃ

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

انسان کو زندگی کے اکثر شعبوں میں دوسرے انسان کے تعاون اور مدد کی ضرورت پڑتی ہے، کیوں کہ بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جن کو وہ اپنی مصروفیات، احوال واعراض، بڑھاپے، مرض، متعلقہ معاملات سے ناواقفیت وغیرہ کی بنا پر از خود نبھانے سے قاصر ہوتا ہے، بلکہ کچھ جائز اور مباح امور بھی ایسے ہوتے ہیں جن کو از خود کرنا انسان کی وجاہت اور شخصیت کو متاثر کرتی ہے، لہٰذا شریعت مطہرہ نے اِن ضروریات کی رعایت کرتے ہوئے وکالت کی اجازت دی ہے۔(۱)

لغوی تحقیق:

وَکالت اور وِکالت کا لغوی معنی ہے: ''حفاظت کرنا''۔ درج ذیل آیت میں بھی وکیل کا معنی ''حافظ'' ہے:

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾(۲)

اسی طرح یہ تفویض (حوالہ کرنا، کسی پر اعتماد کرتے ہوئے کوئی چیز سونپ دینا) کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ فقہاء کے ہاں وکیل (بمعنی مفعول) اسی معنی میں مستعمل ہے۔(۳)

اصطلاحی تحقیق:

إقامة الغير مقام نفسه ترفهًا أو عجزًا في تصرف جائز معلوم. (٤)

سہولت یا عجز کی وجہ سے کسی جائز اور متعین تصرف میں اپنی جگہ کسی دوسرے شخص کو قائم مقام بنانا وکالت ہے۔

---

(١) فتح القدير، كتاب الوكالة:٧/٤،مغني المحتاج، كتاب الوكالة،الخطيب الشربيني محمد،قم ايران: ٢/٢١٧

(٢) آل عمران: ١٧٣

(٣) لسان العرب مادة "وكل": ١٥/٣٨٨،الفقه الإسلامي وأدلته،الفصل التاسع الوكالة،المبحث الأول،تعريف الوكالة: ٥/٤٠٥٥

(٤) الموسوعة الفقهية، مادة وكالة: ٤٥/٥،وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية الكويت

علامہ کاسانیؒ کے ہاں وکالت کی تعریف یوں ہے:

تفویض التصرف والحفظ إلی الوکیل. (۱)

وکیل کو (کسی شے یا حق میں) تصرف اور حفاظت کی ذمہ داری سونپنے کا نام وکالت ہے۔

فقہ حنفی میں بعض دوسرے اصطلاحات، مثلاً: نیابة، ولایة، إیصاء اور قوامة بھی وکالت کے ہم معنی ہیں، تاہم فقہا کے ہاں ان میں بنیادی فرق موجود ہے۔ (۲)

وکالت کی مشروعیت:

وکالت کی مشروعیت کتاب اللہ، سنتِ نبوی اور اجماعِ امت تینوں سے ہے۔

قرآن کریم سے:

اصحاب کہف کے واقعے میں سب کا متفقہ طور پر ایک آدمی کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجنا وکالت ہی ہے (۳)

اسی طرح زوجین کا باہم اختلاف کی صورت میں کسی اور کو حکم اور وکیل بنانا بھی ثابت ہے۔ (۴)

سنت نبوی سے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عروہ بارقیؓ کو بکری خریدنے کا وکیل بنایا تھا۔ (۵)

آپ ﷺ سے حضرت حکیم بن حزامؓ کو قربانی کا جانور خریدنے کے لیے (۶) حضرت ابورافعؓ کو میمونہؓ سے نکاح کرنے کے لیے اور حضرت علیؓ کو جانور ذبح کرنے کے لیے وکیل بنانے کا عمل بھی ثابت ہے۔ (۷)

اسی طرح وکالت کے جواز پر فقہائے امت کا اجماع و اتفاق ہے اور لوگوں کی حاجات کو دیکھ کر عقل بھی اس کے جواز کی مقتضی ہے۔ (۸)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الوکالة: ۴۲۶/۷

(۲) الموسوعة الفقهية، مادة وكالة: ۶۰۵/۴۵ (۳) الكهف: ۱۹ (۴) النساء: ۳۵

(۵) البيهقي، أبو بكر أحمد بن الحسين، السنن الكبرى، كتاب القراض، باب المضارب يخالف...... رقم (۱۱۸۱۷): ۲۱/۹، دار الفكر، بيروت (۶) أيضاً (۱۱۸۲۲): ۲۳/۹

(۷) الدارمي، عبدالله بن عبد الرحمن، سنن الدارمي، كتاب المناسك، الباب الحادي والعشرون، رقم (۱۸۲۵): ۵۹/۲ السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الوكالة، باب التوكيل في المال و طلب الحقوق...... رقم (۱۱۶۲۲): ۴۵۹/۸

(۸) المغني و الشرح الكبير، كتاب الوكالة: ۲۰۱/۵، مغني المحتاج، كتاب الوكالة: ۲۱۷/۲، فتح القدير، كتاب الوكالة: ۴/۷

وکالت کے ارکان:

دوسرے معاملات کی طرح ایجاب وقبول وکالت کے ارکان ہیں۔مؤکل کی طرف سے ایجاب ہوتا ہے اور وکیل کی طرف سے قبول۔وکیل بنانے والے کومؤکل اور اصیل کہتے ہیں اور وکالت قبول کرنے والے کووکیل کہتے ہیں۔

ایجاب وقبول الفاظ کے ذریعے سے بھی ہوسکتے ہیں اور خط وکتابت،اشارے اور عرف میں ایجاب وقبول پر دلالت کرنے والے عمل کے ذریعے بھی۔حنفیہ کے ہاں سکوت ایجاب نہیں بن سکتا،البتہ قبول بن سکتا ہے۔فقہاے کرام کے ہاں قبول میں جلدی شرط نہیں،تراخی کے ساتھ بھی درست ہے۔اسی طرح وکالت کا ایجاب وقبول مطلق بھی ہوسکتا ہے، کسی شرط کے ساتھ مشروط بھی اور کسی وقت کے ساتھ مؤقت ومعلق بھی۔(۱)

ایجاب وقبول کوشرطِ فاسد سے مشروط کرنا:

حنفیہ وحنابلہ کے ہاں وکالت شروطِ فاسدہ سے فاسد نہیں ہوتی،شرط چاہے جس قسم کی بھی ہو۔(۲)

وکالت عقدِ لازم نہیں:

حنفیہ،حنابلہ،شافعیہ اور بعض مالکیہ کے ہاں وکالت عقودِ جائزہ میں سے ہے،لازمہ میں سے نہیں،لہٰذا اس میں خیارِ شرط کی بھی ضرورت نہیں،وکیل اور مؤکل دونوں کی طرف سے فسخ ہوسکتا ہے،البتہ حنفیہ ومالکیہ نے اس سے وہ صورت مستثنیٰ کی ہے جس میں وکالت کے ساتھ دوسرے شخص کا حق متعلق ہو۔(۳)

وکالت کی صحت کے لیے شرائط:

ان میں کچھ شرائط مؤکل سے متعلق ہیں،کچھ وکیل سے متعلق اور بعض ان چیزوں سے متعلق ہیں جن کا وکیل

---

(۱) بدائع الصنائع،کتاب الوکالۃ،فصل في رکن التوکیل:۴۲۶/۷،الفقه الإسلامي وأدلته،الفصل التاسع الوکالة، المبحث الأول،رکن الوکالة:۴۰۵۶/۵،الموسوعة الفقهية،مادة(وکالة):۱۸_۸/۴۵

(۲) ... ى الهندية،کتاب الوکالة،الباب الأول،وأمامايتصل بذلك:۵۶۷/۳

(۳)الفتاوى الهندية،کتاب الوکالة،الباب الأول وأماصفتها:۵۶۷/۳،البهوتي،منصوربن يونس، کشاف القناع عن متن القناع،کتاب بيع الأصول،باب الوکالة،فصل والوکالة عقد جائز من الطرفين:۵۴۵/۳،دار الکتب العلمية بيروت لبنان، المرداوي، علاؤالدين علي بن سليمان،الإنصاف، باب الوکالة، الوکالة عقد جائز من الطرفين:۳۶۸/۵،دارإحياء التراث العربي بيروت،الدر المختار مع رد المحتار،کتاب الوکالة، باب عزل الوکيل:۲۷۸/۸

بنایا جارہا ہے۔

مؤکل سے متعلق شرائط:

(۱) مؤکل جس چیز میں تصرف کا اختیار وکیل کو سونپ رہا ہے، وہ خود بھی اس چیز میں تصرف کا اہل ہو، اگر وہ خود تصرف کا اہل نہ ہو تو دوسرے کو کس طرح اپنا قائم مقام بنا سکتا ہے؟ لہٰذا پاگل اور بہت چھوٹے بچے کی توکیل درست نہیں، البتہ سمجھ دار بچے کا تصرف حنفیہ کے ہاں تین قسم پر ہے:

(الف) بعض تصرفات محض ضرر پر مبنی ہوتے ہیں، جیسے: طلاق، صدقہ، ہبہ وغیرہ، ان میں نہ تو وہ خود تصرف کرسکتا ہے، نہ کسی اور سے کروا سکتا ہے۔

(ب) بعض تصرفات خالص نفع پر مشتمل ہوتے ہیں، جیسے: قبولِ ہدیہ یا صدقہ وغیرہ، ان میں ذاتی تصرف اور توکیل دونوں درست ہیں۔

(ج) بعض تصرفات میں نفع ونقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے، جیسے: بیع اور اجارہ وغیرہ، ان تصرفات میں اگر پہلے سے ولی نے اس کی اجازت دی ہو تو وکیل بنانا درست ہے، ورنہ توکیل اور تصرف دونوں ولی کی اجازت پر موقوف رہیں گے۔(۱)

عورت، مریض اور غائب شخص کی توکیل بھی درست ہے۔(۲)

حنفیہ کے ہاں نکاح کے لیے عورت کی توکیل اور محرم کی توکیل درست ہے، البتہ مرتد، سفیہ اور شراب وخنزیر کا کاروبار کرنے والے کافر کی توکیل درست نہیں۔(۳)

وکیل سے متعلق شرائط:

(۱) وکیل کے لیے صرف عاقل ہونا شرط ہے۔ حنفیہ کے ہاں بلوغ، آزادی اور اسلام شرط نہیں۔(۴)

(۲) وکیل کا متعین ہونا ضروری ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "میں تم دونوں میں سے ایک کو فلاں کام کا وکیل بناتا ہوں"

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الوکالۃ، فصل في شرائط الرکن، أما الذي یرجع إلی الموکل: ۷/۴۲۷، ۴۲۸

(۲) الفقہ الإسلامي وأدلتہ، الفصل التاسع الوکالۃ، المبحث الثاني شرائط الوکالۃ: ۵/۴۰۶۱

(۳) الموسوعۃ الفقہیۃ، مادۃ وکالۃ: ۴۵/۲۲، ۲۳

(۴) بدائع الصنائع، کتاب الوکالۃ، فصل في شرائط الرکن وأما الذي یرجع إلی الوکیل: ۷/۴۲۸

تو یہ درست نہیں۔(۱)

(۳)وکیل کو اپنی وکالت پر علم ہو کہ مجھے فلاں کام کے لیے وکیل بنایا گیا ہے،تصرف کرتے وقت اگر وہ اپنی وکالت سے ناواقف تھا تو اس کا تصرف نافذ نہیں ہوگا۔حنفیہ کے ہاں وکیل کو اپنی وکالت کا علم مشافہتاً،کتابتاً،قاصد یا مخبر کے ذریعے ہو سکتا ہے اور مخبر چاہے دو آدمی ہوں یا ایک،عادل ہوں یا غیر عادل،بشرطیکہ وکیل اس کی تصدیق کردے۔(۲)

(۴)وکیل اپنے مؤکل کو جانتا ہو،کسی بھی طریقے سے ہو۔(۳)

(۵)وکیل اپنے قصد و ارادے سے وکالت قبول کرے،جبر و اکراہ یا مزاح کی صورت میں قبولیت معتبر نہیں۔(۴)

مؤکل بہ(مفوضہ کام)سے متعلق شرائط:

(۱)مؤکل بہ امورِ مباحہ میں سے نہ ہو ایسی چیزیں جو عمومی طور پر مباح ہیں،جیسے گھاس،لکڑی،پانی،شکار وغیرہ ان میں وکالت درست نہیں حنفیہ کے ہاں ان صورتوں میں گھاس لکڑی جمع کرنا یا شمار کرنا وکیل کا اپنا فعل شمار ہوگا،مؤکل کا نہیں۔

(۲)مؤکل بذاتِ خود مؤکل بہ میں تصرف کا مالک ہو،اگر خود ہی مالک نہ ہو تو وکیل کو تفویض کس طرح کرسکے گا؟

(۳)مؤکل بہ(مفوضہ کام)قرض لینا نہ ہو،یعنی اگر مؤکل وکیل سے کہہ دے کہ میرے لیے کسی سے قرض لے لو تو یہ قرض لینا وکیل کا ذاتی فعل شمار ہوگا،ہاں اگر وہ یہ کہہ دے کہ مجھے فلاں نے بھیجا ہے کہ "تم سے اتنا قرض لے لوں" تو یہ درست ہے۔

(۴)مفوضہ کام ایسا ہو جس میں شرعاً نیابت درست ہو،لہٰذا خالص بدنی عبادت(نماز،روزہ،وضو،تیمم)میں وکالت درست نہیں۔(۵)

---

(۱)الأشباه و النظائر لابن نجيم،كتاب الوكالة،الفن الثاني و هو فن الفوائد:ص۱۳۶،ایچ ایم سعید کراچی

(۲)الفقه الإسلامي وأدلته،الفصل التاسع الوكالة،المبحث الثاني شرائط الوكالة،وأماشرائط الوكيل:۴۰۶۴/۵،بدائع الصنائع،كتاب الوكالة،فصل في شرائط الركن،وأماالذي يرجع إلى الوكيل:۴۲۸/۷،الأشباه والنظائر لابن نجيم،كتاب الوكالة،الفن الثاني وهو فن الفوائد:ص۱۳۷،ایچ ایم سعید کراچی

(۳)الفقه الإسلامي وأدلته،الفصل التاسع الوكالة المبحث الثاني شرائط الوكالة،وأما شرائط الوكيل:۴۰۶۴/۵

(۴)الفقه الإسلامي وأدلته،الفصل التاسع الوكالة المبحث الثاني شرائط الوكالة،وأماشرائط الوكيل:۴۰۶۴/۵،الهداية، كتاب الوكالة:۱۸۶،۱۸۷/۳

(۵)الفقه الإسلامي وأدلته،الفصل التاسع في الوكالة،المبحث الثاني شرائط الوكالة،وأماشروط الموكل به:۴۰۶۵/۵،الفتاوى الهندية،كتاب الوكالة،الباب الأول،ومنها ما يرجع إلى الموكل به:۵۶۴،۵۶۳/۳

اُن امور کی تفصیل جن میں وکالت ہوسکتی ہے:

فقہائے کرام کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ جو کام شریعت کی رو سے آدمی خود کرسکتا ہو اس میں دوسرے کو وکیل بنانا بھی درست ہے، تاہم ان امور کو فقہانے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

وہ امور جن میں بالاتفاق وکالت درست ہے۔

وہ امور جن میں بالاتفاق وکالت درست نہیں۔

وہ امور جن میں فقہائے کرام کا باہم اختلاف ہے۔

وہ امور جن میں بالاتفاق وکالت درست ہے:

(۱) عقود: فقہائے کرام کے ہاں خرید و فروخت میں، حوالہ، کفالہ، رہن، شرکہ، ودیعۃ، مضاربۃ، جعالہ، مساقاۃ، اجارہ، قرض، وصیۃ، فسخ، ابراء، صلح، اقالہ اور شفعہ میں توکیل درست ہے۔

(۲) عباداتِ مالیہ: زکوٰۃ، صدقات، منذورات اور کفارات میں بھی توکیل بالاتفاق درست ہے۔

(۳) طلاق، رجوع اور خلع میں بھی توکیل بالاتفاق درست ہے، تاہم مذکورہ تینوں قسم کے امور میں اکثر امور ایسے ہیں جن کا ارتکاب کرتے وقت مؤکل کی طرف نسبت کرنا ہوگا۔(۱)

وہ امور جن میں بالاتفاق وکالت درست نہیں:

(۱) قسم، نذر، لعان، ایلاء اور قسامۃ میں توکیل درست نہیں، کیوں کہ یہ سب امور مؤکل کی ذات اور قلب سے متعلق ہونے کی وجہ سے بمنزلہ عباداتِ بدنیہ ہیں۔

(۲) گواہی (شہادت) میں بھی توکیل درست نہیں، اس لیے کہ گواہی اس چیز کی دی جاتی ہے جو آدمی خود دیکھ لے یا سن لے اور ظاہر ہے کہ وکیل سنئے یا دیکھے بغیر کس طرح گواہی دے سکتا ہے۔

(۳) معاصی میں بالاتفاق وکالت درست نہیں کیونکہ معاصی کا ارتکاب نہ مؤکل کے لیے جائز ہے اور نہ وکیل کے لیے۔

(۴) خالص عباداتِ بدنیہ (مثلاً: نماز، روزے اور طہارت) میں توکیل درست نہیں۔

وہ امور جن میں توکیل کے متعلق فقہا کا اختلاف ہے:

(۱) حج: فقہائے کرام کے ہاں خود حج پر قدرت رکھنے والے شخص کے لیے کسی اور کو وکیل بنانا بالاتفاق جائز

(۱) الفقه الإسلامي وأدلته، الفصل التاسع في الوكالة، المبحث الثاني في شرائط الوكالة: ٥/٤٠٦٦

نہیں، تاہم دائمی عاجز شخص کی توکیل میں اختلاف ہے جو کہ حنفیہ کے ہاں جائز ہے۔

(۲) عمرہ: فقہائے کرام کے ہاں اس میں توکیل بالاتفاق درست ہے، تاہم کچھ امور میں اختلاف موجود ہے۔(۱)

(۳) عورت کا نکاح: حنفیہ کے ہاں عورت نکاح کرنے میں خود بھی وکیل بن سکتی ہے اور کسی دوسرے شخص کو بھی وکیل بنا سکتی ہے۔

(۴) ظہار: جمہور کے ہاں معصیت ہونے کی وجہ سے اس میں توکیل جائز نہیں، بخلاف شافعیہ کے۔

(۵) مباحات: حنفیہ کے ہاں مباح چیزوں میں توکیل جائز نہیں، بخلاف دوسرے فقہا کے۔

(۶) اقرار: حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے ہاں حقوق میں کسی کو اقرار کرنے کے لیے وکیل بنایا جا سکتا ہے کہ میرے مؤکل پر فلاں کا یہ حق ثابت ہے، بخلاف شافعیہ اور امام طحاویؒ کے۔

(۷) توکیل بالخصومۃ: امام ابوحنیفہؒ کے علاوہ باقی سب فقہا کے ہاں توکیل بالخصومۃ مطلقاً جائز ہے، چاہے دَین میں ہو یا عین میں، حاضر ہو یا غائب، صحت مند ہو یا مریض، خصم راضی ہو یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں خصم کی رضامندی ضروری ہے، اگر وہ راضی نہ ہو تو مؤکل کی حاضری ضروری ہے، سوائے چند صورتوں کے، مثلاً: مؤکل بیماری یا طویل سفر کی وجہ سے حاضری سے معذور ہو یا مؤکلہ کوئی پردہ نشین عورت ہو۔ دوسرے فقہا کے ہاں نہ مؤکل کی حاضری ضروری ہے اور نہ خصم کی رضامندی۔(۲)

(۸) اثبات القصاص: جمہور فقہا کے ہاں قصاص کے اثبات کے لیے توکیل درست ہے بخلاف امام ابو یوسفؒ کے۔

(۹) استیفاء القصاص: حنفیہ اور شافعیہ کے ہاں اگر مؤکل غائب ہو تو استیفاء القصاص (قصاص لینے) میں توکیل درست نہیں، بخلاف مالکیہ و شافعیہ کے، اُن کے ہاں مطلقاً درست ہے۔

(۱۰) اثبات الحدود و استیفائها: دیگر فقہا کی طرح اس میں حنفیہ کے ہاں بھی کافی تفصیل ہے جو آگے ''حقوق اللہ کی ادائیگی میں توکیل'' کے عنوان سے ذکر کی جائے گی۔

---

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة (عمرة): ۳۲۸/۳۰

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الوكالة، فصل في شرائط الركن وأما الذي يرجع إلى الموكل به: ۴۳۲،۴۳۱/۷، الفتاوى الهندية، كتاب الوكالة، الباب الأول، ومنها ما يرجع إلى الموكل به: ۵۶۴/۳، الفقه الإسلامي و أدلته، الفصل التاسع في الوكالة، المبحث الثاني شرائط الوكالة، وأما شرائط الموكل به: ۴۰۶۷-۴۰۶۵/۵

حقوق اللہ کی ادائیگی میں وکیل بنانا:

حقوق دو قسم کے ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ پھر حقوق اللہ کی بھی دو صورتیں ہیں: ایک ان حقوق کا اثبات اور دوسرا ان کا استیفا (یعنی ثابت ہونے کے بعد ان حقوق کی وصولی)۔

پھر ان حقوق کا اثبات دو قسم پر ہے:

(۱) ایک وہ حقوق کہ جن میں دعوی شرط ہے، مثلاً: حد قذف، حد سرقہ، وغیرہ۔ ایسے حقوق کو ثابت کرنے کے لیے وکیل بنانا کہ وہ مؤکل کی طرف سے عدالت میں دعوی دائر کرے، امام ابوحنیفہ وامام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے، چاہے مؤکل موجود ہو یا غائب۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز نہیں۔ یہی اختلاف اثبات القصاص میں بھی ہے۔

(۲) اور جن حقوق میں دعوی شرط نہیں، جیسے: حد زنا، حد شرب خمر تو اُن کو ثابت کرنے کے لیے توکیل بھی جائز نہیں، اس لیے کہ یہ حقوق یا تو گواہ کے ذریعے قاضی کے سامنے ثابت ہوں گے یا مجرم کے اقرار کے ذریعے، ان میں خصومت اور دعوی کی کوئی ضرورت نہیں۔ (۱)

استیفاے حدود میں توکیل:

استیفاے حدود، یعنی حدود جاری کرنے میں قاضی کسی کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں تمام فقہا کے ہاں یہ جائز ہے کہ قاضی حدود جاری کرنے میں کسی کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے۔

تاہم یہ بات کہ حد جاری کرتے وقت وکیل کا حاضر ہونا مؤکل کی طرف سے کافی ہوگا یا نہیں؟ تو طرفین کے ہاں حد قذف اور حد سرقہ کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ جس پر تہمت لگائی گئی ہو، یعنی مقذوف اور جس کا مال چوری ہو گیا ہو (مسروق منہ) حد نافذ کرتے وقت اُن کا خود حاضر ہونا ضروری ہے، کیوں کہ ممکن ہے کہ اجراے سزا کے وقت اگر یہ حضرات موجود رہیں تو اپنے دعوی سے رجوع کر لیں تو اس احتمال نے ایک گونہ شبہ پیدا کر دیا ہے اور شبہ سے بھی حد ساقط ہوتی ہے۔ دیگر فقہا کے ہاں حدود جاری کرنے کے لیے مؤکل کی موجودگی ضروری نہیں۔ (۲)

حقوق العباد میں توکیل:

حقوق العباد بھی دو قسم کے ہیں:

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الوکالۃ، فصل في شرائط الرکن، وأما الذي یرجع إلی الموکل بہ: ۷/۴۲۹، ۴۳۰

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الوکالۃ، فصل في شرائط الرکن، وأما الذي یرجع إلی الموکل بہ: ۷/۴۳۰، ۴۳۱، الفقہ الإسلامي وأدلتہ، الفصل التاسع في الوکالۃ، المبحث الثاني شرائط الوکالۃ، الوکالۃ في حقوق اللہ ......: ۵/۶۶۰۴، ۶۷۰

(۱)ایک وہ جو شبہ کی وجہ سے ساقط ہوتے ہیں، جیسے: قصاص۔ایسے حقوق کو ثابت کرنے کے لیے توکیل جائز ہے،لیکن استیفاء یعنی قصاص لیتے وقت مقتول کے ولی کا خود موجود رہنا ضروری ہے۔اگر وہ بذاتِ خود حاضر نہ ہو تو صرف وکیل کی موجودگی میں قصاص نہیں لیا جا سکتا۔

(۲)دوسری قسم حقوق العباد کی وہ ہیں جو شبہ کے باوجود ثابت ہو جاتے ہیں، یعنی مالی حقوق، جیسے: دیون وغیرہ،ان کو ثابت کرنے کے لیے اور استیفا، یعنی وصول کرنے کے لیے ہر صورت میں توکیل جائز ہے۔(۱)

توکیل بالبیع والشراء کی قسمیں:

تفویض شدہ امر (بیع وشرا) کے اعتبار سے وکالت کی دو قسمیں ہیں:

(۱)وکالتِ عامہ:وکالتِ عامہ یہ ہے کہ وکیل کو اختیار دیا جائے کہ وہ کوئی بھی چیز (جس وصف کا بھی ہو) مؤکل کے لیے خرید لے یا اس سے کہا جائے کہ تو ہر جائز کام میں میرا وکیل ہے۔اس صورت میں حنفیہ کے مفتی بہ قول کے مطابق وہ ان تمام امور میں وکیل متصور ہوگا جن میں تبرع اور اسقاط (مثلاً: وقف، ہبہ،صدقہ،طلاق،عتاق وغیرہ) نہ ہو،اس لیے کہ وکیل بنانا اپنے فائدے کے لیے ہوتا ہے اور ان صورتوں میں مؤکل کا نقصان ہو رہا ہے۔(۲)

(۲)وکالتِ خاصہ:وکالتِ خاصہ یہ ہے کہ کسی مخصوص چیز کے خریدنے کا حکم دیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ تمہاری جو مرضی ہو،اس کے مطابق خرید لو۔ایسی وکالت میں اگر زیادہ ابہام ہو تو وکالت درست نہ ہوگی، کیوں کہ اس سے آئندہ نزاع پیدا ہونے کا خدشہ ہے،البتہ اگر ابہام وجہالت معمولی ہو تو وکالت درست ہے۔جہالت دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تفویض شدہ امر کی نوع، وصف یا قیمت وغیرہ بتا کر وکیل بنا دے تا کہ وکیل کو تصرف میں آسانی ہو۔(۳)

وکیل کے اختیارات:

(۱)وکالت کا بنیادی حکم یہ ہے کہ وکیل کو مؤکل کے متعین کردہ حدود میں رہتے ہوئے تصرف کا حق حاصل

(۱) بدائع الصنائع،کتاب الوکالۃ،فصل في شرائط الرکن، و أما الذي یرجع إلی الموکل به:۴۳۱/۷،الفقه الإسلامي وأدلته،الفصل التاسع في الوکالۃ،المبحث الثاني شرائط الوکالۃ،وأما شروط الموکل به، ثانیاً الوکالۃ في حقوق العباد:۴۰۷۲/۵

(۲) رد المحتار علی هامش الدر المختار،کتاب الوکالۃ:۲۴۱،۲۴۰/۸

(۳) بدائع الصنائع،کتاب الوکالۃ،فصل في شرائط الرکن، وأما الذي یرجع إلی الموکل به:۴۳۵،۴۳۴/۷

ہوگا۔اس کے علاوہ شریعت اور عرف کی طرف سے لگائے گئے حدود کی رعایت بھی اس پر لازم ہوگی۔(۱)

(۲) وکیل بالخصومت (مقدمہ کی پیروی کرنے والا) مطلق خصومت میں اپنے مؤکل کے خلاف بھی اقرار کرسکتا ہے، سوائے حدود وقصاص کے، البتہ اگر مؤکل یہ شرط لگادے کہ میرے خلاف اقرار کی اجازت نہیں تو اس صورت میں اپنے مؤکل کے خلاف اقرار نہیں کرسکتا۔ مطلق خصومت میں اقرار امام محمدؒ کے ہاں صرف مجلس قضا میں معتبر ہے، بخلاف امام ابو یوسفؒ کے۔(۲)

(۳) حنفیہ کے ہاں مالی مقدمے میں وکیل بننے والا شخص اس مال پر قبضہ بھی کرسکتا ہے، بخلاف امام زفرؒ کے۔ متاخرین حنفیہ کے ہاں موجودہ دور میں بڑھتی ہوئی خیانت کی وجہ سے امام زفرؒ کا قول مفتی بہ ہے۔

(۴) امام صاحب کے ہاں قرض سے انکار کی صورت میں وکیل اس قرض کو ثابت کرنے میں بھی وکیل بن سکتا ہے بخلاف صاحبین کے، تاہم کسی معین چیز سے انکار کی صورت میں وکیل اس معین چیز کے اثبات میں بالاتفاق وکیل نہیں بن سکتا۔

(۵) اگر کسی کو وکالتِ عامہ کے طور پر کوئی چیز قبض کرنے کے لیے وکیل بنایا جائے تو وہ اس چیز کو قبض کرنے کے لیے کسی اور کو بھی وکیل بنا سکتا ہے، البتہ عمومی اختیار کے بغیر اس کے لیے یہ جائز نہیں۔(۳)

(۶) وکیل کے لیے مؤکل کی قیود کا پابند رہنا ضروری ہے، تاہم اگر قیود کی مخالفت مؤکل کے لیے فائدہ مند ہو تو نافذ رہے گی، لیکن نقصان کی صورت میں یہ تصرف مؤکل ہی کی اجازت پر موقوف رہے گی، جیسے: دس روپے فروخت کرنے کی قید کے باوجود آٹھ روپے میں فروخت کرنا۔

(۷) بیع وشراء کی مطلق وکالت میں امام ابوحنیفہؒ کے ہاں وکیل کو نقد وادھار اور قلیل وکثیر پر فروخت کی اجازت ہے، بخلاف صاحبین کے، ان کے ہاں صرف نقد قیمت اور متعارف نقصان جائز رہے گی۔(۴)

(۸) کسی چیز کو فروخت کرنے پر مامور وکیل اس چیز کو ایک ساتھ فروخت کرے گا، تاہم امام صاحب کے ہاں اگر کچھ حصہ فروخت کرنے سے بقیہ حصہ کو کوئی نقصان یا قیمت میں کمی نہ ہو تو جائز ہے، البتہ خریدنے کا وکیل اگر اس شئے کا بعض

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الوکالة، فصل في حکم التوكيل: ۴۳۶/۷

(۲) أيضاً: ۴۳۷،۴۳۶/۷

(۳) أيضاً: ۴۳۸،۴۳۷/۷

(۴) أيضاً: ۴۴۱/۷

حصہ خریدے تو بالاتفاق یہ شراء غیر نافذ (موقوف علی اذن المؤکل) رہے گی۔(۱)

(۹) امام ابوحنیفہؒ کے ہاں بیع کا وکیل خریدار کو قیمت معاف کرسکتا ہے، مہلت دے سکتا ہے، قیمت کے بدلے کوئی اور چیز لے سکتا ہے، قیمت پر صلح کرسکتا ہے، کسی اور شخص کے حوالہ کو قبول کرسکتا ہے بخلاف صاحبین کے، البتہ امام صاحب کے ہاں وہ ان صورتوں میں مؤکل کے لیے مذکورہ شے کی قیمت کا ضامن ہوگا۔

(۱۰) وکیل اپنے ان رشتہ داروں پر وکالت کا سامان فروخت نہیں کرسکتا جن کے بارے میں ان پر تہمت لگائی جاسکتی ہو، صاحبین کے ہاں مناسب قیمت سے جائز ہے۔(۲)

ایک ہی کام کے لیے ایک سے زیادہ وکیل بنانا:

خصومت کے علاوہ معاملات میں وکلا کا تعدد جائز ہے، تاہم اگر مؤکل نے ایک ہی وقت اور ایک ہی کلام سے دونوں کو وکیل بنایا یا صراحتاً یہ کہا کہ دونوں مل کر تصرف کروگے تو اس صورت میں ان کے لیے انفرادی تصرف کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ اگر دونوں کو الگ الگ وکیل بنایا تو جن معاملات میں تبادلۂ خیال اور غور وفکر کی ضرورت ہو، ان میں کوئی ایک وکیل تنہا تصرف نہیں کرسکتا، مثلاً: وہ مالی معاملات جن میں عوضِ مالی پایا جاتا ہو، جیسے: بیع، اجارہ، مضاربت وغیرہ، البتہ جن امور میں تبادلہ خیال کی حاجت نہ ہو تو ان میں تنہا ایک وکیل کا تصرف بھی معتبر ہے، جیسے: ہبہ، دَین کی ادائیگی، امانت کی واپسی وغیرہ۔(۳)

حقوق وکیل سے متعلق ہوں گے یا مؤکل سے:

حنفیہ کے ہاں اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ بعض امور وہ ہیں جن سے کوئی حق متعلق نہیں، جیسے: مقروض سے دَین کا تقاضا کرنا، ایسے امور میں وکیل کی حیثیت محض مامور کی ہے۔

بعض معاملات وہ ہیں کہ وکیل کو ان کی انجام دہی میں مؤکل کی طرف منسوب کرنے کی حاجت نہیں ہوتی، جیسے: خرید وفروخت، اجارہ وغیرہ۔ اس میں تمام حقوق خود وکیل سے متعلق ہوں گے، چاہے عدالت سے متعلق ہی کیوں نہ ہوں۔

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الوکالۃ، فصل في حکم التوکیل: ۷/ ۴۴۲ (۲) بدائع حوالہ مذکورہ: ۷/ ۴۴۲، ۴۴۳

(۳) الفقہ الإسلامي وأدلتہ، الفصل التاسع الوکالۃ، المبحث الرابع تعدد الوکلاء: ۵/ ۴۱۱۲، الموسوعۃ الفقہیۃ، مادۃ وکالۃ: ۴۵/ ۷۸، ۷۹، بدائع الصنائع، کتاب الوکالۃ فصل في حکم الوکیلین: ۷/ ۴۵۰-۴۵۳، الفتاوی الہندیۃ، کتاب الوکالۃ، الباب الثامن في توکیل الرجلین: ۳/ ۶۳۴

تیسرے وہ معاملات ہیں جن کو وکیل مؤکل کی طرف منسوب کیے بغیر انجام نہیں دے سکتا، جیسے: نکاح، طلاق، خلع وغیرہ۔ ان میں وکیل کی حیثیت محض سفیر اور ترجمان کی ہوتی ہے اور عقد سے متعلق تمام حقوق مؤکل کو راجع ہوں گے۔ تقریباً یہی رائے مالکیہ اور شافعیہ کی بھی ہے، البتہ حنابلہ کے ہاں تمام ہی معاملات میں حقوق مؤکل سے متعلق ہوں گے نہ کہ وکیل سے۔

اسی طرح بعض وہ عقود جو قبض کے بغیر تام نہیں ہوتے، جیسے: ہبہ، قرض، اعارہ، رہن وغیرہ تو ان چیزوں میں بھی مؤکل کی طرف نسبت ضروری ہے، ورنہ یہ قبض وکیل کی طرف سے شمار ہوگا۔(۱)

اجرت اور عدمِ اجرت کے اعتبار سے وکالت کی قسمیں اور ان کا حکم:

(۱) عام طور پر عقدِ وکالت بغیر اجرت کے ہوتی ہے اس کا حکم یہ ہے کہ یہ وکالت عقدِ لازم نہیں۔ مؤکل کسی بھی وقت وکیل کو معزول کر سکتا ہے اور وکیل کسی بھی وقت کام سے انکار کر سکتا ہے۔

(۲) وکالت بالاجر کی پہلی قسم یہ ہے کہ عقدِ وکالت کرتے وقت زمانے یا کام کا تعین نہ کریں۔ یہ صورت بھی بالاتفاق جانبین سے غیر لازم ہے۔ کام شروع کرنے کے بعد یہ وکالت مالکیہ کے ہاں وکیل کے حق میں لازم ہوگی۔

(۳) وکالت بالاجر کی دوسری قسم اجارہ کی ہے جس میں وقت اور کام دونوں معین ہوں، جیسے: دلال وغیرہ۔ حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں یہ عقدِ لازم ہے۔(۲)

وکالت ختم ہونے کے اسباب:

(۱) مؤکل کا وکیل کو معزول کرنے کے لیے چار شرائط ہیں:

(الف) وکیل کو اپنے معزول ہونے کا علم ہو۔

(ب) وکالت سے کسی اور کا حق متعلق نہ ہو۔

(ج) وکالت اجارہ کے طور پر نہ ہو۔

(د) شافعیہ کے ہاں عزل سے کسی فساد کا خطرہ نہ ہو۔

(۲) مؤکل فوت ہو جائے۔

---

(۱) الفقہ الإسلامي وأدلتہ، الفصل التاسع الوکالۃ، المبحث الثالث أحکام الوکالۃ، ثانیاً حقوق العقد و حکمہ في الوکالۃ: ۵/۴۱۰۳

(۲) الفقہ الإسلامي وأدلتہ، الفصل التاسع الوکالۃ، المبحث الخامس طرق انتہاء الوکالۃ، وأما الوکالۃ بأجر: ۵/۴۱۱۴

(۳) مؤکل پاگل ہوجائے جنونِ مطبق کے ساتھ۔

(۴) مؤکل خود تصرف سے عاجز ہوجائے یعنی عدالت کی طرف سے دیوالیہ قرار دیا جائے۔

(۵) وکیل مرجائے۔

(۶) وکیل دیوانہ ہوجائے۔

(۷) مفوضہ امر میں مؤکل خود تصرف کردے۔

(۸) جس چیز میں وکیل بنایا تھا، وہ چیز ضائع ہوجائے۔

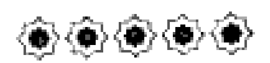
(۹) مؤکل مرتد ہوکر دارالحرب چلا جائے۔(۱)

(۱۰) وکیل کے ذمے جو کام سپرد ہوا تھا، وہ اسے پورا کردے۔

(۱۱) مؤکل یا وکیل وکالت سے انکار کردے، یعنی یہ کہے کہ ہم نے تو وکالت ہی نہیں کی ہے۔

(۱۲) وکیل خود اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوجائے، بشرطیکہ مؤکل کو اطلاع دے۔

اس کے علاوہ بھی بعض شرائط ہیں، تاہم ان میں سے اکثر شرائط یا تو موجودہ شرائط کے ضمن میں آتے ہیں یا وہ شرائط حنفیہ کے ہاں نہیں۔(۲)



(۱) بدائع الصنائع، کتاب الوکالۃ، فصل فيما يخرج به الوكيل عن الوكالة: ٥/٤٥٩_٤٦٥

(۲) الفقه الإسلامي وأدلته، الفصل التاسع الوكالة، المبحث الخامس طرق إنتهاء الوكالة: ٥/١٤١٦_١٤١٨، الموسوعة الفقهية، مادة (وكالة): ٤٥/١٠٢_١١٤

مسائل کتاب الوکالۃ

(وکالت کے مسائل کا بیان)

وکیل کے تصرفات

سوال نمبر(134):

ایک شخص نے دوسرے کو وکیل بنایا اور اس کو رقم دی کہ یہ رقم فلاحی تنظیم کو دے دو۔کیا وکیل اپنی طرف سے اس کو اپنے پاس رکھ کر تصرفات کرسکتا ہے کہ یک مشت نہ دے، بلکہ تھوڑی تھوڑی کر کے دیتا رہے، وضاحت فرمائیں۔

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

عقدِ وکالت میں وکیل کے لیے مؤکل کا تابع ہونا ضروری ہے،یعنی وکیل کو اتنے تصرف کا اختیار حاصل رہتا ہے جتنے تصرف کا اختیار دیا گیا ہو،اس سے تجاوز کرنا جائز نہیں،اس لیے ازخود مؤکل کی اجازت کے بغیر وکیل تصرف کا مجاز نہیں۔ صورتِ مسئولہ میں وکیل کو مؤکل کی منشا کے مطابق رقم خرچ کرنی چاہیے۔اگر مؤکل کی منشا پوری کرنے کے لیے رقم اقساط میں دے تاکہ متعلقہ مصرف میں خرچ یقینی ہو تو پھر گنجائش ہے اور اگر اپنے فائدے کے لیے یوں کر رہا ہو تو پھر جائز نہیں،ایسی صورت میں ضروری ہے کہ پوری رقم یکمشت حوالہ کرے۔

والدّلیل علی ذلک:

إن الوکیل من حیث ہو وکیل یملك جنس التصرف من جہۃ الموکل.(۱)

ترجمہ: وکیل وکیل ہونے کی حیثیت سے اس تصرف کا مالک ہوتا ہے جو مؤکل کی طرف سے اسے سونپ دیا گیا ہے۔

❁❁❁

بذریعہ بینک امپورٹ ایکسپورٹ کاروبار کرنا

سوال نمبر(135):

زید (بائع) پاکستان میں ہے،جب کہ بکر (مشتری) ایران میں ہے۔اب بکر کسی ایرانی بینک سے معاہدہ کرتا ہے

(۱) فتح القدیر، کتاب الوکالۃ:۷/۱۲،۱۳

کہ بینک میرے بائع (زید) کو ثمن ادا کردے، اور مجھ سے وصول کرے۔اب ایرانی بینک پاکستان کے کسی بینک سے کہتا ہے کہ بائع (زید) کو ثمن ادا کردے، جسے پاکستان کا بینک منظور کرتا ہے۔اب اگر مشتری نے ایرانی بینک میں رقم فی الفور جمع کروائی تو پاکستانی بینک بائع کو ثمن کی پوری رقم ادا کرتا ہے اور اگر مشتری ایرانی بینک میں رقم تاخیر سے ادا کرتا ہے تو وہ بینک اس سے کچھ اضافی رقم وصول کرتا ہے۔ پاکستانی بینک فی ڈالر کچھ طے شدہ رقم وضع کر کے بائع کو رقم کی ادائیگی کرتا ہے۔کیا کاروبار کی یہ صورت جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ شریعتِ مطہرہ کی رُو سے جس طرح عاقدین خود خرید وفروخت کرنے کے مجاز ہیں، اسی طرح بائع اور مشتری کے وکیل کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اجرت کے عوض ان کے معاملات طے کریں۔

صورتِ مسئولہ میں کاروبار کی جو صورت مذکور ہے۔اس میں زید اور بکر خود عاقدین ہیں اور ایرانی بینک بکر (مشتری) کا وکیل اور کفیل ہے، جب کہ پاکستانی بینک زید (بائع) کا وکیل اور کفیل ہے، چونکہ وکالت پر اجرت لینا شرعاً جائز ہے اور کفالت پر اجرت لینا شرعاً جائز نہیں، کیوں کہ کفالت ایک تبرع ہے اور تبرع کا عوض مقرر کرنا جائز نہیں۔لہٰذا زید (بائع) کی جانب بینک جو کٹوتی کرتا ہے، اس کے جواز میں تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ بینک اپنی وکالت کی اجرت کے طور پر کاٹ لیتا ہے اور بحیثیتِ کفیل اجرت لینا اگرچہ جائز نہیں، لیکن چونکہ بینک اس صورت میں کفالت کے ساتھ ساتھ اس تمام کارروائی کی کتابت وغیرہ بھی کرتا ہے، اس کے علاوہ وہ ان کاغذات کو بیرون ملک بھی بھیجتا ہے اور دوسری انتظامی ذمہ داریاں بھی برداشت کرتا ہے تو اگر ان امور کی ادائیگی کے عوض بینک اجرت مقرر کر کے وصول کرے تو شرعاً یہ جائز ہوگا۔اس کے علاوہ بینک بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ بھی بنتا ہے جس کی وجہ سے اس کی حیثیت دلال کی ہوجاتی ہے، اس کے عوض بھی بینک کے لیے اجرت وصول کرنا جائز ہے، لہٰذا بینک کا مشتری اور بائع سے بحیثیت وکیل اور دلال اجرت لینا جائز ہے۔

تاہم مشتری (بکر) سے ایرانی بینک رقم کی تاخیر پر جو اضافہ لیتا ہے، یہ قرض پر زیادتی ہے جس کی اجازت نہیں، اس لیے اس کی بہتر صورت یہی ہے کہ مشتری تمام رقم کی ادائیگی یکمشت کرے، ورنہ تاخیر کی وجہ سے جو زیادہ رقم ادا کرنی ہوگی، وہ سود کے حکم میں ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، تاہم اس سے زید وبکر کے درمیان جو عقد ہے اُس پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، یہ عقد جائز رہے گا۔

والدّلیل علی ذلک:

کل عقد جاز أن یعقده الإنسان بنفسه، جاز أن یوکل به غیره.(۱)

ترجمہ: ہر وہ عقد جو انسان خود طے کرسکتا ہے، اس میں دوسرے کو وکیل بنانا بھی جائز ہے۔

إذا أخذ الوکیل الأجرة لإقامة الوکالة، فإنه غیر ممنوع شرعا.(۲)

ترجمہ: اگر وکیل وکالت کی اجرت لے تو یہ شرعاً ممنوع نہیں۔

وفي الحاوي: سئل محمد بن مسلمة عن أجرة السمسار، فقال أرجو أنه لابأس به، وإن کان في الأصل فاسداً؛ لکثرة التعامل، وکثیر من هذا غیر جائز فجوّزوه لحاجة الناس إلیه. (۳)

ترجمہ:

اور حاوی میں ہے کہ محمد بن مسلمہ سے دلال کی اُجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے (جواب میں) فرمایا کہ: میں امید رکھتا ہوں کہ کثرتِ تعامل کی وجہ سے اس میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ اصل میں یہ فاسد ہے اور اس طرح کے بہت سے معاملات جائز نہیں، مگر لوگوں کی حاجت کی وجہ سے فقہا نے ان کو جائز قرار دیا ہے۔

❁❁❁

وکیل کے کاغذات پر پلاٹ خریدنا

سوال نمبر(136):

ریگی للمہ ٹاؤن کی قرعہ اندازی اسکیم میں زید نے پلاٹ کی خریداری کا ارادہ کیا، تاہم واپڈا کا ملازم ہوتے ہوئے اپنے نام سے اس کے حصول کا مستحق نہیں تھا، کیوں کہ مذکورہ اسکیم صوبائی ملازمین کے لیے مخصوص تھی، جب کہ محکمہ واپڈا 'وفاق' سے منسلک ہے۔ چنانچہ زید نے پلاٹ کے حصول کے لیے عمرو سے رابطہ کیا۔ عمرو کا والد صوبائی ملازم تھا۔ عمرو نے اپنے والد کے کاغذات کو استعمال کرتے ہوئے زید کے لیے قرعہ اندازی اسکیم میں حصہ لیا۔ قرعہ اندازی میں پلاٹ نکلا، زید رجسٹریشن فیس کے ساتھ ساتھ کئی قسطیں بھی ادا کرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد حکومت نے

(۱) فتح القدیر، کتاب الوکالۃ: ۳/۷

(۲) أیضاً: ۲/۷

(۳) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الاجارۃ، باب ضمان الأجیر: ۸۷/۹

انتقال اور عام خرید وفروخت کی اجازت دے دی۔ چنانچہ زید نے مذکورہ پلاٹ کو اپنے نام انتقال کرانا چاہا، لیکن عمرو کا والد (جس کی کاغذی کارروائی سے پلاٹ خریدا گیا ہے) اس بنا پر پلاٹ کو اپنا حق سمجھتا ہے کہ میرے کاغذات کی بدولت پلاٹ کا حصول ممکن ہوا ہے، حالانکہ عمرو بھی اس کا گواہ ہے کہ یہ پلاٹ عمرو کے والد کے لیے نہیں، بلکہ زید کے لیے خریدا گیا تھا۔ کیا محض کاغذات کے استعمال کی وجہ سے عمرو کا والد مذکورہ پلاٹ کا حق دار بنتا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جب کسی شخص کو معین چیز خریدنے کے لیے وکیل بنایا جائے تو وکیل کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس چیز کو اپنے لیے (یا کسی غیر کے لیے) خریدے، کیوں کہ اس میں مؤکل کے ساتھ دھوکہ ہے۔

مسئولہ صورت میں جب زید نے عمرو سے قرعہ اندازی اسکیم میں پلاٹ خریدنے کی درخواست کی اور عمرو نے حامی بھرتے ہوئے اپنے والد کے کاغذات بھی زید کے حوالہ کر دیے تو شرعاً عمرو زید کا وکیل ہوا اور وکیل جو چیز خریدتا ہے، وہ دراصل مؤکل ہی کی ہوتی ہے، لہٰذا مذکورہ پلاٹ زید کی ملکیت ہوگی، خصوصاً جب کہ زید اس کی رجسٹریشن کرانے کے بعد کئی قسطیں بھی جمع کراتا رہا ہے۔ عمرو کے والد کا اس میں کچھ حق نہیں بنتا۔ نیز حکومت کی طرف سے ذکر کردہ اسکیم کا طریقہ کار بھی یہی ہے کہ صوبائی ملازمین اپنے لیے یا اپنے رشتہ داروں کے لیے اس میں پلاٹ خرید سکتے ہیں۔ اس بات کا علم اس سے ہوتا ہے کہ حکومت نے کچھ عرصہ بعد ان پلاٹوں کی خرید وفروخت اور دوسروں کے نام انتقال کرانے کا اعلان کیا، لہٰذا عمرو کی شرعی، اخلاقی اور معاشرتی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ پلاٹ کو زید کے نام انتقال کرائے، کیونکہ بلاوجہ کسی کا حق دبانا مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

رہا مسئلہ دوسرے کے کاغذات کے استعمال کا تو یہ زید کی قانونی مجبوری تھی، عمرو نے بحیثیت وکیل اس کی مدد کی، ورنہ اصل مقصد تو زید ہی کے لیے پلاٹ خریدنا تھا۔ محض کاغذات کے استعمال سے پلاٹ عمرو کے والد کا نہیں بنتا۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو وكله بشراء شيء بعينه، فليس له أن يشتريه لنفسه؛ لأنه يؤدي إلى تغرير الآمر حيث اعتمد عليه. (۱)

(۱) الهداية، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء: ۳/ ۱۹۱، ۱۹۲

ترجمہ: اگر موکل نے کسی معین چیز خریدنے کے لیے کسی کو وکیل بنایا تو وکیل کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو اپنی ذات کے واسطے خرید لے، کیونکہ وکیل کا اپنے واسطے خریدنا موکل کو دھوکہ دینے کا سبب ہے، اس لیے کہ موکل نے اس پر اعتماد کیا ہے۔

❀❀❀

تعدّی اور غفلت کی صورت میں وکیل پر ضمان

سوال نمبر(137):

زید نے عمرہ کی ادائیگی کی غرض سے ویزہ کے حصول کے لیے عمرو کو رقم اور پاسپورٹ وغیرہ حوالہ کیا۔ عمرو نے کسی اور کو یہ رقم دی، اس شخص نے کسی اور کو یہ کام سپرد کیا۔ اس طرح کئی افراد تک یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ آخری شخص رقم سمیت غائب ہو گیا۔ اب شرعاً اس رقم کا ضمان (تاوان) کونسے شخص پر آئے گا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جب کوئی شخص کسی کو ویزہ وغیرہ کے حصول کے لیے رقم دے تو شرعاً وہ شخص رقم دینے والے کا وکیل بن جاتا ہے۔ وکالت میں شرعاً اصول یہ ہے کہ موکل کی اجازت کے بغیر وکیل کسی دوسرے شخص کو اس کام کے لیے وکیل نہیں بنا سکتا۔ ہاں اگر موکل کی اجازت ہو یا موکل وکیل کو کہے کہ اپنی رائے کے مطابق جیسے چاہو عمل کرو تو ان دو صورتوں میں وکیل کسی اور کو بھی وکیل بنانے کا مجاز رہتا ہے، لیکن یاد رہے کہ اس صورت میں یہ وکیل موکل ہی کا وکیل متصور ہوگا، نہ کہ وکیل کا۔

وکالت کے سلسلہ میں دوسری بات یہ بھی ہے کہ وکیل موکل کے مال کا امین ہوا کرتا ہے، لہٰذا اگر مال وغیرہ وکیل کی بے جا تصرفات، تعدی اور غفلت کے بغیر ہلاک ہو تو ضمان نہیں، تاہم تعدّی، بے جا تصرف اور غفلت کی صورت میں تاوان اُس پر آئے گا۔

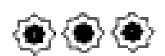
مسئولہ صورت میں اگر وکیل (عمرو) نے اپنے موکل (زید) کی اجازت کے بغیر کسی اور کو وکیل بنایا۔ پھر اس نے کسی اور کو اور یوں سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ مال ضائع ہو گیا تو اس صورت میں اس رقم کا ضمان وکیل (عمرو) پر ہی آئے گا لیکن اگر مسئلہ کی نوعیت اس سے مختلف ہو، یعنی زید (موکل) نے عمرو(وکیل) کو توکیل کی اجازت دی ہو یا یہ کہا

ہوکہ ''اپنی رائے کے مطابق جیسا چاہو کرو'' تو اس صورت میں عمرو کو وکالت کے ساتھ ساتھ توکیل (یعنی وکیل بنانے) کی بھی اجازت دی ہے، لہٰذا عمرو کا دوسرے کو وکیل بنانا اس صورت میں جائز رہے گا، لیکن وکیل ثانی یا آخری وکیل موکل ہی کا وکیل شمار ہوتا ہے اور وکیل اگر چہ امین ہو کر اس پر ضمان نہیں ہوتا، تاہم تعدّی، غفلت اور بے جا تصرف کی وجہ سے وکیل پر ضمان واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں بے جا تصرف (مال لے کر فرار ہونے) کی بنیاد پر آخری وکیل ضامن رہے گا۔ موکل اپنی رقم آخری وکیل سے وصول کرے گا۔

والدّليل على ذلك:

وليس للوكيل أن يوكل فيما وكل به؛ لأنه فوض إليه التصرف دون التوكيل به، وهذا لأنه رضي برأيه، والناس متفاوتون في الأراء، قال: إلاأن يأذن له الموكل لوجود الرضاء أويقول له اعمل برأيك لإطلاق التفويض إلى رأيه، وإذا جازفي هذا الوجه يكون الثاني وكيلا عن الموكل، حتى لايملك الأول عزله. (١)

ترجمہ: اور وکیل کو یہ حق نہیں ہے کہ جس کام میں اس کو وکیل بنایا گیا ہے، اس میں دوسرے کو وکیل بنائے، کیوں کہ موکل نے وکیل کو اس کام میں تصرف کا اختیار دیا ہے، وکیل بنانے کا اختیار نہیں دیا ہے اور یہ اس لیے کہ موکل اس کی رائے پر راضی ہوا ہے اور لوگوں کی آرا مختلف ہوتی ہیں، ہاں اگر موکل اس کو اجازت دے دے، تو رضامندی پائی گئی یا موکل وکیل سے کہہ دے کہ اپنی رائے سے عمل کرو، کیونکہ اس صورت میں اس کو مطلقاً اختیار دیا ہے تو اس صورت میں دوسرا وکیل موکل کی طرف سے وکیل ہوگا، یہاں تک کہ وکیل اول اس کو معزول کرنے کا مالک نہیں۔



وکیل کی ذمہ داری

سوال نمبر (138):

زید نے ایک شخص کو وکیل بنایا اور کہا ثمن ادا کرنا میرے ذمہ ہے۔ تم اشیا خرید لیا کرو۔ چنانچہ وکیل موکل کے

(١) الهداية، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء:٣/٢٠٠

کہنے پر ایسا کرتا رہا، لیکن اب موکل (زید) ثمن کی ادائیگی نہیں کرتا۔ کیا شرعاً وکیل ان لوگوں کی رقم کا ذمہ دار ہے یا نہیں؟ اور رقم نہ ملنے کی صورت میں وکیل گناہ گار ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

باوجود قدرت اور استطاعت کے کبھی انسان معاملات اور لین دین نہیں کرسکتا جس کے نمٹانے کے لیے وکیل مقرر کرتا ہے۔ وکالت کے اِن معاملات میں شریعت نے بعض جگہ موکل کو اہل بنایا اور بعض میں وکیل کو، پھر وکیل کے اہل ہونے کی صورت میں وکیل مدعی ہو کر ثمن اور مبیع وغیرہ کا مطالبہ کرے گا اور کبھی مدعی علیہ بن کر مدعی کے لیے مبیع یا ثمن وغیرہ کی ادائیگی کا ضامن ہوگا۔

مسئولہ صورت میں ثمن ادا کرنا وکیل کی ذمہ داری بنتی ہے جس میں غفلت آمیز رویہ اختیار کرنا گناہ کے زمرہ میں آتا ہے جس کا وبال وکیل پر رہے گا، تاہم اگر وکیل نے وہ اشیا مؤکل کو بالذات یا بالواسطہ حوالہ کیے ہوں تو اس رقم کی ادائیگی مؤکل پر لازم ہوگی۔ مؤکل خود اس کو ادا کرے یا وکیل کے ذریعہ ادا کرے۔

والدّلیل علی ذلک:

(ويخاصم في العيب ويخاصم فيه) فالأول فيما إذا باع، والثاني فيما إذا اشترى ......يجب أن يعلم أن الحقوق نوعان، حق يكون للوكيل، وحق يكون على الوكيل، فالأول كقبض المبيع، ومطالبة ثمن المشتري، والمخاصمة في العيب، والرجوع بثمن مستحق ......وفي النوع الآخريكون الوكيل مدعى عليه، فللمدعي أنه يجبر الوكيل على تسليم المبيع، وتسليم الثمن وأخواتهما.(١)

ترجمہ:

اور وکیل عیب کی صورت میں جب کسی چیز کو بیچتا ہو، تو بائع بن کر مخاصمت کرے گا اور مشتری بن جائے تو اس سے مخاصمت کی جائے گی۔۔۔۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ حقوق دو قسم کے ہیں۔ وکیل کے لیے حق اور وکیل پر حق۔ پہلی قسم جیسے مبیع کا قبض کرنا، مشتری کے ثمن کا مطالبہ کرنا، عیب کی صورت میں مخاصمت کرنا اور قیمت کا رجوع کرنا اور دوسری قسم میں وکیل مدعی علیہ ہوتا ہے۔ پس مدعی مبیع یا ثمن کی حوالگی میں یا ان دونوں جیسی دیگر امور میں وکیل پر جبر کرسکتا ہے۔

(١) فتح القدير، كتاب الوكالة: ١٦/٧

کمپنی کے مالک کا بیک وقت وکیل بالبیع اور مشتری بننا

سوال نمبر(139):

ایک شخص نے ایک ادارہ میں نفع کی غرض سے مالکِ ادارہ کو وکیل بنا کر اُسے کچھ رقم دی۔ مالکِ ادارہ (وکیل) اسی کمپنی کی کوئی پراڈکٹ خرید لیتا ہے۔ پھر اسی پراڈکٹ پر اپنی طرف سے مارکیٹ ریٹ کے مطابق نفع لگا کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ پھر یہ نفع اس شخص (موکل) کو یک مشت یا قسط وار لوٹاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں مالکِ ادارہ وکیل بالبیع بھی ہے اور خریدار بھی۔ کیا وکیل بیک وقت بائع اور خریدار بن سکتا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی شخص کو جب کوئی آدمی خرید وفروخت کا وکیل بنالے تو وکیل کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ موکل کا معاملہ اپنے ساتھ کرے۔ بایں طور کہ موکل کی طرف سے فروخت کنندہ اور اپنی طرف سے خریدار بن جائے۔

لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں موکل کی رقم سے اپنے ہی ادارہ کی کوئی پراڈکٹ خرید کر اپنے پاس رکھنا اور پھر مارکیٹ ریٹ کے مطابق موکل کو نفع لوٹانا جائز نہیں ہے۔ اس کی درست صورت یہ ہوسکتی ہے کہ رقم دینے والے شخص کو اس کی رقم کے حساب سے اپنے ادارے میں سرمایہ کاری کی بنیاد پر شریک کی حیثیت سے شامل کرے اور حاصل ہونے والے نفع میں اس کی رقم کے تناسب سے حصہ دے دیا کرے۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا اشتری الوکیل بالبیع مال موکله لنفسه لایصح.(۱)

ترجمہ:

جب وکیل بالبیع موکل کا مال اپنے لیے خریدے تو یہ جائز نہیں۔

❁❁❁

(۱) شرح المجلة لسلیم رستم باز، المادة: ۱٤۹٦،ص/۸۰۸

اجازتِ موکل کے بغیر وکیل کا دوسرے شخص کو وکیل بنانا

سوال نمبر(140):

ایک شخص نے اپنے والد کی دیت کی وصولی کے لیے ایک شخص کو وکیل بنایا۔کافی عرصہ بعد یہ وکیل اپنے کسی جرم کی پاداش میں جیل گیا تو اس نے اپنی طرف سے بھائی کو وکیل بنایا۔موکل اس پر راضی نہ تھا۔اس لیے موکل نے اپنے لیے دوسرا وکیل رکھ کر کیس جیت لیا۔اب وکیل اول کا اس شخص سے اس کیس پر آنے والے خرچہ کا مطالبہ جائز ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق جس آدمی کو جس کام کے لیے وکیل بنایا جائے،اس کے لیے جائز نہیں کہ موکل کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو اس کام کے لیے وکیل بنائے۔کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ ایک وکیل پر جو اعتماد ہو،دوسرے پر بھی وہی ہو۔لہٰذا صورتِ مسئولہ میں وکیل نے موکل کی اجازت کے بغیر دوسرے کو وکیل بنایا ہے،اس لیے موکل سے رقم کا مطالبہ شرعاً درست نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

ولیس لمن وكل بأمر أن يوكل به غيره؛ لأن الموكل فوض إليه التصرف دون التوكيل، وقد رضي برأيه دون غيره، والناس مختلفون في الآراء.(۱)

ترجمہ:

جو شخص کسی کام کے لیے وکیل بنایا گیا،اس کے لیے(موکل کی اجازت کے بغیر)کسی دوسرے کو وکیل بنانا جائز نہیں۔کیوں کہ موکل نے اس کو تصرف سپرد کیا ہے نہ کہ دوسرے کو وکیل بنانا،اور موکل کو اس کی رائے پسند ہے اس کے علاوہ کی رائے نہیں،کیوں کہ رائے میں لوگ متفاوت ہوتے ہیں۔



(۱) شرح المجلۃ لسلیم رستم باز،المادۃ:۱۴۶۶،ص/۷۸۷

وکالت کی اجرت کو حرام کہنا

سوال نمبر(141):

آج کل وکالت کا پیشہ مذموم تصور کیا جاتا ہے۔بعض لوگ یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ وکیل کی آمدنی حرام ہے۔وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ وکیل وکالت کرتے وقت جھوٹ بولتا ہے،مثلاً کبھی کبھار صاحب حق کو اس کے حق سے بھی محروم کردیا جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ وکیل کی اجرت کا کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عامل کا اپنے عمل پر اجرت لینا شرعاً جائز ہے،بشرطیکہ عمل ایسا ہو جس سے شرعی حدود پامال نہ ہوتے ہوں۔وکیل کا وکالت کرنا بھی ایک مباح امر ہے اور وکالت پر اجرت لینا بھی شرعاً جائز ہے۔تاہم اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ مدعی اور مدعیٰ علیہ میں سے کسی ایک کی ناجائز طرف داری کرکے حقدار کی حق تلفی نہ ہو،لہٰذا فی نفسہٖ وکالت میں کوئی قباحت نہیں اور وکالت کی آمدنی کو مطلقاً حرام کہنا درست نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا أخذ الوکیل الأجرة لإقامة الوکالة، فإنه غیر ممنوع شرعاً،إذ الوکالة عقد جائز، لایجب علی الوکیل إقامتها، فیجوز أخذ الأجرة فیها.(۱)

ترجمہ:

اگر وکیل وکالت پر اجرت لے تو شرعاً یہ ممنوع نہیں، کیوں کہ وکالت ایک جائز عقد ہے۔وکیل پر کسی کی وکالت کرنا واجب نہیں،لہٰذا وکالت میں اجرت لینا جائز ہے۔

❁❁❁

(۱) فتح القدیر، کتاب الوکالۃ: ۲/۷

موکل تک سامانِ تجارت پہنچانے کا خرچہ

سوال نمبر(142):

دو تاجر سنگاپور سے تجارت کیا کرتے تھے۔ایک تاجر جب اپنے مال کی خریداری کے لیے جاتا تو دوسرے کے لیے بھی مال خریدتا، جتنا خرچہ آتا، سامان لانے والا تاجر اس کو ادا کرتا۔کئی سال معمول کے مطابق خرچہ آتا رہا۔ایک دفعہ یوں ہوا کہ پابندی کی وجہ سے مال پر کسٹم وغیرہ کا اضافی خرچہ آیا۔اب دوسرا کہتا ہے کہ سارا خرچہ لانے والا تاجر برداشت کرے گا، کیوں کہ جب میں مال لاتا تو سارا خرچہ میں برداشت کرتا تھا۔پہلے خرچہ معمول کے مطابق برابر ہوجایا کرتا تھا۔اب کے بار زیادہ خرچہ آنے کی صورت میں کون ذمہ دار ہوگا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صورتِ مسئولہ وکالت کی ہے۔جانبین میں سے ہر ایک مختلف اوقات میں دوسرے کا وکیل متصور ہوگا اور شرعاً وکیل پر مبیع کا خرچہ نہیں آتا، لہٰذا تاجر ثانی کے ذمہ کسٹم وغیرہ کا خرچہ دینا واجب ہے، البتہ اپنی باری میں جتنا خرچہ کیا تھا اسے منہا کرکے باقی خرچہ حوالہ کردے۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا أدى الوكيل بالشراء ثمن المبيع من ماله، وقبضه كان له حق الرجوع على الموكل...... فإن كان الموكل قدوكله بشراء شيء من غير المصر ففعل، كان له أن يرجع على الموكل بمؤنة نقل المبيع إلى بيت الموكل.(۱)

ترجمہ:

جب وکیل بالشراء مبیع کی قیمت اپنے مال سے ادا کرے اور مبیع پر قبضہ کرے تو موکل سے اپنے حق کے لیے رجوع کا حق رکھتا ہے۔۔۔۔۔اگر موکل نے وکیل کو شہر سے باہر چیز خریدنے پر مامور کیا ہو اور اس نے کیا تو وکیل کو حق حاصل ہے کہ موکل سے مبیع گھر تک پہنچانے کی مؤنت کے لیے رجوع کرے۔

❁❁❁

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز، المادة/۱٤۹۱،ص/۸۰٤

رقم کی وصولی کے لیے معاوضہ پر وکیل رکھنا

سوال نمبر(143)

زید کا عمرو پر قرضہ ہے۔زید اس کو وصول نہیں کر سکتا۔چنانچہ اس نے بکر سے اپنی رقم کی وصولی کی بات کی۔بکر رقم کی وصولی پر اجرت کا مطالبہ کرتا ہے۔کیا زید کے لیے اپنی رقم کی وصولی پر بکر کو اجرت دینا جائز ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے جب کسی شخص کو کسی کام کی انجام دہی کے لیے وکیل بنایا جائے تو اُس کا وکالت پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔لہٰذا صورتِ مسئولہ میں زید بکر کو رقم کی وصولی پر بنابر وکالت اجرت دے سکتا ہے اور وکیل (بکر) کو بھی اختیار ہے کہ وہ اجرت کا مطالبہ کرے۔البتہ یہ ضروری ہے کہ اجرت پہلے سے ہی متعین کی جا چکی ہو، نیز یہ بھی یاد رہے کہ موکل کو یہ اختیار نہیں کہ کسی ایسے شخص کو رقم کی وصولی کے لیے وکیل بنائے جو جبر اور زبردستی سے کام لیتا ہو، کیوں کہ یہ حق صرف حکومت کو حاصل ہے۔بدمعاشی کی شکل میں کسی سے قرض کی وصولی کے لیے تقرری سے اجتناب ضروری ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا أخذ الوکیل الأجرة لإقامة الوکالة، فإنه غیر ممنوع شرعاً،إذا الوکالة عقد جائز، لایجب علی الوکیل إقامتها، فیجوز أخذ الأجرة فیها.(۱)

ترجمہ:

جب وکیل وکالت پر اجرت لے تو شرعاً یہ ممنوع نہیں، کیوں کہ وکالت ایک جائز عقد ہے۔وکیل پر کسی کی وکالت کرنا واجب نہیں،لہٰذا وکالت میں اجرت لینا جائز ہے۔

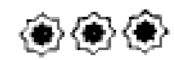
تصح الوکالة بأجر وبغیر أجر ،لأن النبي ﷺ کان یبعث عماله لقبض الصدقات، ویجعل لهم عمولة.(۲)

(۱) فتح القدیر، کتاب الوکالة: ۲/۷

(۲) الفقه الاسلامی وادلته، الفصل التاسع الوکالة: ۵/۴۰۵۸

ترجمہ:

وکالت اجرت اور بلا اجرت (دونوں طرح) جائز ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ عمال کو صدقات کی وصولی کے لیے بھیجتے تھے تو ان کے لیے حق الخدمت بھی مقرر فرماتے تھے۔



ناجائز امور میں وکالت کرنا

سوال نمبر(144):

بینک لوگوں کو سودی قرضے فراہم کرتا ہے۔ بسا اوقات مقروض بینک والوں سے جی چراتا ہے اور رقم کی ادائیگی میں پس و پیش سے کام لیتا ہے۔ میں ایک وکیل ہوں۔ کیا میرے لیے بینک سے ان سودی قرضوں کی وصولی کے لیے وکالت پر اجرت وصول کرنا جائز ہے؟ جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وکیل بینک کی طرف سے وکیل بن کر عدالت میں دعویٰ کرتا ہے، پھر بذریعہ عدالت وہ رقم بینک کو دلوائی جاتی ہے۔

بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

جن امور کا ارتکاب موکل کے لیے جائز نہیں، ان امور کا ارتکاب وکیل کے لیے بھی جائز نہیں۔ صورتِ مسئولہ میں جس طرح سودی قرضہ بینک کے لیے لینا حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح وکیل کے لیے بھی بینک کا نائب بن کر بینک کو سودی قرضہ دلوانا حرام اور ناجائز ہے اور جب اس مقصد کے لیے فی نفسہٖ وکالت جائز نہیں تو ایسی وکالت کی اجرت بھی جائز نہیں۔ اگر سائل بینک سے اس سلسلہ میں کوئی فیس وصول کر چکا ہو تو اسے بلانیت ثواب فقرا پر خرچ کیا جائے۔

والدّليل على ذلك:

كل عقد جاز أن يعقده الإنسان بنفسه جاز أن يوكل به غيره. (١)

ترجمہ:

ہر وہ عقد جو بذاتِ خود انسان کے لیے کرنا جائز ہو اس میں غیر کو وکیل بنانا بھی جائز ہے۔

(١) الهداية، كتاب الوكالة: ١٨٥/٣

ولا يصح في الغصب لأنه محرم، ولا في الجنايات لذلك، ولا في كل محرم لأنه لايجوز له فعله، فلم يجز لنائبه.(۱)

ترجمہ:

غصب، جنایات اور ہروہ کام جوحرام ہو،اس میں توکیل جائز نہیں، کیوں کہ موکل کے لیے خوداس کا کرنا جائز نہیں، پس اس کے نائب کے لیے بھی جائز نہیں۔

❁❁❁

وکیل بالبیع کا موکل کے خلاف کرنا

سوال نمبر(145):

آج کل یوٹیلیٹی سٹورز کے لیے حکومت کی طرف سے دوآدمی مقرر ہوتے ہیں جن کوحکومت کی طرف سے تنخواہ ملتی ہے،لیکن ہمارے علاقے کی برانچ کے لیے ایک آدمی مقرر ہے جس کی وجہ سے کام نمٹانا مشکل ہے۔ کیا ہمارے لیے شرعاًاس کا جواز ہے کہ ایک آدمی کوبطور ملازم رکھیں اوراس کی تنخواہ کے لیے یوٹیلیٹی سٹور کی اشیا کومقررکردہ ریٹ سے زیادہ پرفروخت کریں تاکہ اس کی تنخواہ نکل سکے۔نیز دکان کی حفاظت کے لیے پہرہ داررکھنا اوربجلی کابل یوٹیلیٹی سٹورکی آمدنی سے دینا جائز ہے یانہیں؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

فقہی عبارات سے معلوم ہوتاہے کہ وکیل بالبیع اپنے موکل کی ہدایات کے خلاف نہیں کرسکتا،تاہم اگروکیل کی خلاف ورزی موکل کی متعین کردہ قیمت کی جنس کے مفاد میں سے ہو،مثلاً موکل یہ کہے کہ یہ چیز ہزاردرہم پرفروخت کرواوروکیل نے زیادہ پرفروخت کی تووکیل نے چونکہ دراہم کی جنس سے زیادہ پرفروخت کی،لہٰذااس کی بیع نافذ ہوگی، تاہم زیادہ رقم بھی موکل ہی کی رہے گی۔نیز موکل کی شرائط کاپاس رکھناوکیل کے لیے ضروری ہے۔

لہٰذامسئولہ صورت میں اگرحکومت کی طرف سے یوٹیلیٹی سٹورچلانے کے لیے ایک آدمی مقررکیاگیاہواوروہ اس کام کوانجام نہیں دےسکتا تواس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ حکومت کی طرف سے مقررکردہ قیمت سے زیادہ پر

(۱) المغني، بيان الامور التي يجوز التوكيل فيها: ۳/۱۸۵

چیزوں کو فروخت کرے اور زیادہ رقم بطور تنخواہ اپنی طرف سے مقرر کردہ معاون ملازم کو دے، بلکہ اس کو چاہیے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کرے کہ دوسرے معاون کو بھرتی کیا جائے، اپنی طرف سے اشیا کی قیمت فروخت بڑھا کر عوام کی سہولت میں رکاوٹ نہ بنے۔ اور اگر کبھی زیادہ رقم کمائے تو وہ حکومت کے حوالہ کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح پہرہ دار اور بجلی کے بل کی رقم ادا کرنا باجازت حکومت صحیح ہے۔ بلا اجازت درست نہیں۔

والدليل على ذلك:

الوكيل إذا خالف، إن خالف إلى خير في الجنس كبع بألف درهم، فباعه بألف ومائة نفذ.(۱)

ترجمہ:

وکیل اگر جنس میں بھلائی کی طرف موکل کا خلاف کرے، جیسے موکل کہے، ہزار درہم پر فروخت کرو اور وکیل گیارہ سو درہم میں فروخت کرے تو یہ بیع نافذ ہے۔

الأصل في هذا النوع أن الموكل إذا شرط على الوكيل شرطاً مفيداً من كل وجه، بأن كان ينفعه من كل وجه، فإنه يجب على الوكيل مراعاة شرطه.(۲)

ترجمہ:

اس بارے میں اصل یہ ہے کہ جب موکل وکیل پر کوئی ایسی شرط لگائے جو موکل کے لیے ہر اعتبار سے مفید ہو تو وکیل پر اس شرط کی رعایت واجب ہے۔

۞۞۞

وکیل بالخصومت کی اجرت

سوال نمبر(146):

ایک سرکاری وکیل ہے۔ اس کے ماتحت دو سرکاری وکلا اور دو پرائیویٹ وکلا بھی کام کرتے ہیں۔ شرعاً وکالت کا پیشہ اور اس کی کمائی حلال ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

(۱) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء: ۲۵۶/۸

(۲) شرح المجلة لسليم رستم باز، تحت المادة /۱۵۰۱: ص/۸۱۰

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

حدودِ شرعیہ کا لحاظ کرتے ہوئے اثباتِ حقوق کے لیے وکالت کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، بلکہ مسلمانوں کی امداد اور عدل وانصاف کی فراہمی کی نیت ہو تو ایک قابل تحسین اور جائز پیشہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے عہد مبارک میں اس کے نظائر اور شواہد ملتے ہیں۔

البتہ عہدِ حاضر میں وکالت کے پیشے نے جن مفاسد کو جنم دیا ہے، مثلاً مقدمہ جیتنے کے لیے گواہوں کو جھوٹی تلقین، مقدمات کی بہتات جس کی وجہ سے فریقین کے دعاوی اور حقوق مخفی رہ کر درست فیصلے سے قاصر رہنا، وکلا کے پاس حاضری کے لیے رشوتوں کا سلسلہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن کو مدِ نظر رکھ کر یہ کہنا بجا ہے کہ اس قسم کی وکالت اور اس سے حاصل شدہ کمائی حرام اور قابل اجتناب ہے، تاہم اگر قواعدِ شرعیہ کی رعایت رکھتے ہوئے درست کام کی وکالت کی جائے تو اس قسم کی وکالت کی کمائی جائز اور حلال ہوگی۔نیز حلت وحرمت، جواز وعدمِ جواز کے اعتبار سے وکالت اور اس کی کمائی کا جو معیار بڑے وکیل کے لیے ہوگا، وہی اس کے ماتحت سرکاری وکلا اور پرائیویٹ وکلا کے لیے بھی ہوگا۔ بذاتِ خود یہ پیشہ حرام نہیں ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

ويجوز الوكالة بالخصومة في سائر الحقوق لما قدمنا من الحاجة إذليس كل أحد يهتدي إلى وجوه الخصومات، وقد صح أن عليًا وكّل فيها عقيلا، وبعدما أسن وكّل عبدالله بن جعفرؓ.(١)

ترجمہ: اور تمام حقوق میں وکالت بالخصومت جائز ہے، اس لیے کہ ہر آدمی خصومت کے طریقوں کو نہیں جانتا اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے خصومات میں حضرت عقیلؓ کو وکیل بنایا اور بوڑھا ہونے کے بعد حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو وکیل بنایا۔

❁❁❁

وکیل کا موکل کی چیز کو اپنے لیے خریدنا

سوال نمبر(147):

ایک مسئلہ کا شرعی حل مطلوب ہے۔ایک شخص نے مجھے کوئی چیز فروخت کرنے کے لیے وکیل بنا کر کہا

(١) الهداية، كتاب الوكالة: ١٨٥/٣

ں اس کو فروخت کرو۔کیا موکل کو بتائے بغیر وہ چیز میں اپنے لیے خرید سکتا ہوں؟

بیّنوا توجروا

لجواب وباللہ التوفیق:

وکیل موکل کی چیز نہ اپنے لیے خرید سکتا ہے اور نہ اپنی اولاد کے لیے، کیوں کہ ایک شخص خریدار اور فروخت کنندہ نہیں بن سکتا۔نیز اس میں تہمت کا شبہ بھی موجود ہے، تاہم اگر وکیل یہی چیز کسی غیر کے ہاتھ فروخت کر کے بعد از اس سے اپنے لیے خریدنا چاہے تو یہ شرعاً جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

الوكيل بالبيع لايملك شراء ه لنفسه ؛لأن الواحد لايكون مشتريا و بائعا،فيبيعه من غيره، ثم يشتريه منه .(۱)

ترجمہ: وکیل بالبیع کو اختیار نہیں کہ وہ (موکل کی چیز) اپنے لیے خریدے، کیوں کہ بیک وقت ایک شخص مشتری اور بائع نہیں بن سکتا، چنانچہ اگر وکیل اپنے لیے خریدنا چاہے تو اس کو کسی اور کے ہاتھ فروخت کرے، پھر اُس سے اپنے لیے خریدے۔

❁❁❁

وکیل بالشرا کا مخصوص فیکٹری سے سامان خریدنے پر کمیشن لینا

سوال نمبر(148):

میں ایک کمپنی میں انجینئرنگ کے شعبہ سے وابستہ ہوں۔محکمہ کو انجینئرنگ سے متعلق مختلف میٹیریل فیکٹریوں سے خرید کر مہیا کرتا ہوں۔بعض فیکٹریوں والے مجھ سے کہتے ہیں کہ میٹیریل ہم سے خریدا کرو، اچھی کوالٹی کے ساتھ ساتھ تمہیں 25% کمیشن بھی ملے گا، بشرط یہ کہ آپ دوسری فیکٹری سے کچھ نہ خریدنے کے پابند رہو گے۔کیا شریعت کی رُو سے ان سے اشیا خرید کر کمیشن لینا میرے لیے جائز ہے؟

بیّنوا توجروا

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوکالۃ، باب الوکالۃ بالبیع والشراء، فصل لایعقد وکیل البیع والشراء:۸/۲۵۷

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہاے کرام نے وکیل کا ہراس شخص کے ساتھ عقد نا جائز لکھا ہے جس کے ساتھ عقد میں تہمت کا اندیشہ ہو۔ صورتِ مسئولہ میں انجینئر کی حیثیت متعلقہ محکمہ کے وکیل کی ہے جو فیکٹریوں سے خریداری پر متعلقہ محکمہ سے حق الخدمت کے طور پر تنخواہ وصول کرتا ہے، فیکٹری والوں کے لیے انجینئر کوئی خدمت انجام نہیں دیتا، لہٰذا فیکٹری سے کمیشن وصول کرنا اس کے لیے جائز نہیں۔ نیز مذکورہ معاملہ میں تہمت کا بھی اندیشہ ہے کہ فیکٹری والے میٹیریل مہنگے داموں فروخت کریں یا اعلیٰ اور عمدہ میٹریل مہیا نہ کریں۔ اس وجہ سے انجینئر کا اس فیکٹری سے کمیشن کا معاہدہ کرنا شرعاً جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

والوكيل بالبيع والشراء لايجوز له أن يعقده مع أبيه وجده، ومن لايقبل شهادته له عند أبي حنيفة ......له أن مواضع التهمة مستثناة عن الوكالات.(١)

ترجمہ:

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وکیل بالبیع والشراء کے لیے اپنے والد، دادا اور جس کی شہادت اس کے بارے میں قبول نہیں، ان سے عقد کرنا جائز نہیں۔۔۔۔۔ان کی دلیل یہ ہے کہ تہمت کے مواضع وکالت سے مستثنیٰ ہیں۔

❁❁❁

عاقد کا دوسرے کی طرف سے وکیل بننا

سوال نمبر(149):

ہم صراف کے ساتھ کرنسی کا لین دین کرتے ہیں۔ صراف کے ساتھ ہمارے پاکستانی روپے ایڈوانس جمع ہوتے ہیں۔ صراف مختلف قسم کی کرنسیوں کا کاروبار کرتا ہے جب ہمیں افغانی کرنسی یا ڈالر خریدنا ہو تو ہم فون پر صراف سے امریکی ڈالر یا افغانی کرنسی کا ریٹ طے کر کے خرید لیتے ہیں جو صراف کے پاس ہماری طرف سے جمع ہو جاتی ہے، ہمارے اور صراف کے مابین کوئی وکیل نہیں ہوتا ہے، صرف ٹیلی فون پر بات چیت ہو جاتی ہے۔ کیا مذکورہ معاملہ ازروئے شریعت درست ہے؟

بیّنوا تؤجروا

---

(١) الهداية، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، فصل في البيع: ١٩٦/٣

الجواب وباللہ التوفیق:

مختلف ممالک کی کرنسی نوٹ اگرچہ الگ الگ جنس ہیں، لیکن ان کی بیع وشرا کے وقت عاقدین میں سے کسی ایک کی طرف سے اصالتاً یا وکالتاً قبض ضروری ہے۔

مسئولہ صورت میں گاہک نہ خود قبضہ کرتا ہے اور نہ اس کا کوئی وکیل قبضہ کرتا ہے، اگرچہ صراف کی جانب سے قبضہ پایا جاتا ہے، لیکن صراف چونکہ خود عاقد بھی ہے اور گاہک کی طرف سے وکیل بھی اور معاملات میں ایک ہی شخص عاقد اور وکیل یعنی مالک اور مملک نہیں بن سکتا، اس لیے شرعاً یہ عقد جائز نہیں۔ ہاں گاہک اپنی طرف سے کسی کو وکیل بنا کر صراف کے پاس بھیجے، تاکہ اس کے حصہ کی رقم قبض کرلے یا یہ کہ صراف کے پاس بیٹھے ہوئے کسی شخص کو وکیل بنا کر عقد کرے اور وہ اس کے لیے قبضہ کرے تو یہ جائز ہوگا۔ ورنہ مذکورہ صورت، کہ صراف عاقد بھی ہو اور وکیل بھی، شرعاً جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

ولأن حقوق البیع إذا كانت مقتصرة علی العاقد، وللبیع أحكام متضادة من التسلیم والقبض والمطالبة، فلو تولی طرفي العقد، لصار الشخص الواحد مطالبا ومطلوبا، ومسلما ومتسلما، وهذا ممتنع.(۱)

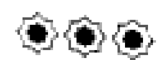
ترجمہ:

اور اس لیے کہ بیع کے حقوق عاقد پر موقوف ہیں اور بیع کے لیے تسلیم، قبض اور مطالبہ جیسے متضاد احکام بھی ہیں، پس اگر عقد کے طرفین کی ذمہ داری کوئی ایک شخص نبھائے تو ایک ہی شخص طالب اور مطلوب، حوالہ کرنے والا اور قبضہ کرنے والا ہو جائے گا اور یہ ممکن نہیں ہے۔

وفي البزازية: لو اشتری مائة فلس بدرهم، یكفي التقابض من إحدی الجانبین.(۲)

ترجمہ:

اور بزازیہ میں ہے کہ اگر کسی نے سو پیسے ایک درہم کے بدلے خریدے تو ایک جانب سے اس میں تقابض کافی ہے۔



(۱) بدائع الصنائع، کتاب النکاح، فصل في رکن النکاح: ۳/۳۲۴

(۲) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب البیوع، باب الربا: ۷/۴۱۴

وکالت میں شرط فاسد لگانا

سوال نمبر(150):

ایک وکیل کسی شخص سے کیس لڑانے کے لیے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ اگر کیس جیت گیا تو اتنی رقم لوں گا اور اگر ہار گیا اور تمہارا کام نہیں ہوا تو کسی رقم کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ کیا وکیل کے ساتھ مذکورہ معاہدہ شرعاً درست ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

وکالت میں ایسی شرط لگانا جو عقد کے مقتضیات سے مخالف ہو، شرطِ فاسد کہلاتی ہے، وکالت شروطِ فاسدہ سے باطل نہیں ہوتی۔ جیتنے کی شرط لگانے میں ممکن ہے کہ یہ شخص اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کرے۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں وکیل کا اجرت کے بارے میں شرط لگانا فاسد ہے، تاہم اس کی وجہ سے عقد پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے وکالت درست ہے اور وکیل حسبِ معاہدہ اجرت کا مستحق ہوگا۔ کام نہ ہونے کی صورت میں اجرت کا مستحق نہیں ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

یکون رکن التوکیل مرة مطلقا، یعني لایکون معلقابشرط، أو مضافا إلی وقت، أومقید بقید، ومرة یکون معلقا بشرط، وقال في شرح المحلة في آخر البحث الثالث: أنهالاتبطل بالشروط الفاسدة، قال في الخانیة: أيّ شرط کان.(۱)

ترجمہ:

وکالت کا رکن کبھی تو مطلق ہوتا ہے، یعنی نہ کسی شرط کے ساتھ معلق ہوتی ہے اور نہ کسی مقررہ وقت کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے اور نہ (ان کے علاوہ) کوئی اور قید ملحوظ ہوتی ہے اور کبھی توکیل کسی شرط کے ساتھ معلق ہوتی ہے اور "شرح المجلہ" میں لکھتے ہیں: "وکالت فاسد شرطوں کی وجہ سے باطل نہیں ہوتی" اور فتاوی قاضیخان میں ہے: "چاہے وہ کوئی بھی شرط ہو"۔

(۱) شرح المحلة لخالد الاتاسي، الکتاب الحادي العشر في الوکالة، الباب الاول في رکن الوکالة: المادة/۱۴۵۶: ۴/ ۴۰۹ـ۴۱۱

وکیل کا موکل کے مال سے ازخود معاوضہ لینا

سوال نمبر(151):

ایک شخص نے مکان خریدنے کے لیے کسی کو وکیل بنایا۔وکیل کو علم ہے کہ موکل اس کو کوئی معاوضہ نہیں دے گا، لہٰذا وکیل اگر یوں کرے کہ قیمتِ خرید سے کچھ زائد قیمت اپنے پاس رکھے اور اس کو اپنی اجرت (معاوضہ) سمجھے۔تو کیا اس طرح وکیل کا موکل کی رقم سے اپنی اجرت ازخود لینا درست ہوگا جب کہ موکل کو علم نہ ہو؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

وکیل اپنی خدمت (وکالت) کا معاوضہ لینے کا شرعاً مستحق ہے، بشرطیکہ موکل کے ساتھ اجرت پہلے سے متعین کرے یا وہ معاشرہ میں اجرت کے عوض کام کرنے پر مشہور ہو، ایسی صورت میں وہ اجرتِ مثل کا مستحق رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر اجرت کی تعیین پہلے سے نہ ہوئی ہو اور نہ یہ شخص اُجرت پر لوگوں کے لیے کام کرتا ہو تو اس صورت میں اس کی خدمت تبرع شمار ہو کر اجرت کا مستحق نہیں رہے گا۔

صورتِ مسئولہ میں جس شخص کو گھر خریدنے کے لیے وکیل بنایا ہے اگر وہ نہ تو اجرت کے عوض لوگوں کے لیے خرید و فروخت کے معاملات کرتا ہو اور نہ ہی پہلے سے اجرت متعین کی ہو تو وہ اُجرت کا مستحق نہیں لہٰذا موکل سے چوری چھپکے کچھ رقم اپنے لیے رکھنا اس کے لیے جائز نہیں، اور اگر اجرت پر لوگوں کے لیے خرید و فروخت کرتا رہا ہو تو پھر اُجرتِ مثل کا مستحق ہوگا، تاہم وہ بھی موکل کو بتا کر اُس کی اجازت سے لے گا، ازخود اُس کی اجازت واطلاع کے بغیر لینا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

إذا اشترطت الأجرة في الوكالة، وأوفاها الوكيل استحق الأجرة ...... وإن لم تشترط، ولم يكن الوكيل ممن يخدم بالأجرة كان متبرعا، فليس له أن يطالب الأجر، وأمّا إذا كان ممن يخدم بالأجرة، فله أجرمثله ؛لأن المعروف عرفا كالمشروط شرطا.(۱)

ترجمہ: جب وکالت میں اجرت شرط قرار دی جائے اور وکیل وکالت پوری کرے تو اجرت کا مستحق ہوگا۔۔۔۔۔اور اگر اجرت شرط نہ کی گئی ہو اور وکیل بھی ایسا نہ ہو، جو اجرت لے کر خدمت کرتا ہو تو وہ کام کرنے میں متبرع ہوگا، لہٰذا اس

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز،الكتاب الحادى العشر في الوكالة، الباب الثالث في احكام الوكالة:١٤٦٧،ص/٧٨٩

کے لیے اجرت کا مطالبہ کرنا جائز نہیں اور اگر وکیل اجرت لے کر خدمت کرتا ہو (اور ابتداءً اجرت متعین نہیں کی ہو) تو اس کے لیے اجر مثل ہوگا، کیوں کہ جو چیز معروف ہو، وہ مشروط کی طرح ہوا کرتی ہے۔

❀❀❀

اجازت کے بغیر مؤکل کے مال میں بے جا تصرف کرنا

سوال نمبر (152):

مؤکل کی طرف سے بیع وشرا پر مامور وکیل نے ایک مرتبہ مؤکل کا نفع اپنے ذاتی مقاصد میں اس نیت سے استعمال کیا کہ یہ مؤکل کا میرے ذمہ قرض رہے گا، حالانکہ مؤکل کو اس کی خبر تک نہ تھی۔ کیا شرعاً وکیل اس طرح تصرف کا مجاز ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

وکیل کے پاس مؤکل کا مال اور اُس کے منافع امانت ہوتے ہیں۔ جسے اُس کی اجازت کے بغیر اپنے ذاتی کام میں استعمال کرنا خیانت متصور ہوتا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں وکیل کے لیے مؤکل کا مال اپنے ذاتی مقاصد میں استعمال کرنا اور یہ کہنا کہ یہ میرے ذمہ قرض رہے گا، شرعاً درست نہیں، یہ مالک کے مال میں خیانت ہے، لہٰذا اب وکیل پر بقدرِ تصرف مال مالک (مؤکل) کو لوٹانا ضروری ہے اور اس گناہ کی معافی کے لیے مؤکل سے معافی مانگے۔

والدّلیل علی ذلک:

أن المقبوض في يد الوكيل بجهة التوكيل ...... أمانة بمنزلة الوديعه ؛لأن يده نيابة عن الموكل بمنزلة المودع، فيضمن بمايضمن في الودائع. (١)

ترجمہ:

وکیل کے ہاتھ میں وکالت کی حیثیت سے مقبوض چیز۔۔۔ ودیعت کی طرح امانت ہوا کرتی ہے، اس لیے کہ وکیل کا قبضہ مؤکل کی جانب سے مودع کی طرح نیابتاً ہوتا ہے، لہٰذا وکالت میں بھی ودائع کی طرح ضمان لازم ہوگا۔

❀❀❀

(١) بدائع الصنائع، كتاب الوكالة، فصل في حكم الوكيلين: ٥٥/٧

کسی کے لیے کام کر کے اُس سے چھپکے سے رقم کاٹنا

سوال نمبر(153):

ایک شخص کا کمپیوٹر خراب تھا۔اس پر مارکیٹ ریٹ کے مطابق ڈھائی ہزار روپے خرچہ آتا تھا۔اس نے اپنے بھتیجے کو کمپیوٹر ٹھیک کرانے کے لیے مارکیٹ بھیج دیا۔بھتیجا کمپیوٹر مارکیٹ میں معرفت رکھتا تھا۔اس کا دُکان دار دوست اس کے لیے مذکورہ کمپیوٹر پانچ سو روپے میں ٹھیک کرتا ہے۔کیا اس کے لیے چچا سے ڈھائی ہزار روپے لے کر پانچ سو روپے کمپیوٹر ساز اور باقی رقم اپنے پاس رکھنا شرعاً جائز ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی شخص کو دوسرے آدمی کے لیے کام کرنے کے عوض اُس سے اجرت لینا جائز ہے،بشرطیکہ اجرت کا تعین پہلے سے کیا ہو یا یہ شخص اجرت کے عوض کام کرنے میں مشہور ہو،اگر تعیین نہ کیا ہو اور اجرت پر کام کرنے میں مشہور بھی نہ ہو تو اس کا کام کرنا محض تعاون اور مدد شمار ہوگا،اور اجرت لینا جائز نہ ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر بھتیجے (وکیل) نے اپنے چچا (موکل) کے ساتھ اجرت کا تعیین کیا ہو تو یہ اپنی اجرت لے سکتا ہے اور اگر اجرت کا تعیین نہ کیا ہو اور نہ ہی بھتیجا اجرت پر لوگوں کے کمپیوٹر ٹھیک کرانے کا کام کرتا ہو،لیکن یہ از خود اپنے چچا کی دی ہوئی رقم سے اجرت کے نام پر رقم منہا کرے یا کمپیوٹر کم قیمت میں بوجہ معرفت ٹھیک کرائے اور باقی رقم اپنے پاس رکھے تو یہ چچا (موکل) کے ساتھ دھوکہ ہوگا،اور یوں دھوکہ سے کسی کی رقم لینا جائز نہیں۔لہٰذا جو رقم بچی ہے وہ سب چچا کو لوٹانا ضروری ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا اشترطت الأجرة في الوكالة، وأوفاها الوكيل استحق الأجرة ...... وإن لم تشترط، ولم يكن الوكيل ممن يخدم بالأجرة كان متبرعا، فليس له أن يطالب الأجر، وأمّا إذا كان ممن يخدم بالأجرة، فله أجر مثله ؛لأن المعروف عرفا كالمشروط شرطا.(١)

ترجمہ: جب وکالت میں اجرت شرط قرار دی جائے اور وکیل وکالت پوری کرے تو اجرت کا مستحق ہوگا۔۔۔۔اور اگر اجرت شرط نہ کی گئی ہو اور وکیل بھی ایسا نہ ہو،جو اجرت لے کر خدمت کرتا ہو تو وہ کام کرنے میں متبرع ہوگا،لہٰذا اس

(١) شرح المجلة لسليم رستم باز،الكتاب الحادي العشر في الوكالة،الباب الثالث في احكام الوكالة:١٤٦٧،ص/٧٨٩

کے لیے اجرت کا مطالبہ کرنا جائز نہیں اور اگر وکیل اجرت لے کر خدمت کرتا ہو (اور ابتداءً اجرت متعین نہیں کی ہو) تو اس کے لیے اجرِ مثل ہوگا، کیوں کہ جو چیز معروف ہو، وہ مشروط کی طرح ہوا کرتی ہے۔

عقدِ اجارہ میں اجرت کی ذمہ داری

سوال نمبر (154):

ایک شخص بس کنڈیکٹر ہے۔ایک دن مالک نے بس کی ریپئرنگ کے لیے اسے مستری کے پاس بھیج دیا۔ کنڈیکٹر نے مستری سے کہا کہ یہ گاڑی فلاں (مالک) کی ہے۔اس پر جتنا خرچہ آئے گا مالک ادا کرے گا۔مستری نے کہا ٹھیک ہے۔اب مالک خرچہ ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہے۔اب کنڈیکٹر کی کیا ذمہ داری بنتی ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

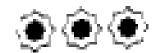
جب کوئی شخص کسی کی طرف سے وکیل بن کر کوئی معاملہ کرتا ہو تو شرعاً اس معاملہ کے حقوق کا مطالبہ وکیل سے ہوتا ہے،تاہم اگر وکیل اس معاملہ کو اپنے موکل کی طرف منسوب کرے تو ایسی صورت میں وکیل محض ایک سفیر اور واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔باقی حقوق (ثمن، اجرت کی ادائیگی وغیرہ) میں مراجعت موکل کی طرف ہوگا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر کنڈیکٹر نے مالک کے حکم پر گاڑی کی ریپئرنگ کرائی ہو اور مستری کو یہ بھی کہا ہو کہ یہ گاڑی فلاں (مالک) کی ہے، وہ تمہیں خرچہ دے گا اور مستری نے رضامندی کا اظہار بھی کیا ہو تو پھر کنڈیکٹر بری الذمہ ہے۔ریپئرنگ کا خرچہ مالک کے ذمہ واجب الاداء ہے،البتہ اگر مالک قسم کھا کر انکار کرتا ہو کہ میں نے اِسے نہیں کہا تھا اور کنڈیکٹر کے پاس گواہ موجود نہ ہوں تو اس صورت میں مستری کنڈیکٹر سے خرچہ کا مطالبہ کر سکتا ہے۔کیوں کہ مباشر (براہِ راست معاملہ نمٹانے والا) تو بہر حال کنڈیکٹر ہی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو أضاف العقد إلی الموکل، تتعلق الحقوق بالموکل اتفاقا.(۱)

ترجمہ: اگر وکیل عقد کی نسبت موکل کی طرف کرے تو حقوق بالاتفاق موکل سے متعلق ہوں گے۔



(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الوکالۃ: ۲٤٦/۸

وکیل کا غیر مصرف میں زکوۃ خرچ کرنا

سوال نمبر(155):

ایک شخص نے سالانہ زکوۃ کی ادائیگی کے لیے اپنی زوجہ اور والدہ کو نمائندہ بنایا، نصف زکوۃ کی رقم والدہ کو اور نصف زوجہ کو سپرد کی۔ اگر وہ زکوۃ کی یہ رقم مصارف زکوۃ میں خرچ نہ کریں، ایسے لوگوں کو دیں جو شرعاً اس کے مستحق نہیں تو کیا اس صورت میں اس شخص کی زکوۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

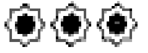
الجواب وباللہ التوفیق:

مسئولہ صورت میں اگر والدہ یا بیوی زکوۃ کی ادائیگی کے وقت غیر مستحق شخص کو مستحق زکوۃ سمجھ کر اُسے زکوۃ دیں اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ لوگ مستحق زکوۃ نہیں تھے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی اور اگر باوجود علم کے (کہ مستحق زکوۃ نہیں) ان کو زکوۃ دیں تو زکوۃ ادا نہ ہوگی۔

والدّلیل علی ذلك:

ولو وكل رجلا ليدفع زكاته إلى فقير، فدفع الوكيل إلى أب الموكل أو ابنه، أو من لا يجوز الدفع إليه، وهو لا يعلم بحالهم جاز عند أبي حنيفة ومحمد. (١)

ترجمہ: اگر کوئی شخص کسی کو وکیل بنائے کہ اس کی زکوۃ فقیر کو دے اور وکیل نے موکل کے باپ یا بیٹے یا اس کو زکوۃ دی جس کو دینا جائز نہیں تھا اور حال یہ ہے کہ وکیل کو ان کی حالت کا علم نہیں تھا تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔



مشتری کا قبضہ کیے بغیر بائع کو وکیل بالبیع بنانا

سوال نمبر(156)

ایک شخص نقد قیمت پر واشنگ مشین کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتا ہے۔ اگر کوئی اسے کہہ دے کہ تم نقد کی

(١) الفتاوى التاتارخانية، كتاب الزكاة، الفصل التاسع في المسائل المتعلقة بمعطى الزكاة: ٢/ ٢١٤

بجائے ادھار قسط وار مہنگا بیچ دیا کرو۔ جتنے مشین فروخت کرو، ان کی نقد قیمت مجھ سے وصول کیا کرو اور قسط وار وصولی کر کے مجھے دیا کرو۔ کیا شرعاً یہ معاملہ جائز ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال میں مذکور معاملہ میں چونکہ مشین کو نقد خریدنے والا نہ تو موقع پر ایجاب وقبول کرتا ہے، نہ قیمت اس وقت ادا کرتا ہے، نہ ہی قبضہ کرتا ہے اس لیے یہ معاملہ جائز نہیں۔

اس کی جائز صورت یہ بن سکتی ہے کہ یہ شخص دکان دار سے نقد قیمت پر چند متعین مشینیں خرید کر قبضہ میں لے لے اور پھر اس دکان دار کو وکیل بنائے کہ اگر کوئی قسط وار مشین خریدنا چاہے تو میری یہ مشین اس کے ہاتھ فروخت کرلیا کرو اور اس سے قیمت وصول کر کے مجھے دیا کرو۔ اس طرح یہ دو عقد ہو کر جائز ہوں گے، دوسرے عقد میں بائع مشتری کا وکیل متصور ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

من حکم المبیع إذا کان منقولاً أن لا یجوز بیعه قبل القبض. (۱)

ترجمہ:

جب مبیع منقولی ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ قبضہ کرنے سے پہلے اُسے بیچنا جائز نہیں۔

تصح الوکالة بأجر وبغیر أجر؛ لأن النبي ﷺ کان یبعث عماله لقبض الصدقات، ویجعل لهم عمولة. (۲)

ترجمہ:

وکالت اجرت کے عوض اور بلا اجرت (دونوں طرح) جائز ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ عمال کو صدقات کی وصولی کے لیے بھیجتے اور ان کے لیے حق الخدمت مقرر فرماتے۔

❁❁❁❁❁

(۱) الفتاویٰ الهندیة، کتاب البیوع، الباب الثاني فیما یرجع إلی انعقاد البیع، الفصل الثالث: ۱۳/۳

(۲) الفقه الاسلامی وادلته، الفصل التاسع الوکالة: ۴۰۵۸/۵

کتاب الشہادات

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

انسان مدنی الطبع ہے اس لیے تن تنہا زندگی گزارنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں دوسرے انسانوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ ایک معاشرتی اکائی ہونے کے ناطے ممکن ہے کہ کسی معاملے میں اس کا کوئی حق تلف ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اس سے کسی کا حق تلف ہو جائے۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی ایک شخص دوسرے شخص کے حق پر دست درازی کرے اور یہ اس کو دیکھتا رہ جائے۔ ان تمام صورتوں میں بنی نوع انسان کو جس طرح ایک بااثر عدلیہ اور بااختیار قانون کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح اس کو اپنے حق کے اثبات میں اس چشم دید گواہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جس کے سچے قول سے قاضی ظلم کا راستہ روک کر مظلوم کی دادرسی کرسکتا ہے۔ شریعت نے اسی ضرورت کے تحت گواہی کے لیے اصول اور شرائط مقرر کر دیے ہیں جن کے ہوتے ہوئے معاشرے میں کسی بھی جھوٹے، فسادی اور فتنہ پرداز شخص کے لیے گواہی کو کاروبار بنانے کا موقع نہیں مل سکتا۔

لغوی تحقیق:

لغت میں شہادت کئی معانی میں مستعمل ہے، مثلاً: قطعی اور یقینی خبر، حاضر ہونا، دیکھنا، نظر آنے والی شے، قسم، اقرار، کلمہ توحید، اللہ کی راہ میں مرنا وغیرہ۔(۱)

اصطلاحی تعریف:

"إخبار صدقٍ لإثبات حقٍ بلفظ الشهادة في مجلس القضاء".(۲)

قاضی کی مجلس میں کسی حق کو ثابت کرنے کی غرض سے لفظِ شہادت کے ذریعے سچی خبر دینے کا نام شہادت (گواہی) ہے۔

---

(۱) بدائع الصنائع، أول كتاب الشهادة، حاشيه نمبر۱: ۹/۳، الموسوعة الفقهية، مادة الشهادة: ۲۶/۲۱٤

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الشهادات، الباب الأول: ۳/٤٥٠، فتح القدير، أول كتاب الشهادات: ٦/٤٤٦

جھوٹی گواہی پر شہادت کا اطلاق مجازاً ہے، اس لیے کہ شہادت سچی گواہی کا نام ہے۔(۱)

مشروعیت:

قرآن کریم میں ہے:

﴿وَاستَشهِدُوا شَهِيدَينِ مِن رِجَالِكُم﴾(۲)

﴿وَلَا تَكتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَن يَكتُمهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلبُهُ﴾(۳)

﴿وَأَشهِدُوا ذَوَى عَدلٍ مِنكُم وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ﴾(٤)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"شاهداك أو يمينه".(٥)

"البينة على المدعي واليمين على المدعىٰ عليه".(٦)

اسی طرح دعاوی، یعنی دعوی جات کے اثبات کے لیے شہادت کی مشروعیت پر فقہا کا اجماع ہے اور لوگوں کے مابین تنازعات ختم کرنے کے لیے اس کی ضرورت کو دیکھ کر عقل بھی اس کے جواز کی مقتضی ہے۔(۷)

شہادت کا رکن:

شہادت کے کسی بھی صیغے سے، ہونے والے معاملے کی خبر دینا شہادت کا رکن ہے۔ دوسرے فقہا کے ہاں شاہد، مشہود لہ، مشہود علیہ، مشہود بہ اور صیغہ سب کے سب شہادت کے لیے ارکان ہیں۔(۸)

---

(۱) الدر المختار علی صدر رد المحتار، أول كتاب الشهادات: ۱۷۲/۸

(۲) البقرة: ۲۸۲

(۳) البقرة: ۲۸۳

(٤) الطلاق: ۲

(٥) السنن الكبرى للنسائي، كتاب القضاء، الإباحة للحاكم، رقم (٥٩٥٠): ٤٢٧/٥

(٦) السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الدعوى والبينات، البينة على المدعي: ٣٩٤/١٠

(٧) المغني والشرح الكبير، كتاب الشهادات، الباب الأول: ٤٠٣/١٢

(٨) الفتاوى الهندية، كتاب الشهادات الباب الأول: ٤٥٠/٣، فتح القدير، كتاب الشهادات، الباب الأول: ٤٤٦/٦، مغني المحتاج، كتاب الشهادات: ٤٢٦/٤

شہادت کی اصطلاحات:

(۱) شاہد: گواہ بننے والا۔

(۲) مشہود لہ: جس کے حق میں گواہی دی جائے۔

(۳) مشہود علیہ: جس کے خلاف گواہی دی جائے۔

(۴) مشہود بہ: جس چیز (حق) کی گواہی دی جائے۔

گواہی کا حکم:

قرآنی آیات کو مدنظر رکھ کر فقہا نے گواہی کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے۔ دوسری امانتوں کی طرح گواہی کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔ گواہی کے وجوب اور عدمِ وجوب میں مندرجہ ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) اگر گواہی سے گواہ کا نقصان ہو یا گواہی سے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید نہ ہو تو گواہی دینا ضروری نہیں۔

(۲) جس شخص کی گواہی شرعاً مقبول نہیں، اس کے لیے گواہی دینا ضروری نہیں، یعنی اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(۳) اگر صاحبِ حق گواہ سے مطالبہ کردے کہ تم نے جو معاملہ دیکھا ہے، اس کی گواہی دو تو اس صورت میں گواہ پر گواہی دینا واجب ہوگا۔

(۴) صاحبِ حق کو گواہ کا علم نہ ہو، لیکن صورتِ حال ایسی ہو کہ گواہی نہ دینے سے اس کا حق ضائع ہو رہا ہو اور موقع پر کوئی اور گواہ موجود نہ ہو تو گواہی دینا فرض ہے اور گواہی کو چھپانا ناجائز ہے۔

(۵) اس طرح اگر حقوق اللہ ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، جیسے ہلالِ رمضان کی گواہی تو اس صورت میں بھی (بغیر مطالبے کے) گواہی واجب ہے۔(۱)

(۶) جن حقوق اللہ میں کسی شخص پر حد جاری ہوتی ہو، مثلاً: زنا، شراب نوشی وغیرہ، تو ان میں ایک مسلمان کے ساتھ پردہ پوشی سے کام لینا زیادہ بہتر ہے، تاہم اگر مجرم انتہائی بے حیا اور معاشرے کے لیے ناسور ہو تو اس کے خلاف

---

(۱) فتح القدیر، کتاب الشهادات، الباب الأوّل: ٦/٤٤٦، الفتاوی الهندیة، کتاب الشهادات، الباب الأوّل: ٣/٤٥٠، الدر المختار مع رد المحتار، أول کتاب الشهادات: ٨/١٧٤، ١٧٥، الأشباه والنظائر، لابن نجیم، کتاب القضاء والشهادات والدعاوی: ص ١٣٠، ١٣١

گواہی دینا ہی بہتر ہے۔(۱)

وجوبِ شہادت کے لیے شرائط:

علامہ حصکفیؒ نے گواہی کے وجوب کے لیے پانچ شرائط ذکر کیے ہیں:

(۱) قاضی عادل ہو۔

(۲) مجلس قضا نزدیک ہو۔

(۳) یہ علم ہو کہ قاضی گواہی قبول کرے گا۔

(۴) مدعی گواہی کا مطالبہ کرے (بشرطیکہ معاملہ حقوق العباد کا ہو)۔

(۵) اس گواہ کے علاوہ اور کوئی گواہ نہ ہو جو اس حق کو ثابت کر سکے۔(۲)

گواہی کے بعد قاضی کے لیے حکم:

شرعی متقضیات اور شرائط کے ساتھ گواہی دینے کے بعد قاضی کے لیے گواہی کے مطابق فوراً فیصلہ کرنا واجب ہے، تاہم اگر قاضی کو فیصلہ کرنے میں شک وشبہ ہو یا فریقین کے مابین فوری مصالحت کی اُمید ہو یا مدعی نے کچھ مہلت مانگی ہو تو ان تین صورتوں میں وہ تاخیر کر سکتا ہے۔(۳)

شہادت کے لیے شرائط:

شہادت کے لیے دو قسم کی شرائط ہیں: تحمل شہادت کی شرائط اور ادائے شہادت کی شرائط:

تحمل شہادت کا مطلب اور اس کے لیے شرائط:

تحمل شہادت کا مطلب کسی واقعہ یا حادثہ وغیرہ کو دیکھنا اور اس کا مشاہدہ کرنا ہے جس کے متعلق بعد میں گواہی کی ضرورت پیش آسکتی ہو۔اس کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

(۱) تحمل شہادت کے وقت گواہ عاقل ہو۔

(۲) واقعہ پیش آنے کے وقت گواہ بصیر، یعنی بینا ہو۔

(۱) الدر المختار علی صدر رد المحتار، أول كتاب الشهادات: ۸/۱۷٦

(۲) أيضاً: ۸/۱۷٤

(۳) أيضا

(۳) جس چیز کے بارے میں گواہی دے رہا ہو، اُس کو بذاتِ خود دیکھا ہو، البتہ اس شرط سے چند امور مستثنیٰ ہیں: نکاح، نسب، موت، قاضی کا تقرر اور وقف وغیرہ۔ اگر اِن امور کو خود نہ دیکھا ہو، لیکن لوگوں میں اس کی شہرت ہو تو شہرت پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی شہادت دی جا سکتی ہے۔

☆......تحمّل شہادت کے لیے بالغ، آزاد، مسلمان اور عادل ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر فی الوقت یہ چیزیں نہ ہوں، بلکہ ادائے شہادت کے وقت پائی جائیں تو بھی کافی ہے۔(۱)

ادائے شہادت کے لیے شرائط:

ادائے شہادت سے مراد دیکھے ہوئے واقع کا قاضی کے سامنے اظہار ہے تاکہ قاضی پر حق واضح ہو سکے اور وہ اس کی روشنی میں فیصلہ کر سکے، ان شرائط میں سے بعض شرائط گواہ (شاہد) کے لیے ہیں، بعض نفسِ شہادت کے لیے، بعض مکانِ شہادت کے لیے اور بعض مشہود بہ کے لیے ہے۔(۲)

شاہد، یعنی گواہ کے لیے شرائط:

اِن میں سے کچھ شرائط تو عام ہیں، ہر قسم کے معاملات میں گواہی دیتے وقت اِن کی رعایت ہوگی، جب کہ بعض شرائط خاص گواہوں کے لیے ہیں۔ عام شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) گواہ عاقل ہو۔　(۲) بالغ ہو۔　(۳) آزاد ہو۔

(۴) بینا ہو۔　(۵) گویا ہو۔

(۶) عادل ہو، غیر عادل کی گواہی جائز تو ہے، لیکن قاضی کے لیے اس کا ماننا اور اس پر فیصلہ کرنا واجب اور ضروری نہیں۔(۳)

(۷) واقعات اور معاملات کو یاد رکھنے والا ہو، یعنی معاشرے میں غفلت اور لاپرواہی سے مشہور نہ ہو۔(۴)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الشهادة، فصل في شرائط الركن: ۹/ ۵-۱۱، الفتاوی الهندية، کتاب الشهادات، الباب الأول: ۳/ ٤٥٠، الدر المختار مع رد المحتار، أول کتاب الشهادات: ۸/ ۱۷۳

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، اول کتاب الشهادات: ۸/ ۱۷۳

(۳) الفتاوی الهندیه، کتاب الشهادات، الباب الأوّل: ۳/ ٤٥٠، وللتفصیل فلیراجع بدائع الصّنائع کتاب الشهاده: ۹/ ۱۵-۲۸

(٤) معین الحکام، الفصل الرابع في صفات الشاهد: ص ۸۱، تبصرة الحکام، القسم الرابع في ذکر البینات، الفصل السادس في صفات الشاهد: ۱/ ۱۷۲، المغني، شروط الشهادة: ۱۲/ ۳۱

(۸) محدود فی القذف نہ ہو، اگر چہ بعد میں توبہ کی ہو (یہ شرط صرف حنفیہ کے ہاں ہے)۔(۱) محدود فی الزنا والسرقہ وشرب خمر اگر بعد میں توبہ کرلیں تو بالاتفاق ان کی گواہی درست ہوگی۔(۲)

(۹) گواہی دینے سے اس پر کوئی تہمت نہ ہو جس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں:

(الف) گواہی سے اپنے لیے فائدہ حاصل کرنے یا خود سے ضرر دفع کرنے کی کوشش کرے۔

(ب) اصل کی شہادت فرع کے لیے یا فرع کی شہادت اصل کے لیے نامقبول ہوگی، بخلاف رضاعت اور دوسرے رشتوں کے۔(۳)

(ج) گواہی دینے والے اور فریق آخر میں نمایاں باہمی عداوت نہ ہو۔ عداوت سے مراد دنیوی دشمنی ہے۔

(د) گواہی سے خود کو راست باز اور سچا ظاہر کرنے کی کوشش کرے۔

(ہ) دعوے اور مطالبے کے بغیر گواہی دینے میں سبقت اور شوق کا مظاہرہ کرے۔

(ز) گواہی دینے والا تعصب اور افراط وتفریط کا شکار ہو۔(۴)

(۱۰) امام ابوحنیفہؒ کے ہاں گواہی دیتے وقت اصل واقعہ اُس کو اچھی طرح یاد ہو، اگر کاغذ وغیرہ میں اپنا نام یا دستخط دیکھ کر صرف گواہی کرے اور واقعہ یاد نہ آئے تو یہ کافی نہیں۔(۵)

(۱۱) گواہی دینے والا خود ایک طرف سے فریق (خصم) نہ ہو، لہٰذا یتیم اور میت کا وصی یتیم اور میت کے حق میں گواہی نہیں دے سکتا، اس لیے کہ یتیم اور میت کی طرف سے خصم بذاتِ خود وصی ہوگا۔ یہی حکم وکیل اور مؤکل کا بھی ہے۔(۶)

شاہد سے متعلق وہ شرائط جو خاص مواقع پر معتبر ہوں گے:

(۱) گواہ مسلمان ہو، بشرطیکہ مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی جائے) مسلمان ہو، اس لیے کہ مسلمان کے خلاف

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الشهادات، الباب الأوّل: ۳/ ۴۵۰، بدائع الصنائع، كتاب الشهادات: ۹/ ۲۸

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الشادة: ۹/ ۳۴

(۳) بدائع الصنائع، كتاب الشهادة: ۹/ ۳۴-۳۷

(۴) القوانين الفقهية، الباب السابع في شروط الشهود: ص ۲۶۴، ۲۶۵، الشرح الكبير علي المغني، كتاب الشهادات، باب موانع الشهادة: ۱۲/ ۷۲-۸۲، الموسوعة الفقهية، المادة الشهادة، شروط الأداء: ۲۶/ ۲۲۴، ۲۲۵

(۵) بدائع الصنائع، كتاب الشهادة: ۹/ ۳۸

(۶) الفتاوی الهندية، كتاب الشهادات، الباب الأوّل: ۳/ ۴۵۰، بدائع الصنائع، كتاب الشهادات: ۹/ ۳۸

کافر کی گواہی درست نہیں۔(۱)

(۲) گواہ مرد ہو اگر گواہی حدود وقصاص کے لیے ہو۔(۲)

نفسِ شہادت سے متعلق شرائط:

(۱) اگر مقدمہ حقوق العباد پر مشتمل ہو تو گواہی سے قبل دعویٰ کی موجودگی ضروری ہے، دعوے کے بغیر گواہی درست نہیں، البتہ حقوق اللہ میں بغیر دعوے کے گواہی درست ہے۔(۳)

(۲) گواہ کی گواہی دعوے کے مطابق ہو، تناقض یا عدم تطبیق کی صورت میں گواہی معتبر نہیں۔

(۳) حدود وقصاص میں بذاتِ خود (بالاصالۃ) گواہی دینا۔(۴)

(۴) شہادت علی الشہادت میں اصل گواہ کے لیے بذاتِ خود حاضری سے معذور ہونا۔

(۵) گواہی لفظ شہادت سے ہو (ہر زبان کے مطابق)۔

(۶) جن امور میں مردوں کو جان کاری ہو سکتی ہو، اُن میں مردوں کی مخصوص شرعی تعداد کا موجود ہونا۔(۵)

(۷) حد شرب میں گواہی دیتے وقت نشئی شخص کے منہ سے شراب کی بو آنا۔(۶)

(۸) حد قذف کے علاوہ دوسرے حدود میں شہادت پر بہت زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو۔(۷)

مشہود بہ کی شرائط:

(۱) مشہود بہ معلوم ہو، مجہول اور نامعلوم چیز کے متعلق گواہی درست نہیں۔(۸)

(۲) اگر مشہود بہ مال یا منفعت ہو تو اس کا متقوم ہونا ضروری ہے۔(۹)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الشہادۃ:۹/۵٦

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الشہادۃ:۹/۵۳، ردالمحتار، أوّل کتاب الشہادات:۸/۱۷۳

(۳) ردالمحتار، کتاب الشہادات:۸/۱۷۳، الموسوعة الفقهية، تحت المادة الشهادة:۲٦/۲۲۵

(٤) بدائع الصنائع، کتاب الشهادة:۹/۵۹

(۵) بدائع الصنائع، کتاب الشهادة، الشرائط التي ترجع إلى النفس الشهادة:۹/۳۹۔۴۸

(٦) بدائع الصنائع، کتاب الشهادة:۹/۵۹

(۷) بدائع حواله بالا، ردالمحتار، کتاب الشهادات:۸/۱۷۳، الموسوعة الفقهية، المادة، الشهادة:۲٦/۲۲۵

(۸) بدائع الصنائع، کتاب الشهادة:۹/۳۸

(۹) الموسوعة الفقهية، المادة، الشهادة:۲٦/۲۲٦

مکان شہادت سے متعلق شرط:

اس سے متعلق ایک ہی شرط ہے اور وہ ہے قاضی کی عدالت اور مجلسِ قضا میں گواہی دینا، اس لیے کہ گواہی حجتِ ملزمہ تب بنتی ہے جب مجلسِ قضا میں ہو۔(۱)

نصاب شہادت:

نصاب شہادت کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

(۱) زنا کے ثبوت کے لیے چار چشم دید مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

(۲) زنا کے علاوہ دیگر حدود اور قصاص کے لیے دو مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) نکاح، طلاق، رجعت، خلع، عدت، مبارئت، اسلام، ارتداد، ثبوتِ نسب، خرید و فروخت، شرکت، حوالہ، کفالت، وکالت اور تمام مالی معاملات میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔

(۴) قاضی مندرجہ ذیل صورتوں میں ایک شخص کی گواہی بھی قبول کرسکتا ہے:

کسی چیز کی تحقیق کے لیے، عیب معلوم کرنے کے لیے، بادل کی صورت میں ہلالِ رمضان کے لیے، جرح و تعدیل کے لیے، گواہوں سے بیان لینے اور اُن کے کلام کا ترجمہ کرنے کے لیے، جرمانے کا اندازہ لگانے کے لیے، کسی چیز کا کھرا کھوٹا معلوم کرنے کے لیے وغیرہ۔(۲)

(۵) جن امور سے عورتیں ہی آگاہ ہوسکتی ہیں، ان میں قاضی ایک خاتون کی معائنہ رپورٹ پر بھی فیصلہ کرسکتا ہے، جیسے: ولادت، کنوارپن، حمل وغیرہ، تاہم یہاں بھی دو عورتوں کی گواہی زیادہ احتیاط پر مبنی ہے۔(۳)

کن گواہوں کی تعدیل اور تزکیہ ضروری ہے؟

امام ابوحنیفہؒ کے ہاں ظاہری عدالت گواہی کے لیے کافی ہے۔ لوگوں سے پوچھ گچھ اور تزکیہ کرنے (عدالتِ حقیقیہ) کی ضرورت نہیں، لیکن صاحبین اور حنفیہ کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق تزکیہ اور حقیقی عدالت ضروری ہے۔(۴)

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الشهادة: ۹/۵۳

(۲) الأشباه والنظائر، کتاب القضاء والشهادات والدعاوي: ص۱۱۹، ۱۲۰

(۳) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الشهادات: ۸/۱۷۷، معين الحكام، القسم الثاني في أنواع البينات: ۱۱۰-۱۱۷، القوانين الفقهية، الباب الثامن في مراتب الشهادات والشهود: ۲۶۵، ۲۶۶

(۴) الفتاوى الهندية، کتاب الشهادات، الباب الأول: ۳/۴۵۰

محمد بن جزی مالکیؒ کے ہاں گواہ پانچ قسم کے ہیں جن کا حکم کچھ یوں ہے:

(۱) وہ گواہ جن کی عدالت لوگوں میں ظاہر اور مشہور ہو، اگر مشہود علیہ سے اس کی دشمنی نہ ہو تو پھر مزید تزکیہ کی ضرورت نہیں، اس کی گواہی ہر جگہ مقبول ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں کسی جرح کو نہیں سنا جائے گا۔

(۲) عدالت بہت ظاہر نہ ہو، اس کی گواہی بھی مقبول ہوگی، تاہم تزکیہ کرنے سے اگر کوئی قابلِ جرح بات نکل آئے تو اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

(۳) ظاہر صورت سے عدالت کے نشانات اور علامات نظر آئیں۔

(۴) نہ عدالت معلوم ہو، نہ جرح۔

(۵) ظاہر صورت سے جرح معلوم ہو۔ ان تینوں صورتوں میں تزکیہ کے بغیر گواہی جائز نہیں۔(۱)

شہادت پر شہادت:

بعض امور وہ ہیں جن میں گواہ کا براہِ راست ہونا ضروری ہوتا ہے، جیسے: حدود وقصاص وغیرہ، تاہم دیگر مالی حقوق، قضاۃ کے فیصلے، اوقاف؛ غرض حدود وقصاص کے علاوہ تمام ہی معاملات میں بالواسطہ گواہی معتبر ہے بالواسطہ شہادت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص قاضی کے پاس حاضر نہ ہو سکے اور دوسرے سے کہے کہ میں فلاں معاملہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں تم قاضی کے پاس میری اس گواہی کی گواہی دے دینا اس گواہی کی درستگی چند شرائط سے مشروط ہے:

(۱) اصل شاہد سفر، مرض یا موت وغیرہ کی وجہ سے مجلسِ قضا میں حاضر نہ ہو سکے۔

سفر تین شب وروز یا اس سے زیادہ کی مسافت کا ہو، تاہم امام ابو یوسفؒ کے ہاں یہ ضروری نہیں، عذر کے بغیر بھی ''شہادت علی الشہادت'' جائز ہے۔

پردہ نشین خواتین کے لیے فقہائے کرام نے بالواسطہ شہادت کی اجازت دی ہے۔

(۲) یہ بھی ضروری ہے کہ اصل شاہد جس وقت دوسرے کو گواہی کے لیے مقرر کرے، اس وقت دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائے جائیں جب ہی شہادت معتبر ہوگی اور دو آدمیوں کی بالواسطہ شہادت سے اب بھی ایک ہی گواہ کی ضرورت پوری ہوگی۔(۲)

---

(۱) القوانين الفقهية، الباب الرابع في الحكم بين المدعي والمدعى عليه: ص ۲۶۰

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الشهادات، باب الشهادة على الشهادة: ۸/۲۲۵، ۲۲۶، البحر الرائق، كتاب الشهادات، باب الشهادة على الشهادة: ۷/۲۰۲، ۲۰۴، لسان الحكام على معين الحكام، الشهادة على الشهادة: ص ۳۸

گواہی سے رجوع اور اس کا حکم:

اگر کوئی شخص اپنی گواہی سے رجوع کرے تو یہ رجوع اس وقت معتبر ہوگی جب قاضی کے مجلس میں کرے۔ اگر کسی عام آدمی کے سامنے اس نے اپنی گواہی سے رجوع کیا تو اس کا اعتبار نہیں، تاہم دوسرے قاضی کے سامنے رجوع کرسکتا ہے۔(۱) پھر اس رجوع کی کئی صورتیں ہیں:

(۱) اگر فیصلہ کرنے سے پہلے رجوع کرلیا تو ان کی گواہی اب قاضی کے لیے فیصلے کے قابل نہ رہی۔ اس صورت میں ان پر کچھ بھی تاوان نہیں، تاہم اس تضاد بیانی پر اس کی تعزیر کی جائے گی۔(۲)

(۲) اگر فیصلہ کرنے کے بعد رجوع کرلے، لیکن ابھی تک اُس فیصلے کی تنفیذ باقی ہو تو پھر دیکھا جائے گا، اگر حدود اور قصاص کا معاملہ ہو تو ان کا استیفا جائز نہیں رہے گا، اس لیے کہ رجوع عن الشہادۃ کی وجہ سے شبہ پیدا ہوا اور یہ حقوق شبہ کی وجہ سے ساقط ہوتے ہیں۔(۳)

(۳) اگر فیصلہ کرنے کے بعد رجوع کرلے اور معاملہ مالی ہو تو فیصلہ اپنے حال پر رہے گا اور گواہوں پر تعزیر کے ساتھ اس مال کا تاوان عائد ہوگا جو ان کی گواہی کی وجہ سے ضائع ہوگیا ہے۔ یاد رہے کہ گواہان گواہی سے فائدہ اُٹھانے والے شخص (محکوم علیہ) پر اداشدہ تاوان کے رجوع کا حق نہیں رکھتے۔(۴)

فقہاے کرام نے رجوع کرنے کے بعد گواہ پر ضمان واجب کرنے کے لیے کچھ شرائط ذکر کی ہیں، مثلاً:

(الف) رجوع قاضی کے فیصلہ کے بعد ہو۔

(ب) رجوع مجلسِ قاضی میں ہو۔

(ج) گواہی کی وجہ سے ضائع شدہ شے عین ہو، منفعت نہ ہو۔

---

(۱) الدرالمختار علی صدرردالمحتار، باب الرجوع عن الشهادة: ۸/ ۲۳۲، لسان الحکام علی معین الحکام، الرجوع عن الشهادة: ص ۳۹

(۲) الدرالمختار علی صدرردالمحتار، باب الرجوع عن الشهادة: ۸/ ۲۳۲، الفتاوی الهندية، کتاب الرجوع عن الشهادة، الباب الأول: ۳/ ۵۳۴، ۵۳۵

(۳) الموسوعة الفقهية، المادة الشهادة: ۲۶/ ۲۴۳، بدائع الصنائع، کتاب الرجوع عن الشهادة، حاشیه نمبر: ۹/ ۷۱

(٤) مغني المحتاج، فصل في رجوع الشهود: ٤/ ٤٥٦، بدائع الصنائع، کتاب الرجوع عن الشهادة: ۹/ ۶۵، ۶۶ الفتاوی الهندية، کتاب الرجوع عن الشهادة، الباب الأول: ۳/ ۵۳۴، ۵۳۵

(د) ضائع شدہ چیز کے عوض محکوم علیہ کو کوئی عوض نہ ملا ہو، یعنی اتلاف بغیر عوض ہو۔(۱)

(۴) اگر ان کی گواہی کی وجہ سے کوئی شخص قصاصاً قتل ہو جائے تو حنفیہ کے ہاں رجوع کے بعد اس پر صرف دیت واجب ہوگی، تاہم یہ دیت عاقلہ پر نہیں ہوگی۔(۲)

(۵) اگر زنا کے گواہوں میں سے کسی نے رجوع کر لیا تو اس پر ہر صورت میں حد قذف جاری کی جائے گی، چاہے فیصلہ ہوا ہو یا نہیں اور محکوم علیہ کو رجم کیا گیا ہو یا کوڑے مارے گئے ہوں، تاہم رجم کی صورت میں بطورِ ضمان گواہ کے ذمے دیت بھی واجب ہوگی، البتہ اگر کوڑے مارنے سے مرجائے تو گواہ پر صرف حد قذف ہوگی، دیت نہیں۔(۳)

بچے کی گواہی میں اختلاف:

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں بچے کی شہادت جائز نہیں، تاہم مالکیہ اور حنابلہ کے ایک قول کے مطابق بچے کی شہادت اُن معاملات میں جائز ہے جہاں پر محکوم علیہ بھی بچے ہوں اور کوئی بالغ موجود نہ ہو اور یہ گواہی صرف جروح اور قتل میں معتبر ہوگی۔ علامہ ابن فرحون نے چند شرائط کے ساتھ بچے کی گواہی کو جائز قرار دیا ہے۔(۴)

جھوٹی گواہی کا حکم:

جھوٹی گواہی کی شناعت کے لیے یہ کافی ہے کہ آپ ﷺ نے تین بار جھوٹی گواہی کو شرک کے برابر قرار دیا ہے۔(۵)

جن لوگوں کی جھوٹی گواہی ثابت ہو جاتی تھی، حضرت عمرؓ ان کو چالیس کوڑے لگاتے تھے اور اس کے چہرے پر سیاہی لگاتے تھے اسی لیے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے ہاں جھوٹے گواہ کو مارنا پیٹنا جائز ہے اور قید بھی کیا جا سکتا ہے(۶)

۞۞۞۞۞

(۱) البحرالرائق، کتاب الشهادة، باب الرجوع عن الشهادة: ۷/۲۱۵، بدائع الصنائع، کتاب الرجوع عن الشهادة: ۹/۷۰

(۲) الهندية، کتاب الرجوع عن الشهادة، الباب التاسع: ۳/۵۵۵، الموسوعة الفقهية، مادة الشهادة: ۲۶/۲۴۳، ۲۴۴

(۳) البحرالرائق، کتاب الشهادات، باب الرجوع عن الشهادة: ۹/۲۱۵

(٤) تبصرة الحكام، الباب السادس والأربعون في القضاء بشهادة الصبيان: ۲/۳۶، القوانين الفقهية، الباب السابع في شروط الشهود ص ۲٦٤، بدائع الصنائع، حاشیه، کتاب الشهادة: ۹/۷،٦

(۵) ابوداؤد، کتاب القضايا، باب في شهادة الزور: ۲/۱۵۰، ایچ۔ایم سعید کمپنی

(٦) البحرالرائق، کتاب الشهادة، قبيل باب الرجوع عن الشهادة: ۷/۲۱۲-۲۱٤

مسائل کتاب الشهادات

(گواہی سے متعلقہ مسائل کا بیان)

جھوٹی گواہی سے رقم وصول کرنا

سوال نمبر(157):

ہمارے علاقے میں ملوں (فیکٹریوں) میں ملازمین کام کرتے ہیں۔حکومت کی طرف سے ملازمین کی بیٹیوں کی شادی کے موقع پر جہیز کے لیے کچھ رقم ملتی ہے، جسے ملازمین فارم پُر کر کے رقم وصول کرتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ بعض وہ ملازمین جن کی بیٹیاں نہیں ہوتیں یا ہوتی ہیں،لیکن کم عمر ہوتی ہیں یا شادی شدہ ہوتی ہیں، باوجود اس کے وہ نکاح فارم پُر کر کے حکومت کے ساتھ دھوکہ دہی کرتے ہیں۔کیا ان ملازمین کے لیے اس رقم کا حصول اور اس کا استعمال شرعاً جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

ہر مسلمان کے لیے دیانت داری اور امانت داری کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے۔اسلام کا منشا یہ ہے کہ محنت کش طبقہ امانت اور دیانت کو اپنا کر جھوٹ وفریب کا راستہ اختیار نہ کریں اور اپنے اختیارات کی حد سے تجاوز نہ کریں۔بعض ملازم پیشہ حضرات جن کے پاس کچھ اختیارات ہوتے ہیں، وہ عموماً اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کر کے ناجائز اور غلط طریقوں سے ملک وقوم کے خزانے کو شیر مادر سمجھ کر بے جا لوٹتے رہتے ہیں جو بہت بڑا گناہ ہے اور پوری قوم کا مجرم بنتا ہے۔

اگر حکومت کسی مستحق ملازم کو کوئی سہولت فراہم کرتی ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غیر مستحق ملازم بھی اپنے کو مستحق دکھلا کر حرام طریقے سے مستفید ہو۔لہٰذا صورتِ مسئولہ میں وہ ملازمین جو اس حکومتی عطیہ کے مستحق نہیں اور محض جھوٹی گواہی اور کذب بیانی سے خود کو مستحق ظاہر کرتے ہیں،ان کا یہ فعل شرعاً بے حد مذموم اور حرام ہے،اس سے اجتناب ضروری ہے۔مذکورہ رقم کے حصول کے لیے تگ ودو کرنا اور اس رقم کو اپنے استعمال میں لانا ناجائز اور حرام ہے۔

والدلیل علی ذلك:

قال تعالی: ﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ﴾.(١)

ترجمہ: اور جھوٹی گواہی سے بچو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾.(٢)

ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔

قال رسول الله ﷺ: ألا أحدثكم بأكبر الكبائر، قالوا: بلى يارسول الله، قال الإشراك بالله، وعقوق الوالدين قال: وجلس وكان متكئا قال: وشهادة الزور.(٣)

ترجمہ: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: ''کیا میں تمہیں اکبر الکبائر (سب سے بڑے گناہ) کی خبر نہ دوں'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''کیوں نہیں، یارسول اللہ!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا'' راوی کہتے ہیں: آپ تکیہ لگائے ہوئے تھے، بیٹھ کر فرمایا: ''اور جھوٹی گواہی''۔

❁❁❁

گواہ کو مشہود بہ کا علم ہونا

سوال نمبر (158):

کیا شرعاً ایسے گواہ معتبر ہیں جو فقط مدعی کی زبان پر یقین کر کے شہادت کے لیے تیار ہوں، باقی کیس کے متعلق ان کو کچھ علم نہ ہو۔ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعاً گواہی کا مطلب یہ ہے کہ گواہ بذاتِ خود اپنی آنکھوں سے کسی معاملہ کا معائنہ کر چکا ہو یا اپنے کانوں سے کسی بات کو سن چکا ہو تو اُس کی گواہی دے سکتا ہے۔ اگر خود دیکھا یا سنا نہ ہو تو صرف مدعی کی زبان پر یقین کر کے گواہی دینا جائز نہیں۔

---

(١) الحج/ ٢٨

(٢) سورة النساء/ ٢٩

(٣) سنن الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في عقوق الوالدين: ٢/ ٥٤ مكتبه رحمانيه لاهور پاكستان

والدّلیل علی ذلك:

یلزم أن یکون الشهود قد عاینوا بالذات المشهود به، وأن یشهدوا علی ذلك الوجه، یعني لایحل للشاهد أن یشهد بشيء مالم یکن عاینه، فیشهد بماسمع إن کان من المسموعات، وبما رأی إن کان من المرئیات. (۱)

ترجمہ:

ضروری ہے کہ جس کے بارے میں گواہی دی جارہی ہے، گواہوں نے بذاتِ خود اس کا معائنہ کیا ہو، اور اسی طریقہ پر گواہی دیں، یعنی کسی گواہ کے لیے اس وقت تک گواہی دینا جائز نہیں جب تک اس نے خود معائنہ نہ کیا ہو، پس اگر اس کا تعلق سننے سے ہو تو وہ گواہی دے گا جو اس نے خود سنا ہو۔ اور اگر اس کا تعلق دیکھنے سے ہو، تو گواہی دے گا جو اس نے خود دیکھا ہو۔



گواہوں کی گواہی کے الفاظ کا مختلف ہونا

سوال نمبر(159):

جب گواہوں کے بیانات آپس میں مختلف ہوں تو کیا ان کی گواہی شرعاً معتبر ہوگی؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر اختلاف صرف الفاظ تک محدود ہو، مقصود اور معنی دونوں کا ایک ہو تو ایسی گواہی شرعاً قبول کی جاسکتی ہے۔ لیکن جہاں کہیں الفاظ کے تضاد سے معنی ومفہوم اور مقصود میں بھی اختلاف ہو رہا ہو تو وہاں گواہی معتبر نہ ہوگی۔

والدّلیل علی ذلك:

یعتبر اتفاق الشاهدین لفظا ومعنی عند أبي حنیفةؒ، وقالا: الاتفاق في المعنی هو المعتبر لاغیر. (۲)

---

(۱) شرح المجلة لخالد الاتاسي، الکتاب الخامس العشر في البینات والتحلیف: المادة/ ۱۶۸۸: ۲۰۷/۴

(۲) الفتاوی الهندیة، کتاب الشهادات، الباب الثامن في الاختلاف بین الشاهدین: ۵۰۳/۳

ترجمہ:
امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شاہدین کا لفظاً و معناً اتفاق معتبر ہے، جب کہ صاحبینؒ کے نزدیک صرف معناً اتفاق کافی ہے۔

❁❁❁

فاسق کی گواہی

سوال نمبر(160):

فاسق کی گواہی شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟ اور فاسق کا اطلاق کس شخص پر ہوگا؟ آج کل گناہ کرنا عام معمول بن چکا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے کیا شرعی فیصلے غیر معتبر سمجھے جائیں گے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعاً گواہی کے لیے شرط ہے کہ گواہ عاقل ہو، بالغ ہو، آزاد ہو، بینا ہو اور عادل ہو۔ فقہائے کرام نے عادل کی تفسیر میں لکھا ہے کہ کبائر سے اجتناب کرتا ہو اور صغائر پر مواظبت نہ کرتا ہو اور اس کی نیکیاں گناہوں پر غالب ہوں۔ متقدمین فقہانے شہادت کے لیے جو شرائط مقرر کی ہیں، موجودہ زمانے میں ان تمام شرائط کا پایا جانا مشکل ہے، اس لیے متاخرین فقہائے کرام نے فاسق کی گواہی چند شرائط کے ساتھ مقبول قرار دی ہے، مثلاً: کوئی عادل گواہ میسر نہیں جس سے مدعی کی حق تلفی کا اندیشہ ہو اور قاضی کو اس گواہی کے صدق پر اطمینان حاصل ہو جائے تو فاسق کی گواہی لینا مرخص ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

منها مايرجع إلى الشاهد: وهو العقل، والبلوغ، والحرية، والبصر، والعدالة.(١)

ترجمہ: شہادت کی کچھ شرطوں کا تعلق گواہ کے ساتھ ہے، کہ وہ عاقل، بالغ، آزاد، بینا اور عادل ہو۔

وأما شهادة الفاسق: فإن تحرّى القاضي الصدق في شهادته تقبل وإلا فلا.(٢)

---

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الشهادات، الباب الاول في تعريفها: ٣/٤٥٠

(٢) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الشهادات: ١٧٨/٨

ترجمہ: اگر قاضی فاسق کی شہادت میں تحری کرے کہ یہ سچا ہے تو شہادت قبول کی جا سکتی ہے، ورنہ نہیں۔

❁❁❁

جھوٹی گواہی دینے والوں کی گواہی

سوال نمبر (161):

بعض لوگ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہوتے ہیں، حج بھی کیے ہوتے ہیں، باوجود اس کے جھوٹی گواہی دیتے رہتے ہیں۔ کیا جھوٹی گواہی دینے والے کی آئندہ گواہی شرعاً مقبول ہوگی یا مردود؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جھوٹی گواہی گناہ کبیرہ ہے۔ احادیث میں اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں اور فقہائے کرام نے مرتکب کبیرہ کی گواہی کو غیر معتبر لکھا ہے، تاہم اگر کوئی شخص جھوٹی گواہی دینے کے بعد توبہ کرے تو توبہ کرنے کے بعد اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

قال رسول اللہ ﷺ: ألا أحدثكم بأكبر الكبائر، قالوا: بلى يارسول الله، قال الإشراك بالله، وعقوق الوالدين قال: وجلس وكان متكئا قال: وشهادة الزور.(۳)

ترجمہ: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: ''کیا میں تمہیں اکبرالکبائر (سب سے بڑے گناہ) کی خبر نہ دوں'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''کیوں نہیں، یارسول اللہ!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا'' راوی کہتے ہیں: آپ تکیہ لگائے ہوئے تھے، بیٹھ کر فرمایا: ''اور جھوٹی گواہی''۔

والمعروف بالعدالة إذا شهد بزور، وتاب تقبل شهادته، وعليه الاعتماد...... وغير العدل إذا شهد بزور، ثم تاب، جازت شهادته.(۲)

---

(۱) سنن الترمذی، ابواب البر والصلة،باب ماجاء في عقوق الوالدين: ۲/۱۰۴

(۲) الفتاوی الهندية، كتاب الشهادات،الباب الرابع فيمن تقبل شهادته: ۳/۴۶۸

ترجمہ:
جو شخص عدالت میں مشہور ہو وہ جب جھوٹی گواہی دے اور پھر توبہ کرے تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی، یہی قول معتمد ہے۔۔۔۔اور غیر عادل شخص جھوٹی گواہی دے اور پھر توبہ کرے تو اس کی گواہی بھی درست ہے۔

۞۞۞

بہن کے لیے گواہی دینا

سوال نمبر(162):

ایک شخص نے بیوی کو طلاق دی۔اب طلاق دینے سے منکر ہے۔عورت کے بھائی طلاق دیتے وقت موجود تھے۔کیا بھائی اپنی بہن کے حق میں گواہی دے سکتے ہیں کہ شوہر نے اس کو طلاق دی ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اصول وفروع کے حق میں اندیشہ تہمت کی وجہ سے گواہی شرعاً معتبر نہیں۔اصول وفروع اور زوجین کے علاوہ دیگر محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کے حق میں گواہی معتبر ہے۔لہٰذا مسئولہ صورت میں بھائیوں کی گواہی شرعاً معتبر ہے، بشرطیکہ نصاب گواہی مکمل ہو۔

والدّلیل علی ذلك:

وإن شهد على طلاق أخته قبلت شهادته ادعت الأخت ذلك أو جحدت.(١)

ترجمہ: اگر کوئی شخص اپنی بہن کی طلاق پر گواہی دے تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی، چاہے اس کی بہن طلاق کا دعویٰ کرے یا انکار۔

فتقبل شهادة الربيب وشهادة الأخ لأخيه وأخته وأولادهما، وكذاالأعمام وأولاده، والأخوال، والخالات، والعمات.(٢)

(١) الفتاوى التاتارخانية، كتاب الطلاق، الفصل التاسع عشر في الشهادة في الطلاق: ٤٠٤/٣

(٢) شرح المجلة لسليم رستم باز، الكتاب الخامس عشر في البينات والتحليف، الفصل الثالث في شروط الشهادة: المادة/١٧٠٠: ص/١٠٣١

ترجمہ:

لے پالک کی گواہی، بھائی کی بھائی کے لیے، بہن کے لیے اوران کی اولاد کے لیے گواہی، اسی طرح چچوں اوران کی اولاد کے لیے، اور ماموں، خالاؤں اور پھوپھیوں کے لیے گواہی قبول کی جائے گی۔

۞۞۞

نابالغ بچوں کی گواہی

سوال نمبر(163):

ایک شخص نے اپنے رشتہ دار پر چوری کا الزام لگایا اوراس پر دو بچے اور ایک شخص گواہ ہیں۔کیا شرعاً ان کی گواہی معتبر ہے؟اگر نہیں تو مسئلہ کا حل کیا ہوگا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اثبات جرم کے لیے شرعاً دومرد یا ایک مرد اور دوعورتوں کی گواہی ضروری ہے۔نابالغ بچوں کی گواہی شرعاً معتبر نہیں۔لہٰذا مذکورہ مسئلہ میں نصابِ گواہی مکمل نہ ہونے کی وجہ سے مدعیٰ علیہ کو قسم دی جاسکتی ہے۔قسم اٹھانے سے مدعیٰ علیہ بری الذمہ ہوجائے گا۔اور قسم سے انکار کی صورت میں جرم ثابت ہوگا۔

والدّلیل علی ذلك:

ولاتقبل أيضاًشهادة الصبيان ......لأن الشرع جعل حد كمال العقل البلوغ.(۱)

ترجمہ:

بچوں کی شہادت (گواہی) بھی مقبول نہیں ہے۔۔۔کیوں کہ شریعت نے عقل کامل ہونے کی مدت بالغ ہونا مقرر کیا ہے۔

قال النبي ﷺ في خطبته: البيّنة على المدّعي واليمين على من أنكر. (۲)

---

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز،الكتاب الخامس عشر في البينات والتحليف : المادة /١٦٨٦:ص/١٠٠٥

(۲) سنن الترمذي:٦/٢٤٩

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: گواہ مدعی (دعوی کرنے والے) کے ذمہ ہے اور قسم (یمین) انکار کرنے والے کے ذمہ ہے۔

❁❁❁

ملازمت کے حصول کے لیے دینی اسناد پیش کرنا

سوال نمبر (164):

کسی ادارے میں ملازمت کے لیے حفظِ قرآن یا فراغت درس نظامی کی سند پیش کرنا از روئے شریعت جائز ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

سند کی حیثیت شہادت کی ہے جس کے ذریعے جاری کنندہ یا ادارہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ حامل سند فلاں ادارہ سے فارغ التحصیل ہے اور حامل سند میں مذکورہ قابلیت واہلیت موجود ہے۔

اگر کہیں ادارہ کی شہادت کی ضرورت پڑے تو قابلیت کے ہوتے ہوئے سند دکھا کر ملازمت کے لیے کوشش کرنا شرعاً جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

عن أنس بن مالك قال: لما أراد النبي ﷺ أن يكتب إلى الروم، قالوا: أنهم لا يقرؤن كتابا إلا مختوما، فاتخذ النبي ﷺ خاتما من فضة كأني أنظر إلى وبيصه، ونقشه محمد رسول الله.(۱)

ترجمہ:

حضرت انسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب نبی کریم ﷺ نے روم کو خط بھیجنے کا ارادہ کیا تو مجلس میں حاضر لوگوں نے عرض کیا کہ روم والے وہ خطوط نہیں پڑھتے جن پر مہر موجود نہ ہو تو حضور ﷺ نے ایک مہر بنوالی جو چاندی کی تھی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: اس وقت بھی گویا اس کی چمک میرے سامنے ہے، اس پر یہ عبارت ''محمد رسول اللہ'' نقش تھی۔

❁❁❁

(۱) الصحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب الشهادة على الخط المختوم: ۲/۱۰۶۰، ۱۰۶۱

قصاص کے باب میں مجروح اور عورت کی گواہی

سوال نمبر(165):

ایک شخص کو کسی نے گولی ماری، وہ زخمی حالت میں تھانہ گیا اور کہا کہ مجھے فلاں فلاں نے مارا ہے۔بعد میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا،اس کے قتل پر صرف اس کی بیوہ گواہ ہے۔کیا قصاص لینے کے لیے ایک عورت کی گواہی یا حالتِ نزع میں مجروح کی گواہی شرعاً کفایت کرتی ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

قصاص میں شرعاً صرف عورت کی گواہی معتبر نہیں ہے، بلکہ ہر وہ گواہ بھی معتبر نہیں جس میں قصاص کے گواہ کی شرائط موجود نہ ہوں۔قصاص کے باب میں گواہی کے لیے دو عادل مردوں کا گواہ بننا ضروری ہے جو اس کیس کے چشم دید گواہ بھی ہوں۔

مسئولہ صورت میں محض مجروح کے بیان کا سہارا لینا درست نہیں، کیوں کہ اس وقت وہ خود مدعی تھا اور مدعی خود گواہ نہیں بن سکتا،لہٰذا شرعاً اس مجروح اور عورت کی گواہی معتبر نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

ونصاب الشهادة لبقية الحدود والقود رجلان، ولاتقبل فيها شهادة النساء.(۱)

ترجمہ:

حدود اور قصاص کے لیے نصاب دو مرد ہیں،اس باب میں عورت کی گواہی معتبر نہیں۔

❁❁❁

جعلی شناختی کارڈ بنوا کر ملازمت حاصل کرنا

سوال نمبر(166):

میں لکی مروت کا مستقل باشندہ ہوں۔میرے آباواجداد بھی مستقل لکی مروت کے باسی ہیں۔میٹرک پاس

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز، تحت المادة/١٦٨٥: ص/١٠٠٣

کرنے کے لیے میں پشاور آیا، یہاں پر میں نے ڈومیسائل بنایا، پھر بی، ٹی، سی کالج میں داخلہ لیا، کالج میں شناختی کارڈ کا مطالبہ ہوا میں شناختی کارڈ دفتر گیا، انہوں نے بتایا کہ آپ لوگوں کا مستقل ریکارڈ کی مروت کا ہے، تمام ریکارڈ منتقل کرنے کی صورت میں آپ کا شناختی کارڈ بن سکتا ہے۔ یہ ایک لمبا چوڑا طریقہ کار تھا، کیوں کہ میرے بھائیوں وغیرہ سب کے شناختی کارڈ لکی مروت کے پتہ پر بنے تھے۔ پھر مجھے کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ اسٹامپ پیپر پر ماں باپ کو وفات لکھنے سے اور پشاور کے باسی ظاہر کرنے سے پشاور کا شناختی کارڈ بنانا ممکن ہے۔ میں نے رشوت دیکر مذکورہ طریقہ سے شناختی کارڈ بنوایا جس پر مجھے کالج میں داخلہ ملا، بی، ٹی، سی بھی کرلیا، پھر بعد میں مجھے اس شناختی کارڈ پر نوکری مل گئی۔ کیا جھوٹ، رشوت کے ذریعے بنائے گئے شناختی کارڈ پر ملنے والی ملازمت کی تنخواہ شرعاً حلال ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صورتِ مسئولہ میں رشوت اور جھوٹی گواہی سے کام لیا گیا ہے اور یہ سب کبیرہ گناہ ہیں اور کبیرہ گناہوں کے لیے توبہ اور استغفار ضروری ہے، تاہم اگر صورتِ حال ایسی ہو کہ کوئی شخص حقیقتاً ملازمت کا اہل ہو اور اس ملازمت کے حصول کے لیے کسی کی حق تلفی نہ ہوتی ہو اور ملازم اپنے فرائض بخوبی سرانجام دے رہا ہو تو اس کے عوض ملنے والی تنخواہ اس کے لیے حلال ہے، لیکن یاد رہے کہ دوسرے علاقہ کا جعلی شناختی کارڈ بنوانا کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ اس کے لیے اتنے جھوٹ اور رشوت جیسے کبیرہ گناہ کی اجازت دی جاسکے، کیوں کہ دوسرے علاقہ کا شناختی کارڈ بنوانا قانونی طور پر بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، لہٰذا جعلی شناختی کارڈ بنوانا کذب بیانی اور رشوت کا گناہ بدستور اس کے ذمہ رہے گا جن کے لیے توبہ واستغفار ضروری ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

قال رسول اللّٰہ ﷺ: الا احدثکم باکبر الکبائر، قالوا: بلی یارسول اللّٰہ، قال الاشراك باللّٰہ، وعقوق الوالدین قال: وجلس، وکان متکأقال: وشهادة الزور.(۱)

ترجمہ:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: میں تمہیں اکبر الکبائر (سب سے بڑے گناہ) کی خبر نہ دوں، صحابہ رضی اللہ عنہم

(۱) سنن الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في عقوق الوالدین: ۲/ ٤٥٤

نے عرض کیا جی ہاں یارسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور بیٹھ گئے، اس حال میں کہ تکیہ لگائے ہوئے تھے، فرمایا اور جھوٹی گواہی۔

❁❁❁

جعلی سند سے عہدہ حاصل کرنا

سوال نمبر (167):

ایک شخص نے بحالتِ مجبوری جعلی سرٹیفکیٹ سے کوئی عہدہ حاصل کیا۔ اس میں اس عہدہ کی لیاقت بھی ہے، بعد میں اصلی سرٹیفکیٹ بھی مل گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ متعلقہ محکمہ کو اصلی سند دکھادے یا جعلی سند سے کام چلاتا رہے۔ اصلی سند دکھلانے کی صورت میں اس کے خلاف مقدمہ کا خطرہ بھی ہے۔ کیا اس صورت میں قدیم سند (جعلی) پر رہتے ہوئے ملازمت کرنا جائز ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جعلی سند بنوا کر ملازمت حاصل کرنا جھوٹ اور دھوکہ ہے جو کہ گناہ کبیرہ ہیں، تاہم اگر صورتِ حال ایسی ہو کہ کوئی شخص حقیقتاً اس ملازمت کا اہل ہو اور اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیتا ہو اور دوسرے کی حق تلفی نہ ہو تو اپنے اس سروس کے عوض اجرت لینا جائز ہے، لیکن اگر اس شخص کو اپنے عہدہ کے موافق اصلی سند مل چکی ہے تو اگر اصلی سند دکھلانے پر نوکری کو کوئی خطرہ نہ ہو تو اصلی سند دکھلانا بہتر ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

ثم الأجرة تستحق بأحد معان ثلاثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتأجيل، أو باستيفاء المعقود عليه.(١)

ترجمہ:

تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت میں اجرت کا استحقاق بن جاتا ہے: (۱) معجّل ادا کرنے کی شرط کے ساتھ۔ (۲)...... یا معین مدت تک ادا کرنے کی شرط کے ساتھ۔ (۳) یا معقود علیہ کو پورا پورا حوالہ کرنے کے بعد۔

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الاجارة، الباب الثاني في بيان أنّه متى تجب الأجرة وما يتعلق به من الملك وغيره: ٤١٣/٤

کسی غیر سے امتحان دلوا کر ڈگری حاصل کرنا

سوال نمبر(168):

ایک شخص نے اپنے امتحان کے موقع پر کسی دوسرے ساتھی کو امتحان حال میں بٹھا کر امتحان پاس کیا اور سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ کیا اس سرٹیفکیٹ کو لے کر نوکری کرنا اور اس نوکری کے عوض تنخواہ لینا شرعاً جائز ہے؟

بیّنوا توجروا

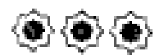
الجواب وباللّٰہ التوفیق:

سرٹیفکیٹ یا ڈگری وغیرہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس کا حامل اتنی تعلیم اور اتنی قابلیت رکھتا ہے، لیکن اگر یہ ڈگری اور سرٹیفکیٹ نقل یا کسی غیر سے امتحان دلوا کر حاصل کیا ہو تو یہ دھوکہ دہی اور جھوٹی گواہی کے مترادف ہو کر حرام بن جاتا ہے، تاہم اگر ایسا شخص نوکری کرتا ہے اور اس نوکری کی اہلیت رکھتا ہو تو اس کے لیے تنخواہ لینا جائز ہوگا، کیوں کہ تنخواہ محنت اور وقت کے عوض میں ملتی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

قال رسول اللّٰہ ﷺ: ألا أحدثکم بأکبر الکبائر، قالوا: بلی یارسول اللّٰہ، قال الإشراك باللّٰہ، وعقوق الوالدین قال: وجلس، وکان متکأقال: وشہادۃ الزور.(۱)

ترجمہ: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ میں تمہیں اکبرالکبائر (سب سے بڑے گناہ) کی خبر نہ دوں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا جی ہاں یارسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور بیٹھ گئے، اس حال میں کہ تکیہ لگائے ہوئے تھے، فرمایا اور جھوٹی گواہی۔



حدِ زنا میں گواہوں کی تحدید

سوال نمبر(169):

جناب مفتی صاحب! حدِ زنا کے لیے چار گواہوں کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ اگر اس سے مقصود زنا کی خبر دینا ہے،

(۱) سنن الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في عقوق الوالدین: ۲/ ۴۵۴

تو وہ دو سے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ شریعت میں حدِ زنا کے لیے چار مردوں کی گواہی ضروری قرار دی گئی۔

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اللہ تعالیٰ حکیم ذات ہے۔ اس کا ہر حکم مبنی بر حکمت ہوتا ہے، تاہم ہر حکمت کا جاننا ضروری نہیں، بلاچوں وچرا شریعت کا حکم ماننا مسلمان کا فرض ہے۔ حدِ زنا کے لیے چار مردوں کی گواہی میں حکمت یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے، اس لیے بندوں پر پردہ ڈالنے کو پسند کرتا ہے، اسی وجہ سے حد زنا کے لیے چار مرد گواہ ضروری قرار دیے گیے ہیں تاکہ حضرت انسان کی پردہ پوشی ہو اور شرعاً یہی مندوب ہے۔ کیوں کہ چار گواہوں کا ملنا بھی بڑا مسئلہ ہے۔ نیز انسان کی پردہ دری اور عزت پر وار کرنے کے لیے سوچے سمجھے منصوبوں کے لیے سدباب بھی ہے، تاکہ باآسانی اس باب میں الزام کا دروازہ نہ کھل سکے۔

والدلیل علی ذلک:

ثم سبب هذا الحد يثبت عند الإمام بالشهادة تارة، وبالإقرار أخرى، فبدأ الكتاب ببيان ما يثبت بالشهادة، فقال: والزنا مختص من بين سائر الحقوق في أنه لا يثبت إلا بشهادة أربعة لقوله تعالى ﴿فاستشهدوا عليهن أربعة منكم﴾ .... نقول إن الله تعالى يحب الستر على عباده، وإلى ذلك ندب وذم من أحب أن تشيع الفاحشة، فلتحقيق معنى الستر شرط زيادة العدد في الشهود على هذه الفاحشة.(۱)

ترجمہ:

امام صاحب کے ہاں حدِ زنا کا ثبوت کبھی شہادت سے ہوتا ہے اور کبھی اقرار سے۔ پس مصنفؒ نے شہادت سے اثبات کا بیان شروع کیا اور فرمایا زنا تمام حقوق سے مخصوص ہے، اس لیے اس کا ثبوت چار گواہوں کے بغیر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ''کہ زانی اور زانیہ پر چار گواہ طلب کرو'' ۔۔۔۔ احناف فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر پردہ کو پسند کرتے ہیں، اس وجہ سے پردہ پوشی مستحب ہے اور جو کوئی فحش کاموں کی تشہیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی ہے، پس پردہ پوشی کی وجہ سے حدِ زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہ شرط قرار دیے گئے۔

❁❁❁

(۱) المبسوط للسرخسي، كتاب الحدود:

مدعا علیہ کے یمین کے بعد مدعی کا گواہ پیش کرنا

سوال نمبر(170):

چند افراد نے مل کر ایک گھر سے چوری کی۔ پھر چوروں نے قسم کھائی کہ ہم نے چوری نہیں کی۔ چند دنوں بعد مالک مکان نے واضح کردیا کہ چوری کا مال مذکورہ افراد کے پاس ہے۔ کیا شریعت کی رُو سے قسم کھانے کے بعد دوبارہ اثبات جرم ہو تو مجرم سے چوری شدہ سامان کا تاوان لیا جاسکتا ہے؟ حالانکہ چورا سے فروخت کرچکے ہیں۔

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نزاع کے حل کے لیے گواہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر مدعی کسی وجہ سے گواہ پیش نہ کرسکے اور مدعی علیہ قسم کھائے اور اس کے بعد مدعی کو گواہ مل جائیں تو ان کو پیش کرکے شرعاً ان کی گواہی قبول کی جائے گی اور مدعی علیہ کا قسم اُٹھانا کالعدم شمار ہوگا، تاہم یہ ضروری ہے کہ گواہ گواہی کے اہل ہوں اور ان کی تعداد پوری ہو۔

مسئولہ صورت میں ابہام ہے۔ مدعی نے "واضح کردیا" سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد دو معتبر گواہ ہیں، جو چوری شدہ مال کی گواہی دیتے ہوں یا چور نے خود ان کے سامنے چوری کا اعتراف کیا تو پھر ان سے تاوان لیا جائے گا اور اگر گواہ غیر معتبر ہوں یا تعداد پوری نہ ہو تو پھر تاوان لازم نہیں ہوتا۔

والدّلیل علی ذلک:

(وتقبل البينة لو أقامها بعد يمين) المدعى عليه...... (عند العامة) وهو الصحيح لقول شريح: اليمين الفاجرة أحق أن ترد من البينة العادلة، ولأن اليمين كالخلف عن البينة، فإذا جاء الأصل انتهى حكم الخلف، كأنه لم يوجد أصلا.(۱)

ترجمہ: اور مدعی کے گواہ قبول کیے جائیں گے، اگرچہ مدعی علیہ کی قسم کے بعد پیش ہوں، عام مذہب یہی ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ قاضی شریح کا قول ہے کہ جھوٹی قسم اس لائق ہے کہ سچی گواہی سے رد ہو اور دوسری بات یہ ہے کہ یمین شہادت کا خلف ہے اور جب اصل موجود ہو جائے تو خلف کا حکم ختم ہو جاتا ہے اور خلف ایسا متصور کیا جاتا ہے کہ گویا تھا ہی نہیں۔

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الدعوی: ۲۹۷/۸

کتاب الصلح

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

معاشی اور معاشرتی ضروریات کے تحت انسانوں کا باہمی میل جول، تعلق اور لین دین ایک فطری امر ہے۔ اور لین دین وتعلق میں فریقین کا کسی بات پر اُلجھ جانا بھی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ الجھنے کی صورت میں کبھی معاملہ جنگ وجدال اور فساد تک پہنچ جاتا ہے، اس لیے شریعت مطہرہ نے فریقین کو ان کا جائز حق دلانے کے لیے قضا اور صلح وغیرہ کا انتظام کیا ہے، تاہم قضا کی بنسبت صلح اس اعتبار سے زیادہ مناسب ہے کہ اس میں ''کچھ لو کچھ دو'' پر عمل کرتے ہوئے فریقین خود ہی اپنی رضامندی سے ایک درمیانی راستہ متعین کر لیتے ہیں جس سے فریقین کسی بڑے مالی خسارے سے بھی بچ جاتے ہیں اور قلبی رنجش اور ناچاقی بھی دور ہو جاتی ہے۔ اس عظیم فائدے کو رب کریم نے ﴿والصلح خیر﴾(۱) سے ذکر فرمایا ہے، جب کہ حضرت عمرؓ بھی فرماتے ہیں:

ردّوا الخصوم حتی یصطلحوا، فإن فصل القضاء یحدث بین القوم الضغائن.(۲)

قضائے قاضی سے پہلے فریقین کو صلح کرنے پر راضی کر لو، اس لیے کہ قاضی کا فیصلہ ان کے درمیان بغض وعداوت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

لغوی تحقیق:

صلح لغت میں فساد، نزاع اور خصومت کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ درستگی، صحت، برابری اور اچھائی وغیرہ جیسے الفاظ سے اُردو میں اس کی تعبیر کی جا سکتی ہے، تاہم لڑائی جھگڑا، جنگ، نفرت اور دشمنی ختم کرنے میں اس کا استعمال زیادہ عام اور مشہور ہے۔(۳)

---

(۱) النساء: ۱۲۸

(۲) تبیین الحقائق کتاب الصلح ۵/۴٦۷۔۴٦۹، إعلام الموقعین، فصل الصلح بین المسلمین: ۱/۱۰۷، ۱۰۸

(۳) القاموس الفقهي، مادة صلح: ص ۲۱۵، الاختیار لتعلیل المختار، کتاب الصلح: ۳/۵، الموسوعة الفقهیة، مادة صلح: ۲۷/۳۲۳

اصطلاحی تعریف:

معاقدة ترتفع بها النزاع، وينقطع بها الخصومة بين الخصوم، ويتوصل بها إلى الموافقة بين المختلفين.(۱)

وہ معاہدہ جس کی وجہ سے فریقین کے مابین لڑائی جھگڑا اور اختلاف ختم ہو جائے اور ان کے مابین موافقت اور ہم آہنگی پیدا کرلے۔

شرح المجلۃ میں اس کی تعبیر یوں کی گئی ہے:

عقد يرفع النزاع بالتراضي.(۲)

اصطلاحات:

۱-المصالح: صلح کرنے والا۔

۲-مصالح عليه: جس کے بدلے صلح کی جائے۔

۳-مصالح عنه: جس کی وجہ سے صلح کی جائے، یعنی وہ چیز جس کے متعلق دعویٰ تھا۔(۳)

صلح سے ملتی جلتی اصطلاحات اور ان کی مختصر تشریح:

فقہائے کرام کے ہاں ضمنی یا التزامی طور پر تحکیم، ابراء اور عفو کے الفاظ صلح کے لیے استعمال ہوتے ہیں، تاہم ان میں باہم چند بنیادی فروق ہیں:

(۱) تحکیم: متنازع فریقین کے درمیان فیصلہ کرنے کا حق تحکیم کہلاتا ہے۔ یہ حق قاضی کو بھی حاصل ہے اور فریقین باہمی طور پر بھی کسی کو حکم بنا سکتے ہیں۔ تحکیم اور صلح میں فرق یہ ہے کہ تحکیم لازمی اور جبری فیصلہ ہوتا ہے جس پر فریقین میں سے ہر ایک کی رضامندی ضروری نہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ صلح میں کوئی ایک فریق یا دونوں اپنا پورا حق یا کوئی حصہ خود اپنی رضامندی سے چھوڑ دیتے ہیں، بخلاف تحکیم کے کہ اس میں حکم کے قول کا اعتبار ہوتا ہے۔

(۲) ابراء: اپنے کسی حق کو ساقط کرنے کا نام ابراء ہے۔ صلح عموماً نزاع کے بعد ہوتی ہے، بخلاف ابراء کے۔

(۳) عفو: عفو ایک عام اصطلاح ہے، جب کہ صلح میں اس قدر عموم نہیں۔ عفو ایک جانب سے بھی ہو سکتا ہے۔

---

(۱) المغني، كتاب الصلح: ۵/۳، الدر المختار، كتاب الصلح: ۱۲/۲۸۸، الموسوعة الفقهية، مادة صلح: ۲۷/۳۲۳

(۲) شرح المجلة، سليم رستم باز، مادة: ۱۵۳۱، ص: ۸۲۷

(۳) شرح المجلة رستم باز: ص ۸۲۸، مادة (۱۵۳۲-۱۵۳٤)

بخلاف صلح کے کہ اس میں جانبین سے بعض حقوق چھوڑ دینے پر اتفاق کیا جاتا ہے۔(۱)

صلح کی مشروعیت:

صلح کی مشروعیت قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس ہر ایک سے ہے۔

قرآن کریم کی آیت ﴿والصلح خیر﴾ اور ﴿إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بین أخویکم﴾ (۲،۳) سے صراحتاً اس کی مشروعیت معلوم ہو رہی ہے۔ دیگر آیات بھی اس کی اباحت پر دال ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے مابین صلح کرانے کو روزہ اور نماز سے افضل قرار دیا ہے۔(۴)

اور یہ بھی فرمایا ہے:

الصلح بین المسلمین جائز إلا صلحاً أحل حراما أو حرم حلالاً.(۵)

مسلمانوں کے درمیان ہونے والی ہر صلح جائز ہے، سوائے اس صلح کے جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کردے۔

فریقین کے اعتبار سے صلح کی قسمیں:

(۱) مسلمانوں اور کافروں کے مابین صلح: کتب فقہ میں کتاب الجہاد، کتاب السیر اور جزیہ وغیرہ کے تحت اس سے بحث ہوتی ہے۔

(۲) عادل اور باغیوں کے مابین صلح: کتاب البغاۃ اور کتاب المرتدین میں اس سے بحث ہوتی ہے۔

(۳) شوہر اور بیوی کے مابین صلح: کتاب النکاح، عشرۃ النساء اور نشوز وغیرہ عنوانات کے تحت اس سے بحث ہوتی ہے۔

(۴) کسی جنایت اور زخم وغیرہ پر صلح: کتاب القصاص، دیات اور جنایات میں اس سے بحث ہوتی ہے۔

(۵) دو فریقوں کا کسی مالی معاملے میں صلح کرنا: مذکورہ باب میں اسی سے بحث ہوگی۔(۶)

---

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة صلح: ۲۷/۳۲۳

(۲) النساء: ۱۲۸

(۳) الحجرات: ۱۰

(٤) موارد الظلمآن، كتاب الأدب، باب الاصلاح بين الناس، باب ۳۲، رقم ۱۹۸۲: ص ٤٨٦

(٥) موارد الظلمآن، كتاب القضاء باب نمبر ٤، باب في الصلح، رقم ۱۱۹۹: ص ۲۹۱

(٦) المغني، كتاب الصلح: ٥/٣۔٨، الموسوعة الفقهية، مادة صلح: ۲۷/۳۲٦

شرعی حکم کے اعتبار سے صلح کی قسمیں:

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ جس صلح کا دارومدار اللہ کی رضا اور خصمین کی رضامندی اور خوشنودی پر ہو اور صلح کرنے والا انصاف پسند (عادل) ہونے کے ساتھ ساتھ خصمین کے حالات وواقعات اور شرعی احکام سے باخبر ہو تو اس قسم کی صلح جائز اور قابلِ تحسین ہے۔

اور جو صلح کسی حلال چیز کے حرام یا حرام چیز کے حلال ہونے کا ذریعہ بن جائے یا مظلوم کو اس کا جائز حق دلا کر اس کی دادرسی اور شنوائی اس میں نہ ہو سکے، بلکہ ظالم کو اپنی جاہ وجلال کی وجہ سے مزید مراعات مل جائیں تو یہ صلح سراسر حرام ناجائز اور مردود ہے۔(۱)

صلح پر مرتب ہونے والے احکام کے سلسلے میں بنیادی نکتہ:

جمہور فقہائے کرام کے ہاں صلح بذاتِ خود کوئی مستقل عقد نہیں جس کے لیے اپنی خاص شرائط واحکام ہوں، بلکہ صلح کی ظاہری صورت اور نوعیت جس معاملے سے زیادہ مشابہ ہو، اس پر وہی احکام مرتب ہوں گے۔لہٰذا:

اگر مال کے بدلے مال کی صلح ہو تو ایسی صلح بیع سمجھی جائے گی۔

اگر مال کے بدلے منفعت ہو تو یہ اجارہ ہوگا۔اگر عین کے بعض حصے کو چھوڑ کر بقیہ حصہ پر صلح ہو تو یہ معاملہ ہبۃ البعض کے حکم میں ہوگا۔

اگر نقد کے بدلے نقد کی صلح ہو تو یہ بیع صرف شمار ہوگی جس میں کمی زیادتی ربوا کے حکم میں ہوگی۔

کسی کے ذمے معین اور کسی خاص وصف سے موصوف مال کے بدلے صلح بیع سلم متصور ہوگی۔

اور کسی قرض کا دعوی کرنے کے بعد اس قرض کا کچھ حصہ لے کر دعوی سے دست بردار ہونا بقیہ رقم کی نسبت سے ابراء شمار ہوگا۔(۲)

صلح کے ارکان:

دوسرے معاملات کی طرح صلح کے بھی دو ارکان ہیں، یعنی ایجاب وقبول۔فقہائے کرام کے ہاں صلح پانچ چیزوں سے منعقد ہو سکتی ہے:

---

(۱) إعلام الموقعين،فصل الصلح إما مردود وإما جائز نافذ: ۱/۱۰۸،۱۰۹

(۲) تبيين الحقائق، كتاب الصلح: ٥/٤٧١،٤٧٢،الموسوعة الفقهية،مادة صلح:۲۷/۳۲۷،روضة الطالبين، كتاب الصلح: ۳/٤٢٧۔٤٣٠

(۱) ایجاب وقبول سے۔

(۲) کتابت سے۔

(۳) اخرس کے لیے اشارے سے۔

(۴) صرف ایجاب سے، مثلاً دائن مدیون سے یہ کہہ دے کہ تمہارے ذمے میرے جو ہزار دینار ہیں، میں ان کے بدلے پانچ سو دینار پر تجھ سے صلح کرنا چاہتا ہوں تو اس صورت میں مدیون کا قبول کرنا ضروری نہیں، اس لیے کہ ابراء اور اسقاط ایک جانب سے بھی ہو سکتا ہے۔(۱)

(۵) تعاطی سے: حنفیہ کے ہاں قرائن کی موجودگی میں کلام کے بغیر تعاطی کے ساتھ بھی صلح ہو سکتی ہے، مثلاً مدعی ایک ہزار کا دعوی کرے اور مدعا علیہ انکار کر لے یا خاموش رہے، لیکن کچھ بولے بغیر کوئی بکری وغیرہ مدعی کو دے دے اور مدعی اس کو قبول کر لے تو یہ صلح ہے جس کے بعد کوئی بھی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا، تاہم اگر ہزار کے بدلے پانچ سو دے دے اور کچھ بولے بغیر مدعی قبض کر لے تو اس کو بعد میں بقیہ رقم کے مطالبے کا حق ہے، اس لیے کہ یہاں پر صلح کا قرینہ قوی نہیں بلکہ ممکن ہے کہ مدعا علیہ اس کا حق تسلیم کرتے ہوئے قسط وار ادائیگی کا خواہاں ہو۔(۲)

صلح کی شرائط:

صلح کی شرطیں بعض صلح کرنے والے سے متعلق ہیں، بعض اس چیز سے متعلق ہیں جس پر صلح کی گئی ہو اور بعض اس حق سے متعلق ہیں جس کی وجہ سے صلح ہوتی ہے۔

مصالح یعنی صلح کرنے والے سے متعلق شرائط:

(۱) صلح کرنے والا عاقل ہو، لہٰذا پاگل اور ناسمجھ بچے کی صلح معتبر نہیں، البتہ اگر نابالغ بچہ فہم وشعور رکھتا ہو تو اس کی وہ صلح معتبر ہوگی جو سراسر فائدے پر مشتمل ہو یا اس میں معمولی قسم کا نقصان ہو۔

(۲) نابالغ بچے کی طرف سے اگر اس کا ولی صلح کرنا چاہے تو وہ صلح بچے کے لیے کسی بڑے نقصان کا سبب نہ ہو۔

(۳) نابالغ کی طرف سے صلح کرنے والا ایسا شخص ہو جس کو اس نابالغ کے مال میں تصرف کا حق حاصل ہو، جیسے: باپ، دادا اور وصی۔

---

(۱) دررالحکام شرح مجلة الأحکام، المادة ۱۵۳۱: ۴/۸-۱۱، بدائع الصنائع، کتاب الصلح، فصل في شرائط الرکن: ۴۶۸/۷

(۲) حوالہ بالا

(۴) صلح کرنے والا امام ابوحنیفہؒ کے ہاں مرتد نہ ہو، تاہم صاحبین کے ہاں مرتد کی صلح بھی نافذ شمار ہوگی۔

☆ صلح کرنے والے کا آزاد یا بالغ ہونا ضروری نہیں۔(۱)

بدلِ صلح سے متعلق شرطیں:

جس چیز پر صلح طے ہوتی ہے اس کی شرائط یہ ہیں:

(۱) شریعت کی نظر میں وہ مال متقوم ہو، لہٰذا مردار، شراب یا خون وغیرہ پر صلح درست نہیں۔

(۲) اس مال پر صلح کرنے والے کی ملکیت ہو، لہٰذا کسی مال پر صلح کرلی اور بعد میں کوئی مستحق نکل آیا تو صلح ختم ہو جائے گی۔

(۳) جس مال پر صلح ہو رہی ہو، اس کی مقدار معلوم ہو۔(۲)

(۴) اگر بدل صلح پر قبضہ کی حاجت ہو تو اس کا متعین ہونا ضروری ہے۔ یہ تعیین اس شے سے متعلق عرف کے اعتبار سے ہوگی جس شے میں حاضر کیے بغیر تعیین نہ ہو سکے، اس کو حاضر کرنا ضروری ہوگا جو اشیا قبضہ کے محتاج نہ ہوں، جیسے: مکان یا زمین وغیرہ تو ان میں تعیین ضروری نہیں۔(۳)

حق (مصالح عنہ) سے متعلق شرطیں:

جس حق کے بدلے صلح کی جاتی ہے اس کی شرائط یہ ہیں:

(۱) جس حق کے بدلے صلح ہو رہی ہو، وہ حق العبد یعنی انسانی حق ہو، حقوق اللہ میں صلح کی گنجائش نہیں لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کو زنا کرتے، شراب پیتے یا چوری کرتے ہوئے دیکھ لے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس سے مال وغیرہ لے کر اس بات پر صلح کرلے کہ میں تمہیں قاضی کے سامنے پیش نہیں کروں گا۔

(۲) مذکورہ حق صلح کرنے والے کا ذاتی ہو، لہٰذا اگر کوئی مطلقہ عورت اپنے شوہر پر یہ دعویٰ کرے کہ آپ کا یہ بچہ میرے بطن سے ہے، پھر وہ اس دعویٰ سے دست بردار ہو کر صلح کرے تو یہ صلح درست نہیں، اس لیے کہ نسب کا حق تو بچے کا ہے عورت کا نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ نسب ان حقوق میں سے نہیں جن کو ساقط کر کے ان کے بدلے عوض لیا جا سکے۔(۴)

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الصلح، فصل في شروط الركن: ۷/۴۶۸-۴۷۲، الدرالمختار، كتاب الصلح: ۱۲/۲۸۸

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الصلح، فصل في الشروط التي ترجع إلى المصالح عليه: ۷/۴۷۲-۴۸۲

(۳) الدرالمختار مع رد المحتار، كتاب الصلح: ۱۲/۲۹۰

(۴) بدائع الصنائع، كتاب الصلح، فصل في مايرجع إلى المصالح عنه: ۷/۴۸۳-۴۸۵

(۳)وہ حق ایسا ہو جس کا عوض لیا جاسکتا ہو، اگر چہ وہ غیر مال ہو، مثلاً: قصاص اور تعزیر کے بدلے صلح کرنا جائز ہے جو حقوق قابلِ معاوضہ نہیں، جیسے: شفعہ یا حدِ قذف وغیرہ تو ان کے بدلے صلح معتبر نہیں۔(۱)

☆جس حق کے بدلے صلح ہو رہی ہو، حنفیہ وحنابلہ کے ہاں اس کا معلوم ومتعین ہونا ضروری نہیں، اس لیے کہ صلح کرتے وقت اس حق کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اس سے چشم پوشی کر کے اس کے بدلے کوئی اور چیز لی جاتی ہے، لہٰذا یہ مفضی الی المنازعۃ نہیں، بخلاف صلح میں دینے والی چیز کے کہ اس کا معلوم القدر اور متعین ہونا ضروری ہے۔(۲)

صلح کی قسمیں:

صلح کبھی تو مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان ہوتی ہے اور کبھی مدعی اور کسی اجنبی کے مابین، یعنی مدعا علیہ کی طرف سے کوئی اور مدعی سے صلح کرے۔ اول صورت کی تین قسمیں ہیں۔ اقرار کے ساتھ صلح، انکار کے ساتھ صلح اور سکوت کے ساتھ صلح۔

(۱)مدعا علیہ کے اقرار کے ساتھ صلح:

یعنی مدعا علیہ کو مدعی کے دعوی کا اقرار ہو اور سب کچھ مانتا ہو۔ اس صورت میں صلح تمام فقہا کے ہاں جائز ہے۔ پھر یہ صلح کسی عین اور خاص شے کے بدلے بھی ہو سکتی ہے اور دین (قرض) کے بدلے بھی ہو سکتی ہے۔

(۱)عین کے بدلے صلح:

اگر صلح کسی عین کے بدلے ہو تو اس کی دو قسمیں ہیں۔ صلح الابراء اور صلح المعاوضہ۔

(الف) صلح الابراء یا صلح الحطیطۃ:

مدعی کسی خاص زمین یا گھر وغیرہ پر دعوی کرے اور مدعا علیہ اسی گھر کے کسی خاص حصے کے بدلے اس سے صلح کرلے۔ مالکیہ اور شافعیہ کے ہاں یہ صلح جائز ہے اور یہ اس عین کے بقیہ حصے کا ہبہ متصور ہوگا۔ حنابلہ کے ہاں اگر مدعی نے اپنی زبان سے ہبہ کا لفظ استعمال کیا تو ٹھیک ہے، ورنہ نہیں، جبکہ حنفیہ کے ظاہر الروایۃ کے مطابق بھی یہ صلح جائز ہے اور مدعی کو بعد میں عین کے بقیہ حصے پر دعوی کرنے کا حق نہیں، بلکہ صلح کرتے وقت مدعی کی طرف سے یہ دعوے کے بعض

(۱) الدر المختار، کتاب الصلح: ۲۹۲،۲۹۱/۱۲، بدائع الصنائع، کتاب الصلح، فصل في مایرجع إلی المصالح عنه: ۴۸۵۔۴۸۳/۷، خزانة الفقه، کتاب الصلح مالا یجوز الصلح فیه: ص ۱۹۲

(۲) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلح: ۲۹۱/۱۲، المغني، کتاب الصلح: ۹/۵

حصے سے دست بردار ہونا متصور ہوگا۔

مذکورہ صلح میں یہ بھی جائز ہے کہ مدعا علیہ اقرار کرلے کہ واقعی فلاح گھر تیرا ہے، مگر بطور صلح تو اس گھر میں، مثلاً ایک سال تک رہو۔ حنفیہ کے ہاں یہ اجارہ متصور ہوگا جب کہ شافعیہ کے ہاں یہ اعارہ، یعنی عاریت ہے۔ حنابلہ کے ہاں یہ صلح جائز نہیں۔

(ب) صلح المعاوضہ:

کسی عین کے اقرار کے وقت صلح کی دوسری صورت یہ ہے کہ مدعا علیہ مخصوص عین کے بدلے کوئی اور عین صلح میں دے دے۔ یہ صورت تمام فقہا کے ہاں جائز ہے، تاہم مبادلۃ المال بالمال ہونے کی وجہ سے اس میں بیع کی تمام شرائط لاگو ہوں گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معین عین کے بدلے کسی اور عین کی منفعت پر صلح کرلیں، مثلاً گھر کے بدلے کسی اور گھر کی رہائش یا سواری وغیرہ پر صلح کرے۔ یہ صورت بھی بالاتفاق جائز ہے۔(۱)

(۲) دین کے بدلے صلح:

مثلاً ایک شخص دوسرے شخص پر دین کا دعوی کرے اور مدعا علیہ اس کا اقرار کرکے اسی دین کے کسی حصے یا مال کے بدلے اس سے صلح کرے۔ یہ صورت بھی فقہا کے ہاں جائز ہے۔ یہاں بھی دو صورتیں بن سکتی ہیں: صلح الابراء والاسقاط اور صلح المعاوضہ۔

(الف) صلح الاسقاط والابراء:

جس میں مذکورہ قرض کے کسی خاص حصے پر صلح ہوجائے۔ حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کے ہاں ایسی صلح جائز ہے اور یہ ایسا ہے گویا مدعی نے اپنا بعض حق لے کر اپنے بقیہ حق کو ساقط کردیا۔

یاد رہے کہ ایک ہزار قرض روپیہ کے بدلے پانچ سو نقد روپیوں کی صلح جمہور کے ہاں ناجائز اور سود ہے۔ اگرچہ علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیمؒ اور بعض حنابلہ کے ہاں جائز ہے۔

---

(۱) ملخص از الموسوعۃ الفقہیۃ، مادۃ صلح: ۳۲۷/۲۷۔ ۳۳۰، شرح المجلۃ، مادۃ (۱۵۵۱): ۵۵۸/۴۔۵۶۱، تحفۃ الفقہاء، کتاب الصلح: ۲۴۹/۳، ۲۵۰، مجمع الأنہر، کتاب الصلح: ۳۰۸/۲، کفایۃ الأخیار في حل غایۃ الاختصار، کتاب الصلح: ۱۶۷/۱

(ب) صلح المعاوضہ:

مثلاً ایک شخص دوسرے پر دین کا دعوی کرے اور وہ اس کا اقرار کر کے اس دین کے بدلے کوئی اور چیز دے کر صلح کرلے۔ اس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں جن پر بیع کے احکام لاگو ہوں گے۔

(۱) سامان کے بدلے نقد پیسے دے کر صلح کرے۔

(۲) دینار کے بدلے درہم یا درہم کے بدلے دینار دے دے۔ صلح کی اس صورت پر بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے۔

(۳) نقد کے بدلے غلہ وغیرہ دے دے۔

(۴) نقد کے بدلے کسی منفعت (سواری اور رہائش وغیرہ) پر صلح کرے۔ (۱)

(۲) انکار کے ساتھ صلح:

یعنی مدعی جو دعوی کر رہا ہو، مدعا علیہ کو اس سے انکار ہو، تاہم قسم اور مقدمہ کی طوالت سے بچنے کے لیے کچھ دے کر صلح کر لیتا ہے۔ صلح کی یہ صورت حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے ہاں جائز ہے، شوافع کے نزدیک جائز نہیں۔

اگر مدعی کو علم ہو کہ میرا فلاں کے ذمے کوئی حق نہیں، لیکن وہ شریف آدمی ہے، عدالتی چارہ جوئی سے بچنے کے لیے کچھ دے کر صلح کرلے گا یا مدعی علیہ کو علم ہو کہ مدعی کا دعوی تو درست ہے، لیکن انکار کر لو اور کچھ دے دلا کر بقیہ مال ہڑپ کر لو تو ان صورتوں میں صلح باطل ہے اور عنداللہ دونوں سخت گنہگار اور مجرم ہیں۔ (۲)

سکوت کے ساتھ صلح:

یعنی مدعا علیہ نہ تو مدعی کے حق کا اقرار کر رہا ہو اور نہ انکار، بلکہ کچھ دے کر اس کے ساتھ صلح کرتا ہو۔ فقہائے کرام نے اس کو بھی صلح عن الانکار کا حکم دیا ہے۔ جمہور کے ہاں ایسی صلح جائز ہے، جبکہ شوافع کے ہاں جائز نہیں۔ (۳)

---

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة صلح: ۲۷/ ۳۳۴، ۳۳۵، تحفة الفقهاء، كتاب الصلح: ۳/ ۲۵۱-۲۵۳، بدائع الصنائع، كتاب الصلح، فصل في الشروط التي ترجع إلى المصالح عليه: ۷/ ۴۴۷، مجمع الأنهر، باب الصلح في الدين: ۲/ ۳۱۵

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الصلح: ۱۲/ ۳۰۱، المغني مع شرح الكبير: ۵/ ۱۰-۱۳، تبيين الحقائق، كتاب الصلح: ۵/ ۴۷۴

(۳) تبيين الحقائق، كتاب الصلح: ۵/ ۴۷۴

مدعی اور اجنبی کے مابین صلح:

آیات کریمہ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ (۱) اور ﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ (۲) کے تناظر میں فقہائے کرام نے یہ جائز قرار دیا ہے کہ کوئی تیسرا شخص اُٹھ کر مدعا علیہ کی جانب سے مدعی سے صلح کرے۔

فقہائے کرام کے ہاں یہ صلح دو قسم پر ہے:

(۱) اگر مدعا علیہ نے اجنبی کو بذاتِ خود اپنی طرف سے صلح کی اجازت دی ہو تو اس صورت میں اجنبی کی حیثیت مدعی علیہ کی طرف سے وکیل کی ہوگی اور صلح سے متعلق ذمہ داریاں خود مدعا علیہ سے متعلق ہوں گی۔

(۲) اگر مدعا علیہ نے اجازت نہ دی ہو تو اس کی پانچ صورتیں ہیں: پہلی چار صورتوں میں صلح جائز ہوگی اور آخری صورت میں مدعا علیہ کی اجازت پر موقوف ہوگی۔ وہ پانچ صورتیں یہ ہیں:

(۱) صلح کی ذمہ داری اور تاوان اپنے ذمہ لے لے۔

(۲) صلح کا مال اپنی طرف منسوب کرلے۔

(۳) صلح کا مال معین کر کے پیش کرے، اگرچہ اپنی طرف منسوب نہ کرے۔

(۴) صلح کا مال مدعی کے حوالہ کردے، اگرچہ اپنی طرف ضمان وغیرہ کی نسبت نہ کرے۔

(۵) مذکورہ صورتوں کے علاوہ کوئی صورت اپنا لے، مثلاً: یہ کہے کہ فلاں کی طرف سے ہزار درہم یا فلاں گھر پر تم سے صلح کرتا ہوں۔ اس صورت میں چونکہ اجنبی کی طرف سے ذمہ داری لینے کا کوئی قرینہ نہیں، اس لیے یہ مدعا علیہ کی طرف راجع ہوگی، لہٰذا اس کی اجازت کے بغیر یہ صلح نافذ نہ ہوگی۔ (۳)

صلح کے احکام:

(۱) صلح سے متعلق بعض احکام صلح کی تمام صورتوں سے متعلق ہیں اور وہ یہ ہیں کہ صلح کی وجہ سے فریقین کے درمیان نزاع ختم ہوجاتا ہے، اب اگر فریقین میں سے کوئی اس معاملہ سے متعلق دعویٰ کرے تو وہ قابلِ سماعت نہ ہوگا۔

(۲) کچھ احکام صلح کی بعض صورتوں سے متعلق ہیں، بعض سے نہیں۔ ان میں سے ایک حقِ شفعہ کا حاصل ہونا ہے۔ اگر

---

(۱) الحجرات: ۱۰

(۲) النساء: ۱۲۸

(۳) شرح المجلہ للأتاسي، مادة (۱۵۴٤): ٤/٥٤٣، بدائع الصنائع، فصل في ما يرجع إلى المصالح عنه: ۷/٤۹۰

مکان یا زمین پر صلح ہوئی ہے اور بدلِ صلح مکان یا زمین کے علاوہ اور کوئی چیز مقرر ہوئی ہے۔ پھر صلح اقرار پر مبنی ہو تو صاحبِ حق کو حقِ شفعہ حاصل ہوگا اور بدلِ صلح بھی مکان یا زمین ہو تو اقرار کی صورت میں دونوں مکانوں یا زمینوں پر شفعہ کا حق ہوگا۔ ہاں اگر صلح انکار پر مبنی ہو تو حقِ شفعہ صرف اس مکان سے متعلق ہوگا جو بطور بدلِ صلح کے ملے پایا ہو۔

(۳) اگر صلح مدعا علیہ کے اقرار پر مبنی ہو تو بمنزلہ بیع کے ہوگی، لہٰذا فریقین میں سے ہر ایک کو عیب کی بناء پر سامان کی واپسی کا حق حاصل ہوگا اور اگر صلح مدعا علیہ کے انکار کے باوجود ہوئی ہے تو چونکہ یہ صرف مدعی کے حق میں بیع کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لیے خیارِ عیب کا حق بھی صرف اسی کو حاصل ہوگا۔

(۴) مدعی اور مدعا علیہ کو صلح کے بدلے ملنے والی اشیا میں خیارِ رؤیت کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ انہوں نے پہلے اس کا مشاہدہ نہ کیا ہو۔

(۵) اگر بدلِ صلح منقولہ شے متعین ہوئی ہے تو جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے، اس کو فروخت کرنا، ہبہ کرنا وغیرہ جائز نہیں۔ البتہ غیر منقولہ اشیا (زمین، گھر وغیرہ) میں قبضہ سے پہلے بھی تصرف کر سکتا ہے۔

(۶) اگر بدلِ صلح کے طور پر اصل حق کا عوض دینا طے پایا ہو اور صلح وکیل کی وساطت سے ہوئی ہو تو مدعا علیہ کا وکیل خود اس عوض کا ذمہ دار ہوگا اور اگر بدلِ صلح میں اصل حق ہی کا ایک حصہ ادا کرنا طے پایا ہے تو اگر وکیل نے اس کی ذمہ داری قبول کی ہے، تب تو وہ ہی ذمہ دار ہوگا اور اگر قبول نہیں کی ہے تو خود مدعا علیہ پر اس کو ادا کرنے کی ذمہ داری ہوگی۔(۱)

جن صورتوں میں صلح باطل ہو جاتی ہے:

درج ذیل صورتوں میں صلح باطل ہو جاتی ہے:

(۱) اقالہ، یعنی فریقین کا معاملہ صلح کو ختم کر دینا۔ البتہ اگر قاتل اور مقتول کے اولیا میں صلح طے پائی گئی تھی کہ قاتل ایک مخصوص معاوضہ ادا کرے گا اور مقتول کے ورثا قصاص سے دست بردار ہو جائیں گے تو یہ صلح ختم نہیں کی جا سکتی، اس لیے کہ حقِ قصاص کو ایک مرتبہ ساقط کرنے کے بعد دوبارہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اگر ایک فریق مرتد ہو کر دار الحرب چلا جائے یا ارتداد کی حالت میں مر جائے تو بھی صلح ختم ہو جائے گی۔

(۳) خیارِ عیب یا خیارِ رؤیت کی وجہ سے صلح میں ملنے والا سامان واپس کر دے۔

(۱) بدائع الصنائع، فصل في حكم الصلح: ۷/۴۹۲-۴۹۴

(۴) بدل صلح یا مصالح عنہ، یعنی جس چیز کے عوض صلح ہوئی ہو، ان میں کسی کا استحقاق نکل آئے، یعنی کوئی اس میں اپنی ملکیت کو گواہی کے ساتھ ثابت کردے۔

(۵) اگر کسی چیز کی عین کو بدل صلح نہ بنایا گیا ہو، بلکہ کسی چیز کی منفعت کو بدل صلح بنادیا گیا ہو اور فریقین میں سے کوئی ایک اس مدتِ انتفاع کے درمیان مرجائے۔

(۶) مدتِ انتفاع کے دوران وہ چیز منتفع بہ قدرتی طور پر ضائع ہوجائے۔(۱)

بطلانِ صلح کے بعد کے احکام:

بطلانِ صلح کے بعد دیکھا جائے گا اگر:

(الف) صلح مدعا علیہ کے اقرار پر مبنی تھی تو مدعی کو حق ہوگا کہ مدعا علیہ سے خاص اسی شے کا مطالبہ کرے جس پر دعویٰ تھا۔

(ب) اگر مدعا علیہ انکاری تھا تو پھر مدعی کا دعویٰ حسبِ سابق برقرار رہے گا۔

(ج) البتہ اگر صلح قصاص پر ہوئی تھی تو بطلانِ صلح کے بعد مدعی صرف دیت کا مطالبہ کرے گا، قصاص کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔(۲)

❁❁❁❁❁

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلح، فصل فی بیان ما یبطل به الصلح بعد وجوده: ۴۹۴/۷-۴۹۶، الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلح: ۳۰۰/۱۲

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الصلح، فصل فی حکم الصلح إذا بطل بعد صحته أو لم یصح أصلا: ۴۹۶/۷

کتاب التحکیم

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

اسلامی قانونِ قضا کے ہوتے ہوئے بھی بسا اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ متخاصمین کسی قاضی یا عدالت کی بجائے اپنا فیصلہ کسی بااثر شخصیت اور ثالث کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں، اس لیے کہ کبھی تو عدالت تک عام رسائی ممکن نہیں ہوتی، کبھی عدالتی چارہ جوئی میں وقت اور پیسے کے ضیاع کا خطرہ ہوتا ہے اور کبھی عدالت اور وکالت میں رشوت وسفارش کا اندیشہ ہوتا ہے ان وجوہات کی بنا پر متخاصمین علاقائی اقدار وروایات کو سامنے رکھ کر کسی دانش مند اور زیرک شخص سے اپنا فیصلہ کروالیتے ہیں۔ عام طور پر یہ زیادہ آسانی سے نافذ العمل اور سستا طریقہ ہے۔ اس کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ عام سرکاری عدالتوں کے برعکس اس میں فریقین اپنا مؤقف بلا جھجک بالکل واضح انداز میں بیان کرلیتے ہیں جس کے نتیجے میں ہونے والا فیصلہ یقیناً اطمینان بخش ہوتا ہے۔

لغوی اور اصطلاحی تحقیق:

تحکیم کا لغوی معنی ہے: محاکمہ، مرافعہ اور مخاصمہ، یعنی بات کو قاضی کی عدالت تک لے جانا اور فیصلہ طلب کرنا۔ فیصلہ کرنے اور کسی ثالث کو فیصلہ کرنے کا اختیار دینے کو بھی تحکیم کہتے ہیں۔(۱)

اصطلاحِ شرع میں تحکیم کا معنی ہے:

"تولیة الخصمین حاکماً یحکم بینهما".(۲)

یعنی فریقین کا باہمی نزاع ختم کرنے کی غرض سے کسی شخص یا جماعت کو ثالث بنانا تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرلے۔

باب التحکیم کی اصطلاحات:

(۱) تحکیم.........: خصمین (فریقین) کا اپنی رضا سے کسی کو فیصلے کا حق دینا۔

(۲) حَکَم.........: فیصلہ کرنے والا۔ اس کو ثالث یا مُحَکَّم بھی کہتے ہیں۔

(۱) البحر الرائق، باب التحکیم، کتاب الحوالة: ۷/۴۱، لسان العرب، مادة حکم: ۳/۲۷۱

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب القضاء، باب التحکیم: ۸/۱۲۵

(۳) محکّم ....: فریقین، یعنی جن دو جماعتوں کے درمیان نزاع ہو۔

(۴) محکوم بہ ....: جس چیز پر فیصلہ ہو جائے۔(۱)

تحکیم سے ملتی جلتی اصطلاحات:

(۱) القضاء: قضا کا معنی بھی فیصلہ کرنا ہے تاہم قضا اور تحکیم میں فقہائے کرام کے ہاں سترہ فروق ہیں، مثلاً قاضی کو ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے اور حکم کو نہیں، قضا حدود و قصاص اور جملہ امور شرعیہ میں ہوتی ہے اور تحکیم صرف حقوق العباد میں، قاضی کا فیصلہ حتمی اور لازمی ہوتا ہے جب کہ حَکم کے فیصلے کو قاضی فسخ بھی کر سکتا ہے۔(۲)

(۲) الاصلاح: باہمی رنجش اور چپقلش دور کرنے کے لیے صلح کا راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے، تاہم تحکیم میں فیصلہ سونپنے کا اختیار دونوں فریق مل کر کسی ثالث کو دیتے ہیں، جب کہ اصلاح میں یہ ضروری نہیں۔ کوئی بھی شخص فریقین میں صلح کرا سکتا ہے۔(۳)

تحکیم کی مشروعیت:

تحکیم کی مشروعیت قرآن مجید کی درج ذیل آیات سے ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا﴾(٤)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾(٥)

خود آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذؓ کو غزوہ بنو قریظہ کے موقع پر حَکم بنایا تھا۔(٦)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ابو شریح ہانی بن یزیدؓ کی تحکیم اور فیصلوں سے خوش ہو کر فرمایا:

"ماأحسن هذا". (٧)

---

(١) درر الحكام شرح مجلة الأحكام، مادة (١٧٩٠): ٤/٥٧٨

(٢) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب القضاء، باب التحكيم: ٨/١٢٧، البحر الرائق، كتاب الحوالة، باب التحكيم: ٧/٤٦-٤٨

(٣) الموسوعة الفقهية، مادة تحكيم: ١٠/٢٣٤

(٤) النساء: ٣٥ (٥) النساء: ٦٥

(٦) الصحيح للبخاري، كتاب المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب: ٢/٥٩١

(٧) السنن الكبرى للبيهقي، كتاب آداب القاضي، باب ما جاء في التحكيم، رقم (٢١٠٩٧): ١٥/١٥٥

اسی طرح حضرت عمرؓ اور ابی بن کعبؓ کے درمیان زید بن ثابتؓ نے اور حضرت عثمانؓ اور طلحہؓ کے درمیان جبیر بن مطعمؓ نے حَکَم بن کر فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ واقعات کافی صحابہؓ سے ثابت ہیں۔ گویا صحابہؓ سے لے کر آج تک اس کی مشروعیت پر اجماع ہے۔(۱)

تحکیم کا حکم:

حنفیہ کے ہاں تحکیم جائز تو ہے، لیکن قضا کی نسبت اس کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ تحکیم مجتہدات، یعنی مختلف فیہا مسائل میں بھی درست ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خصمین اپنی سہولت کے لیے کسی جاہل کو خصم بنا کر مذہب اور تقلید کو مذاق نہ بنائیں۔ اس کے علاوہ تحکیم کو عام کرنے سے قاضی اور اسلامی عدالت کی رونق اور وقار ماند پڑ جائے گا۔ انتظامی امور پر حکومت کی دسترس سست پڑ جائے گی اور ہر علاقے کے شریف و معزز لوگ بذاتِ خود حکم بننے کی کوشش کریں گے، اگر چہ وہ تحکیم کے اصول و رموز اور شرعی قوانین سے جاہل ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا نے تحکیم کی صحت کے لیے سخت شرائط رکھے ہیں اور حَکَم کے فیصلے کو قاضی کے لیے قابل الفسخ بھی قرار دیا ہے۔(۲)

ان مفاسد کو مدنظر رکھ کر ائمہ ثلاثہ نے بھی تحکیم کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی ہے، اگر چہ فی الجملہ وہ بھی جواز کے قائل ہیں۔(۳)

تحکیم کا رکن:

تحکیم کا رکن ایجاب وقبول ہے، یعنی خصمین ثالث سے یہ کہیں کہ ہم نے آپ کو حَکَم بنایا ہے یا آپ ہمارے حَکَم ہیں یا ہم نے فیصلہ کرنے کا اختیار آپ کو سونپ دیا ہے اور ثالث اس کو قبول کرتے ہوئے کہے کہ ''ہاں مجھے منظور ہے'' یا کسی اور لفظ سے رضامندی اور قبول کا اظہار کرے۔(۴)

تحکیم کے لیے شرائط:

تحکیم کی صحت کے لیے بعض شرائط تو فریقین سے متعلق ہیں، بعض بذاتِ خود حَکَم (محکَّم) کے لیے ہیں اور

(۱) فتح القدير، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم: ٤٠٦/٦، المبسوط للسرخسي، باب الحكمين: ٦٢/٢١، السنن الكبرى للبيهقي، كتاب آداب القاضي، باب ماجاء في التحكيم، رقم(٢١٠٩٧):١٠٥/١٠

(٢) شرح الوقايه، باب التحكيم:١٣٦/٣، ١٣٧، الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب القضا، باب التحكيم:١٢٩/٨

(٣) الموسوعة الفقهية، مادة تحكيم: ٢٣٦/١٠، مغني المحتاج، كتاب القضاء: ٣٧٩/٤

(٤) درر الحكام شرح مجلة الأحكام، مادة (١٧٩٠):٥٧٨/٤، الدرالمختار، كتاب القضاء، باب التحكيم:١٢٥/٨

بعض محکوم بہ، یعنی فیصلے کے لیے ہیں۔

فریقین کے لیے شرائط اور بنیادی احکام:

(۱) فریقین صاحبِ عقل وتمیز ہوں، اگرچہ غلام یا کافر ہی کیوں نہ ہوں۔(۱)

(۲) فریقین میں سے ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے حَکَم کو فیصلہ کرنے کا حق دے۔(۲)

وکیل مؤکل کی اجازت کے بغیر، بچہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر اور مضارب رب المال کی اجازت کے بغیر کسی کو حَکَم نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح ولی، وصی اور محجور مفلس شخص کی تحکیم بھی درست نہیں ہوگی، اگرچہ اس سے بچے یا قرض خواہوں کا نقصان ہو۔(۳)

حَکَم کے لیے شرائط اور چند احکام:

(۱) حَکَم قاضی بننے کا اہل ہو، یعنی اہلِ شہادت میں سے ہو۔ یہ اہلیت تحکیم کے وقت سے لے کر فیصلہ کرنے تک ضروری ہے، اگر ان دو اوقات میں سے کسی بھی ایک میں اہلیت فوت ہو جائے تو تحکیم درست نہیں۔(۴)

(۲) اگر فریقین دونوں مسلمان ہوں یا ان میں سے ایک مسلم ہو تو حَکَم کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ذمیوں کے مابین فیصلہ کرنے کے لیے ذمی کا حَکَم بننا ضروری ہے۔(۵)

(۳) حَکَم معلوم ومتعین ہو، لہٰذا اگر یہ کہے کہ مسجد کے دروازے سے جو پہلے داخل ہو جائے وہی حَکَم ہوگا تو یہ بالاتفاق ناجائز ہے، البتہ اگر داخل ہونے کے بعد اس کو دوبارہ حَکَم بنالیں تو درست ہے۔(۶)

☆...... حَکَم کے لیے مرد ہونا شرط نہیں، عورت بھی حَکَم بن سکتی ہے۔(۷)

---

(۱) البحر الرائق، کتاب الحوالة، باب التحکیم:۷/۴۱، الدر المختار، کتاب القاضي، باب التحکیم:۸/۱۲۶

(۲) البحر الرائق، کتاب الحوالة، باب التحکیم:۷/۴۶

(۳) رد المحتار علی الدر المختار، کتاب القضاء، باب التحکیم:۸/۱۲۹، مغني المحتاج، کتاب القضاء: ۴/۳۷۹، الموسوعة الفقهية، مادة تحکیم: ۱۰/۲۳۷

(۴) الدر المختار، کتاب القضاء، باب التحکیم:۸/۱۲۶

(۵) الفتاوی الهندیة، کتاب القضاء، الباب الرابع والعشرون في التحکیم:۳/۳۹۷

(۶) الدر المختار، کتاب القضاء، باب التحکیم:۸/۱۲۷، الموسوعة الفقهية، مادة تحکیم: ۱۰/۲۳۷

(۷) الفتاوی الهندیة، کتاب القضاء، الباب الرابع والعشرون في التحکیم: ۳/۳۹۸

☆...... اگر ایک سے زیادہ لوگوں کو حَکم بنایا گیا تو فیصلہ اس وقت نافذ ہوگا جب سب اس پر متفق ہوں۔(۱)

☆...... حَکم خصمین کی رضامندی کے بغیر کسی اور کو حَکم نہیں بنا سکتا۔(۲)

☆...... اگر مختلف فیہ مسائل میں حَکم نے اپنے مذہب کے خلاف کسی قول پر فیصلہ کیا تو اس کا یہ فیصلہ نافذ شمار نہیں ہوگا(۳)

☆...... حَکم کے لیے فریقین میں سے کسی کو محبوس رکھنا جائز نہیں، البتہ صدر الشریعہ سے اس کا جواز ثابت ہے۔(۴)

☆...... حَکم فیصلہ کرنے سے قبل کسی کی دعوت نہ کھائے اور نہ کسی سے تحفہ قبول کرے۔(۵)

☆...... اگر خصمین یہ کہیں کہ ہمارا فیصلہ آج ہی کردو یا اسی مجلس میں کردو یا فلاں مفتی سے پوچھ کر اس کی روشنی میں فیصلہ کردو تو یہ شرائط درست ہیں اور حَکم کے لیے ان شرائط پر عمل کرنا جائز ہے۔(۶)

تحکیم کی حیثیت:

فیصلہ کرنے سے پہلے تحکیم کی حیثیت محض جواز کی ہے یعنی فریقین میں سے کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے حَکم کو معزول کرسکتا ہے اور اس کا فیصلہ ماننے سے انکار کرسکتا ہے، البتہ فیصلہ کرنے کے بعد اس پر عمل کرنا واجب اور ضروری ہے۔ فیصلہ کرنے کے بعد قاضی کو اس فیصلے پر نظرِ ثانی کرکے اس کی تائید و تردید دونوں کا حق حاصل ہوتا ہے، البتہ حَکم کو ایک مرتبہ فیصلہ کرنے کے بعد اپنے فیصلے سے رجوع کرکے دوسرا فیصلہ سنانا جائز نہیں۔(۷)

محکوم بہ (محلِ تحکیم یا فیصلے) سے متعلق شرائط اور بنیادی احکام:

(۱) حقوق اللہ میں تحکیم درست نہیں، صرف حقوق العباد میں درست ہے، مثلاً: اموال، طلاق، عتاق، نکاح اور چوری کے تاوان وغیرہ میں تحکیم درست ہے۔ حدِ زنا، حدِ قذف، حدِ سرقہ اور لعان میں تحکیم درست نہیں۔(۸)

---

(۱) الدرالمختار، کتاب القضاء، باب التحکیم: ۱۲۹/۸

(۲) الدرالمختار، کتاب القضاء، باب التحکیم: ۱۳۰/۸

(۳) البحرالرائق، کتاب الحوالۃ، باب التحکیم: ۴۵/۷

(۴) الموسوعۃ الفقہیۃ، مادۃ تحکیم: ۲۴۰/۱۰

(۵) البحرالرائق، کتاب الحوالۃ، باب التحکیم: ۴۷/۷

(۶) البحرالرائق، کتاب الحوالۃ، باب التحکیم: ۴۶/۷

(۷) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب القضاء، باب التحکیم: ۱۲۷/۸، البحرالرائق، حوالہ بالا: ۴۲/۷۔۴۵

(۸) الفتاوی الہندیۃ، کتاب القضاء، الباب الرابع والعشرون في التحکیم: ۳۹۷/۳

قصاص میں تحکیم سے متعلق احناف کے اقوال مختلف ہیں، تاہم صحیح قول یہ ہے کہ قصاص میں تحکیم درست نہیں۔(۱)

اسی طرح مجتہد فیہ مسائل میں بھی تحکیم درست ہے، البتہ عوام کی لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے فقہا نے اس پر فتویٰ دینے سے منع فرمایا ہے۔(۲)

(۲) تحکیم کا فیصلہ لازمی ہوتا ہے، متعدی نہیں، لہٰذا اگر حَکَم قاتل اور مقتول کے ورثا میں دیت پر فیصلہ کر دے تو عاقلہ کو اس سے انکار کا حق حاصل ہے، البتہ شرعی لحاظ سے جو دیات اور ارش قاتل اور جنایت کرنے والا خود برداشت کرتا ہے، جیسے: قتل عمد کی دیت، اقرار کے ساتھ ثابت ہونے والے قتل اور جنایت کی دیت، اعضا کی وہ دیت جو اتنی کمی کی وجہ سے عاقلہ کے ذمے نہ ہو ان سب میں تحکیم درست ہے۔(۳)

☆ ...... فیصلہ کرنے کے لیے حَکَم، گواہی، اقرار، قسم اور نکول یعنی قسم سے انکار ہر ایک کو بنیاد بنا سکتا ہے۔

☆ ...... اگر فریقین میں سے ایک فریق حَکَم کے اصول وفروع یا زوجہ پر مشتمل ہو تو ان کے حق میں فیصلہ کرنا درست نہیں، البتہ ان کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے۔(۴)

جن صورتوں میں حَکَم فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا:

(۱) فریقین میں سے کوئی ایک یا دونوں فیصلہ کرنے سے پہلے اس کو معزول کر دیں۔

(۲) فیصلہ کرنے کا اختیار کسی مجلس یا وقت کے ساتھ مقید ہو اور وہ مجلس یا وقت ختم ہو جائے۔

(۳) حَکَم شہادت کے قابل نہ رہے، مثلاً مرتد ہو جائے یا اندھا ہو جائے وغیرہ۔

(۴) حَکَم ایک مرتبہ فیصلہ سنا دے۔(۵)

❁❁❁❁❁

---

(۱) البحرالرائق، کتاب الحوالة، باب التحکیم:۷/ ٤٤

(۲) البحرالرائق، کتاب الحوالة، باب التحکیم:۷/ ٤٤۔٤٥

(۳) الدرالمختارمع ردالمحتار، کتاب القضاء، باب التحکیم:۸/ ۱۲۷، ۱۲۸، البحرالرائق، کتاب الحوالة، باب التحکیم: ۷/ ٤٤

(٤) الدرالمختارمع ردالمحتار، کتاب القضاء، باب التحکیم:۸/ ۱۲۹

(٥) البحرالرائق، کتاب الحوالة، باب التحکیم: ۷/ ٤٥۔٤٨

مسائل کتاب الصلح والتحکیم

(صلح اور تحکیم سے متعلقہ مسائل کا بیان)

صلح اور فیصلہ کے دوران بعض قبائلی رواجوں کا تفصیلی جائزہ

سوال نمبر(171):

بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ جب فریقین کے درمیان کسی مسئلہ میں صلح کی جاتی ہو تو ایک فریق بکرا ذبح کرکے لوگوں کو کھلاتا ہے۔ یہ رواج بھی ہے کہ قاتل کے رشتہ دار مقتول کی گلی میں بکری ذبح کرتے ہیں اور لوگوں کو کھلاتے ہیں اور یہ ان کی طرف سے "ندامت" کی علامت ہوتی ہے۔ نیز ایکسیڈنٹ میں مرنے والے کی گلی میں بھی اس طرح کیا جاتا ہے کہ بکری یا بھیڑ ذبح کرکے لوگوں کو کھلاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ رواج شرعاً درست ہیں یا نہیں؟ اور ان میں ذبح شدہ جانوروں کا گوشت کھانا اور کھلانا کیسا ہے؟　بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عالمی سطح پر ادیانِ عالم میں سے اسلام ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ایک قابلِ عمل اور فلاح و بہبود پر مبنی، کامیابی و کامرانی پر مشتمل ضابطہ حیات رکھتا ہے۔ شریعتِ مطہرہ انسانیت کی عموماً اور مسلمانوں کی خصوصاً زندگی کے ہر موڑ پر بحیثیتِ مذہب راہنمائی و راہبری کرتی ہے۔ دینِ اسلام ہی وہ مذہب ہے کہ جس میں بیت الخلا سے لے کر بیت اللہ تک، مہد سے لے کر لحد تک اور گود سے لے کر گور تک تمام ضروری ہدایات، اصول، قواعد اور ضوابط موجود ہیں۔ معاشرتی زندگی گزارنے، باہمی میل جول، رہن سہن، بود و باش، طرزِ زندگی، تہذیب و تمدن الغرض اسلام نے معاشرہ کی ہر دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر تمام معاملات میں واضح تعلیمات دی ہیں۔

اس تشریعی نظام کے ہوتے ہوئے اپنے آپ پر رسوم لازم کرنا اور رواجوں کو فروغ دینا کسی طرح مناسب نہیں اور "التزام مالا یلزم" کے قبیل سے ہے، تاہم شریعت مطلق رسم و رواج کو ناجائز اور حرام نہیں سمجھتی، بلکہ رسوم میں قدرے تفصیل ہے:

درحقیقت رسوم دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱)......وہ رسوم جو کسی کی وفات کے موقع پر ادا کیے جاتے ہیں، مثلاً ساتواں، تیجہ، دسواں، چالیسواں وغیرہ کے رواج بعض علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

(۲)......دوسری قسم وہ رسوم جو خوشی کے مواقع پر ادا کیے جاتے ہیں، ان میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی، بلکہ عموماً علاقائی رواج کی حیثیت سے ادا کیے جاتے ہیں۔

صلح بھی خوشی اور مسرت کا موقع ہوتا ہے، لہٰذا جن علاقوں میں قاتل اپنی ندامت کے اظہار کے لیے صلح کے وقت مقتول کی گلی (محلّہ) میں بکرا ذبح کرتا ہے یا ایکسیڈنٹ ہو جانے کی صورت میں ڈرائیور ہلاک ہونے والے شخص کی گلی میں بکرا ذبح کرتا ہے تو اس طرح کے رسوم کی ادائیگی علاقائی رواج اور عرف کی حیثیت سے ہوتی ہے، اس وجہ سے انہیں ناجائز کہنا مشکل ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ ان کی ادائیگی سے دو مسلمانوں کی نفرت و دشمنی اخوت ومحبت میں تبدیل ہوتی ہو۔ پس ان رسوم میں ذبح کیے جانے والے جانور اگر کسی مسلمان نے ذبح کیے ہوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی غیر کے نام پر ذبح نہ ہوئے ہوں تو ان کا کھانا جائز ہے، علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

ولو ضافه أمير فذبح عندقدومه، فإن قصد التعظيم لاتحل وإن أضافه بها، وإن قصدالإكرام تحل وإن أطعم غيرها.(۱)

ترجمہ: اگر امیر کسی کا مہمان بن جائے، تو اُس کے آنے کے وقت (جانور کو) ذبح کیا جائے، اگر اس ذبح سے مقصد اُس کی تعظیم ہو تو جائز نہیں اور اگر مقصد اکرام ہو تو جائز ہے، اگر چہ دوسروں کو کھلایا جائے۔

اسی طرح بعض علاقوں میں جب دو فریقین کے درمیان صلح کی جاتی ہو تو زعماء جرگہ زیادتی کرنے والے شخص پر جرمانہ لگاتے ہیں کہ وہ بکریاں ذبح کر کے لوگوں کو کھلائے۔ یہ تعزیر بالمال کا مسئلہ ہے، جو کہ اختلافی ہے، بعض علماء کرام جائز قرار دیتے ہیں اور بعض عدم جواز کے قائل ہیں۔ تاہم موجودہ دور میں انسداد جرائم، ظالم کو ظلم سے روکنے اور انتظامی مصلحت کی بنیاد پر معاشرہ میں امن وسلامتی کو فروغ دینے کے لیے مالی جرمانہ لگانے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ جرمانہ لینے والے اسے اپنی ذاتی استعمال میں نہ لائیں، بلکہ ظالم سے لے کر مظلوم کو دے دیں یا غرباء پر صدقہ کریں یا مفادِ عامہ میں لگائیں، لہٰذا جن علاقوں میں قاتل پر جرمانہ "بکریوں کو ذبح کرنے" کی شکل میں لگایا جاتا ہے، وہ جائز ہے، تاہم مجرم کی استطاعت کو مدنظر رکھ کر جرمانہ لگایا جائے۔

---

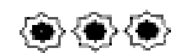
(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الذبائح: ۹/۴۴۹

پھر اس قسم کی صلح میں ذبح کیے جانے والے جانور کو اگر کسی مسلمان نے ذبح کیا ہو اور غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ ہوا ہو تو اس کا کھانا جائز ہے۔تعزیر بالمال کے بارے میں فقہ حنفی کی شہرہ آفاق کتاب ''معین الحکام'' میں امام علاء الدین ابوالحسن الطرابلسی فرماتے ہیں:

یجوز التعزیر بأخذ المال، وهو مذهب أبي یوسفؒ وبه قال مالكؒ. ومن قال: أن العقوبة المالية منسوخة، فقد غلط على مذاهب الآئمة نقلا واستدلالاً، وليس بسهل دعوى نسخها، وفعل الخلفاء الراشدين وأكابر الصحابة لها بعد موته ﷺ مبطل لدعوى نسخها، والمدّعون للنسخ ليس معهم سنة ولا إجماع يصح دعواهم.(۲)

ترجمہ

تعزیر بالمال جائز ہے، امام ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ عقوبت مالیہ منسوخ ہے، وہ نقلاً اور استدلالاً مذاہب آئمہ کے بارے میں غلطی کا شکار ہیں اور نسخ کا دعویٰ آسان بھی نہیں، کیونکہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد خلفاے راشدین اور اکابر صحابہ کا اس کو کرنا دعویٰ نسخ کو باطل کرتا ہے اور نسخ کے مدعیوں کے پاس سنت اور اجماع کی کوئی دلیل نہیں ہے۔



مصالحت کے بعد فریقین کا رجوع کرنا

سوال نمبر(172):

جب فریقین کے مابین ان کی رضامندی سے ایک فریق کے حق میں کسی چیز کے عوض مصالحت ہو جائے۔کیا اس کے بعد فریقین رجوع کا حق رکھتے ہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جس چیز پر مصالحت کی جا رہی ہو، اس کا معیّن اور معلوم ہونا ضروری ہے جب کسی معلوم اور معیّن چیز پر

(۱) معین الحکام: ص/۲۳۱

مصالحت ہوجائے تو اس کے بعد کسی ایک فریق کو رجوع کا حق حاصل نہیں۔

والدلیل علی ذلك:

إذاتم الصلح فليس لواحد فقط من الفريقين الرجوع عنه.(۱)

ترجمہ:

جب صلح مکمل ہو جائے تو پھر فریقین (مدعی، مدعی علیہ) میں سے کسی ایک کو رجوع کا حق حاصل نہیں۔

يلزم أن يكون المصالح عليه، والمصالح عنه معلومين إن كانامحتاجين إلى القبض والتسليم، وإلافلا. (۲)

ترجمہ:

ضروری ہے کہ جس پر صلح کی جارہی ہو اور جس کے بدلے صلح کی جارہی ہو، دونوں معلوم ہوں، بشرطیکہ وہ دونوں قبض وتسلیم کے محتاج ہوں، ورنہ نہیں۔

❁❁❁

صلح یا جرگہ پر خرچہ کی ذمہ داری

سوال نمبر (173):

ایک شخص نے دو افراد (ماموں اور سالے) کے درمیان صلح کی کوشش کے لیے جرگے بٹھائے جس پر سولہ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ کیا فریقین سے یہ خرچہ وصول کرنا شرعاً جائز ہے؟

بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر خرچہ فریقین میں سے کسی کے کہنے پر کیا گیا ہو، خواہ جرگہ کے انعقاد کے لیے یا دوسری مد میں، تو اس خرچہ کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز ہے اور اگر فریقین کے کہے بغیر اپنی طرف سے صلح کے لیے خرچہ کیا گیا ہو تو یہ محض تبرع واحسان ہے،

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز، الكتاب الثاني عشر في الصلح والابراء،الباب الرابع في احكام الصلح والابراء: المادة/۱۵۵٦: ص/۸٤٥

(۲) ايضاً،الباب الثاني في بعض احوال المصالح: المادة/۱۵٤۷: ص/۸۳۵

اس کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز نہیں، تاہم فریقین کو چاہیے کہ اِس احسان کا اُسے اچھا بدلے دیں۔

والدّلیل علی ذلک:

وتجوز الكفالة بأمرالمكفول عنه وبغير أمره،فإن كفل بأمره رجع بماأدى عليه،وإن كفل بغير أمره لم يرجع بمايؤديه ؛لأنه متبرع بأداله.(٢)

ترجمہ:

اور کفالہ جائز ہوتا ہے،مکفول عنہ کے حکم سے بھی اور بغیر اس کے حکم کے بھی،پس اگر کفیل نے مکفول عنہ کے حکم سے کفالت کی ہو تو کفیل نے جو کچھ ادا کیا وہ مکفول عنہ سے لے گا اور اگر کفیل نے مکفول عنہ کے حکم کے بغیر کفالت کی ہو تو جو کچھ ادا کیا ہے،اس کو واپس نہیں لے سکتا کیوں کہ (اس صورت میں) کفیل ادائیگی میں احسان کرنے والا ہے۔

۞۞۞

قتلِ خطا میں دیت کی مقدار سے زائد پر صلح کرنا

سوال نمبر(174):

ایک شخص نے خطاءً کسی کو قتل کیا۔مقتول کے ورثا صلح پر راضی ہیں،لیکن پوچھنا یہ ہے کہ قتلِ خطا کی صورت میں کس مقدار پر صلح کرنی چاہیے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

قتلِ خطا کی صورت میں شرعاً دیت لازم ہوتی ہے،تاہم اس میں صلح بھی جائز ہے،لیکن صلح کی صورت میں دیت سے زائد چاندی یا سونا یا اونٹ مقرر کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے سود لازم ہوتا ہے،اس لیے کہ معین مقدار کے بدلے میں زائد وصول کرنا سود ہے۔تاہم اگر صلح میں رقم مقرر کرتے ہوں تو اُس میں زیادتی کی گنجائش ہے کیونکہ سونے چاندی اور اونٹوں سے اس کی جنس مختلف ہے۔

(١) بدائع الصنائع، كتاب الصلح، فيمايرجع إلى المصالح عنه: ٤٩٠/٧

والدّليل على ذلك:

الصلح من الدية على أكثر مما تجب فيه الدية أنه لايجوز؛ لأن المانع من الجواز هناك تمكن الربا...... لأن الربا يختص بمبادلة المال بالمال.(۱)

ترجمہ: صلح میں دیت سے زائد مقدار مقرر کرنا اس صورت میں جس میں دیت لازم ہو، جائز نہیں، کیوں کہ اس صورت میں جواز سے ربا مانع ہے (یعنی اس صورت میں ربا لازم آتا ہے)۔۔۔۔کیوں کہ ربا وہاں مخصوص ہوتا ہے جہاں مال کا مال سے تبادلہ ہو (اور قتل خطا کی دیت مال ہوتا ہے، لہٰذا اس کے عوض زیادہ لینا سود کے حکم میں ہوگا)۔

❁❁❁

صلح کی شرائط

سوال نمبر(175):

کیا "وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" کی آیت مطلق ہے یا شرعاً صلح کی کچھ شرائط ہیں۔ تفصیل سے آگاہ فرمائیں کہ صلح کن چیزوں پر ہوسکتی ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وبالله التوفيق:

باہمی تنازعات کو ختم کرنے کے لیے "صلح" سے بہتر کوئی عمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے "وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" فرما کر مصالحت کو پسندیدہ قرار دیا ہے اور اس کو عام عنوان سے بیان فرمایا کہ اس میں میاں بیوی کے جھگڑے، گھریلو تنازعات اور ہر قسم کے باہمی خصومات اور مقدمات شامل ہیں، کیوں کہ الفاظ قرآن عام ہیں کہ "صلح بہتر ہے" نیز ارشاد نبوی علیہ السلام ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کی صلح جائز ہے، مگر وہ صلح جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کردے۔ لفظِ قرآن کے عموم اور رسول اللہ علیہ السلام کی حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کی صلح جائز ہے، سوائے اس صلح کے جس میں شریعت کا کوئی حکم متاثر ہو یعنی جو کسی حکمِ شرعی سے متصادم ہو۔

فقہائے کرام نے صلح کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صلح ایسی چیز پر ہو جو خالص بندوں کا حق ہو یا بندوں کا حق اس میں غالب ہو، جیسے حدِ زنا، حدِ سرقہ، حدِ شرب پر صلح کرنا جائز نہیں، کیوں کہ یہ خالص اللہ کے حقوق

---

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل وامابيان مايسقط القصاص: ۲۹۵/۱۰

ہیں۔اس کے علاوہ صلح کرنے والے،صلح جس چیز کے بدلے کیا جائے اور جس چیز کے ساتھ کیا جائے ان سب سے متعلق کچھ شرائط ہیں جنہیں فقہائے کرام نے تفصیل سے لکھا ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

قال رسول اللہ ﷺ: الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحاحرم حلالا، أو أحل حراما، وإن المسلمین علی شروطهم، إلا شرطاحرم حلالا. (۱)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:مسلمانوں کے مابین صلح جائز ہے،مگر وہ صلح جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنائے اور مسلمان اپنے شروط کے پابند ہوں گے،مگر وہ شرط جو حلال کو حرام بنائے (اس کے پابند نہیں)۔

❁❁❁

حکم کے فیصلہ سے پہلے فریقین کا حقِ رجوع

سوال نمبر(176):

دو قبیلوں کا آپس میں کسی زمین پر تنازعہ چل رہا تھا۔فریقین نے ایک عالم دین کو بطور حَکَم مقرر کیا۔اثنائے فیصلہ ایک فریق نے متنازعہ زمین میں ٹریکٹر چلا کے دخل اندازی کی۔دوسرے فریق نے حَکَم کو اس سے خبردار کیا اور منع کرنے کے لیے کہا،تاہم حَکَم نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا جس کی وجہ سے اس فریق کے مختاران نے فیصلہ کا حق دینے سے رجوع کیا۔باوجود اس کے حَکَم نے فیصلہ صادر کیا۔اس فریق نے دیگر علمائے کرام سے رجوع کیا،ان علمائے کرام نے بھی چند وجوہات کی بنا پر اس فیصلہ کو غیر نافذ قرار دیا جو درج ذیل ہیں:

اول یہ کہ ایک فریق کی اکثریت نے حَکَم کو حَکَم ماننے سے انکار کیا اس کے باوجود فیصلہ صادر کیا گیا۔

دوم یہ کہ زمین کی حدود کے بیان میں حَکَم کے دو فیصلوں میں تناقض ہے۔

سوم یہ کہ ایک فریق جس نے حَکَم کی تحکیم سے انکار کیا تھا،ایک فرد جو مستحق حصہ رسدگی ہے،حاضر نہیں تھا اور اس نے بھی بطورِ احتجاج حَکَم کے نام ایک خط ارسال کیا تھا۔اب اس فیصلہ کے بارے میں جناب کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں اور اس فیصلے کے نفاذ اور عدم نفاذ کے بارے میں شرعی حکم کے منتظر ہیں۔اس کی وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

بیّنوا توجروا

---

(۱) المستدرک علی الصحیحین، کتاب الاحکام، رقم الحدیث:۷۰۵۹: ۴/ ۱۱۳

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کسی تنازعہ کے فریقین اگر ذاتی مجبوریوں یا دیگر وجوہات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے تنازعہ کا حل حکومت کی کسی عدالت کی بجائے کسی شخص کے سامنے پیش کریں اور اُسے تنازعہ کے تصفیہ کا اختیار دے دیں تو شرعاً یہ تحکیم کہلاتا ہے۔ تحکیم کے جملہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اگر وہ فیصلہ صادر کرے تو وہ فیصلہ لازم رہے گا۔

شرائطِ تحکیم میں سے یہ بھی ہے کہ فریقین برضا ورغبت اپنے فیصلہ کا اختیار حَکَم کو دیں اور فیصلہ سے پہلے پہلے اُن میں سے ایک فریق بھی اس سے رجوع نہ کرے۔ چنانچہ اگر ایک فریق بھی فیصلہ کنندہ کو بطور حَکَم ماننے سے انکار کرے تو حَکَم کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ فیصلہ نہ کرے، کیونکہ فریقین کو فیصلہ سے پہلے پہلے رجوع کا حق حاصل ہے، باوجود اس کے حَکَم کا فیصلہ غیر موثر اور کالعدم شمار ہوگا۔ جب کہ فیصلہ سنانے کے بعد کسی فریق کے لیے انکار کی گنجائش نہیں لہٰذا اگر کوئی انکار کرے گا تو وہ شرعاً غیر مؤثر ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر حقیقتاً حَکَم نے ان اصولی شرائط اور تقاضوں سے ہٹ کر مذکورہ فیصلہ صادر کیا ہو تو اس فیصلہ سے متعلق جن علمائے کرام نے شرعی تحفظات کا اظہار کیا ہے، وہ اقرب الی الحق معلوم ہوتے ہیں، لہٰذا مذکورہ فیصلہ غیر موثر اور غیر نافذ ہے۔

والدلیل علی ذلک:

(ولکل واحد من الحکمین أن یرجع قبل حکمه)لأنه تقلد من جهتهما، فكان لكل منهما عزله، وهو من الأمور الجائزة، فينفرد أحدهما بنقضه كالمضاربة والشركة والوكالة.(فإن حكم لزمهما)لصدوره عن ولاية شرعية، فلايبطل حكمه بعزلهما.(۱)

ترجمہ:

حَکَم کے فیصلہ سے قبل ہر فریق کو رجوع کا حق حاصل ہے، اس لیے کہ حَکَم دونوں کی طرف سے مقرر ہوا ہے، لہٰذا ہر ایک کو اس کے معزول کرنے کا حق ہے اور یہ تحکیم ایک جائز معاملہ ہے (لازم نہیں) لہٰذا اس میں صرف ایک فریق کو نقض کا اختیار حاصل ہے۔ جیسا کہ مضاربت، شرکت اور وکالت میں ہے اور اگر حَکَم نے فیصلہ صادر کیا

(۱) البحرالرائق، کتاب الحوالة، باب التحکیم: ۷/۴۴

تو پھر لازم ہوگیا، اس لیے کہ شرعی ولایت کے تحت یہ فیصلہ صادر ہوا ہے، لہٰذا اس کے بعد ان کے معزول کرنے سے فیصلہ باطل نہیں ہوگا۔

❁❁❁

مصالحت کا شریعت کے موافق ہونا

سوال نمبر(177):

جناب مفتی صاحب! دو فریقین کے درمیان قتل وقتال کا تنازعہ تھا۔ ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے دو علمائے کرام حکم مقرر کیے گئے۔ فریقین نے ان کو کلی اختیار دیا کہ جو فیصلہ علمائے کرام فرمائیں گے، ہمیں منظور ہوگا۔ علمائے کرام نے ان کے مابین مصالحت کی اور اپنا فیصلہ بعنوان ''فیصلہ شرعیہ اور صلح مابین فریقین'' سنایا۔ موقع پر فریقین نے منظور کرکے آپس میں معافی کرکے دستبرداری بھی کی۔ بعد میں فریقین کہتے ہیں کہ مصالحت کرانا شرعی فیصلہ نہیں ہوتا، البتہ اگر ثبوت مل جائے کہ یہ شرعی فیصلہ ہے تو ماننے کو تیار ہیں۔ اب مطلوب یہ ہے کہ کیا مصالحت کرانا شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟ دلائل کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

قتل وقتال یا دیگر معاملات میں فریقین کا باہمی رضامندی سے کسی کو حکم (ثالث) بناکر مصالحت کرنا شرعاً جائز ہے۔ پھر حکم (ثالث) فریقین کے درمیان فیصلہ کے بجائے اگر مصالحت کرے، تو فریقین کے لیے اسے تسلیم کرنا لازم ہوگا، اگرچہ حکم حدود اور قصاص کا فیصلہ کرکے حد، قصاص یا دیت جاری کرنے کا مجاز نہیں، کیونکہ یہ اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں، لیکن فریقین میں مصالحت کرسکتا ہے۔

فقہائے کرام نے ''وَالصُّلْحُ خَيْرٌ'' آیت کے تحت تمام دنیاوی معاملات، تنازعات اور مقدمات میں مصالحت کو جائز قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ قتل عمد اور قتل خطا جیسے بڑے تنازعات میں بھی مصالحت کرنا جائز اور مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں علمائے کرام کا بطور حکم قتل کے معاملہ میں مصالحت کرنا شریعت کے موافق ہے، اس کی مخالفت جائز نہیں اور مصالحت کو شرعی فیصلہ کہنے میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ مصالحت بھی شریعت کا حکم ہے۔

والدليل على ذلك:

(وإذاحكم رجلان رجلا فحكم بينهما ورضيا بحكمه جاز.....وإذاحكم لزمهما).(١)

ترجمہ: جب دو آدمی کسی کو حَکَم بنائیں اور وہ ان کے درمیان محاکمہ کرے، اس حال میں کہ دونوں اس پر راضی ہوں تو جائز ہے اور جب وہ محاکمہ کرے تو اس کا ماننا دونوں پر لازم ہے۔

(الصلح جائز عن دعوى الأموال،والمنافع،ويصح عن جناية العمد، والخطاء.(٢)

ترجمہ: صلح اموال اور منافع کے دعاوی میں جائز ہے، اور قتل عمد وخطا کے جرم میں بھی صلح جائز ہے۔

❁❁❁

جرگہ کا فیصلہ کرنے کے بعد شریعت کا مطالبہ کرنا

سوال نمبر(178):

فریقین کے مابین زمین کا تنازعہ تھا۔حکم نے فریقین کی رضامندی سے جرگہ کا اختیار لے کران کے مابین صلح کی۔اب ایک فریق صلح کو نہیں مانتا۔کیا شرعاً ایک فریق کا فیصلہ نہ ماننے سے صلح ٹوٹ سکتا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جرگہ میں عموماً علاقہ کے رسم ورواج اور عرف کو مدِ نظر رکھ کر اس کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں اور عرف ورواج فقہ کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے۔عرف اگر شریعت کے مخالف نہ ہو تو اس کے مطابق کیا جانے والا فیصلہ باہمی مصالحت کا درجہ رکھتا ہے اور یہ فیصلہ فریقین پر اس طرح لازم ہوگا،جس طرح باہمی مصالحت فریقین پر لازم ہوتی ہے۔فریقین چونکہ حکم کو ولایت عطا کرتے ہیں اور حکم اسی ولایت کی وجہ سے فریقین کے مابین فیصلہ کرتا ہے،اس لیے حکم کے فیصلہ کرنے کے بعد فریقین کے لیے اسے تسلیم نہ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

---

(١) الهداية، كتاب ادب القاضي، باب التحكيم: ١٥١/٣

(٢) الهداية، كتاب الصلح، فصل : ٢٥٢/٣

اسی طرح اگر فریقین نے ثالثوں کو بصورتِ صلح تنازعہ نمٹانے کا اختیار دے رکھا ہو اور وہ شرعی اصولوں کے مطابق بصورتِ صلح ان کا تنازعہ ختم کردیں تو ان کی مصالحت بھی فریقین پر لازم ہو جائے گی، کیونکہ صلح میں وکالت جائز ہے۔ اس لیے فریقین جن امور میں خود باہمی مصالحت کر سکتے ہیں، ان کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی طرف سے کسی کو وکیل بنا دیں اور جس طرح فریقین کے خود باہمی مصالحت کے بعد کسی فریق کے لیے رجوع کی گنجائش نہیں رہتی، اسی طرح ثالثوں کو اختیار دینے کی صورت میں بھی ثالثوں کی مصالحت ان پر لازم ہو جاتی ہے اور پھر کسی فریق کو یہ اختیار نہیں کہ وہ ثالثوں کے فیصلے سے انکار کرے۔

والدّلیل علی ذلک:

إذاو كل أحد الطرفين أحد المحكمين والأخرالمحكم الأخر لإجراء الصلح في الخصوص الذي تنازعا فيه، وتصالح المحكمان بإضافة عقد الصلح الى مؤكليهم، وكان الصلح موافقاًللأحكام المشروعة،فليس لأحد الطرفين أن يمتنع عن قبول هذا الصلح والتسوية......اذاتم الصلح، فليس لأحدالطرفين الرجوع عنه.(١)

ترجمہ: جب طرفین میں سے ایک نے متنازعہ فیہ مسئلہ میں صلح کرانے کے لیے ایک حکم کو وکیل بنایا اور دوسرے فریق نے دوسرے حکم کو۔ پھر ان دونوں محکمین نے شرعی اصول کے تحت صلح کی اور صلح کو فریقین کی طرف منسوب کیا، تو اس کے بعد کسی فریق کو اس صلح سے انکار کی گنجائش نہیں ۔۔۔۔ جب صلح مکمل ہو جائے تو کسی کو رجوع کا حق نہیں۔

(ولكل واحد من الحكمين أن يرجع قبل حكمه)لأنه تقلد من جهتهما، فكان لكل منهما عزله،وهومن الأمورالجائزة،فينفرد أحدهما بنقضه كالمضاربة والشركة والوكالة.(فإن حكم لزمهما) لصدوره عن ولاية شرعية، فلايبطل حكمه بعزلهما.(٢)

ترجمہ: حکم کے فیصلہ سے قبل ہر فریق کو رجوع کا حق حاصل ہے، اس لیے کہ حکم دونوں کی طرف سے مقرر ہوا ہے، لہٰذا ہر ایک کو اس کے معزول کرنے کا حق ہے اور یہ تحکیم ایک جائز معاملہ ہے (لازم نہیں) لہٰذا اس میں صرف ایک فریق کو نقض کا اختیار حاصل ہے۔ جیسا کہ مضاربت، شرکت اور وکالت میں ہے اور اگر حکم نے فیصلہ صادر کیا تو پھر لازم ہو گیا، اس لیے کہ شرعی ولایت کے تحت یہ فیصلہ صادر ہوا ہے، لہٰذا اس کے بعد ان کے معزول کرنے سے فیصلہ باطل نہیں ہوگا۔

(١) دررالحكام، المسائل المتعلقة بالتحكيم: ٧٠٣/٤

(٢) البحرالرائق، كتاب الحوالة، باب التحكيم: ٤٤/٧

حکمین کا اپنی حدود سے تجاوز کرنا

سوال نمبر(179):

ہمارا ایک فریق سے راستہ کا تنازعہ چل رہا تھا جس کے فیصلہ کا اختیار فریقین نے جرگہ کو دے دیا۔ اراکین جرگہ نے راستے کا نزاع ہموار کرنے کی بجائے ہمارا گھر مخالف فریق کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ کیا اس فیصلہ کا ماننا ہم پر شرعاً لازم ہے؟ انکار کی صورت میں گناہ تو نہ ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

تنازعات کے حل کی نجی صورتوں مثلاً تحکیم اور جرگہ سسٹم میں حَکم اور اراکین جرگہ کے پاس ولایت عامہ نہیں ہوتی، بلکہ ان کے پاس ایک جزوی ولایت ہوتی ہے جو فریقین کی جانب سے انہیں تفویض کردہ ہوتی ہے، لہٰذا ولایت کے نقصان اور قصور کی وجہ سے ان کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔

مسئولہ صورت میں اگر خصمین کا تنازعہ فقط راستہ کا ہو اور خصمین نے اراکین جرگہ کو فقط اسی راستے کے بارے میں کسی مناسب حل کے لیے اپنے مابین حَکم اور ثالث مقرر کیا ہو تو اراکین جرگہ کا اس راستہ کے بارے میں مناسب فیصلہ کرنے کی بجائے ایک خصم کا مکان دوسرے خصم کے ہاتھ بیچ دینا اپنی حدود سے تجاوز کرنا متصور ہوگا، اس لیے اس فیصلہ کا ماننا صاحبِ مکان پر شرعاً لازم نہیں اور انکار کی صورت میں گناہ گار نہیں ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

لایجوز ولاینفذحکم المحکم إلاعلی الخصمین الذین حکماہ، وبالشأن الذي حکماہ بہ، فلایسري حکمہ علی غیرھما، ولایتناول غیرذلک الشأن.(۱)

ترجمہ:

حَکم کے لیے جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کا حکم نافذ ہوتا ہے، بجز ان خصمین پر جنہوں نے اس کو حَکم بنایا اور اس چیز کے بارے میں جس کے بارے میں اس کو حَکم بنایا گیا ہے، لہٰذا اس کا حکم خصمین کے علاوہ اور تحکیم کے لیے مفوضہ مسئلہ کے علاوہ صحیح نہیں ہے۔

(۱)شرح المجلۃ لسلیم رستم باز،الکتاب السادس عشر في القضاء، المادۃ /۱۸۴۲: ص/ ۱۱۹۴

حَکَم کا مقررہ جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ فیصلہ سنانا

سوال نمبر(180):

حَکَم نے مدعی، مدعا علیہ کے بیانات سننے کے بعد اُسی مجلس میں فیصلہ نہیں سنایا، بلکہ پندرہ دن بعد کسی دوسری مجلس میں فیصلہ سنانے کا کہا۔ کیا اس سے حَکَم معزول ہوتا ہے اور کیا حَکَم کا یہ فعل شرعاً جائز ہے اور یہ اس کے دائرہ اختیار میں شامل ہے؟ دوسری مجلس میں فیصلہ سنانے سے قبل اگر ایک فریق حَکَم کو معزول کرے تو حَکَم کے فیصلہ کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فریقین نے اگر فیصلہ کا اختیار اسی مجلس تک محدود ہونے کی شرط لگائی ہو تو قاضی یا حَکَم کا فیصلہ اسی مجلس تک محدود رہے گا، دوسری مجلس میں فیصلہ سنانے کا قاضی یا حَکَم کو اختیار نہ ہوگا، البتہ اگر فریقین نے مطلقاً اختیار دیا ہو، مجلس اور مکان کی قید نہ لگائی ہو تو اس صورت میں قاضی یا حَکَم کو دوسری مجلس میں فیصلہ سنانے کا اختیار ہے، البتہ اگر فیصلہ کرنے سے قبل کسی فریق نے حَکَم کو معزول کیا تو معزول ہونے کی بنا پر دوسری مجلس میں اس کا فیصلہ معتبر نہ ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

إذاتقيد التحكيم بوقت يزول بمروره ...... فلايجوزأن يحكم بعد انقضائه، وإذافعل لاينفذحكمه. (۱)

ترجمہ:

جب تحکیم کسی وقت کے ساتھ مقید ہو تو اس وقت کے گزرنے پر تحکیم کا حق ختم ہو جائے گا۔۔۔لہٰذا اس وقت کے ختم ہونے کے بعد فیصلہ کرنا جائز نہیں اور اگر فیصلہ کا حکم صادر کیا، تو فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔

لكل من الخصمين عزل المحكم قبل الحكم. (۲)

ترجمہ: ہر دو مدمقابل (خصم) کو یہ اختیار حاصل ہے کہ محکم (فیصلہ کرنے والے) کو فیصلہ سے قبل معزول کردیں۔

❁❁❁❁❁

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز، الكتاب السادس عشر في القضاء، المادة/ ۱۸۴۶: ص/ ۱۱۹۷

(۲) أيضاً

کتاب الغصب

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ حرمت:

فقہی نقطۂ نظر سے انسانی جان، مال، عزت، دین، نسل اور عقل کے تحفظ کو ضروریاتِ دین کی حیثیت حاصل ہے۔(۱) نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ان کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بے شک تمھاری جانیں، اموال اور عزت وآبرو تم پر اس طرح حرام ہیں جس طرح آج کا دن تمھارے اس (مقدس) مہینے اور (مقدس) شہر میں محترم اور معزز ہے۔(۲)

فقہی ذخائر کا تقریباً دو تہائی حصہ ان ہی ضروریات کے تحفظ سے متعلق ہے جو ان ضروریات کے تحفظ کے لیے ذرائع متعین کرنے کے ساتھ ساتھ دست درازی کرنے والوں سے نمٹنے کے گر بھی سکھاتا ہے تاکہ اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے کسی کو غیر کے جان ومال کی طرف ناحق دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ کتاب الغصب بھی اس مستحکم نظام کا ایک باقاعدہ حصہ ہے جس میں خاص طور اموال کے تحفظ اور اس میں کمی کوتاہی کے انسداد سے بحث کی جاتی ہے۔

لغوی تحقیق:

غصب کا لغوی معنی ہے:

"أخذ الشيء ظلماً" یا "أخذ الشيء من الغير على وجه القهر مالا كان أو غير مال."

کسی دوسرے شخص کی چیز کو زبردستی لے لینا، چاہے وہ چیز مال ہو یا غیر مال۔(۳)

اصطلاحی تحقیق:

صاحب ہدایہ کے ہاں غصب کی تعریف یوں ہے:

---

(۱) الموافقات في أصول الأحكام، الشاطبي، أبو إسحاق ابراهيم بن موسىٰ اللخمي، كتاب المقاصد، النوع الأول، المسألة الأولى: ۲/۴، دار الفكر، بيروت لبنان

(۲) مسند أحمد، رقم (۱۹۸۷٤)، حديث أبي بكرة نفيع بن الحارث بن كلدة: ٦/٦، دار إحياء التراث العربي لبنان

(۳) تبيين الحقائق، الزيلعي، كتاب الغصب: ٦/٣١٤، حاشية بدائع الصنائع، كتاب الغصب: ۱۰/۳

أخذ مال متقوم محترم بغير إذن المالك على وجه يزيل يده.

جب کہ علامہ کاسانیؒ کے ہاں اس کی تعریف یوں ہے:

إزالة يد المالك عن ماله المتقوم على سبيل المجاهرة والمغالبة بفعل في المال.

دونوں تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے:

ایسا مال جو شریعت کی نگاہ میں قابلِ قیمت اور محترم ہو، اسے مالک کی اجازت کے بغیر ظلماً اور علانیۃً (کھلم کھلا) مالک کے قبضہ سے نکال کر خود قابض بننے کا نام غصب ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ تعریف میں ایک اور قید کا اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

على وجه يزيل يد المالك إن كان في يده أو يقصر يده إن لم يكن في يده.

قید اضافہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مستاجر، مرتہن اور مودع سے زبردستی لیا جانے والا مال بھی تعریف میں داخل ہو جائے۔

گویا تعریف میں چار قیود بمنزلہ ارکان ہیں:

(۱) وہ مال شرعاً قابلِ قیمت اور محترم ہو۔

(۲) مالک کی اجازت نہ ہو۔

(۳) مال زبردستی اور کھلم کھلا لیا جائے۔

(۴) اور مال سے مالک کا قبضہ اور تصرف ختم ہو کر غاصب کے تصرف میں آ جائے۔(۱)

اصطلاحات:

(۱) غصب: کسی دوسرے کا مال بلا اجازت زبردستی لے لینا۔

(۲) غاصب: مذکورہ طریقے سے مال لینے والا۔

(۳) مغصوب منہ: جس سے مال لیا جائے۔

(۴) مغصوب: غصب شدہ چیز۔

---

(۱) بدائع الصنائع مع حاشیة نمبر(۱) كتاب الغصب: ۳/۱۰، دار الكتب العلمية بيروت، الهداية مع فتح القدير، كمال الدين محمد بن عبد الواحد، ابن الهمام، كتاب الغصب: ۸/۲٤٤، مكتبه حقانية پشاور

غصب سے ملتی جلتی اصطلاحات:

(۱) تعدی: تعدی مطلق ظلم و زیادتی اور حد سے گزرنے کا نام ہے۔

(۲) اتلاف: کسی چیز میں ایسا نقص پیدا کرنا جس کی وجہ سے وہ مطلوبہ منافع دینے کے قابل نہ رہے۔ اتلاف غصب کے بغیر بھی ہوسکتا ہے، مثلاً: مالک کے قبضہ میں موجود کسی شے میں نقصان پیدا کرنا اتلاف تو ہے، مگر غصب نہیں۔

(۳) اختلاس: خفیہ طور پر یا علانیہ طور پر کسی سے کوئی چیز اچک کر بھاگ جانا۔

(۴) سرقہ: مالِ متقوم کو کسی محفوظ جگہ سے خفیہ طور پر اٹھالینا سرقہ، یعنی چوری ہے۔

(۵) حرابہ (راہزنی): رعب و دبدبے کا سہارا لے کر اسلحہ کی نوک پر راہ چلتے ہوئے لوگوں سے زبردستی مال لے لینا، تاہم یہ اقدام وہاں مقصود ہوتا ہے جہاں پر حکومت کا کنٹرول اور دسترس نہ ہو۔ اس کا حکم انتہائی سخت ہے۔ (۱)

غصب کی حرمت:

غصب کی حرمت قرآن، حدیث اور اجماع تینوں سے ثابت ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (۲)

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم خوب جانتے ہو۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

من أخذ شبراً من الأرض بغير حقه طوقه في سبع أرضين يوم القيامة. (۳)

جس نے ناحق ایک بالشت زمین بھی غصب کی، قیامت کے دن اللہ تعالی سات زمینوں تک اس کا طوق بنا کر اس کو پہنائے گا۔

اور حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے انسانی جان، مال اور عزت کو یوم عرفہ، ذی الحجہ کے مہینے اور مکہ مکرمہ کی طرح مقدس قرار دے کر فرمایا:

---

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة غصب: ۳۱/۲۲۹، الكويت

(۲) البقرة: ۱۸۸

(۳) الصحيح لمسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض: ۲/۳۳

ألا لاتظلموا، ألالاتظلموا، ألالاتظلموا،إنه لایحل مال امرئ إلا بطیب نفسه منه.(۱)

خبردار ظلم مت کرو، خبردار ظلم مت کرو، خبردار ظلم مت کرو، بے شک کسی بھی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر (استعمال کرنا) حلال نہیں۔

علامہ ابن قدامہؒ نے غصب کی حرمت پر تمام مسلمانوں کا اجماع بھی نقل فرمایا ہے۔(۲)

غصب کا حکم:

اس کا حکم دو طرح کا ہے: ایک حکم اخروی مواخذہ اور گناہ کے اعتبار سے ہے جب کہ دوسرا حکم دنیوی تعزیر اور ضمان وتاوان کے اعتبار سے ہے۔اخروی مواخذہ اور گناہ کا حکم تب ہوگا جب غاصب کو علم ہو کہ یہ مال دوسرے کا ہے، میرے لیے اس میں تصرف کا کوئی حق نہیں۔اگر اس کو علم نہ ہو بلکہ غلطی یا جہالت کا شکار ہو کر مالِ غیر میں تصرف کا ارتکاب کرے تو گنہگار تو نہیں، البتہ ضمان اور تاوان میں وہ بالکل پہلے والے کی طرح ہے، یعنی ضمان کے لیے علم کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔(۳)

کتاب الغصب کے چند مشہور مسائل کا تذکرہ:

غیر منقولی اموال میں غصب کا مسئلہ:

مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ میں سے امام محمد وزفر رحمہم اللہ کے ہاں کسی شے پر زبردستی غلبہ اور قبضہ حاصل کرنا غصب ہے، اگر چہ وہ شے اپنی جگہ پر ہی موجود ہو، یعنی غصب کے لیے مغصوبہ شے کو مالک کے قبضہ سے نکال کر کسی دوسری جگہ منتقل کرنا ضروری نہیں، جب کہ امام ابوحنیفہؒ وامام ابو یوسفؒ کے ہاں غصب کے تحقق کے لیے اس شے کا مالک کے قبضہ سے نکال کر غاصب کے قبضہ میں آنا ضروری ہے اور ایسا کرنا اس شے کو اپنی جگہ سے منتقل کرنے کے بعد ہی ممکن ہے، لہٰذا امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک غیر منقولی اشیا، مثلاً: زمین پر جارحانہ قبضہ غصب کے زمرے میں نہیں آتا، جب کہ جمہور کے ہاں یہ بھی غصب ہے۔(۴)

---

(۱) مسند أحمد، رقم۲۰۱۷۲،حدیث عم أبي حرة الرقاشي عن عمةؓ:۶/۶۹،دار إحیاء التراث العربي

(۲)المغني مع الشرح الکبیر،ابن قدامة، أبي محمد عبدالله، کتاب الغصب: ۵/۳۷۵،المکتبة التجاریة، المکة المکرمة

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الغصب، باب حکم الغصب،فصل وأما حکم الغصب:۱۰/۲۲،تبیین الحقائق، کتاب الغصب: ۶/۲۱۴،الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الغصب:۹/۲۶۳

(٤) المغني مع الشرح الکبیر، کتاب الغصب:۵/۳۷۵،الدر المختار مع ردالمحتار، کتاب الغصب:۹/۷۲،۲۷۱

فقہائے احناف میں سے متاخرین نے وقف کی جائیدادوں کے ساتھ لوگوں کی تعدی اور زیادتی کو دیکھ کر وقف کی جائیدادوں کے بارے میں امام محمدؒ اور ائمہ ثلاثہؒ کی رائے کو، جب کہ دوسری جائیدادوں میں امام صاحبؒ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔(۱)

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام صاحب کے ہاں غیر منقولہ جائیداد پر قبضہ جمانے کے بعد غاصب کچھ بھی کر سکتا ہے، بلکہ اس کے ہاتھ سے اس زمین میں جتنا بھی نقصان ہو جائے، وہ اس کا ضامن ہوگا اس لیے کہ یہ اتلاف ہے اور غیر منقولی اشیا میں اتلاف پر وجوبِ ضمان کے حکم میں کسی کا بھی اختلاف نہیں، البتہ اگر آفتِ سماوی، مثلاً: سیلاب یا کسی تیسرے شخص کے اتلاف کی وجہ سے زمین کو نقصان پہنچا تو امام ابو حنیفہؒ وابو یوسفؒ کے ہاں غاصب پر اس کا ضمان نہیں، جب کہ جمہور (بشمول امام محمدؒ) کے ہاں وہ ہر صورت میں ضامن ہے۔ فسادِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے فقہا نے یتیم اور بچے کی غیر منقولی جائیداد میں بھی وقف کی طرح ضمان کا حکم کیا ہے، اسی طرح کاشت یا دیگر منافع کے لیے تیار کی گئی زمین کو بھی غصب کا حکم دیا گیا ہے۔(۲)

موجودہ زمانے میں اراضی اور جائیداد پر ناجائز تسلط کا فتنہ عام ہے، اس لیے جس طرح فقہائے متاخرین نے وقف کی جائیداد وغیرہ کے بارے میں امام محمدؒ اور جمہور کے قول پر فتوی دیا ہے۔ اگر عام مملوکہ جائیداد پر ناجائز تسلط کی بابت بھی یہی رائے اختیار کی جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔(۳)

مغصوبہ شے کے زوائد کا مسئلہ:

غاصب کے ہاں مغصوبہ شے میں جو اضافہ ہو جائے، وہ دو قسم کا ہے:

یا تو وہ مغصوبہ شے سے متصل ہوگا، جیسے: جانور میں موٹاپا اور حسن وجمال یا علیحدہ ہوگا، جیسے: بچے، دودھ، پھل اور اُون وغیرہ

امام ابو حنیفہؒ وابو یوسفؒ کے ہاں یہ زوائد غاصب کے ہاتھ میں امانت ہیں۔ اگر غاصب کی تعدی سے یہ اشیا ہلاک ہو گئے یا مالک کے مطالبے کے باوجود اس نے واپس نہیں کیے یا فروخت کیے تو بالاتفاق غاصب اس کا ضامن

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الغصب: ۲۷۲/۹

(۲) المغني مع الشرح الكبير، كتاب الغصب: ۳۷۵/۵، الدر المختار مع رد المحتار ۹/۲۷۱-۷۳، بدائع الصنائع مع الحاشية كتاب الغصب: ۱۰/۱۷-۱۵

(۳) قاموس الفقه، مادة غصب: ۴۳۹/۴، حاشية بدائع الصنائع، كتاب الغصب: ۱۰/۱۵

ہوگا، لیکن اس کے علاوہ صورتوں میں ان اشیا کی ہلاکت سے غاصب پر کوئی ضمان نہیں اس لیے کہ یہ اشیا غصب کے وقت موجود نہیں تھے، لہٰذا ان میں شیخین کے اصول کے مطابق ازالۃ ید المالک نہیں پایا گیا، جب کہ امام محمدؒ اور جمہور کے ہاں ہر صورت میں غاصب ضامن ہوگا۔(۱)

مغصوبہ شے کے منافع کا مسئلہ:

مغصوبہ شے کے منافع (رہائش، سواری، کرایہ وغیرہ) کے بارے میں حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غاصب پر ان منافع کے بدلے کوئی منافع واجب نہیں، اگرچہ اس نے خود اس سے فائدہ بھی اٹھایا ہو یا کسی اور کو اجرت پر دی ہو، تاہم امام ابوحنیفہؒ و محمدؒ کے ہاں یہ نفع حلال نہیں، جب کہ امام ابو یوسفؒ کے ہاں حلال ہے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ کسی غیر کے مال سے فائدہ اٹھا کر اس نفع میں خیانت آتی ہے، لہٰذا اس کو صدقہ کردے۔(۲)

متاخرین حنفیہ نے وقف اور یتیم کے املاک اور معاشی فوائد وزراعت کے لیے تیار شدہ زمین کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے، ان کے ہاں ان تین صورتوں میں اجرِ مثل واجب ہوگی۔(۳)

شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں غاصب ہر صورت میں اجرِ مثل کا ضامن ہے، چاہے اس نے منافع حاصل کیے ہوں یا نہیں۔ مالکیہ کے ہاں اگر اس نے استعمال کیے ہوں یا آمدن کا ذریعہ بنایا ہو تو ضامن ہے، ورنہ نہیں۔(۴)

غیر متقوم شے کا غصب:

☆......اگر مسلمان کسی ذمی کے شراب اور خنزیر کو تلف کرے تو اس پر ان دونوں کی قیمت واجب ہوگی، عین خمر اور خنزیر کو واپس کرنا واجب نہیں، البتہ اگر یہ اشیا کسی مسلمان کے ہوں تو غاصب پر کوئی ضمان نہیں۔(۵)

---

(۱) الشرح الکبیر علی المغني مسألة: ویضمن زوائد الغصب......: ٥/٤٠٩، الفقه الإسلامي وأدلته، الفصل السابع الغصب والإتلاف، المبحث الأول الغصب وأحكامه، المطلب الأول، زوائد المغصوب أو النماء السماوي: ٦/٤٧٩٢

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الغصب: ٩/٢٧٥، ٢٧٦، بدائع كتاب الغصب فصل في حكم الغصب: ١٠/٤٥-٤٧، فتح القدير مع الهداية كتاب الغصب: ٨/٢٥٧

(۳) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الغصب، مطلب في ضمان منافع الغصب: ٩/٢٩٩، تبيين الحقائق مع حاشية شلبي، كتاب الغصب: ٦/٢٣٨، ٢٣٧

(٤) فتح القدير على الهداية، كتاب الغصب: ٨/٢٨١، الموسوعة الفقهية، مادة غصب: ٣١/٢٣٧

(٥) الهداية مع فتح القدير، كتاب الغصب، فصل في غصب مالا يتقوم: ٨/٢٨٥، ٢٨٦

☆……مردار اشیا کے غصب سے غاصب پر کوئی ضمان نہیں آتا، مثلاً: خون اور مردہ جانور وغیرہ۔(۱)

☆……کسی مسلمان سے آلاتِ لہو غصب کرنے یا توڑنے سے ضمان لازم نہیں آتا، تاہم اگر ان آلات کا درست استعمال ممکن ہو، جیسے: دف یا طبلہ وغیرہ؛ تو امام ابوحنیفہؒ کے ہاں اس پر ضمان ہوگا اور اگر درست استعمال ممکن نہ ہو تو ضمان واجب نہیں، یہ قول صاحبین کا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔(۲)

غصب پر مرتب ہونے والے آثار:

دنیوی اعتبار سے غصب پر دو قسم کے آثار مرتب ہوتے ہیں:

(۱) تعزیر:

حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کے ہاں غاصب کو قید یا مار پیٹ کی سزا اور تعزیر دی جاسکتی ہے، اگر چہ وہ نابالغ ہی کیوں نہ ہو، تاکہ فساد کا راستہ روک کر لوگوں کے لیے عبرت کا ذریعہ بن جائے۔(۳)

مغصوبہ شے کی واپسی اور ضمان:

اس کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) مغصوبہ شے بعینہ موجود ہو۔　(۲) مغصوبہ شے ہلاک ہوگئی ہو۔

(۳) مغصوبہ شے میں نقصان پیدا ہوا ہو۔　(۴) مغصوبہ شے میں زیادتی آگئی ہو۔

ان میں سے ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) مغصوبہ شے بعینہ موجود ہو تو اس کو واپس کرنا واجب ہے، ساتھ ہی وہ زائد اشیا بھی لوٹائی جائیں جو غصب کے دوران اصل شے سے مستفاد ہوں۔ یاد رہے کہ مغصوبہ شے کی واپسی پر آنے والا خرچہ غاصب کے ذمے ہوگا۔(۴)

(۲) اگر مغصوبہ شے غاصب کے ہاتھ میں ہلاک ہوجائے تو اس کی دو صورتیں ہیں: اگر مثلیات (مکیلات، موزونات اور عددیاتِ متقاربہ) میں سے ہو تو غاصب پر ضمانِ مثل واجب ہوگا اور اگر غیر مثلی (مذروعات،

---

(۱) الهداية مع فتح القدير، كتاب الغصب، فصل في مالايتقوم: ٢٨٧/٨

(٢) الدرالمختار مع رد المحتار، كتاب الغصب: ٣٠٧،٣٠٦/٩، الهداية مع فتح القدير قبيل كتاب الشفعة: ٢٩٣/٨

(٣) القوانين الفقهية، الكتاب السادس، الباب التاسع في الغصب: ص ٢٨٢، الموسوعة الفقهية، مادة غصب: ٢٣٥/٣١

(٤) بدائع الصنائع، كتاب الغصب، فصل وأما حكم الغصب: ٢٥،٢٤/١٠

معدوداتِ متفاوتہ) اشیا میں سے ہو تو اس پر قیمت واجب ہوگی۔(۱)

(۳) اگر مغصوبہ شے میں نقصان پیدا ہو تو اس کی کئی صورتیں ہیں:

(الف) نقصان سے مراد بازاری قیمت اور نرخ میں کمی ہو تو اس سے غاصب پر کوئی ضمان نہیں آتا، اس لیے کہ سعر (نرخ) کی کمی بیشی اللہ کی طرف سے ہے۔

(ب) مغصوبہ شے کا کوئی جز، کوئی خاص یا پسندیدہ وصف یا منفعت فوت ہو جائے تو دیکھا جائے گا، اگر مغصوبہ شے اموالِ ربویہ میں سے نہ ہو تو غاصب پر نقصان کے بقدر ضمان ہوگا اور اگر وہ شے اموالِ ربویہ میں سے ہو، مثلاً: گندم، سونا چاندی وغیرہ؛ تو خراب ہونے کے باوجود بھی مالک نقصان کا تاوان نہیں لے سکتا، بلکہ یا تو وہی اشیا بعینہ لے لے اور یا غاصب کے حوالہ کر کے اس کے مثل کا مطالبہ کر دے، اس لیے کہ اموالِ ربویہ میں رداءت اور جودت کا کوئی اعتبار نہیں۔(۲)

(۴) اگر مغصوبہ شے میں زیادتی آگئی ہو تو یہ زیادتی دو قسم کی ہے: اگر زیادتی منفصل ہو، جیسے: بچے، میوہ، دودھ، اُون وغیرہ؛ یہ سب چیزیں اصل شے کے ساتھ مالک کو لوٹائی جائیں گی، غاصب کے لیے کچھ بھی نہیں۔

اگر زیادتی متصل ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت اس زیادتی کی ہے جو بذاتِ خود مغصوبہ شے سے مستفاد ہو، جیسے: حسن و جمال، بڑھوتری وغیرہ تو یہ بھی اصل شے کے ساتھ مالک کو ملیں گی۔ اس صورت میں غاصب کے لیے کچھ بھی نہیں، دوسری صورت اس زیادتی کی ہے جو غاصب کی وجہ سے آگئی ہو، اگرچہ وہ مغصوبہ شے سے متصل ہو، مثلاً: کپڑے کو غصب کر کے رنگ دیا ہو تو اس صورت میں یا تو مالک کپڑا واپس لے کر غاصب کو رنگ کے پیسے دے دے یا غاصب بغیر رنگ دیے ہوئے کپڑے کی قیمت دے کر کپڑا خود رکھ لے اور یا کپڑا فروخت کر کے اپنے حصے کے بقدر رقم تقسیم کریں۔ اسی طرح ستو اور گھی کا بھی مسئلہ ہے۔(۳)

چند متفرق مسائل:

اگر مقبوضہ زمین پر قابض نے مکان بنا دیا یا درخت لگا دیا اور زمین کی قیمت زیادہ اور درخت و عمارت کی کم ہے تو بالاتفاق قابض سے کہا جائے گا کہ وہ درخت اور مکان کو وہاں سے اکھاڑ دے اور اگر اس کی قیمت زمین سے زیادہ

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الغصب، وأما الذي يتعلق بحال هلاك المغصوب: ۳۵،۳۴/۱۰

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الغصب، وأما الذي يتعلق بحال نقصان المغصوب: ۵۹،۵۸/۱۰، حوالہ مذکورہ: ۵۰/۱۰

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الغصب، وأما حكم الغصب، وأما الذي يتعلق بحال زيادة المغصوبة: ۶۳-۶۰/۱۰

ہے تو امام کرخیؒ کا خیال ہے کہ غاصبانہ طور پر غاصب مالکِ زمین کو زمین کی قیمت ادا کرے گا اور زمین کا مالک ہوجائے گا، لیکن دوسرے مشائخ کو اس سے اتفاق نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گویا یہ ظلم کو سندِ جواز عطا کرنے کے مترادف ہے، اس لیے بہر صورت قابض کو مکان اور درخت اکھاڑنے کا کہا جائے گا، سوائے اس کے کہ خود مالکِ زمین اس پر راضی ہو۔ فقہائے کرام کے ہاں اسی پر فتویٰ ہے۔(۱)

البتہ اگر درخت کے اکھاڑنے یا عمارت منہدم کرنے سے زمین کا نقصان ہو تو مالک زمین کو یہ حق ہے کہ وہ اکھڑی ہوئی حالت میں درخت کی اور منہدم حالت میں عمارت کے ملبہ کی قیمت غاصب کو ادا کر کے درخت اور عمارت کا مالک ہوجائے۔(۲)

غصب کی ہوئی زمین پر نماز کا حکم:

غصب کی ہوئی زمین کا استعمال ناجائز اور حرام ہے، تاہم اگر ایسی زمین پر نماز پڑھی گئی تو فرض ادا ہوجائے گا، اس لیے کہ فرض ادا کرنا اپنی جگہ الگ فعل ہے اور زمین کا استعمال اس سے الگ چیز ہے۔(۳)

غاصب کب اپنے ذمہ سے فارغ متصور ہوگا؟

(۱) مغصوبہ شے بعینہ واپس کرنے سے۔ (۲) اس کا ضمان ادا کرنے سے۔

(۳) مالک کے بری کرنے، ہبہ کرنے یا صدقہ کرنے سے۔

(۴) مالک اپنا غصب شدہ مال استعمال کرے، کھائے، بطور امانت، بطور ہبہ، بطور اجارہ، بطور قصارۃ (دھونے) اور خیاطۃ (سینے) وصول کرے۔ ان تمام صورتوں میں اگر مالک کو یہ علم ہوجائے کہ یہی میرا مال ہے تو غاصب بری ہوجائے گا۔(۴)

❁❁❁❁❁

(۱) تبيين الحقائق، كتاب الغصب، تحت قوله: ولو غرس أو بنى......إلخ: ٦/٣٢٩، ٣٣٠

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الغصب: ٩/ ٢٨٠، حواله مذكوره: ٩/ ٢٨٣، ٢٨٤

(۳) رد المحتار على هامش الدر المختار، كتاب الحج، مطلب في من حج بمال حرام: ٣/ ٤٥٣، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الصلوة، مطلب في الصلوة في الأرض المغصوبة، قبيل باب الأذان: ٢/ ٤٤

(٤) الموسوعة الفقهية، مادة غصب: ٣١/ ٢٤٥، بدائع الصنائع، كتاب الغصب، وأما حكم الغصب، وأما بيان ما يخرج به الغاصب عن عهدة الضمان: ١٠/ ٣٩، ٤٠

مسائل کتاب الغصب

(غصب سے متعلقہ مسائل کا بیان)

بل زیادہ آنے پر بجلی چوری کرنا

سوال نمبر (181):

بعض لوگ بجلی چوری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حکومت (واپڈا) والے بجلی کے بلوں میں استعمال سے زیادہ رقم بھیج دیتی ہے۔کیا شرعاً اس حالت میں بجلی کی چوری جائز ہے؟

بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

بجلی پوری قوم کی امانت ہے۔ ملک کے ہر باسی کا حق اس سے متعلق ہے اس لیے اس کے استعمال میں صارفین کو نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے، تاکہ اہل وطن کی حق تلفی نہ ہو، دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جتنی بھی صَرف کی جائے، اتنی بجلی کا بل حکومت کو ادا کر دیا جائے، بصورت دیگر اگر کوئی شخص بجلی کی چوری کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ قانون کی خلاف ورزی ہے، حکومت اس کے خلاف قانونی کارروائی کرسکتی ہے، نیز مذکورہ شخص گناہگار بھی ہے۔

رہی بات بل زیادہ آنے کی تو اس کا قانونی حل یہ ہے کہ متعلقہ محکمہ (واپڈا) یا کسی بھی ذریعہ سے حکومت کو مطلع کیا جائے تاکہ اس کا تدارک ہو اور حکومت کا فریضہ ہے کہ اس بارے میں سنجیدہ قدم اُٹھائے تاکہ کسی پر بے جا بوجھ نہ پڑے اور کسی کے لیے بجلی چوری کرنے کا بہانہ میسر نہ ہو۔

والدّلیل علی ذلك:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللّٰهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِی الْأَمْرِ﴾

قال الشیخ ظفر احمد عثمانیؒ فی تفسیر هذه الآیة المبارکة:

وهذا الحكم أي وجوب طاعة الأمير مختص بمالم يخالف أمره الشرع، يدل عليه سياق الآية، فإن اللّٰه تعالى أمر الناس بطاعة أولي الأمر بعد ما أمرهم بالعدل في الحكم تنبيها على أن طاعتهم واجبة ماداموا على العدل.(۱)

(۱) ظفراحمد عثمانی، احکام القرآن: ۲/۲۹۲، ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة، کراچی

ترجمہ:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول اور اولوا الامر کی اطاعت کرو۔

شیخ ظفر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اور یہ حکم یعنی اطاعت امیر کا وجوب ان امور میں ہے جو شریعت کے مخالف نہ ہوں۔ آیت کا سیاق اسی پر دال ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانوں کو فیصلوں میں عدل کا حکم کرنے کے بعد لوگوں کو اطاعت کا حکم کیا ہے۔ اس بات پر خبردار کرنے کے لیے کہ ان کی اطاعت تب تک واجب ہے جب تک وہ عدل پر ہوں۔

❀❀❀

غصب کے مال کو جانتے ہوئے خریدنا

سوال نمبر (182):

ایک تاجر دوسرے تاجروں کا مال لے کر فرار ہوا۔ کیا اس تاجر سے یہی مال خریدنا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

علم کے باوجود مال مغصوبہ خریدنا شرعاً جائز نہیں۔ بالفرض اگر خرید لیا ہو تو جب تک غاصب مغصوبہ چیز کا ضمان ادا نہ کرے، تب تک بیع موقوف رہے گی۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا باع الغاصب المغصوب، ثم ضمنه المالك قيمته نفذ بيعه.(۱)

ترجمہ: جب غاصب مغصوبہ چیز کو بیچ دے، پھر مالک اس کو مغصوبہ چیز کی قیمت کا ضامن بنا دے تو اس کی بیع نافذ ہوجائے گی۔

(الحرمة تتعدد)......ومانقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لايتعدى ذمتين ......هو محمول على ماإذالم يعلم بذلك.(۲)

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز،الكتاب الثامن في الغصب والاتلاف، الباب الاول: تحت المادة/۸۹۱: ص/۴۹۲

(۲) ردالمحتار على الدرالمختار،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب الحرمة تتعدد: ۳۰۱/۷

کھلی زمین میں ختم ہو جاتی ہے جب کہ چھوٹا پودا باقی رہتا ہے اور اسی میں اضافہ ہوتا ہے۔

❁❁❁

سکول کے شیشے توڑنے پر طلبہ سے ضمان

سوال نمبر(184):

عموماً سکول اور کالج میں پڑھنے والے طلبہ کی یہ عادت ہوتی ہے کہ کبھی کمروں میں لگے شیشے توڑتے ہیں تو کبھی سکول کے فرنیچر وغیرہ کو قصداً نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیا اس حرکت پر طلبہ گناہ گار ہوتے ہیں اور گناہ گار ہونے کی صورت میں گناہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، جب کہ اس ادارے، یعنی سکول اور کالج سے فارغ ہو چکا ہو؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

بحیثیت مسلمان کسی کے املاک کو نقصان پہنچانا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ اس کا مرتکب عنداللہ مجرم اور گناہ گار ہے۔ سکول یا کالج کے طلبہ کا ادارہ کے املاک، مثلاً: دروازے، کھڑکیاں، شیشے وغیرہ کو نقصان پہنچانا ایک عظیم گناہ ہے جس سے اجتناب لازمی اور ضروری ہے، بالخصوص جب کہ سکول اور کالج گورنمنٹ کی ملکیت ہو، اس لیے کہ گورنمنٹ کی ملکیت میں پوری قوم شریک ہوتی ہے تو اس کو نقصان پہنچانا بھی گویا پوری قوم کا مجرم بنتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم ایسی حرکت کر چکا ہو اور اب نادم ہو کر اس کا کفارہ اور ضمان ادا کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اگر اس کو ان نقصان زدہ چیزوں کا علم ہو تو متعلقہ ادارے میں جا کر ان کی مرمت کر لے اور اگر علم نہ ہو یا ان کی مرمت ہو چکی ہو تو ان کی قیمت کا اندازہ لگا کر ادارے کے مفاد میں خرچ کرلے، خواہ انتظامیہ کو پتہ بھی نہ چلے، ذمہ فارغ ہو جائے گا۔

والدّلیل علی ذٰلک:

رجل افسد تالیف حصیر رجل،أو نزع باب داره من موضعه،أوحل سرج إنسان ...... ینظر إن أمکنه إعادته إلی ماکان یؤمر الناقض بالإعادة، وإن لم یمکن إعادته إلی ماکان ضمن قیمته.(۱)

---

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الغصب، الباب الثالث فیمالایجب الضمان: ۱۲۸/۵

ترجمہ:

ایک شخص نے کسی کی بنی ہوئی چٹائی کو خراب کیا یا کسی کے دروازے کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا یا کسی کے زین کو کھول دیا تو دیکھا جائے گا کہ اگر اس کو اپنے حال پر واپس کرنا ممکن ہو تو نقصان والے کو اعادہ کا حکم دیا جائے گا، ورنہ قیمت کا ضامن رہے گا۔

ويجب رد عين المغصوب في مكان غصبه، ويبرأ بردها ولو بغير علم المالك.(۱)

ترجمہ:

غصب کی ہوئی چیز میں عین مغصوبہ کو واپس کرنا واجب ہے۔ اگر مالک کے علم کے بغیر بھی چیز واپس کرے گا تو بری ہو جائے گا۔

❁❁❁

باپ سے چوری کردہ مال کو لوٹانے کی صورت

سوال نمبر(185):

ایک شخص نے اپنے باپ سے رقم چوری کی اور پھر اس سے کاروبار شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد کاروبار خوب بڑھ گیا، نفع ہوا۔ اب وہ شخص اپنے کیے پر نادم ہے، اپنے والد کو وہ رقم لوٹانا چاہتا ہے۔ اس کی کیا صورت ہوگی؟ تمام مال منافع سمیت لوٹائے گا یا صرف چوری کردہ مقدار کی رقم؟ اور منافع کی رقم اس کے لیے حلال ہے یا نہیں؟

بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

چوری کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ ایک طرف اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہے تو دوسری طرف بندوں کے حق کو ضائع کرنا بھی ہے، تاہم چوری کے پیسوں سے پھلنے پھولنے والے کاروبار میں نفع مال کے مالک کو لوٹانا ضروری نہیں، صرف چوری کردہ مقدار کی رقم مالک کو لوٹانا ضروری ہے۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں صرف چوری کردہ مقدار کی رقم والد کو لوٹائی جائے اور منافع کا استعمال اس بیٹے کے لیے جائز ہے۔

---

(۱) تنویر الابصار مع الدر المختار، کتاب الغصب: ۹/۲۶۶

والدلیل علی ذلک:

أصله أن الغلة للغاصب عندنا ؛ لأن المنافع لا تتقوم إلا بالعقد والعاقد هو الغاصب، فهو الذي جعل منافع العبد مالا بعقده فكان هو أولى ببدلها، ويؤمر أن يتصدق بها لاستفادتها ببدل خبيث، وهو التصرف في مال الغير.(۱)

ترجمہ: احناف کے ہاں غصب شدہ مال کا نفع غاصب کا ہے، کیوں کہ منافع عقد کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں اور عاقد غاصب ہی ہے، پس اس نے عقد کے ذریعہ غلام کے منافع سے مال بنایا، پس وہ اس کے بدل کا زیادہ حق دار ہے اور اس کو اس کے صدقہ کرنے کا حکم دیا جائے گا کہ یہ حرام سے حاصل کیے گئے ہیں اور وہ غیر کے مال میں تصرف کرنا ہے۔

❁❁❁

مغصوبہ زمین پر درخت لگانا

سوال نمبر(186):

ایک شخص نے مالکِ جائیداد کی اجازت کے بغیر اس کی زمین میں درخت لگائے اور زمین پر قابض ہوا، آخرکار مالکِ جائیداد نے مقدمہ دائر کرکے زمین سے اس کو بے دخل کیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ درخت مالکِ جائیداد کے ہوں گے یا غاصب کو دیے جائیں گے؟ تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

حضورﷺ کا ارشاد ہے: جس نے بنجر زمین کو آباد کیا، وہ اسی کے لیے ہوگی اور رگ ظالم کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔ رگ ظالم سے مراد یہ ہے کہ کوئی دوسرے کی زمین میں بلا استحقاق پودے لگا دے اور چاہے کہ اس کے ذریعہ سے مستحق ہو جائے، لہٰذا اگر کسی شخص نے دوسرے کی زمین غصب کرکے اس میں پودے لگائے یا کوئی عمارت بنائی تو اس سے کہا جائے گا کہ اپنی عمارت اور پودے اکھاڑے اور خالی زمین واپس کردے۔

مسئولہ صورت میں درخت بہرحال غاصب کے ہیں لیکن اگر درخت اکھاڑنے سے زمین کے خراب ہونے کا خطرہ ہو تو مالک جائیداد اکھڑے ہوئے درختوں کی قیمت دے کر درخت بھی لے لے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الغصب، مطلب شری دارا وسکنھا فظھرت لوقف اویتیم: ۲۷۶،۲۷۵/۹

زمین کی قیمت درخت کے بغیر لگائی جائے، پھر عمارت و درخت کے ساتھ اس کی قیمت کا اندازہ کیا جائے اور جو فرق ہو وہ زمین کا مالک غاصب کو دے دے۔

والدلیل علی ذلک:

ومن غصب أرضا فغرس فيها أو بنى قيل له: اقلع البناء والغرس وردها وإن كانت الأرض تنقص بقلع ذلك فللمالك أن يضمن له قيمة البناء أو الغرس مقلوعا ويكون له ومعناه قيمة بناء أو شجر يوم بقلعه؛ لأن حقه فيه فتقوم الأرض بدون الشجر أو البناء وتقوم وبها شجر أو بناء أمر بقلعه فيضمن فضل ما بينهما كذا في الكافي. (۱)

ترجمہ: جس نے زمین غصب کرکے اس میں پودے لگائے یا عمارت بنائی تو اس سے کہا جائے گا کہ عمارت اور درخت اُکھاڑ کر زمین واپس کر۔ اور اگر زمین میں اس کے اکھاڑنے سے نقصان آتا ہو تو مالک کو اس کی اجازت ہے کہ وہ غاصب کے لیے اکھڑی ہوئی عمارت یا درخت کی قیمت کا ضامن بنے۔ اور یہ عمارت اور درخت اس کے ہوجائیں گے۔ اس کے مطلب یہ ہے جس دن اس کو اکھاڑتے ہیں اس دن کی قیمت کا ضامن بنے گا کیونکہ اُس کا حق اسی میں ہے۔ چنانچہ پہلے درخت اور عمارت کے بغیر زمین کی قیمت لگائی جائے گی، پھر اس عمارت اور درخت کے ساتھ اُس کی قیمت لگائی جائے گی، پھر ان کے درمیان جو فرق ہے مالک اس کا ضامن بن جائے گا۔

❁❁❁

مغصوبہ زمین وقف کرنا

سوال نمبر(187):

ایک شخص کے پاس مغصوبہ زمین ہے۔ ایک آدمی نے باوجود علم کے یہ زمین خریدی اور مسجد کے لیے وقف کردی۔ کیا اس مغصوبہ زمین پر مسجد بنانا اور وقف کرنا شرعاً جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

---

(۱) الهندية، كتاب الغصب، الباب الثاني المغصوب إذا تغير بعمل الغاصب أو غيره

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

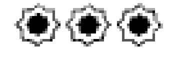
وقف کے لیے ملکیت کا ہونا شرعاً ضروری ہے۔ غیر کی ملکیت کو وقف کرنا جائز نہیں۔ مغصوبہ زمین کو غاصب سے خریدنا جائز نہیں اور نہ ہی خریدنے سے خریدار اس کا مالک بن جاتا ہے اور ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے وقف بھی صحیح نہیں ہوتا اور جب وقف صحیح نہیں، تو اس پر مسجد بنانا بھی صحیح نہیں، کیوں کہ مسجد شرعی بننے کے لیے کسی زمین کا وقف صحیح ہونا ضروری ہے۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق جب ایک آدمی کے پاس غصب کی زمین تھی اور دوسرے نے اس سے خریدی، باوجود یہ کہ خریدار کو معلوم تھا کہ یہ زمین غصب کی ہے، پھر بھی وہ اس کو وقف کر کے مسجد بنانا چاہتا ہے تو شرعاً خریدنے سے وہ زمین اس کی ملکیت میں نہیں آئی اور نہ ہی اس کا وقف کرنا صحیح ہے اور جب وقف صحیح نہیں تو اس میں مسجد بنانا بھی درست نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

(ومنها) الملك وقت الوقف: حتى لوغصب أرضا فوقفها، ثم اشتراها من مالكها، ودفع إليه، أو صالح علي مال دفعه إليه لاتكون وقفا.(۱)

ترجمہ: (وقف کی) شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وقف کرتے وقت وہ چیز وقف کرنے والے کی ملکیت میں ہو، چنانچہ اگر کوئی زمین غصب کر کے اس کو وقف کر دے، پھر یہ غاصب یہی زمین مالک سے خرید لے اور اس کو اس زمین کی قیمت دے دے یا کسی مال پر مصالحت کر کے مالکِ زمین کو دے دے، تو بھی یہ وقف شمار نہ ہوگی۔



غاصب کا گھر گرانا

سوال نمبر(188):

ایک شخص نے کسی کی زمین غصب کی، پھر اس پر گھر تعمیر کیا، مالک بار ہا اس سے مطالبہ کرتا رہا، لیکن غاصب ٹال مٹول سے کام لیتا رہا، آخر کار مالکِ زمین نے موقع پا کر غاصب کے گھر کو خود ہی بلڈوزر سے گرا دیا۔ کیا مالک پر اس کا ضمان ہے؟ اور مالک اتنی مدت بلا معاوضہ رہنے والے غاصب سے معاوضہ اور ضمان لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۱) الفتاوی الهندية، الكتاب الوقف : ۳۵۳/۲

الجواب وباللہ التوفیق:

وقف کے لیے ملکیت کا ہونا شرعاً ضروری ہے۔ غیر کی ملکیت کو وقف کرنا جائز نہیں۔ مغصوبہ زمین کو غاصب سے خریدنا جائز نہیں اور نہ ہی خریدنے سے خریدار اس کا مالک بن جاتا ہے اور ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے وقف بھی صحیح نہیں ہوتا اور جب وقف صحیح نہیں، تو اس پر مسجد بنانا بھی صحیح نہیں، کیوں کہ مسجد شرعی بننے کے لیے کسی زمین کا وقف صحیح ہونا ضروری ہے۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق جب ایک آدمی کے پاس غصب کی زمین تھی اور دوسرے نے اس سے خریدی، باوجود یہ کہ خریدار کو معلوم تھا کہ یہ زمین غصب کی ہے، پھر بھی وہ اس کو وقف کر کے مسجد بنانا چاہتا ہے تو شرعاً خریدنے سے وہ زمین اس کی ملکیت میں نہیں آئی اور نہ ہی اس کا وقف کرنا صحیح ہے اور جب وقف صحیح نہیں تو اس میں مسجد بنانا بھی درست نہیں۔

والدلیل علی ذلک:

(ومنها) الملك وقت الوقف: حتى لو غصب أرضا فوقفها، ثم اشتراها من مالكها، ودفع إليه، أو صالح على مال دفعه إليه لاتكون وقفا.(۱)

ترجمہ: (وقف کی) شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وقف کرتے وقت وہ چیز وقف کرنے والے کی ملکیت میں ہو، چنانچہ اگر کوئی زمین غصب کر کے اس کو وقف کر دے، پھر یہ غاصب یہی زمین مالک سے خرید لے اور اس کو اس زمین کی قیمت دے دے یا کسی مال پر مصالحت کر کے مالکِ زمین کو دے دے، تو بھی یہ وقف شمار نہ ہوگی۔

۞۞۞

غاصب کا گھر گرانا

سوال نمبر (188):

ایک شخص نے کسی کی زمین غصب کی، پھر اس پر گھر تعمیر کیا، مالک بار ہا اس سے مطالبہ کرتا رہا، لیکن غاصب ٹال مٹول سے کام لیتا رہا، آخر کار مالکِ زمین نے موقع پا کر غاصب کے گھر کو خود ہی بلڈوزر سے گرا دیا۔ کیا مالک پر اس کا ضمان ہے؟ اور مالک اتنی مدت بلا معاوضہ رہنے والے غاصب سے معاوضہ اور ضمان لے سکتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) الفتاوی الهندیة، الکتاب الوقف: ۲/۳۵۳

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کسی کی مملوکہ زمین پر مالک کی اجازت کے بغیر قبضہ کرنا ہرگز جائز نہیں، اگر کسی نے قبضہ کرکے اس پر عمارت کھڑی کردی تو مالکِ زمین کو عمارت ڈھانے کا شرعاً اختیار ہے، بشرطیکہ عمارت کی قیمت زمین کی قیمت سے کم ہو، ڈھانے کے بعد مالکِ زمین غاصب کو صرف ملبہ کی قیمت ادا کرے گا، البتہ اگر عمارت کی قیمت زمین سے زیادہ ہو تو مالک کے ڈھانے کی صورت میں مالک غاصب کو عمارت کا ضمان ادا کرے گا، کیوں کہ ایسی صورت میں مالکِ زمین کو عمارت ڈھانے کا حق نہیں رہتا، بلکہ غاصب پر زمین کی قیمت واجب الادا رہتی ہے۔

غصب سے حاصل شدہ منافع کا ضمان نہیں ہوتا، لہٰذا غاصب سے غصب شدہ مکان میں رہنے کا معاوضہ طلب کرنا درست نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

(ومن بنى أوغرس في أرض غيره بغيرإذنه، أمربالقلع والرد) لو قيمة الساحة أكثر (وللمالك ان يضمن له قيمة بناء أو شجر أمر بقلعه). وفي الشامية: ولو قيمتها أقل، فللغاصب أن يضمن له قيمتها، ويأخذ. (۱)

ترجمہ: جس شخص نے کسی دوسرے کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی عمارت بنائی یا کوئی درخت لگادی، تو اس شخص کو حکم دیا جائے گا کہ وہ عمارت ہٹادے اور درخت اکھیڑ دے، بشرطیکہ سطح (زمین) کی قیمت اس تعمیر ودرخت کی نسبت زیادہ ہو اور مالکِ زمین اس صورت میں اس شخص کے لیے مکان اور اس درخت کی قیمت کا ضامن ہوگا۔ شامی میں ہے: اور اگر اس زمین کی قیمت اس عمارت اور درخت سے کم ہو تو اس صورت میں غاصب مالکِ مکان کو اس زمین کی قیمت کا ضمان دے گا اور اس طور وہ زمین حاصل کرے گا۔

(منافع الغصب استوفاها أو عطلها) فإنها لا تضمن عندنا، ويوجد في بعض المتون: ومنافع الغصب غيرمضمونة إلى آخره. (۲)

ترجمہ: غصب کی ہوئی چیز سے منافع کا حصول چاہے، وہ غاصب پورا پورا حاصل کرے یا ان کو معطل کرے، ہمارے نزدیک ان کا ضمان غاصب پر نہیں ہوگا اور بعض متون میں یہ ہے: غصب کے منافع پر ضمان نہیں ہے۔

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الغصب: ۹/۲۸۳، ۲۸۴

(۲) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الغصب: ۹/۲۹۹

سروس تاروں سے براہ راست بجلی کا استعمال

سوال نمبر(189):

ایک شخص فوت ہوا، اس کے بچوں کا آمدنی کے واسطے کوئی مستقل ذریعہ نہیں، لہٰذا بجلی کے ڈائریکٹ سروس تار سے بجلی لے کر استعمال کرتے ہیں، باقاعدہ میٹر نہیں لگایا ہے۔ کیا اس کا استعمال ان کے لیے جائز ہے؟ اور اس کے استعمال سے ان کی عبادت (نماز، روزہ) پر کچھ اثر تو نہیں پڑتا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

بجلی قانوناً حکومت کی ملکیت ہے اور اجتماعی مفادات اس سے وابستہ ہیں، اسی وجہ سے حکومت نے مستقل قانون بنا کر صارفین پر اس کی باقاعدہ قیمت مقرر کی ہے جو بلوں کے ذریعے سے حکومت وصول کرتی ہے، کسی شخص کے لیے قانون شکنی کرتے ہوئے بجلی چوری کرنا یا بغیر میٹر کے براہ راست سروس تار سے بجلی کا استعمال شرعاً جائز نہیں۔

تاہم غیر قانونی طور سے حاصل شدہ بجلی کو استعمال میں لانے والوں کے نماز، روزہ وغیرہ عبادات بجالانے سے ذمہ فارغ ہو جاتا ہے۔ بغیر میٹر کے بجلی کا استعمال مستقل جرم ہے جس سے احتراز ضروری ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾

قال الشیخ ظفر احمد عثمانیؒ فی تفسیر ہذہ الآیة المبارکة:

وهذا الحكم أي وجوب طاعة الأمير مختص بمالم يخالف أمره الشرع، يدل عليه سياق الآية، فإن اللّٰه تعالى أمر الناس بطاعة أولي الأمر بعد ماأمرهم بالعدل في الحكم تنبيها على أن طاعتهم واجبة ماداموا على العدل.(۱)

ترجمہ:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔

شیخ ظفر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اور یہ حکم یعنی اطاعت امیر کا وجوب ان امور میں ہے

(۱) احکام القرآن: ۲/۲۹۲، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، کراچی

جو شریعت کے مخالف نہ ہوں۔ آیت کا سیاق اسی پر دال ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانوں کو فیصلوں میں عدل کا حکم کرنے کے بعد لوگوں کو اطاعت کا حکم کیا ہے۔ اس بات پر خبردار کرنے کے لیے کہ ان کی اطاعت تب تک واجب ہے جب تک وہ عدل پر ہوں۔ جو شریعت کے مخالف نہ ہوں۔ آیت کا سیاق اس پر دال ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو احکامات میں عدل پر حکم کرنے کے بعد وجوب اطاعت کا حکم کیا ہے۔ اس بات پر خبردار کرنے کے لیے کہ ان کی اطاعت تب واجب ہے جب وہ عدل پر ہوں۔

۞۞۞

مسجد میں بجلی کا ناجائز استعمال

سوال نمبر (190):

ایک مسجد کا بجلی کنکشن بغیر میٹر کے ڈائریکٹ سروس تار سے ہے۔ جب سرکاری اہلکار معلومات کے لیے جاتے ہیں تو ان کو ڈرا دھمکا کر یا کچھ رقم دے کر خاموش کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ مسجد کے لیے اس کا استعمال درست ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ یہ اتنی بڑی بات نہیں، آج کل کون سا کام حلال ہے؟ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا اور اس کے پانی سے وضو کرنا شرعاً جائز ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

بجلی قانوناً حکومت کی ملکیت ہے۔ اجتماعی مفاد اس سے وابستہ ہے، آئین کے دفعہ ۱۶۱ کی شق ''الف'' اور ''ب'' کی رُو سے بجلی اور قدرتی گیس متعلقہ صوبوں کے ذرائع آمدنی شمار کیے گئے ہیں۔

ملکی قوانین کو مدنظر رکھتے ہوئے بجلی حکومت صارفین پر باقاعدہ قیمت مقرر کر کے فروخت کرتی ہے، اس لیے بجلی کو چوری کرنا ظاہراً یا خفیتاً ازروئے شرع وقانون ناجائز ہے، تاہم ایسی بجلی سے گرم کیے ہوئے پانی یا نکالے گئے پانی سے وضو کرنا اور نماز پڑھنے سے ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے، لیکن جرم سے پھر بھی خالی نہیں۔ مسجد کو ایسے ناجائز ذرائع استعمال سے محفوظ رکھا جائے۔

والدلیل علی ذلک:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ﴾

قال الشیخ ظفر احمد عثمانیؒ فی تفسیر هذه الآیة المبارکة:

وهذا الحكم أي وجوب طاعة الأمير مختص بمالم يخالف أمره الشرع، يدل عليه سباق الآية، فإن الله تعالى أمرالناس بطاعة أولي الأمر بعد ماأمرهم بالعدل في الحكم تنبيها على أن طاعتهم واجبة ماداموا على العدل.(۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔

شیخ ظفر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اور یہ حکم یعنی اطاعت امیر کا وجوب ان امور میں ہے جو شریعت کے مخالف نہ ہوں۔ آیت کا سیاق اسی پر دال ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانوں کو فیصلوں میں عدل کا حکم کرنے کے بعد لوگوں کو اطاعت کا حکم کیا ہے۔ اس بات پر خبردار کرنے کے لیے کہ ان کی اطاعت تب تک واجب ہے جب تک وہ عدل پر ہوں۔ جو شریعت کے مخالف نہ ہوں۔ آیت کا سیاق اس پر دال ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو احکامات میں عدل پر حکم کرنے کے بعد وجوب اطاعت کا حکم کیا ہے۔ اس بات پر خبردار کرنے کے لیے کہ ان کی اطاعت تب واجب ہے جب وہ عدل پر ہوں۔

❁❁❁

مفادِ عامہ یا مصلحت کی بنا پر حکومت کا کسی سے زمین لینا

سوال نمبر(191):

ایک قوم ایک علاقہ پر پچاس سال سے آباد ہے۔ جملہ آبادی پہاڑ اور مفادات ان کے زیر تسلط ہیں۔ کیا یہ زمین اور پہاڑ حکومت اپنے قبضہ میں لینے کا اختیار رکھتی ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جہاں کہیں حکومت کو ضرورت پیش آئے اور مفادِ عامہ اس سے وابستہ ہوں، تو مصلحت کے پیش نظر حکومت کو کسی خطۂ زمین کا یا پہاڑ کا لینا درست ہے، تاہم مالکان کو اس کی صحیح اور جائز قیمت دینا ضروری ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

التصرف على الرعية منوط بالمصلحة......وقد قالوا:أيضاأن للسلطان أن يجعل ملك الرجل طريقا عند الحاجة.(۲)

---

(۱) احکام القرآن: ۲/۲۹۲

(۲) شرح المجلة لسليم رستم باز،تحت المادة /۵۸: ص/۲۰۴۲۳

ترجمہ: رعیت (کے اموال) پر تصرف مصلحت سے متعلق ہے۔۔۔۔فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ حاکم کے لیے جائز ہے کہ کسی کی ملک (زمین) کو ضرورت کے تحت راستہ بنائے۔

یؤخذ لدی الحاجة ملك أي أحد بقيمته بأمر السلطان، ويلحق بالطريق، ولكن لا يؤخذ من يده مالم يؤد له الثمن. (۱)

ترجمہ: حاجت کے وقت حاکم کے حکم سے کسی کی بھی ملکیت قیمتاً لی جائے گی اور اس کو راستہ سے ملالیا جائے گا، لیکن اس کے قبضہ سے اس وقت تک لینا جائز نہیں جب تک اس کی قیمت نہ دی جائے۔

۞۞۞

نظامِ ٹیکس اور عوام کی ذمہ داری

سوال نمبر(192):

ٹیکسیشن نظام کیا ہے؟ اور یہ کس حد تک جائز ہے؟ کیا ٹیکس اہلکاروں سے جھوٹ بول کر جان چھڑانا جائز ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

بین الاقوامی طور پر اکثر ممالک ریاستی انتظامات کو احسن طریقہ سے چلانے کے لیے مختلف ذرائع آمدن اختیار کرتے ہیں، جن میں سے ٹیکس بھی شامل ہے۔ٹیکس کے نظام کا طریقہ کار اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ حکومت رعایا کے مختلف متمول طبقوں سے مخصوص رقم وصول کرتی ہے اور اس کو رعایا ہی کے مفادات مثلاً سرحدات کی حفاظت اور مفادِ عامہ کے مختلف مصارف میں خرچ کرتی ہے۔اسی طرح ٹرانسپورٹ سے وصول شدہ ٹیکس سے حکومت سڑک اور پل تعمیر کرتی ہے۔

ٹیکس کے نظام اور اس کی وصول یابی کے لیے حکومت عموماً دو طریقے اپناتی ہے:

(۱) بالواسطہ ٹیکس (۲) بلاواسطہ ٹیکس

بالواسطہ ٹیکس کا نفاذ اگر چہ ایک شخص پر ہوتا ہے، لیکن وہ اس بار کو دوسروں کے کندھوں پر ڈالنے کا مجاز ہوتا ہے جیسے درآمدی ٹیکس، ایکسائز ڈیوٹی ٹیکس اور محصول چونگی۔ان ٹیکسوں کی ادائیگی کے بعد ان اشیا کی قیمت میں جمع ہو کر اس کا سارا بوجھ عوام کے کندھوں پر آجاتا ہے۔

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز، الكتاب العاشر في انواع الشركات: المادة/۱۲۱٦: ص/٦٦٧

بلا واسطہ ٹیکس کا نفاذ بھی اگرچہ ایک شخص پر ہوتا ہے، لیکن اس میں ادائیگی کا بوجھ دوسرے پر ڈالنے کا وہ مجاز نہیں ہوتا جیسے انکم ٹیکس وغیرہ۔

ان دونوں ذرائع کے علاوہ بھی حکومت مختلف ٹیکس وصول کرتی ہے، مثلاً گاڑیوں کی رجسٹریشن، ڈرائیونگ لائسنس اسلحہ لائسنس، بجلی، گیس، ریلوے، ڈاک ٹکٹ، فون اور ٹول ٹیکس جیسے مختلف عنوانات سے ٹیکس عام معمول کا حصہ ہے۔

جدید دور میں حکومتی انتظامات کے لیے ٹیکس کی ضرورت سے انکار مشکل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موجودہ ٹیکسیشن کے نظام میں خامیاں موجود ہیں، لیکن حکومت کو عوام کی مفادات کے لیے کسی حد تک مخصوص طبقہ پر ٹیکس کی گنجائش پائی جاتی ہے، جہاں گنجائش پائی جاتی ہے، وہاں حکومت کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ ظالمانہ ٹیکس سے اجتناب کرے اور بقدر ضرورت قابل تحمل اور آسان طریقہ کار وضع کرے، جو ایذارسانی کا باعث نہ ہو اور ٹیکس کی رقم ملک وملت کی واقعی اور حقیقی مصلحتوں اور ضرورتوں پر خرچ کی جائے، ناجائز اور ظالمانہ ٹیکس لگانا اور عوام سے وصول کرنا حکومت کے لیے شرعاً جائز نہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں دیگر ممالک کی طرح ٹیکسیشن کا نظام مستحکم نہیں اور عوام کو لینے کے دینے پڑتے ہیں۔ عوام تک ٹیکس کی وصولی کے فوائد کا ملنا نہایت مشکل ہے جس کی وجہ سے عوام چوری اور دھوکہ پر مجبور ہو جاتے ہیں، تاہم ان تمام تر حقائق کے باوجود جھوٹ اور دھوکہ کی کھلی چھٹی دینا بھی شرعاً جائز نہیں کہ جس کے جی میں آئے، جھوٹ بول کر چھٹکارا حاصل کرے، جھوٹ بولنا بہر حال گناہ کبیرہ ہے اور معاملات کے باب میں اس کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا ہے، لہٰذا اس سے احتراز کیا جائے۔

والدّليل على ذلك:

فإن لم يكن في بيت المال شيء، فالإمام يجبر الناس على كريه إحياء لمصلحة العامة.....يخرج له من كان يطيقه، ويجعل مؤنته على المياسير الذين لا يطيقون بأنفسهم.(١)

ترجمہ: اگر بیت المال خالی ہو تو امام لوگوں کو مجبور کرے گا کہ نہر کو بناؤ، تا کہ ان کی مصلحت فوت نہ ہو اور کھدائی کی اجرت مال داروں پر ہوگی۔ بادشاہ نہر کی کھدائی کے لیے ان اشخاص کا تقرر کرے گا جو کھدائی کا کام کر سکیں اور ان کی اجرت مال داروں پر ہوگی جو خود کھدائی کا کام نہیں کر سکتے۔



(١) الهداية، كتاب احياء الموات، فصل في كرى الانهار: ٤٩١/٤

كتاب الجنايات

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

کسی انسان سے سرزد ہونے والا ہر وہ عمل جو کسی دوسرے شخص کے لیے جانی یا مالی نقصان کا سبب بن جائے، جنایت کہلاتا ہے۔ فقہی نقطۂ نظر سے جنایت کا اطلاق قتل، جرح، اتلاف؛ سب پر ہوتا ہے۔ حج یا عمرے کے دوران حرم یا احرام کی عظمت یا ان کے شرعی احکام میں کمی بیشی کو بھی جنایت کہتے ہیں۔ فقہائے کرام ان میں سے ہر ایک جنایت کو ان کے خاص مقام (مثلاً: کتاب الحدود، قصاص، غصب، سرقہ، ضمان، دیات اور حج وغیرہ) پر ذکر کرتے ہیں، تاہم کتاب الجنایات میں خاص طور پر ان افعال اور جرائم کا ذکر ہوتا ہے جن کا تعلق خاص طور پر انسانی جسم اور اعضا سے ہوتا ہے۔(۱)

شریعت مطہرہ میں انسانی جان، مال، عقل، نسل اور دین کو "مقاصدِ شرع" اور ضروریات کے نام سے جانا جاتا ہے۔(۲) یہ وہ امور ہیں جن کی رعایت اور پاس داری میں شریعت کسی بھی پس وپیش کی قائل نہیں، بلکہ جو شخص ان امور کی اہانت اور اتلاف کی کوشش کرے، شریعت اس کو معاشرے کے لیے عبرت ناک انجام بنانے کے درپے رہتی ہے۔ کتاب الجنایات، حدود اور قصاص میں ان ہی مقاصدِ شرعیہ سے بحث ہوتی ہے۔

لغوی تحقیق:

جنایت کے اصل معنی درخت سے پھل توڑنے کے ہیں، عموماً کسی جرم یا غلطی کے ارتکاب کرنے پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ علامہ جرجانی فرماتے ہیں کہ ہر وہ ممنوع کام جس سے کسی کی جان یا مال کو ضرر پہنچے، جنایت

---

۱) المغني مع الشرح الكبير، عبدالله بن قدامة، كتاب الجرح، المكتبة التجارية المكة المكرمة:۹/۳۱۹، حاشية طحطاوي على مراقي الفلاح، أحمد الطحطاوي، كتاب الحج، باب الجنايات: ص۶۰۹، نور محمد كارخانه تب، آرام باغ كراچي، الاختيار لتعليل المختار، الموصلي عبدالله بن محمود، كتاب الجنايات: ۵/۲۲، دار المعرفة بيروت لبنان

۲) الموافقات للشاطبي: ۲/۴

کہلاتا ہے۔(۱)

اصطلاحی تعریف:

الجنایة شرعاً اسم لفعل محرم حلّ بمال أو نفس.(۲)

جنایت شریعت کی اصطلاح میں اس ممنوع اور حرام فعل کے ارتکاب کو کہتے ہیں جو کسی کے مال یا نفس پر واقع ہو جائے۔

فقہائے کرام نے لفظِ جنایت کو انسانی جان اور اعضا کے ساتھ خاص کیا ہے اور مال کے لیے وہ الگ اصطلاح غصب، سرقہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ تاہم جرم اور جریمۃ ایسے عام الفاظ ہیں، جو ان تمام ممنوعہ افعال کو شامل ہو سکتے ہیں۔(۳)

حکم کے اعتبار سے جنایات کی اقسام:

جنایت کی تین مختلف صورتیں ہیں:

(۱) جنایة علی النفس، یعنی قتل

(۲) جنایة علی مادون النفس، یعنی قتل سے کم درجے کی جنایت جس سے موت واقع نہ ہو۔

(۳) جنایة علی الجنین، یعنی پیٹ میں موجود بچے پر جنایت۔

پھر ان جنایات کا اجمالی حکم دو قسم پر ہے:

(۱) اخروی حکم: اخروی حکم کے اعتبار سے ہر وہ فعل جس سے کسی شخص کی جان، مال اور عزت کو نقصان پہنچے، حرام اور موجبِ گناہ ہے۔(۴)

(۲) دنیوی حکم: دنیوی حکم کے اعتبار سے جنایت کی مختلف صورتوں پر مندرجہ ذیل احکام مرتب ہوتے ہیں:

قصاص، دیت، ارش، حکومتِ عدل، کفارہ، حرمان عن المیراث اور حرمان عن الوصیۃ۔(۵)

---

(۱) محمد بن منظور الأفریقي، لسان العرب، مادة جنی: ۲/۳۹۲، دار إحیاء التراث العربي، الجرجاني، السید الشریف، کتاب التعریفات، مادة الجنایة (۵۱۳): ص ۵۷، دار المنار للطباعة

(۲) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الجنایات: ۱۰/۱۵۵

(۳) الأحکام السلطانیة، الماوردي علي بن محمد، الباب التاسع عشر في أحکام الجرائم: ص ۲۹۲

(٤) الصحیح للبخاري، کتاب العلم، باب رب مبلغ أوعی من سامع: ۱/۱۶

(۵) الموسوعة الفقهیة، مادة، جنایة: ۱۶/۵۹، ۶۰، وزارة الأوقاف والشئون الإسلامیة الکویت

کتاب الجناية کی اصطلاحات:

جاني: جرم کرنے والا۔

مجني عليه: جس شخص کے اوپر جنایت واقع ہو جائے۔

جناية: جرم، زیادتی۔

ذیل میں جنایت کی تینوں صورتوں کی تفصیل پیش کی جارہی ہے:

جناية على النفس (قتل) کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم:

حنفیہ کے ہاں حکم اور ارادے کے اعتبار سے قتل کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) قتل عمد:

عمد سے مراد وہ قتل ہے جس میں ہتھیار یا کسی ایسی چیز کا استعمال کیا جائے جس میں اجزائے جسم کو ٹکڑے کر دینے کی صلاحیت موجود ہو، جیسے: تلوار، دھاری دار لکڑی، نوک دار پتھر، بانس کا دھاری دار حصہ، آگ یا موجودہ زمانہ میں گولی وغیرہ۔ دراصل قتلِ عمد وہ ہے جس میں مجرم کا ارادہ قتل ہی کا ہو البتہ ارادہ قتل ایک باطنی چیز ہے، لہٰذا ایسے آلات کا استعمال جو قتل ہی کے لیے استعمال کیے جاتے ہوں، اس کے حق میں ارادۂ قتل کی دلیل ہے۔(۱)

جن چیزوں سے عام طور پر ہلاکت واقع ہوتی ہو، جیسے: بڑا پتھر اور لکڑی کا سل وغیرہ؛ تو صاحبین اور ائمہ ثلاثہ سب کے ہاں یہ بھی قتلِ عمد شمار ہوگا، کیوں کہ اصل اعتبار آلہ کا نہیں، بلکہ فاعل کے ارادہ اور اس کے فعل کو ہے۔(۲)
اسی طرح کسی کا گلا گھونٹنا، کسی اونچی جگہ سے گرانا، گہرے پانی میں پھینکنا، آگ میں گرانا، کسی درندے کے سامنے پھینکنا، زبردستی زہر دے کر مارنا، قید کر کے کھانا پینا بند کرنا؛ یہ سب قتلِ عمد کی صورتیں ہیں، اس لیے کہ عام طور پر ان چیزوں سے موت واقع ہوتی ہے۔ یہ رائے جمہور کی ہے، امام ابوحنیفہؒ کے ہاں یہ تمام صورتیں شبہ عمد کی ہیں(۳)

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الأول في تعريف الجناية وأنواعها وأحكامها: ٦/ ٢،

(۲) الاختيار لتعليل المختار، كتاب الجنايات: ٥/ ٢٤، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير، الدسوقي، محمد عرفة، باب في الدماء، قولة: (وإن بقضيب) ٦/ ١٨٤، دار الكتب العلمية بيروت لبنان

(۳) المغني على الشرح الكبير، كتاب الجراح، أنواع القتل بغير المحدود وأحكامها: ٩/ ٣٢٥ ـ ٣٣١، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الجنايات، مبحث شريف: ١٠/ ١٨٦، ١٨٧، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير، باب في الدماء قوله: (وليس في كلامه تكرار): ٦/ ١٨٤

قتلِ عمد کے احکام:

(۱) قتلِ عمد کی وجہ سے قصاص واجب ہوتا ہے۔

(۲) اگر مقتول کے ورثا دیت لینے پر آمادہ ہو جائیں اور قاتل بھی دیت دینے پر تیار ہو تو قاتل کے ذمے دیت واجب ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر قصاص کسی شبہ کی وجہ سے ثابت نہ ہو سکے تو پھر بھی دیت واجب ہوگی، تاہم یہ دیت قاتل کے ذمہ ہوگی، نہ کہ عاقلہ کے ذمے۔

(۳) قاتل اگر مقتول کا وارث ہو تو میراث سے محروم ہو جاتا ہے۔

(۴) مقتول نے اگر قاتل کے لیے کوئی وصیت کی ہو تو قاتل اس وصیت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔(۱)

(۵) اخروی اعتبار سے شدید گناہ ہے، یہاں تک کہ قرآن نے اس کو دائمی عذابِ جہنم کا باعث بتایا ہے۔(۲)

(۶) قتلِ عمد میں کفارہ واجب نہیں ہوتا، کیوں کہ کفارہ میں ایک پہلو عبادت کا بھی ہے اور قتلِ عمد گناہ کبیرہ ہے، اس لیے کفارہ اس کے لیے مناسب نہیں۔(۳)

(۲) قتل شبہ عمد:

شبہ عمد ایسی چیز سے قتل کرنے کا نام ہے جو نہ ہتھیار ہو اور نہ ہتھیار کے درجہ کی چیز ہو، جیسے: بڑا پتھر اور لکڑی۔ یہ تعریف امام ابوحنیفہؒ کی ہے۔ صاحبین اور جمہور کے ہاں شبہ عمد ایسی چیزوں سے بالقصد مارنے کو کہتے ہیں جن سے عام طور پر ہلاکت واقع نہیں ہوتی۔

شبہ عمد کے احکام:

(۱) شبہ عمد میں چونکہ قاتل کا ارادۂ قتل مشتبہ اور مشکوک ہے کیونکہ آلۂ قتل استعمال نہیں کیا، اس لیے شبہ کی وجہ سے اس میں قصاص نہیں۔

(۲) کفارہ واجب ہوگا۔ جو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا یا دو ماہ مسلسل روزے رکھنا ہے۔

(۳) قاتل گناہ گار ہوگا۔

---

(۱) الهداية مع فتح القدير، كتاب الوصايا، باب صفة الوصية: ۹/ ۳۵۰ مكتبه حقانية بشاور، بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في بيان مايسقط القصاص بعد وجوبه: ۱۰/ ۳۰۰

(۲) النساء: ۹۳

(۳) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الأول في تعريف الجناية وأنوعها وأحكامها: ۶/ ۲، الاختيار لتعليل المختار، كتاب الجنايات: ۵...... ۲۳، ۲۴، ردالمحتار على هامش الدرالمختار، كتاب الجنايات: ۱۰/ ۱۵۷، ۱۵۸

(۴) عاقلہ پر دیتِ مغلظہ واجب ہوگی۔

(۵) شبہ عمد کے ذریعے اگر کسی عضو کو نقصان پہنچے تو یہ عمد کے حکم میں ہوگا اور اس عضو کا قصاص ہوگا۔

(۶) شبہ عمد کی وجہ سے بھی قاتل میراث اور وصیت سے محروم رہے گا۔(۱)

(۳) قتلِ خطا:

قتلِ خطا وہ ہے جس میں قتل کا ارادہ نہ ہو۔ خطا کی دو صورتیں ہیں:

(۱) قصد و ارادہ میں غلطی ہوگئی، جیسے: شکار سمجھ کر گولی چلائی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شکار نہیں، آدمی تھا۔

(۲) اس کے فعل میں غلطی واقع ہوگئی، جیسے: گولی کسی اور شے پر چلائی، لیکن نشانہ چوک گیا اور آدمی کو لگ گئی۔

قتلِ خطا کے احکام:

(۱) کفارہ واجب ہوگا، البتہ کفارہ کے لیے قاتل کی جانب میں اسلام، عقل اور بلوغ تینوں شرط ہیں۔(۲)

(۲) عاقلہ پر عام دیت واجب ہوگی، نہ کہ دیتِ مغلظہ۔

(۳) قاتل میراث اور وصیت سے محروم ہوگا۔

(۴) قتل کا گناہ تو نہیں، لیکن غفلت و بے توجہی کا گناہ ہوگا۔(۳)

(۴) قائم مقام خطا:

یہ وہ قتل ہے جس میں قاتل کے فعلِ اختیاری کو دخل نہ ہو، جیسے: ایک شخص سویا ہوا تھا، نیند ہی میں کروٹ لی اور کسی پر آپڑا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی یا کوئی شخص چھت سے گر گیا اور کسی انسان پر آپڑا یا اس کے ہاتھ سے کوئی وزنی چیز گر گئی اور کسی آدمی کو لگ گئی یا اس کی سواری نے انسان کو روند کر مار ڈالا۔ ان تمام صورتوں کا حکم بالکل وہی ہے جو

---

(۱) فتح القدير، كتاب الجنايات، فصل في صفة الوصية: ۹/۳۵۰، بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في بيان مايسقط القصاص بعد وجوبه: ۱۰/۲۹۹، ۳۰۰، الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الأول في تعريف الجناية وأنواعها وأحكامها: ۶/۳، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الجنايات: ۱۰/۱۵۸-۱۶۰، الاختيار لتعليل المختار، كتاب الجنايات: ۵/۲۴، ۲۵

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في بيان مايسقط القصاص بعد وجوبه: ۱۰/۳۰۱

(۳) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الأول في تعريف الجناية وأنواعها وأحكامها: ۶/۳، الاختيار لتعليل المختار: ۵/۲۵، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الجنايات: ۱۰/۱۶۰

قتلِ خطا کا ہے۔(۱)

(۵) قتل بالسبب:

قتل بالسبب سے مراد یہ ہے کہ وہ بالواسطہ ہلاکت کا باعث بنا ہو، جیسے: دوسرے کی زمین میں بلا اجازت کنواں کھود دے یا راستہ میں پتھر وغیرہ رکھ دے اور کنویں میں گر کر یا راستہ میں ٹھوکر کھا کر کسی کی موت واقع ہو جائے۔

قتل بالسبب کا حکم:

(۱) عاقلہ پر دیت ہوگی۔

(۲) قتل کا گناہ تو نہیں، البتہ دوسرے کی ملک میں کنواں کھودنے اور راستہ میں پتھر رکھنے کا گناہ اس کے ذمے ہوگا۔

(۳) قصاص اور کفارہ نہیں۔

(۴) میراث اور وصیت سے محروم نہیں ہوگا، بلکہ دوسرے ورثا کی طرح میراث اور وصیت کا حق دار ہوگا۔(۲)

جنایۃ علی مادون النفس، یعنی قتل سے کم درجے کی جنایت جس سے موت واقع نہ ہو:

ہر وہ فعل جس سے کوئی عضو بدن سے کٹ جائے، زخمی ہو جائے یا اس کے منافع ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں یا اُس سے سر میں زخم آ جائے، سب کے سب جنایت علی مادون النفس کے زمرے میں داخل ہیں۔

علامہ کاسانیؒ کے ہاں جنایت علی مادون النفس کی چار قسمیں ہیں:

(۱) إبانة الأطراف، یعنی اعضاء کو جدا کرنا۔

(۲) عضو موجود ہو، لیکن اپنا مخصوص کام کرنا چھوڑ دے۔

(۳) چہرے اور سر کے زخم (شجاج)

(۴) چہرے اور سر کے علاوہ زخم (جراح)۔(۳)

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الأول في تعريف الجناية وأنواعها وأحكامها: ٦/٣، الاختيار لتعليل المختار كتاب الجنايات: ٥/٢٦، دار المعرفة بيروت لبنان

(۲) الاختيار لتعليل المختار كتاب الجنايات: ٥/٢٦، الفتاوى الهندية، كتاب الجنايات، الباب الأول في تعريف الجناية وأنواعها وأحكامها: ٦/٣، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الجنايات: ١٠/٦٢، ١٦١

(۳) بدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في الجناية على مادون النفس: ١٠/٣٩٦-٣٩٨

احکام:

اخروی حکم کے اعتبار سے تو ہر ایسا اقدام حرام اور ممنوع ہے، تاہم دنیا کے اعتبار سے اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) اگر جنایت عمداً ہو تو اس میں قصاص واجب ہوگا، بشرطیکہ قصاص کی تمام شرائط موجود ہوں۔

(۲) اگر جنایت خطاءً ہو یا عمداً ہو، لیکن قصاص کی شرائط موجود نہ ہوں تو دونوں صورتوں میں یا تو دیت واجب ہوگی یا ارش یا حکومت عدل۔(۱)

جنین کی جنایت:

یہ جنایت کی تیسری قسم ہے۔ جنین ماں کے پیٹ میں موجود بچے کو کہتے ہیں۔ حنفیہ کے ہاں اگر کوئی شخص کسی حاملہ عورت کو مارے یا کوئی اور جنایت کرے جس کے نتیجے میں اس کا مردہ بچہ پیدا ہو جائے (مذکر ہو یا مؤنث) تو اس میں مارنے والے کے عاقلہ پر ''غرہ'' یعنی پوری دیت کا بیسواں حصہ (۵۰۰ درہم یا ۵۰ دینار) واجب ہوگا۔

جنین کی زندگی کا چونکہ کسی کو قطعی علم نہیں ہوتا، اس لیے اس میں غرہ کا وجوب استحساناً ہے، یہی رائے دوسرے فقہا کی بھی ہے۔

جنین پر جنایت کی چند اور صورتیں:

(۱) اگر جنین زندہ پیدا ہوا اور پھر مر گیا تو اس کے عاقلہ پر دیت ہوگی اور اس پر کفارہ قتل ہوگا۔

(۲) اگر جنین مردہ پیدا ہوا اور اس ضرب کی وجہ سے ماں مر گئی تو دیت اور غرہ دونوں واجب ہوں گے۔

(۳) اگر جنایت کی وجہ سے ماں پہلے مر گئی پھر مردہ بچہ پیدا ہوا تو صرف دیت ہوگی غرہ نہیں۔

(۴) اگر ماں کے مرنے کے بعد بچہ زندہ پیدا ہو کر مر گیا تو اس پر دو دیتیں واجب ہوں گی۔

(۵) جنین کے مرنے کے بعد غرہ کا مال جنین کے ورثا کے مابین شرعی اصول کے مطابق تقسیم ہوگا، البتہ اگر مارنے والا بھی ورثا میں سے ہو تو وہ محروم رہے گا۔(۲)

❁❁❁❁❁

(۱) الموسوعة الفقهية،مادة جناية على مادون النفس:۱٦/٦٣،٦٤،بدائع الصنائع، كتاب الجنايات،فصل في الجناية على مادون النفس:۱۰/۳۹٦۔۳۹۸

(۲) الاختيار لتعليل المختار، كتاب الديات،فصل في حكم من ضرب بطن امرأة فألقت جنيناً ميتاً:٥/٤٤،٤٥،بدائع الصنائع،كتاب الجنايات، فصل في الجناية على الجنين:۱۰/٤٥٥۔٤٥٧

مسائل کتاب الجنایات

حملہ آور شخص کو قتل کرنا

سوال نمبر(193):

ایک بالغ لڑکے نے اپنے گھر کی چھت پر کسی کی آہٹ محسوس کی۔اوپر جا کر دیکھا تو اچانک اس پر فائرنگ شروع ہوگئی۔معلوم ہوا کہ کوئی چور ہے۔اس لڑکے نے بھی اس سمت پر فائرنگ کی۔رات کی تاریکی میں پتہ نہیں چلا، صبح کے وقت ایک لاش گھر کی حدود میں ملی۔بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑکے کی فائرنگ سے ہلاک ہوا ہے۔جس گھر میں یہ واقعہ پیش آیا، یہ پہاڑی علاقہ میں واقع ہے۔کیا اس لڑکے پر شرعاً قصاص یا دیت ہے؟مقتول کے ورثا مصالحت پر راضی ہیں کیا اس میں مصالحت ممکن ہے اور قبائلی روایات کے مطابق مقتول کے ورثا کا چار عورتوں اور دو سو گائے کا مطالبہ کیا درست ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعت کی رُو سے جان یا مال کی حفاظت کے لیے اقدام قتل کرنے والے قاتل پر کچھ لازم نہیں ہوتا، تاہم جان یا مال کی حفاظت کا محض بہانہ بنا کر کسی کو قتل کرنے والا قصاص یا دیت سے چھٹکارہ نہیں پاسکتا۔

مسئولہ صورت میں اگر حسبِ بیان واقعی قتل جان یا مال کی حفاظت کی غرض سے ہوا ہو اور یہ مبرہن اور مسلم ہو تو قاتل پر کچھ لازم نہیں، کیوں کہ مشاہر (حملہ آور) کا خون مباح ہے، لیکن اگر ذاتی رنجش اور خاندانی تنازعات کی بنیاد پر قتل کیا ہو اور واقعہ فرضی ہو تو قاتل پر قصاص لازم ہوگا البتہ اگر مقتول کے اولیا مصالحت پر رضامند ہوں تو مصالحت کی راہ اختیار کرنا شرعاً جائز ہے۔مصالحت میں گائے لینے کی گنجائش ہے تاہم قبائلی روایات کے مطابق عورتوں کو ''سورہ'' میں دینا یا لینا ہرگز جائز نہیں۔یہ شریعت کی کھلی خلاف ورزی شمار ہوگی۔

والدّلیل علی ذلک:

إذا شهر علی رجل سلاحاً فقتله، أو قتله غيره دفعاً عنه، فلا يجب بقتله شيء، ولا يختلف بين أن يكون بالليل أو النهار في المصر أو خارج المصر.(۱)

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الجنايات، الباب الثاني فيمن يقتل قصاصاً ومن لا يقتل: ٦/٧

ترجمہ:

جب کوئی شخص کسی آدمی پر اسلحہ تان لے اور وہ یا کوئی اور دفع کرنے کے لیے اس کو قتل کرے تو اس کے قتل سے کچھ لازم نہیں ہوتا، چاہے دن ہو یا رات، شہر ہو یا شہر سے باہر۔

❁❁❁

خوف کی وجہ سے مقابل فریق کو قتل کرنا

سوال نمبر (194):

ہمارا جائیداد پر خاندانی تنازعہ ہے۔ مقابل فریق ہمارے قتل کے درپے ہے۔ ایک دفعہ وہ قتل کی کوشش بھی کر چکا ہے۔ کیا ایسے موقع پر اپنے قتل کے خوف سے مقابل فریق پر قتل کا اقدام شرعاً درست ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات میں معزز اور مکرم بنایا ہے اور اس کی جان، مال یا آبرو پر ہاتھ اُٹھانے کو حرام قرار دیا ہے۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کی جان پر ہاتھ اُٹھانا سنگین جرم ہے۔ سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ نے کسی کو ناحق عمداً قتل کرنے کی سزا ابدی جہنم بتائی ہے۔ احادیث میں بھی اس پر سخت وعیدیں وارد ہیں۔ پیغمبر پاک ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں اپنی امت کو دوسری تعلیمات کے ساتھ آپس میں قتل وقتال سے بھی سختی سے منع فرمایا۔

البتہ بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں کسی شخص کا خون مباح ہو جاتا ہے اور حاکم وقت ایسے شخص کے قتل کا مختار اور مجاز رہتا ہے، مثلاً ڈاکو (راہزن) یا ناحق قتل کرنے والا (قاتل) یا مرتد (دین اسلام سے پھرنے والا)؛ ان کو حاکم قتل کی سزا دینے کا مجاز ہے۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کو اپنی حفاظت کرنی چاہیے لیکن کسی کو محض اس خوف سے قتل کرنا کہ کہیں میں اس کا شکار نہ بنوں، ہرگز جائز نہیں۔ تاہم اگر دشمن کسی پر حملہ آور ہو اور قتل کی دھمکی دے دے یا قتل کی نیت سے اسلحہ اٹھائے اور یہ یقین ہو جائے کہ یہ مجھے قتل کرے گا اور بچنے کی کوئی صورت بظاہر معلوم نہیں ہوتی، بجز اس حملہ آور کے قتل کرنے کے تو ایسی صورت میں اپنی جان کی حفاظت کی غرض سے مدمقابل کو قتل کرنا جائز ہے۔ البتہ جہاں تک ممکن ہو، قتل سے احتراز

کرنا ضروری ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

والأصل في هذا أن من قصد قتل إنسان لاينهدر دمه، ولكن ينظر إن كان المشهور عليه، يمكنه دفعه عن نفسه بدون القتل لايباح له القتل، وإن كان لايمكنه الدفع إلا بالقتل يباح له القتل ؛لأنه من ضرورات الدفع.(۱)

ترجمہ:

قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کے قتل کا ارادہ کرے تو مطلقاً حملہ آور کا خون مباح نہیں ہوتا، بلکہ دیکھا جائے گا کہ جس پر حملہ کیا ہے اگر اس کے لیے اس حملہ آور کو بغیر قتل کے اپنے آپ سے دفع کرنا ممکن ہو تو پھر اس کا قتل مباح نہ ہوگا اور اگر بدون قتل دفع کرنا ممکن نہ ہو تو پھر اس کا قتل مباح ہے، کیوں کہ اب قتل کرنا دفع کرنے کی ضرورت میں داخل ہوگیا۔

❁❁❁

مجنون بیٹے کا باپ کو قتل کرنا

سوال نمبر(195):

ایک لڑکا مجنون ہے۔ حالتِ جنون میں اس نے اپنے باپ کو مار ڈالا۔ کیا اب باپ کے میراث میں اس کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعت کی رُو سے باپ کو قتل کرنا جرم عظیم ہے۔ اس میں قصاص کی سزا کے ساتھ ساتھ قاتل بیٹا میراث سے بھی محروم رہتا ہے، لیکن اگر بیٹا بوقتِ قتل ناسمجھ بچہ یا مجنون ہو اور باپ کو قتل کرے تو مرفوع القلم ہونے کی وجہ سے اس پر نہ قصاص جاری ہوگا نہ ہی میراث سے محروم ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر بیٹے کا جنون مبرہن اور مسلّم ہو تو باپ کے قتل کے باوجود اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا اور نہ ہی اسے میراث سے محروم کیا جائے گا۔

(۲) بدائع الصنائع، کتاب قطاع الطريق، فصل في المقطوع فيه: ۹/۳٦٥

والدّلیل علی ذلک:

وأمّا الصبي والمجنون إذا قتل مورثه لم یحرم المیراث.(۱)

ترجمہ:

بچہ اور مجنون جب اپنے مورث کو قتل کریں تو وہ میراث سے محروم نہیں ہوتے۔

❀❀❀

غیر مستند ڈاکٹر کا کلینک کھولنا

سوال نمبر(196):

ایک شخص نے کوئی میڈیکل کورس نہیں کیا ہے۔صرف ڈسپنسر کورس کیا ہے۔چند ماہ کسی ماہر ڈاکٹر سے تربیت حاصل کی ہے۔اب کلینک کھولتا ہے، حالانکہ ڈسپنسر کورس کیے ہوئے کے لیے قانوناً پرائیویٹ کلینک کھولنا منع ہے۔کیا ایسے غیر کوالیفائیڈ اور غیر مستند ڈسپنسر کا مریضوں سے فیس لینا جائز ہے؟اگر ایسے برائے نام ڈاکٹر کے غلط دوا تجویز کرنے سے کوئی ہلاک ہو جائے تو قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ شرعاً اس کی سزا کیا ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسا شخص جو مستقل میڈیکل ڈگری (ایم بی بی ایس وغیرہ) کا سرٹیفیکیٹ نہ رکھتا ہو اور نہ کسی تجربہ کار اور ماہر ڈاکٹر کی زیرنگرانی رہ کر تربیت حاصل کی ہو تو ایسے غیر مستند اور غیر ماہر شخص کے لیے کلینک کھولنا اور لوگوں کا علاج معالجہ کرنا کسی صورت میں درست نہیں، یہ اخلاقی اور قانونی لحاظ سے سنگین جرم ہے۔ایسے جاہل طبیبوں سے علاج کرنا بھی شرعاً ممنوع ہے، کیوں کہ علاج معالجہ کے سلسلہ میں تجربہ کار اور سند یافتہ ڈاکٹر سے رجوع بدن کا حق بنتا ہے اور صحت کے حوالہ سے قابل توجہ امر ہے، البتہ اگر کسی شخص نے مکمل کورس نہیں پڑھا لیکن کسی ماہر طبیب کی زیرِ تربیت رہ کر طب سے خوب آگاہی رکھتا ہو اور دواؤں کے مفید اور مضر پہلو سے باخبر ہو اور ماہر ڈاکٹر کی اجازت سے پریکٹس کرتا ہو تو ایسے شخص کے لیے رخصت ہے اور اس کے عوض اجرت (فیس) لینا بھی درست ہے۔

---

(۱) المبسوط، کتاب الفرائض، باب میراث القاتل

اگر ماہر ڈاکٹر کے علاج سے مریض کی ہلاکت واقع ہوئی اور دوائی وعلاج مرض کے مطابق تھا اور بظاہر مریض کی ہلاکت میں ڈاکٹر کا منفی قصدواراده شامل نہ ہوتو ایسے ڈاکٹر پر قتل کا الزام درست نہیں۔ نیز اس سے دیت یا تاوان وغیرہ کا مطالبہ بھی درست نہیں۔ تاہم حکومت کے لیے غیر تجربہ کار اور نااہل اطبا پر عبرت اور تعزیر کی سزا قانوناً مقرر کرنا حکمت سے خالی نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

روي عن أبي حنيفةؒ: أنه كان لايجري الحجرإلاعلى ثلاثة: المفتي الماجن، والطبيب الجاهل، والمكاري المفلس. (١)

ترجمہ:

امام ابوحنیفہؒ کے ہاں تین افراد کے علاوہ کسی پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی ہے، وہ تین یہ ہیں: جاہل مفتی، جاہل طبیب اور دیوالیہ کرایہ دار۔

سئل في طبيب ذمي غيرجاهل، طلبت منه امرأة مريضة دواء لها، فأعطاها دواء، شربته بنفسها في بيتها، فزعم ابنها أنه ازداد مرضها بالدواء المذكور، وأن الطبيب يلزمه ديتها إذا ماتت من المرض المرقوم، فهل لايلزمه شيء ولاعبرة بزعمه ؟(الجواب) نعم.(٢)

ترجمہ:

(سوال) ایک ذمی باخبر طبیب سے مریض عورت نے دوائی مانگی، اس نے دوائی دی، عورت نے گھر جاکر دوائی پی لی اس کے بیٹے نے گمان کیا کہ اس طبیب کی دوائی سے مرض بڑھ گیا اور طبیب پر عورت کی دیت لازم ہوئی، جب عورت اس مرض سے مرگئی۔ کیا ایسا نہیں کہ طبیب پر کچھ لازم نہیں اور بیٹے کے گمان کو کچھ اعتبار نہیں؟ جواب: ہاں طبیب پر کچھ لازم نہیں۔

۞۞۞

(١) بدائع الصنائع، کتاب الحجر والحبس: ٨٢/١٠

(٢) تنقیح الحامدیة، کتاب الجنایات: ٢٨٢/٢

نابالغ جنایت کرنے والے کے تاوان کی ذمہ داری

سوال نمبر(197):

دو نابالغ بچوں کے مابین کسی بات پر لڑائی ہوئی۔ ایک نے دوسرے کی آنکھ پھوڑ دی اور اس کی آنکھ ضائع ہوئی اس کا باپ تاوان کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیا اس کو مطالبہ کا حق ہے؟ اور تاوان کون ادا کرے گا؟ کیوں کہ جنایت کرنے والا مجرم بچہ (نابالغ) ہے۔

بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

مسئولہ صورت میں اگر چہ جنایت کرنے والا بچہ غیر مکلف ہے، لیکن دوسری طرف جس کی آنکھ جیسی قیمتی عضو ضائع ہے، وہ بھی معصوم بچہ ہے، لہٰذا شریعت دونوں کی رعایت کرتے ہوئے عاقلہ پر نصف دیت لازم کرتی ہے، تاہم عاقلہ کا نظام جہاں موجود نہ ہو وہاں دیت جانی (جنایت کرنے والے) کے مال سے ادا کی جاتی ہے، لیکن جانی نابالغ ہونے کی وجہ سے مذکورہ دیت اس کے والد پر لازم ہے۔

والدّليل على ذلك:

ولا قصاص بين الصبيان في النفس أو فيما دونها، وإذا جنى الصبي على رجل في النفس أو فيما دونها، فلا قود عليه ؛لأن عمد الصبي خطاءٌ و كذلك المعتوه و كذلك المجنون إذا أصاب في حال جنونه ...... وعمد الصبي والمجنون في حال جنونه والمعتوه خطاء تعقله العاقلة.(١)

ترجمہ:

نفس اور اس سے کم جنایت کے بدلے میں دو بچوں کے مابین قصاص نہیں ہے اور جب کوئی بچہ کسی آدمی کو نفس سے مارے یا نفس سے کم جنایت کرے تو اس پر قصاص نہیں، کیوں کہ بچے کی عمداً جنایت کرنا خطا کے حکم میں ہے، اسی طرح جب کوئی معتوہ یا مجنون جنون کی حالت میں جنایت کرے۔۔۔۔ بچے، معتوہ اور مجنون کا جنون کی حالت میں جنایت کرنا خطا ہے جس کی دیت اس عاقلہ پر ہے۔

---

(١) المبسوط للشيباني، كتاب الديات، فصل القصاص: ٤٩٣/٥،٤٩٤

ولنا قوله عليه السلام: في العينين الدية ......وفي كل واحد من هذه الأشياء نصف الدية (١)

ترجمہ:

حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ دونوں آنکھیں (پھوڑ دینے میں) دیت ہے اور ان چیزوں میں سے ہر ایک میں نصف دیت ہے۔

❁❁❁

قتل وقتال میں دوسروں کے ساتھ تعاون کرنا

سوال نمبر(198):

ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے دشمنی چلی آرہی ہے۔خاندان والوں نے آپس میں معاہدہ کیا کہ قتل وقتال میں باہم شریک ہوں گے۔میں ایک صلح پسند آدمی ہوں۔جنگ وجدال سے طبعی نفرت ہے۔کیا میرے لیے اس معاہدہ کا نبھانا ضروری ہے؟اس معاہدہ سے روگردانی شرعاً گناہ تو نہیں؟

بيّنوا توجروا

الجواب وبالله التوفيق:

ناجائز قتل وقتال پر باہمی تعاون کا معاہدہ کرنا تعاون علی الاثم کے زمرہ میں آکر سراسر شریعت کے اصول سے متصادم ہے۔نہ ایسے معاہدات پر کاربند رہنا ضروری ہے نہ اس سے روگردانی پر کچھ گناہ لازم ہوتا ہے۔لہٰذا مسئولہ صورت میں سائل کے لیے ناجائز قتل وقتال پر کیے ہوئے معاہدہ سے روگردانی میں کوئی گناہ نہیں کیونکہ اس سے بچنا واجب ہے۔

والدّليل على ذلك:

قال تعالى: ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾(٢)

ترجمہ: گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو۔

❁❁❁

---

(١)الهداية، كتاب الديات، فصل في مادون النفس: ٥٨٢/٤

(٢) المائدة /٢

جان کی حفاظت کی ذمہ داری

سوال نمبر(199):

دوآدمیوں کے درمیان دشمنی ہے۔دونوں ایک دوسرے کے قتل کے درپے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے ایک دشمن کے سامنے اسلحہ کے بغیر جاتا ہے اور دشمن موقع پاکر اس کو قتل کردیتا ہے کیا اس کا یہ فعل خودکشی شمار ہوگا؟

بینوا تؤجروا

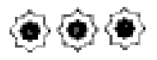
الجواب وباللّٰہ التوفیق:

قصداً اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا شرعاً جائز نہیں۔جہاں کہیں انسان کو اپنی جان کی ہلاکت کا خطرہ ہو اس کے باوجود وہ اس خطرہ کی جگہ بے احتیاطی سے جائے تو اگر وہاں جانے سے وہ قتل ہوا تو اس صورت میں وہ خود بھی گناہ گار ہو گا،کیوں کہ اس نے اپنے قصد وارادہ سے قاتل کو قتل کا موقع فراہم کیا۔تاہم مقتول کا یہ فعل خودکشی کے زمرہ میں نہیں آتا، کیونکہ مقتول خود اپنے نفس کے قتل کا مرتکب نہیں ہوا،البتہ سببِ ضعیف بننے کی وجہ سے گناہ گار ہے،قتل کی نسبت بہرحال قاتل کی طرف کی جائے گی۔اگر قتلِ عمد ہو تو حاکمِ وقت قاتل کو اس میں قصاصاً قتل کروائے گا۔

والدلیل علی ذلک:

قال تعالیٰ: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾.قال الآلوسي : واستدل بالأية علی تحریم الإقدام علی مایخاف منه تلف النفس.(۱)

ترجمہ: ’’اور خود کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں مت ڈالو۔‘‘علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ کوئی ایسا اقدام جس میں جان جانے کا خطرہ ہو،حرام ہے۔



قتلِ عمد میں قاتل کی مغفرت کیسے ہوگی؟

سوال نمبر(200):

ایک بھائی نے والد سے ساز باز کرکے اپنے ایک بھائی کو قتل کیا۔اب قاتل بھائی اپنے کیے پر بے حد

(۱) تفسیر روح المعانی،البقرۃ/۱۹۵ : ۷۸/۲

پشیمان ہے۔کیا توبہ سے اس کی بخشش ممکن ہے؟ بصورت دیگر اس کی بخشش کا طریقہ کار کیا ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی کو قتل کرنا یا قتل میں تعاون کرنا شرعاً حرام ہے۔اگر کوئی شخص کسی کو اپنے بیٹے کے قتل پر آمادہ کرے یا حکم دے تو تب بھی اُسے قتل کرنا جائز نہیں بلکہ اگر کوئی شخص کسی کو اپنے آپ کے قتل کا کہہ دے، تو اُس کا قتل بھی حلال نہیں، کیوں کہ جان اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہے، اس میں انسان مجاز نہیں۔ایسی صورت میں قاتل اور امر دونوں گناہ گار شمار ہوں گے، تاہم قصاص کی سزا صرف قاتل کو دی جائے گی۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے دربار میں مغفرت کی بات ہے تو قصاص اور استغفار کرنے سے قتل کا گناہ معاف ہوگا۔البتہ اگر اولیائے مقتول قصاص معاف کریں اور قاتل صدقِ دل سے استغفار بھی کرے تو دنیا میں قصاص ساقط ہو جائے گا، البتہ آخرت میں اگر مقتول معاف نہ کرے تو اس کی سزا بھگتنی پڑے گی، اور اگر وہاں مقتول بھی معاف کرے تو بغیر سزا کے مغفرت ممکن ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

قوله:(لاتصح توبة القاتل حتى يسلم نفسه للقود) أي لاتكفيه التوبة وحدها. واعلم أن توبة القاتل لاتكون بالاستغفار والندامة فقط، بل يتوقف على إرضاء أولياء المقتول، فإن كان القتل عمداً، لابد أن يمكنهم من القصاص منه، فإن شاؤوا قتلوه، وإن شاؤوا عفوا عنه مجانا، فإن عفوا عنه كفته التوبة ....وقال في مختار الفتاوى: القصاص مخلص من حق الأولياء، وأما المقتول، فيخاصمه يوم القيمة.(۱)

ترجمہ:

شارح کے قول: ''قاتل کی توبہ درست نہیں جب تک اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش نہ کرے'' کی تشریح میں ابن عابدین فرماتے ہیں: یعنی قاتل کے لیے صرف توبہ کافی نہیں۔جان لو کہ قاتل کی توبہ صرف استغفار اور ندامت سے نہیں ہوتی، بلکہ مقتول کے اولیا کی رضامندی پر موقوف ہے۔چنانچہ اگر قتلِ عمد ہو تو ضروری ہے کہ اولیائے مقتول

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الجنایات، مبحث شریف: ۱۰/۱۹۵

کو اپنے آپ پر قصاص کی قدرت دے دے۔ پھر اگر وہ چاہیں تو قتل کریں یا چاہیں تو مفت میں معاف کریں، اگر انہوں نے معاف کیا تو پھر توبہ کافی ہے..... مختار الفتاوی میں ہے کہ قصاص اولیا کے حق سے چھوٹنے کا ذریعہ ہے، اور جہاں تک مقتول کا حق ہے تو وہ قیامت کے دن اُس کے بارے میں جھگڑے گا۔

❁❁❁

بعض اولیا کا قصاص کو معاف کرنا

سوال نمبر (201):

بعض اولیا کے معاف کرنے سے قصاص ساقط ہو سکتا ہے یا نہیں یعنی اگر بعض اولیا قاتل کو معاف کریں تو دیگر اولیا قصاصاً قتل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مقتول کے ورثا میں کوئی ایک بھی قاتل کو معاف کرے یا صلح کر کے قیمت لینے پر راضی ہو جائے تو قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں مقتول کے کسی وارث کے لیے قاتل کو قتل کرنا شرعاً جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

إن صالح أحد الشركاء من نصيبه على عوض أو عفا، سقط حق الباقين عن القصاص.(١)

ترجمہ:

اگر قصاص لینے میں شریک اولیاے مقتول میں سے کوئی ایک بھی اپنے حصہ سے کسی عوض کے بدلے قاتل کے ساتھ صلح کرے یا اُسے معاف کرے تو باقی شرکا کا حق قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔

❁❁❁

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلح، الباب الاول في تعريف الصلح: ٢١٠٢٠/٦

عملیات کے ذریعے نقصان پہنچانے والے کا قتل

سوال نمبر(202):

ہمارا تعلق کوہاٹ سے ہے۔ ہمارا ایک رشتہ دار جو محکمہ تعلیم میں ملازم اور سابقہ تبلیغی ساتھی ہے۔ اس نے جنات پر دسترس حاصل کرنے کا چلہ کاٹا۔ گیارہ کافر جنات اس کے قبضہ میں آئے۔ اب وہ تبلیغی جماعت سے رابطہ منقطع کیے ہوئے ہے۔ نماز وغیرہ عبادات کا معاملہ بھی بگڑا ہوا ہے۔ تعویذ اور جناتی عمل سے لوگوں کو بیماریوں اور کاروبار کے بگاڑ میں مبتلا کرنا اس کا معمول بن گیا ہے۔ ہمارا رشتہ دار ہونے کے باوجود پچھلے کئی سالوں سے ہم کاروبار میں نقصان اٹھا رہے ہیں۔ ہمارے بکریوں کے فارم میں بلاکسی وجہ بکریاں ہلاک ہورہی ہیں اور گھر کے مختلف افراد بیماریوں میں جکڑے ہوئے ہیں جس کی نوعیت ڈاکٹروں کو بھی معلوم نہیں۔ کیا اس قسم کے ضرر رساں شخص کو قتل کیا جاسکتا ہے تاکہ مسلمان اس کے شر سے نجات پائیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مقدسہ نے مسلمانوں کے جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے اور کسی کو یہ اجازت نہیں دی ہے کہ وہ دوسرے کے جان، مال یا عزت وآبرو کو پائے مال کرے۔ اگر کسی شخص سے معاشرے کے اجتماعی مفادات کو نقصان پہنچتا ہو تو شریعت نے حاکم وقت کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ ایسے شخص کے لیے تعزیراً کوئی مناسب سزا تجویز کرے لیکن کسی فرد کے لیے انفرادی طور پر ایسا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

مسئولہ صورت میں اس شخص کے بارے میں آپ کا یہ گمان کرنا کہ یہ عملیات کے ذریعے مجھے نقصان پہنچا رہا ہے، محض گمان اور ظن ہے، کوئی یقینی بات نہیں اور گمان وتخمینہ سے کسی پر حکم لگانا جائز نہیں۔ لہٰذا آپ کے لیے ایسے شخص کو قتل کرنا ہرگز جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا کَثِیرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾ (۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو۔ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

(۱) الحجرات /۱۲



قال رسول الله ﷺ: لایحل دم امرئ مسلم یشهد أن لاإله إلا الله وأني رسول الله إلابإحدى الثلث: الثیب الزاني، والنفس بالنفس، والتارك لدینه المفارق للجماعة.(۱)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان آدمی یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اُس کا خون حلال نہیں، البتہ تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں: شادی شدہ زانی، جان کے بدلے جان، اور دین کو چھوڑنے والے جو جماعت سے الگ ہوں۔

❁❁❁

کسی کی بکری مارنے پر تاوان

سوال نمبر(203):

ایک شخص نے کسی کی بکری کو کھیت سے بھگانے کے لیے پتھر مارا جس کی وجہ سے وہ مرگئی۔ کیا اس شخص پر بکری کا تاوان آئے گا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

بکری کو پتھر مار کر ہلاک کرنے کی صورت میں مارنے والے پر بکری کی قیمت کے بقدر تاوان لازم ہوگا جو وہ مالک کو ادا کرنے کا پابند ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

إذا وجد في کرمه أوزرعه دابة رجل، وقد أفسدت شیئا، فحبسها صاحب الکرم أو الزرع، فهلکت، ضمن صاحب الکرم أو الزرع قیمتها.(۲)

ترجمہ: اگر کسی نے اپنے انگور کے باغ یا کھیتی میں دوسرے شخص کا جانور اس حال میں پایا کہ اُس نے باغ یا کھیتی کا نقصان کیا تھا، چنانچہ باغ یا کھیتی کے مالک نے اس کو پکڑ کر قید کر دیا اور قید میں وہ جانور مرگیا تو باغ یا کھیتی کا مالک اس کی قیمت کا ضامن (ذمہ دار) ہوگا۔

(۱) سنن الترمذی، ابواب الدّیات، باب ماجاء لایحل دم امرأ مسلم......:۱۶۸/۱

(۲) الفتاوی الهندیة، کتاب الجنایات، الباب الثاني عشر في جنایة: ۵۴/۶

گدھے کو مار کر ہلاک کرنا

سوال نمبر(204):

ایک شخص کا گدھا دوسرے کے گدھے کے ساتھ لڑنے لگا۔ مالک نے یہ دیکھ کر دوسرے گدھے کو خوب مارا، یہاں تک کہ وہ زخمی ہوا اور زخموں کی وجہ سے مرگیا۔ کیا اس شخص پر ضمان آئے گا حالانکہ اب وہ انکار کرتا ہے کہ میں نے نہیں مارا۔

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جب کوئی شخص کسی کے جانور کو مارے اور اُس سے وہ ہلاک ہو جائے تو مارنے والے پر تاوان لازم ہوتا ہے۔ مذکورہ صورت میں اگر ہلاک شدہ جانور کا مالک اس بات پر گواہ پیش کر سکے کہ واقعی اُس نے گدھا مارا اور زخمی کیا تھا تو ثبوت کے بعد اُس پر ضمان لازم ہوگا اور اگر گواہ پیش نہ کر سکے تو منکر کو قسم دی جائے، اگر قسم کھانے سے انکار کرے، تب بھی اس پر گدھے کی قیمت کا ضمان آئے گا اور اگر قسم اُٹھائے تو اس پر تاوان سے بری ہو جائے گا۔

والدّلیل علی ذلک:

لو أتلف أحد حيوانا ضمن قيمته. (۱)

ترجمہ:

اگر کوئی شخص کسی جانور کو ہلاک کردے تو وہ اس جانور کی قیمت کا ضامن (ذمہ دار) ہوگا۔

إن أنكر الضارب هلاكها بسبب ضربته، وأقام ربها عليه البرهان أن موتها بسبب الجرح، ضمنها، وإلالا ؛لأنه المدعي والأخر المنكر. (۲)

ترجمہ:

اگر مارنے والا انکار کردے اور یہ کہے کہ میرے مارنے کی وجہ سے یہ جانور ہلاک نہیں ہوا اور مالک اس بات

---

(۱) شرح المجلة لسليم رستم باز، الكتاب الثامن في الغصب، تحت المادة / ۹۴۰:ص/۵۳۳

(۲) الفتاوى الخيرية على هامش تنقيح الحامدية، كتاب الديات: ۲/ ۳۲۱

پر دلیل پیش کرے کہ اس جانور کی موت اسی زخم کی وجہ سے واقع ہوئی ہے تو اس صورت میں مارنے والا ضامن ہوگا، ورنہ نہیں، کیوں کہ وہ مدعی ہے اور دوسرا شخص منکر (مدعا علیہ) ہے۔

❁❁❁

عورت کی لاش ملنے کی صورت میں اس کے شوہر پر دعوی

سوال نمبر (205):

ایک شخص ذہنی مریض ہے۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں بیوی کو ماروں گا۔ ایک شب کمرے میں میاں بیوی نے رات گزاری، صبح کمرے میں عورت کی لاش ملی اور شوہر بھاگ گیا تھا، عورت پر ظاہری چند نشانات بھی ہیں، لیکن آلہ جارحہ کے نشانات نہیں ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کو شوہر نے مار ڈالا ہے۔ کیا مذکورہ صورتِ حال میں اس کے شوہر پر قصاص کا حکم لگایا جاسکتا ہے؟ یا اس سے دیت لی جائے گی؟ یا شرعاً اس کے لیے کوئی اور راہ ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جب لاش پر آلہ جارحہ کے اثرات نہیں تو اسے قتل عمد شمار نہیں کیا جاسکتا اور قبل از وقت شوہر کی باتیں ثبوتِ قتل کے لیے کافی نہیں، بالخصوص جب کہ شوہر نفسیاتی مرض کا بھی شکار ہے۔ تاہم اگر مردہ لاش پر پائے جانے والے نشانات قتل کی نشاندہی کرتے ہوں تو اس سے خاوند کو مجرم ٹھہرایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ چشم دید گواہ ہوں یا شوہر قسم سے انکار کرے، ایسی صورت میں اس سے دیت لی جاسکتی ہے اور اگر نشانات بھی نہ ہوں اور قسم سے انکار بھی کرے تو دیت لینا جائز نہیں۔ البتہ علاقائی وخاندانی حمیت کی بنا پر اگر دشمنی پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو مصالحت کی راہ تلاش کرنی چاہیے لیکن یاد رہے کہ جرگہ کسی کے قتل یا حد جاری کرنے کا مجاز نہیں۔

والدّليل على ذلك:

(ولا قسامة ولا دية في ميت لا أثر به، أو يسيل دم من فمه أو أنفه أو دبره بخلاف عينه وأذنه) لأن القسامة تجب في القتيل، وهذا ليس بقتيل، وإنما مات حتف أنفه، وفي مثله لا قسامة ولا غرامة.(١)

---

(١) تبيين الحقائق، كتاب الديات، باب القسامة: ٣٥٢/٧

ترجمہ: قسامت اور دیت اس میت میں نہیں ہے جس پر نشان نہ ہوں یا اس کے منہ، ناک یا دبر سے خون بہہ رہا ہو، البتہ اگر آنکھ یا کان سے خون بہہ رہا ہو تو حکم مختلف ہے۔ قسامت اس لیے نہیں کہ یہ مقتول ملنے کی صورت میں واجب ہوتا ہے اور یہ مقتول نہیں بلکہ طبعی موت مرا ہے اور طبعی موت میں قسامت اور تاوان کچھ بھی نہیں۔

لأن في منع هذا الصلح فتح باب المنازعات، وإثارة الثائرات بين الناس، وإقامة الفتن والمكايدات.(١)

ترجمہ: صلح کو ختم کردینے سے جھگڑوں کا دروازہ کھلتا ہے، اور لوگوں میں دشمنی کی آگ بھڑکتی ہے، اور فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے (اس لیے صلح کی اجازت دی گئی ہے)۔

❁❁❁

محض شک سے کفارہ قتل کا وجوب

سوال نمبر(206):

ایک عورت اپنی بچی کے ساتھ چارپائی پر سوئی تھی۔ سحری کے لیے اٹھی، سحری کر کے بچی کے پاس آئی تو اس کو مردہ پایا۔ بچی پر کروٹ کی موت کے آثار بھی نہیں پائے جارہے ہیں۔ صرف اس کو شک ہے کہ شاید میری وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ کیا محض شک کی بنا پر کفارہ لازم آتا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعی کوئی ایسا قرینہ موجود نہ ہو جو بچے کے کروٹ تلے دبنے پر دلالت کرتا ہو تو محض شک کی بنیاد پر کفارہ قتل واجب نہ ہوگا۔ تاہم حقائق پر پردہ ڈال کر کفارہ سے راہِ فرار اختیار کرنا جائز نہیں۔

والدّليل على ذلك:

اليقين لايزول بالشك ...... من شك هل فعل أو لا فالأصل عدمه.(٢)

ترجمہ: یقین شک سے زائل نہیں ہوتا۔۔۔۔۔جس کو شک ہو کہ فلاں کام کیا ہے یا نہیں؟ تو نہ کرنا اس میں اصل ہے۔

❁❁❁❁❁

(١) تبيين الحقائق، كتاب الصلح: ٤٦٩/٥

(٢) الاشباه والنظائر: ص/٣٠٢

کتاب الوقف

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمت مشروعیت:

شریعتِ اسلامی بنی نوع انسان کے لیے سراسر خیراور ہمدردی پر مشتمل دستورِ حیات ہے، جس میں ہر اس کام کو مستحسن قرار دیا گیا ہے جس میں انسان کا دنیوی یا اخروی فائدہ ہو۔ ''وقف'' اسلامی شریعت کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس میں ایک طرف غربا فقرا یا اپنے محبوب لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے تو دوسری طرف توشۂ آخرت کی تیاری کا نہ ختم ہونے والا ذریعہ بھی ہے۔ مسلمان خلافتوں کے عہد میں عبادت، تعلیم، خدمت خلق، اور رفاہی کاموں کے لیے جتنے زیادہ اور بڑے اوقاف ملتے ہیں، تاریخ میں کہیں اور ایسے اوقاف نہیں پائے جاتے۔

وقف کا لغوی اور اصطلاحی معنٰی:

وقف کا لغوی معنٰی ہے: "الحبس" یعنی روکنا یا "الحبس عن التصرف" تصرف سے روکنا جب کہ موقوفہ چیز کو بھی وقف کہا جاتا ہے۔(۱)

امام ابوحنیفہؒ کے ہاں ''اصل شے کو حکماً واقف کی ملکیت میں روکے رکھنا اور اس کے نفع کو فقرا پر صدقہ کرنا یا کسی خیر کے کام میں خرچ کرنا'' وقف ہے۔

هو حبس العين على ملك الواقف، والتصرف بالمنفعة على الفقراء أو على وجه من وجوه الخير.

جب کہ صاحبین کے ہاں ''اصل شے کو حکماً اللہ کی ملکیت میں دینا اور اس کے منافع کو اپنی پسند کے لوگوں پر خرچ کرنا (اگر چہ وہ مالدار ہوں)'' وقف ہے۔

هو حبسها على حكم ملك الله تعالى وصرف منفعتها على من أحبّ ولو غنياً.(۲)

(۱) الفقه الإسلامي وأدلته،الباب الخامس الوقف،الفصل الأول تعريف الوقف ومشروعيته:۱۰/۷۵۹۹

(۲) الفتاوىٰ الهندية، كتاب الوقف،الباب الأول في تعريفه......:۲/۳۵۰،الدرالمختار، كتاب الوقف:۶/۵۲۰

امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے مابین وقف کے حکم میں فرق:

امام ابوحنیفہؒ کے ہاں وقف محض جائز ہے، لازم نہیں۔ وقف کرنے والا جب بھی چاہے وقف سے رجوع کر سکتا ہے، اگرچہ ایسا کرنا مکروہ ہے اور اگر اس کا انتقال ہوگیا تو اس میں میراث جاری ہوگی، البتہ تین صورتوں میں وقف لازم ہوجاتا ہے اور واقف کو رجوع کا اختیار نہیں رہتا:

(۱)......قاضی نے وقف لازم ہونے کا فیصلہ کر دیا ہو۔

(۲)......واقف نے وصیت کی ہو کہ میری موت کے بعد میری فلاں جائیداد فلاں مقصد کے لیے وقف ہے۔

(۳)......مسجد کے لیے زمین وقف کی ہو اور اس میں با جماعت نماز پڑھی گئی ہو تو اب واقف کو رجوع کا حق نہیں۔

صاحبین کے ہاں وقف لازم ہوجاتا ہے، لہٰذا وقف کے بعد نہ اس میں رجوع کا حق ہے اور نہ اس میں ہبہ اور وراثت جاری ہوسکتی ہے۔ فتویٰ بھی اسی قول پر ہے۔ (۱)

مشروعیتِ وقف:

قرآن کریم میں ہے:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (۲)

تم ہرگز نیکی میں کمال حاصل نہیں کر سکو گے جب تک اپنی محبوب چیز میں سے خرچ نہ کرو۔

اور ارشادِ نبوی ہے:

إذا مات الإنسان انقطع عمله إلا من ثلثة أشياء، من صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعوله. (۳)

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل رک جاتا ہے، سوائے تین اشیا کے: صدقہ جاریہ یا وہ علم جس سے فائدہ اُٹھایا جارہا ہو یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔

حضرت عمرؓ نے خیبر کی زمین میں سے سو حصے وقف کیے تھے یہ اسلامی تاریخ کا پہلا وقف تھا۔

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الأول في تعريفه......: ۲/ ۳۵۰، الهداية، كتاب الوقف: ۲/ ۶۱۵، الفقه الإسلامي وأدلته، الباب الخامس الوقف، الفصل الأول: ۱۰/ ۷۶۰۰

(۲) آل عمران: ۹۲

(۳) سنن أبي داؤد، باب ماجاء في الرجل يوقف الوقف: ۲/ ۴۲

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ہر صاحب ثروت صحابی نے وقف کیا ہے۔علامہ ابن قدامہؒ نے وقف کی صحت پر صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے۔(۱)

کتاب الوقف سے متعلقہ اصطلاحات:

(۱) واقف:........... وقف کرنے والا شخص۔

(۲) موقوف:........ وہ شے جس کو وقف کیا جائے۔

(۳) موقوف علیہ:... وہ مقصد جس کے لیے وقف کیا جائے۔

وقف کا رکن:

حنفیہ کے ہاں وقف کا رکن ایسے الفاظ اور صیغے ہیں جو خاص وقف پر دلالت کرنے والے ہوں، جیسے: میری یہ زمین ہمیشہ کے لیے مساکین کے لیے وقف ہے یا اس گھر کا کرایہ ہمیشہ مسکینوں پر خرچ کیا جائے۔

امام ابو یوسفؒ کے ہاں ہمیشگی اور دوام کے الفاظ ضروری نہیں، بلکہ عرف میں جن الفاظ سے وقف مروج ہو، ان سے وقف درست ہے۔(۱)

جمہور کے ہاں وقف کے چار ارکان ہیں: واقف، موقوف، موقوف علیہ اور صیغہ وقف۔(۲)

لفظ کا قائم مقام بننے والی اشیا:

(۱)......گونگے کے لیے ایسا اشارہ جس سے وقف کا معنی معلوم ہو۔

(۲)......کتابت جیسے: "وقف لله تعالى على طلبة العلم" وغیرہ

(۳)......مسجد، مدرسہ، مقبرہ یا پُل وغیرہ بنا کر لوگوں کو استعمال کرنے کی کھلی اجازت۔(۳)

وقف کب لازم متصور ہوتا ہے؟

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک الفاظ وقف کا تلفظ کرتے ہی وقف مکمل ہو جائے گا اور واقف کی ملکیت اس پر ختم ہو جائے گی، البتہ امام محمدؒ کے ہاں جب تک وقف کے لیے متولی مقرر نہ ہو اور اس کے حوالے نہ ہو، وقف مکمل نہیں ہوگا۔

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الوقف:۶/۵۲۲، ۵۲۳

(۲) مغني المحتاج، کتاب الوقف:۲/۳۷۶

(۳) مغني المحتاج، کتاب الوقف:۲/۳۸۱

احتیاط اور سہولت کی بنا پر فتوی امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے۔(۱)

وقف کے لزوم کے لیے قبول کی حیثیت:

جن چیزوں میں قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جیسے: مساجد، مدارس، پل وغیرہ یا غیر محدود اور غیر معین فقرا تو اس صورت میں صرف ایجاب کافی ہے، قبول کی ضرورت نہیں، البتہ اگر موقوف علیہ کوئی معین شخص ہو تو اس کا قبول کرنا بھی ضروری ہے۔ایک مرتبہ رد کر دینے کے بعد پھر قبول کرنے کی کوئی حیثیت نہیں۔(۲)

وقف صحیح ہونے کی شرطیں:

فقہاے کرام نے واقف، موقوف (مالِ وقف)، موقوف علیہ (فقرا وغیرہ) اور صیغہ وقف کے لیے الگ الگ شرائط ذکر کی ہیں۔

واقف سے متعلق شرائط واحکام:

(۱)......مال میں تصرف کی اہلیت رکھتا ہو، یعنی عاقل، بالغ اور آزاد ہو۔(۳)

(۲)......وقف کرتے وقت موقوفہ شے کی ملکیت اس کو حاصل ہو۔

(۳)......حکومت یا قرض خواہوں کی وجہ سے اس پر مالی تصرفات کی پابندی نہ ہو۔(۴)

(۴)......مرض الوفات میں وقف ایک تہائی حصے سے لازم ہوگا۔اس سے زیادہ کی اجازت ورثا پر موقوف ہوگی۔(۵)

(۵)......واقف اپنے اختیار اور ارادے سے وقف کرے، مکرَہ اور ہازل کا وقف درست نہیں۔(۶)

☆......واقف کا مسلمان ہونا ضروری نہیں، غیر مسلم بھی اپنی اولاد، خاندان اور فقرا وغیرہ کے لیے وقف کرسکتا ہے۔اگر

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الوقف:۶/ ۵۲۰، ۵۲۳، الفتاوی الهندية، كتاب الوقف، الباب الأول في تعريفه وحكمه: ۲/ ۳۵۱

(۲) ردالمحتار، کتاب الوقف، تتمة:۶/ ۵۲۵، مغني المحتاج، كتاب الوقف:۲/ ۳۸۸

(۳) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الأول في تعريفه وحكمه:۲/ ۳۵۲، مجلة البحوث الفقهية، اكتوبر نومبر ۲۰۰۱ء، ص ۳۲۲

(۴) رد المحتار، کتاب الوقف:۶/ ۵۲۳

(۵) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الأول في تعريفه وحكمه:۲/ ۳۵۱

(۶) مغني المحتاج، كتاب الوقف: ۲/ ۳۷۷

مساکین کے لیے وقف کردے تو مسلمان مساکین بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔(۱)

☆......واقف کے لیے موقوفہ زمین دیکھے بغیر بھی وقف درست ہے۔(۲)

☆......امام ابوحنیفہ ومحمد رحمہما اللہ کے ہاں واقف کے لیے ضروری ہے کہ شے کو وقف کرنے کے بعد اس کو کسی متولی کے سپرد کرے، لیکن امام ابو یوسفؒ کے ہاں یہ ضروری نہیں۔(۳)

☆......واقف جن شرائط کے ساتھ وقف کرے ان کی رعایت کی جائے گی جب تک وہ شریعت کے مخالف نہ ہوں(۴)

موقوفہ چیز سے متعلقہ شرائط واحکام:

(۱)......موقوفہ شے غیر منقول ہو جیسے: زمین۔حنفیہ کے ہاں منقول اشیا کا وقف درست نہیں اس لیے کہ ان میں موقوفہ شے کے فوائد کا دائمی طور پر قائم رہنا ممکن نہیں، البتہ اگر منقولی اشیاز مین کے تابع ہوں تو وقف درست ہے۔اسی طرح محض کتابوں کا وقف بعض مشائخ نے عرف کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے۔صاحبین کے ہاں جانوروں اور ہتھیاروں کا وقف بھی جہاد کے لیے جائز ہے، یعنی جن چیزوں کے بارے میں عرف یا نص وارد ہو، وہ اگر چہ منقولی ہوں، ان کا وقف درست ہوگا۔(۵)

امام شافعیؒ کے ہاں جس مادی شے سے ہمیشہ کے لیے نفع اُٹھانا ممکن ہو، اس کا وقف درست ہے۔جیسے: زمین، ہتھیار، گھر کا سامان، جانور وغیرہ۔(۶)

موالک کے ہاں منافع کا وقف اصل شے کے بغیر بھی درست ہے اور حنابلہ کے ہاں تو زمین کے بغیر اوپر چھت کا وقف بھی درست ہے۔(۷)

(۱)......موقوفہ شے شرعاً مال متقوم ہو لہٰذا جس چیز کی خرید وفروخت شرعاً جائز نہیں، اس کا وقف درست نہیں۔(۸)

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الأول في تعريفه و حكمه: ۲/۳۵۲

(۲) مغني المحتاج، كتاب الوقف: ۲/۳۷۷

(۳) الهداية، كتاب الوقف: ۲/۶۱۶، بدائع الصنائع، كتاب الوقف، فصل في مايرجع إلى الموقوف: ۸/۳۹۶

(٤) ردالمحتار، كتاب الوقف: ۶/۵۲۷

(٥) بدائع الصنائع، كتاب الوقف والصدقة، فصل في مايرجع إلى الموقوف: ۸/۳۹۸

(٦) مجموع شرح المهذب، كتاب الوقف: ۱۷/۱۲٤

(٧) المغني، كتاب الوقف: ۶/۲۱۸

(٨) الدر المحتار، كتاب الوقف: ۶/۵۲۲

(۳)......موقوفہ شے وقف کرتے وقت واقف کی ملکیت میں ہو۔(۱)

(۴)......موقوفہ شے معلوم ومتعین ہو یعنی مقامِ وقف کا حدود اربعہ اور علامات بتانا ضروری ہے، البتہ اگر کوئی جگہ اس کے بغیر بھی معروف ہو تو پھر ضرورت نہیں۔(۲)

(۵) اگر موقوفہ شے قابل تقسیم ہو تو تقسیم کے بعد وقف کو درست قرار دیا جائے گا، البتہ امام ابو یوسفؒ کے ہاں مشاع چیز کا وقف بھی درست ہے۔(۳)

☆......موقوفہ زمین کا کرایہ اور غلہ وغیرہ رفاہی کاموں میں خرچ کرنا واجب ہے۔(۴)

☆......جن چیزوں کو استعمال کرنے سے وہ ضائع ہو جائیں، ان کا وقف درست نہیں، جیسے: کھانا، پینا، روپیہ، درہم و دینار وغیرہ۔ ان سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ان کو ضائع کرنا پڑتا ہے، لہٰذا وقف جائز نہیں۔

☆......قرآن کریم کے نسخوں کا وقف درست ہے، البتہ جن مساجد کے لیے وقف ہوں، ان ہی مساجد میں ان کی تلاوت کی جائے گی۔(۵)

موقوف علیہ (جن مقاصد پر وقف ہو) سے متعلق شرائط واحکام:

جس مقصد کے لیے وقف کیا جائے یا جس پر وقف کیا جائے، اسے موقوف علیہ کہتے ہیں۔ اس کے لیے بھی چند شرائط ہیں:

(۱)......وہ مقصد اسلام کی نظر میں ثواب اور قربت ہو، معصیت کی چیزوں کے لیے وقف درست نہیں، لہٰذا گرجا، مندر، یا اس کی خدمت وغیرہ وقف کے مصارف نہیں۔(۶)

(۲)......وہ مقصد وقف کا مصرف بننے کا اہل ہو۔ حقیقتاً ہو، جیسے ایک شخص پر وقف ہو یا افراد کے مجموعے پر جیسے: علما،

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الوقف، الباب الأول في تعریفه ورکنه ......: ۳۵۳/۲

(۲) رد المحتار، کتاب الوقف، مطلب لایشترط التحدید في وقف العقار: ۵۵۲/۶

(۳) الهدایة، کتاب الوقف: ۶۱۷/۲، بدائع الصنائع، کتاب الوقف، فصل في مایرجع إلی الموقوف: ۴۰۰/۸

(۴) بدائع الصنائع، کتاب الوقف، فصل في مایرجع إلی الموقوف: ۳۹۱/۸

(۵) الفتاوی الهندیة، کتاب الوقف، الباب الثاني في مایجوز وقفه ومالایجوز: ۳۶۲،۳۶۱/۲

(۶) الدر المختار، کتاب الوقف: ۵۲۴/۶، مغني المحتاج، کتاب الوقف: ۳۷۹/۲

فقرا، وغیرہ یا حکماً جیسے: مسجد، مدرسہ، مقبرہ وغیرہ۔(۱)

(۳)......وقف صرف اغنیا پر نہ ہو۔اس کی تین جائز صورتیں ہیں:

(1)...... وہ وقف جو صرف فقرا کے لیے ہو۔

(2)......یا جو ابتداءً اغنیا کے لیے ہو، پھر فقرا کے لیے۔

(3)......یا وہ اوقاف جن سے دولت منداور فقیر دونوں استفادہ کریں، جیسے: قبرستان، پل، ہسپتال وغیرہ۔

صرف اغنیا پر وقف جائز نہیں، اس لیے کہ یہ باعث قربت نہیں۔(۲)

(۴)......عنقریب وجود میں آنے والی شے پر حنفیہ کے ہاں وقف درست ہے، لہٰذا اگر زید کی اولاد کے لیے وقف کیا اور وہ ابھی تک موجود نہ ہوں یا کسی مکان پر وقف کیا جو مستقبل میں مسجد کے لیے تعمیر ہونے والی ہے تو اصح قول کے مطابق یہ وقف درست ہے، البتہ اولاد کے پیدا ہونے تک اور مسجد کی تعمیر تک وقف کا فائدہ فقرا پر تقسیم ہوگا۔یہی حال جنین کا بھی ہے۔اس کے لیے اگرچہ فی الحال وقف درست نہیں، نہ مقصوداً اور نہ تبعاً، تاہم پیدا ہونے کے بعد وہ وقف کے منافع کا مستحق ہوگا۔(۳)

(۵)......امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ کے ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وقف کا آخری مصرف ایسی چیز ہو جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہو، البتہ امام ابویوسفؒ کے ہاں یہ ضروری نہیں، بلکہ اس مصرف کے ختم ہونے کے بعد فقرا ہی اس کے آخری مصرف ہوں گے۔(۴)

صیغۂ وقف اور تعبیر کے لیے شرائط:

(۱)......وقف فی الحال قابل نفاذ ہو۔مستقبل کی کسی شرط سے مشروط نہ ہو، جیسے: فلاں آئے تو یہ زمین وقف ہوگی۔یا مستقبل کی طرف مضاف ومنسوب نہ ہو، جیسے: آئندہ ایک سال کے بعد یہ زمین وقف کرتا ہوں۔(۵)

---

(۱) حاشية الدسوقي، باب صح وقف مملوك:٥/٤٥٧،مغني المحتاج، كتاب الوقف:٢/٣٧٩

(۲) الدر المختار، كتاب الوقف:٦/٦٠٣

(۳) رد المحتار، كتاب الوقف:٦/٥٢٥،مغني المحتاج، كتاب الوقف:٢/٣٧٩

(٤) بدائع الصنائع، كتاب الوقف،فصل في مايرجع إلى الموقوف:٨/٣٩٧،فتح القدير، كتاب الوقف:٥/٤٢٧

(٥) الدر المختار، كتاب الوقف:٦/٥٢٤

(۲)......وقف کے الفاظ میں تابید ہو، یعنی وقف کی مدت محدود نہ ہو، بلکہ دائمی ہو، لہٰذا ایک ماہ یا ایک سال وغیرہ کے لیے وقف درست نہیں۔(۱)

(۳)......وقف فی الفور لازم ہو، لہٰذا اگر وقف کے ساتھ خیارِ شرط لگادے کہ مجھے وقف سے رجوع کا اختیار حاصل ہوگا تو یہ وقف درست نہیں۔امام ابو یوسفؒ کے ہاں مسجد کے علاوہ اوقاف میں تین دن کا خیارِ شرط لے سکتا ہے۔(۲)

(۴)......وقف کرتے وقت کوئی ایسی شرط نہ لگائی جائے جس سے وقف کا مقصد متاثر ہوجائے، جیسے: یہ کہے کہ میں بوقت ضرورت اس کو فروخت کرنے یا ہبہ کرنے کا حق محفوظ رکھوں گا یا اس کے منافع اور رقم کو کسی اور مقصد میں استعمال کروں گا۔اس قسم کی شرط لگانے سے وقف درست نہیں ہوگا، البتہ مسجد کے لیے وقف کی گئی زمین کے ساتھ اس طرح کی شرطیں لگائی گئیں تو شرطوں کا اعتبار نہیں ہوگا اور وقف درست ہوگا۔(۳)

وقف سے واقف کی ملکیت کب ختم ہوگی؟

حنفیہ کے ہاں چار صورتوں میں مال وقف سے واقف کی ملکیت ختم ہوگی:

(۱)......اگر وقف مسجد کا ہو تو زمین علیحدہ کر دی جائے اور اس میں باجماعت نماز پڑھی جائے۔

(۲)......امام ابوحنیفہؒ کے ہاں قاضی کے لازم کر دینے سے وقف لازم ہوتا ہے، البتہ امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ کے ہاں وقف اس کے بغیر بھی لازم ہے۔

(۳)......وقف کو اپنی موت سے مشروط کرنے سے، لیکن اس صورت میں واقف کی ملکیت کا ایک ثلث وقف لازم ہوگا۔

(۴)......حیات اور وفات دونوں میں ہمیشہ کے لیے وقف پر قول کرنا۔

☆......مسجد، عیدگاہ اور جنازگاہ وغیرہ سے مالک کی ملکیت ختم ہونے کے لیے امام ابو یوسفؒ کے ہاں قول یا فعل دونوں درست ہیں یعنی یا تو یہ کہہ دے کہ میں نے اس کو مسجد بنادیا یا چند افراد کو لے کر اس میں باجماعت نماز پڑھ لے، البتہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے ہاں باجماعت نماز پڑھنا ضروری ہے، صرف قول کافی نہیں۔(۴)

---

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الوقف، الباب الأول في تعریفه......:۲/۳۵٦، الدر المختار، کتاب الوقف:٦/٥٢٥

(۲) فتح القدیر، کتاب الوقف:٥/٤٤١، فتح القدیر، الدر المختار، کتاب الوقف:٦/٥٢٥

(۳) الفتاوی الهندیة، کتاب الوقف، الباب الأول في تعریفه......:۲/۳۵٦، الدر المختار، کتاب الوقف:٦/٥٢٥

(٤) رد المحتار، کتاب الوقف:٦/٥٤٥

مساجد کے اوقاف میں امتیازی نکات:

مساجد کے اوقاف میں فقہاے حنفیہ نے اپنے اصول میں حسبِ ضرورت تبدیلی کر کے چند امتیازی نکات ذکر کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱)......مشاع (غیر تقسیم شدہ) زمین کا وقف مسجد کے لیے درست نہیں، لہٰذا مسجد کی زمین کے وقف کے لیے افراز، یعنی تقسیم اور اطراف سے علیحدگی، ضروری ہے، تاکہ مسجد دوسری جاگیروں سے علیحدہ ہو کر خالص اللہ کے لیے ہو جائے اور اس میں کسی قسم کی مداخلت کا امکان نہ رہے۔(۱)

(۲)......مسجد کا وقف متولی کے بغیر بھی درست ہے، امام محمدؒ نے بھی مسجد کے وقف میں اسی پر قول کیا ہے۔(۲)

(۳)......مسجد کی زمین کے وقف میں قاضی کا فیصلہ ضروری نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے بھی یہاں پر اپنی شرط میں نرمی فرمائی ہے۔(۳)

(۴)......مسجد ہمیشہ کے لیے مسجد رہے گی، اگرچہ ویران اور غیر آباد ہو جائے۔(۴)

(۵)......جو چیز مسجد کے لیے وقف کردی جاتی ہے، اس کا استعمال اسی مسجد کے مصالح ومقاصد تک محدود رہے گا، البتہ اگر مسجد کے مصالح سے زائد ہو اور آئندہ بھی اس کے استعمال کی امید نہ ہو تو ایسی صورت میں قریبی مسجد کی ضرورت میں صرف کرنا جائز ہے۔(۵)

(۶)مسجد کے اندر موجود پھل دار درختوں کا پھل فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد کے مصارف میں خرچ کی جائے گی، البتہ اگر واقف نے ہر کسی کو کھانے کی اجازت دی ہو تو درست ہے۔(۶)

"شرط الواقف كنصّ الشارع" کا مطلب:

فقہاے کرام نے وقف کرنے والے کی پابندی کو نص کی پابندی کی طرح قرار دیا ہے۔ فقہاے کرام کا قاعدہ ہے

---

(۱) الهداية، كتاب الوقف:٢/٦١٧، ردالمحتار، كتاب الوقف:٦/٥٤٤

(٢) بدائع الصنائع، كتاب الوقف، فصل في مايرجع إلى الموقوف: ٨/٣٩٧، ردالمحتار حواله سابقه

(٣) ردالمحتار، حواله سابقه

(٤) الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الوقف:٦/٥٤٨

(٥) الدرالمختار، كتاب الوقف:٦/٥٤٩

(٦) البحرالرائق، كتاب الوقف:٥/٣٤١، ٣٤٢، الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الوقف:٦/٦٤٠

کہ واقف کی شرط شارع کی نص کی طرح ہے، یعنی جس طرح شارع کے نصوص پر عمل کرنا واجب ہے، اسی طرح وقف کے نفاذ میں واقف کی شرائط کی رعایت بھی ضروری ہے، اس لیے کہ وہ اس مال کا مالک ہے، لہٰذا وہ جس طرح بھی چاہے اپنے مال کو خرچ کرسکتا ہے، خود ہی مصارف بھی متعین کرسکتا ہے، جائز شرطیں بھی لگا سکتا ہے، اپنی ذات اور خاندان کی رعایت بھی کرسکتا ہے، لہٰذا اس کی جو بھی شرط شریعت کے مخالف نہ ہو، وہ معتبر ہوگی۔

واقف کی شرطیں تین طرح کی ہوسکتی ہیں:

(۱)......ایسی شرطیں جو باطل اور شریعت کے مخالف ہوں، ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

(۲)......وہ جائز شرطیں جو وقف اور شریعت کی مناسب ہوں، ان کی مخالفت جائز نہیں۔

(۳)......وہ جائز شرطیں جن کی مخالفت میں وقف سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کا یقین ہو، ضرورت اور مفادِ عامہ کے تحت قاضی ایسی جائز شرطوں کے خلاف کچھ عمل کرسکتا ہے۔

علامہ حصکفیؒ نے ایسے سات مسائل ذکر کیے ہیں جن میں قاضی واقف کی شرائط کی مخالفت کرسکتا ہے۔(۱)

استبدالِ وقف:

اس کی چند صورتیں ہیں:

(۱)......اگر واقف نے اپنے لیے یا کسی اور کے لیے حق استبدال کی شرط لگادی تو بالاتفاق متعلقہ شخص کو اس کا حق حاصل ہوگا، کیوں کہ یہ ایک جائز شرط ہے اور واقف اپنے مال میں اس قسم کی شرط لگانے کا اختیار رکھتا ہے۔

(۲)......اگر وقف میں استبدال کی شرط نہ ہو، لیکن استبدال کے بغیر وقف سے فائدہ اُٹھانا ناممکن ہو تو ایسی صورت میں دیانت دار قاضی کی اجازت سے استبدال جائز ہے۔

(۳)......اگر وقف قابلِ انتفاع ہو، لیکن استبدال سے منافع بڑھنے کا یقین ہو تو احناف کا صحیح قول یہ ہے کہ اس صورت میں استبدال جائز نہیں، اگرچہ علامہ شامیؒ نے اس کو ایک مقام پر جائز بھی کہا ہے۔

علامہ شامیؒ کے ہاں استبدال کے لیے بنیادی شرطیں یہ ہیں:

(۱)......اراضی وقف مناسب قیمت پر فروخت کی جائیں۔

(۲)......ذمہ دار اور دیانت دار قاضی یا ادارہ اس کی اجازت دے۔

---

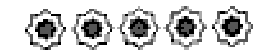
(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الوقف:۶/۵۲۷، ۵۸۷، الموسوعة الفقهية، مادة وقف: ۴۴/۱۳۱-۱۳۹، وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية الكويت

(۳)......اس زمین کے بدلے اسی طرح زمین اور مکانات خریدے جائیں، نہ کہ نقد پیسے، اس لیے کہ نقد پیسوں کا تحفظ اور ان کی بقا کی ضمانت نہیں دی جاسکتی، بلکہ ان کے ضائع ہونے کا خطرہ یقینی ہوتا ہے، الہٰذا غیر منقولی املاک کے ذریعے ان کو تحفظ دینا شرط ہے۔(۱)

وقف کی تولیت کا حق:

جہاں کہیں واقف وقف کردہ مکان، دکان یا زمین کسی شخص کے ذاتی منافع یا کسی ادارے کو وقف کر کے باقاعدہ حوالہ کرے اور حکومت وقت اس وقف کے بارے میں فیصلہ کر دے تو متعلقہ شخص یا ادارہ اس کا متولی رہے گا۔ واقف کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہاں جہاں کہیں وقف میں کسی کو سپردگی نہ ہو تو پھر ایسی صورت میں وقف پر تولیت کا پہلا حق خود وقف کرنے والے کا ہے۔ اگر خود واقف اپنے لیے وقف کی تولیت کا منصب رکھے تو یہ جائز ہے۔ اور اس پر اجماع ہے۔ اگر اس نے کسی اور کو تولیت سپرد نہیں کی، تب بھی وہی متولی سمجھا جائے گا۔ ایسی صورت میں واقف اپنی زندگی میں یا اپنے بعد بھی کسی کو متولی بنا سکتا ہے۔ اپنے بعد اپنی اولاد کو بھی متولی مقرر کر سکتا ہے۔ اسی طرح کئی افراد کو بالترتیب (میرے بعد فلاں، اس کے بعد فلاں......) بھی متولی مقرر کر سکتا ہے۔ اسی طرح کئی افراد کو ایک ساتھ متولی بنانا بھی جائز ہے جو باہم مشورے سے وقف میں تصرف کریں گے۔

اگر واقف کی طرف سے کوئی متولی یا وصی نہ ہو تو اس کی موت کے بعد قاضی کو متولی (قیّم) مقرر کرنے کا حق حاصل ہوگا۔(۲)



(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الوقف:۶/۵۸۵، ۵۸۶، قاموس الفقه، ماده وقف:۵/۳۰۲

(۲) الفتاوی الهندية، کتاب الوقف، الباب الخامس في ولاية الوقف وتصرف القيم:۲/۴۰۸ـ۴۱۰

مسائل کتاب الوقف

(وقف سے متعلقہ مسائل کا بیان)

فلاحی ادارے کے لیے وقف شدہ زمین بیوی کو مہر میں دینا

سوال نمبر(207):

ایک شخص کے والد صاحب نے فلاحی ادارے کے لیے زمین وقف کی تھی۔اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے اور میں اسے اپنی بیوی کو بطورِ مہر دیتا ہوں۔کیا جب زمین ایک دفعہ وقف ہو جائے تو پھر اس میں ملکیت کا دعویٰ اور بیوی کو مہر کے طور پر دینا جائز ہے؟ بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر مذکورہ زمین کا فلاحی ادارے کے لیے وقف ہونا اور وقف کا تام ہونا مسلم اور ثابت ہو تو یہ زمین اسی فلاحی ادارے کے مقاصد اور مصالح ہی کے لیے استعمال کی جائے گی، کیوں کہ جب زمین ایک دفعہ وقف ہو جائے تو پھر نہ اس کی خرید وفروخت جائز ہے، نہ ہی میراث میں ورثا کو منتقل ہوتی ہے۔لہٰذا واقف کے بیٹے کا دعویٰ ملکیت اور بیوی کو مہر میں دینا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

(فإذاتم ولزم لایُملَك ولایُمَلَّك، ولایعار، ولایرهن) قال ابن عابدین: قوله (لایملك)أي لایکون مملوکا لصاحبه، (ولایملك)أي لایقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه.(١)

ترجمہ: اور جب وقف تام اور لازم ہو جائے تو نہ وہ مالک کی مملوک رہتی ہے اور نہ کسی کو اِس کا مالک بنایا جا سکتا ہے، نہ ہی عاریت پر دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی رہن میں رکھا جا سکتا ہے۔علامہ ابن عابدین 'لایملک' کا معنیٰ بیان کرتے ہیں کہ: مالک کی مملوک نہیں رہتی۔اور 'لایملک' کا معنیٰ بیان کرتے ہیں کہ دوسرے کو بیع وغیرہ کے ذریعے اس کا مالک نہیں بنایا جا سکتا۔



(١) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب فرق ابو یوسف بین قوله "موقوفة": ٦/٥٣٩

واقف کی شرائط کا لحاظ

سوال نمبر (208):

علاقے کے ایک معزز متمول شخص نے اپنی ایک مخصوص جائیداد اپنے گاؤں کے غریبوں کے لیے وقف کی ہے کہ اس کی آمدنی سے غریب افراد کے لیے ایک گھی کا ڈبہ اور ایک بوری چینی سالانہ دی جائے گی۔ کیا دوسرے گاؤں کے غریب لوگوں کو یہ وقف شدہ گھی اور چینی دینا جائز ہے؟ جب کہ واقف نے صرف اپنے گاؤں کے مستحقین کے لیے وقف کیا ہے۔ بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب واقف نے صرف اپنے گاؤں کے فقرا کو وقف کی آمدنی سے گھی اور چینی خریدنے کا کہا ہے تو یہ مذکورہ اشیا دوسرے گاؤں کے غریب افراد کو دینا جائز نہیں، کیوں کہ اس میں واقف کی شرط کی مخالفت لازم آتی ہے جو کہ جائز نہیں۔ تاہم اگر واقف اجازت دے دے تو پھر دوسرے گاؤں کے غربا میں ان چیزوں کو تقسیم کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

قال في الإسعاف: يجب صرف الغلة على ماشرط الواقف، وفي غيره شرط الواقف كنص الشارع في المفهوم والدلالة. (١)

ترجمہ:

اسعاف میں نقل کیا ہے کہ وقف سے حاصل ہونے والی آمدنی واقف کی شرط کے مطابق خرچ کی جائے گی اور دیگر کتب میں ہے کہ واقف کی شرط مفہوم اور دلالت میں شارع کی نص کی طرح ہے۔

❁❁❁

وقف شدہ زمین میں امام کے لیے گھر بنانا

سوال نمبر (209):

مسجد کے قریب ایک شخص نے مسجد کے مصالح کے لیے زمین وقف کی ہے۔ اب مسجد کی کمیٹی امام مسجد کے لیے

(١) الفتاوى تنقيح الحامدية، كتاب الوقف: ١/ ١٢٥، ١٢٦

اس زمین میں گھر بنانا چاہتی ہے تو کیا اس موقوفہ زمین پر امام کے لیے گھر بنانا جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مسجد کا امام اور اس کی ضروریات چونکہ مسجد کے مصالح میں سے ہیں، لہٰذا جو زمین مسجد کے مصالح کے لیے وقف کی گئی ہے اس میں امامِ مسجد کے لیے گھر بنانا شرعاً جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں کمیٹی والوں کے لیے امام کے لیے مذکورہ زمین میں مکان بنانا شرعاً درست ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

وبماذکرناہ علم أنّہ لوبنی بیتاً علی سطح المسجد لسکنی الإمام فإنّہ لایضرّ في کونہ مسجدًا لأنّہ من المصالح.(۱)

ترجمہ: ہم نے جو ذکر کیا اُس سے معلوم ہوا کہ اگر مسجد کی چھت پر امام کے رہنے کے لیے کمرہ بنادیا جائے تو اِس سے مسجد کی مسجدیت کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا کیونکہ یہ مسجد کے مصالح میں سے ہے۔

۞۞۞

مغصوبہ زمین سکول کے لیے وقف کرنا

سوال نمبر(210):

ہمارے علاقے کے ایک آدمی نے معذوروں کے سکول کے لیے ایک ایسی زمین وقف کی ہے جس کا وہ خود مالک نہیں ہے، بلکہ جبری طور پر کسی سے غصب کی ہے۔ اب اس زمین کے اصل مالک نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ مجھے واپس دی جائے۔ کیا ایسی صورت میں مذکورہ زمین کا وقف درست ہے یا نہیں؟ اور اصل مالک اس کو لے سکتا ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

وقف کی شرائط میں سے ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ جو چیز وقف کی جائے وہ واقف کی ملکیت میں ہو، چنانچہ

(۱) البحر الرائق، کتاب الوقف، قولہ ومن جعل مسجدًا تحتہ سرداب...

جو زمین جبری طور پر غصب کی گئی ہو اس کو کسی فلاحی ادارے یا سکول وغیرہ کے لیے وقف کرنا درست نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی یہ زمین مالک کی بجائے غاصب نے وقف کی ہو تو اس کا وقف درست نہیں، لہٰذا اس کو مالک کے حوالہ کرنا ضروری ہے۔ تاہم اگر پھر مالک خود اپنی رضامندی سے اسے وقف کرے تو وقف درست ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

ومن شرائطه: الملك وقت الوقف حتى لو غصب أرضا فوقفها، ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن إليه،أو صالح على مال دفعه إليه لاتكون وقفا.(۱)

ترجمہ: (وقف کی) شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وقف کرتے وقت وہ چیز وقف کرنے والے کی ملکیت میں ہو، چنانچہ اگر کوئی زمین غصب کر کے اس کو وقف کردے، پھر یہ غاصب یہی زمین مالک سے خرید لے اور اس کو اس زمین کی قیمت دے دے یا کسی مال پر مصالحت کر کے مالک زمین کو دے دے، تو بھی یہ وقف شمار نہ ہوگی۔

❁❁❁

وقف شدہ زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنا

سوال نمبر(211):

بہت عرصہ پہلے ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی تھی جس پر باقاعدہ گواہ موجود ہیں۔ اب اس شخص کے پوتوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ زمین ہمارے دادا نے مسجد کے لیے وقف نہیں کی، بلکہ ہمارے لیے میراث چھوڑی ہے تو کیا ان کا دعویٰ شرعاً درست ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کسی زمین کا مسجد کے لیے وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو وہ مسجد ہی کے لیے وقف رہے گی اور جب ایک مرتبہ وقف تام ہو جائے تو نہ واقف کو رجوع کا اختیار باقی رہتا ہے اور نہ ہی اس کی خرید و فروخت جائز ہے اور جب واقف رجوع نہیں کرسکتا تو واقف کے مرنے کے بعد اس میں میراث بھی جاری نہیں ہوسکتی۔

(۱) البحر الرائق، کتاب الوقف، تحت قوله(حبس العین علی ملك الواقف): ٥/٣١٤

صورتِ مسئولہ میں بھی اگر واقعی مرحوم کا اپنی زمین کو مسجد کے لیے وقف کرنا ثابت ہوا اور وقف تام بھی ہوا ہو تو بعد میں پوتوں کا موقوفہ زمین پر میراث کا دعویٰ کرنا شرعاً جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

ومن اتخذ أرضه مسجداً لم يكن له أن يرجع فيه، ولا يبيعه، ولا يورث عنه ؛لأنه تجرد عن حق العباد وصار خالصا لله تعالىٰ.(١)

ترجمہ: اور جس نے اپنی زمین کو مسجد بنایا تو اس کے لیے رجوع کا حق نہیں، نہ اس کو بیچے گا نہ اس سے بطورِ میراث منتقل ہوگی، کیوں کہ یہ (مسجد) لوگوں کے حق سے علیحدہ ہو کر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگئی۔

❁❁❁

اوپر کمرہ بنانے کی شرط پر وضوخانہ کے لیے جگہ وقف کرنا

سوال نمبر(212):

شہر میں ایک مسجد کا وضوخانہ بہت تنگ ہے۔ایک شخص اس شرط پر وضوخانہ کے لیے جگہ دے رہا ہے کہ اس کے اوپر میں اپنے لیے کمرہ وغیرہ بناؤں گا۔کیا واقف کا اس طرح شرط لگانا شرعاً درست ہے؟ بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے وقف میں موقوفہ چیز کا واقف کی ملکیت سے نکلنا اور مکمل طور پر الگ کرنا ضروری ہے، تا کہ رب کی ملکیت کے ساتھ بندہ کا کوئی تعلق باقی نہ رہے،اس لیے اگر واقف کوئی ایسی شرط لگائے جس کی وجہ سے واقف کی ملکیت موقوفہ چیز سے ختم نہیں ہوتی ہو تو وہ شرط باطل ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں وضوخانہ کے لیے جگہ دینے کے ساتھ یہ شرط لگانا کہ واقف اس کے اوپر اپنے لیے کمرہ بنائے گا،شرعی لحاظ سے جائز نہیں ہے،کیوں کہ اس طرح موقوفہ چیز میں واقف کی ملکیت بھی ثابت ہوگی،حالانکہ موقوفہ چیز میں واقف کی ملکیت کا ختم ہونا ضروری ہے،اس لیے اگر واقف اس شرط کو ختم کر کے وقف کرے تو وقف درست ہوگی،ورنہ بصورتِ دیگر وہ وقف متصور نہ ہوگی،تاہم اگر وہ اپنی زمین ملک میں رکھتے ہوئے اس میں نمازیوں کی سہولت کے لیے وضوخانہ بنائے تو بھی مستحق اجر وثواب ہوگا اور ملکیت بھی باقی رہے گی۔

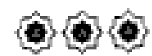
(١) الهداية، كتاب الوقف: ٢/٦٢٢

والدّلیل علی ذلك:

وفي القهستاني ولا بد من إفرازه أي تمييزه عن ملكه من جميع الوجوه، فلو كان العلو مسجدا، والسفل حوانيت أو بالعكس لا يزول ملكه لتعلق حق العبد به.(١)

ترجمہ:

اورقہستانی نامی کتاب میں ہے کہ وقف میں موقوفہ چیز کوواقف کی ملکیت سے مکمل علیحدہ کرنا ضروری ہے، چنانچہ اگر (وقف میں) اوپر مسجداور نیچے دُکانیں یااس کے برعکس ہوتواس صورت میں یہ واقف کی ملکیت اس سے زائل نہ ہوگی، اس لیے کہ بندہ (واقف) کا حق اس کے ساتھ متعلق ہے۔



موقوفہ زمین کاعشر

سوال نمبر(213):

ایک شخص مسجد کی موقوفہ زمین میں کاشت کرتا ہے جس سے سال بھر میں ایک فصل حاصل کرتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ چونکہ یہ زمین مسجد کے لیے وقف شدہ ہے اوراس کا مالک وہ نہیں اس وجہ سے اس کا عشر ادا کرنا بھی واجب نہیں۔ کیااس کا یہ گمان ازروئے شریعت درست ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب و باللّٰہ التوفیق:

عشر کے وجوب کے لیے زمین کا مالک ہونا شرط نہیں بلکہ زمین سے فصل حاصل کرنے والا، جوفصل کا مالک ہوتا ہے اس پر عشر لازم ہوتا ہے۔صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص موقوفہ زمین کا اگرچہ مالک نہیں لیکن عشر کی ادائیگی اس پر لازم ہے، کیوں کہ زمین کے حاصلات کا تو مالک وہ ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

وكذاملك الأرض ليس بشرط للوجوب لوجوبه في الأراضي الموقوفة، ويجب في أرض

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب في أحكام المسجد: ٦/٥٤٥

المأذون والمکاتب.(۱)

ترجمہ: اس طرح زمین کا مالک ہونا عشر کے وجوب کے لیے شرط نہیں، کیوں کہ عشر وقف زمینوں میں بھی واجب ہے اور ماذون ومکاتب کی زمین میں بھی واجب ہے۔

۞۞۞

وقف شدہ پلاٹ کی فروخت

سوال نمبر(214):

اگر کسی شخص نے اپنا مملوکہ پلاٹ مسجد یا قبرستان کے لیے وقف کیا ہو اور اب واقف اس کو فروخت کرنا چاہتا ہو تو کیا یہ جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جب کوئی زمین مسجد یا قبرستان کے لیے وقف کی جائے تو وقف تام ہونے کے بعد موقوفہ جائیداد میں واقف یا کسی اور شخص کو مصرفِ وقف کے علاوہ کسی تصرف کا حق حاصل نہیں ہوتا۔لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ پلاٹ باقاعدہ طور پر مسجد یا قبرستان کے لیے وقف کیا گیا ہے اور وقف تام ہو چکا ہے تو اس کی خرید وفروخت جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

وإذا صح الوقف، لم یجز بیعه، ولا تملیکه.(۲)

ترجمہ:

اور جب وقف صحیح ہو جائے تو پھر اس کی بیع یا تملیک درست نہیں۔

(فإذاتم ولزم لایُمَلَّك ولایُمَلِّك، ولایعار، ولایرهن) قال ابن عابدین: قوله (لایملك)أي لایکون مملوکا لصاحبه، (ولایملك)أي لایقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه.(۳)

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الزکاة، الباب السادس في زکاة الزروع والثمار: ۱/۱۸۵

(۲) الهدایة، کتاب الوقف: ۲/۶۱۹

(۳) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب فرق ابو یوسف بین قوله "موقوفة": ۶/۵۳۹

ترجمہ: اور جب وقف تام اور لازم ہو جائے تو نہ وہ مالک کی مملوک رہتی ہے اور نہ کسی کو اس کا مالک بنایا جاسکتا ہے، نہ ہی عاریت پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی رہن میں رکھا جاسکتا ہے۔ علامہ ابن عابدین 'لایملک' کا معنی بیان کرتے ہیں کہ: مالک کی مملوک نہیں رہتی۔ اور 'لایملک' کا معنیٰ بیان کرتے ہیں کہ دوسرے کو بیع وغیرہ کے ذریعے اس کا مالک نہیں بنایا جاسکتا۔

❁❁❁

وقف چیز کی تخصیص

سوال نمبر(215):

ایک سکول کے یتیم طلبہ کے لیے ایک شخص نے کپڑے وقف کیے ہیں اور کہا ہے کہ اسے یتیم بچوں پر تقسیم کیا جائے۔ کیا یہ کپڑے سکول کے ملازمین اور اساتذہ استعمال کر سکتے ہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر مذکورہ کپڑے صرف یتیم بچوں کے لیے وقف کیے گئے ہوں تو یتیم بچوں کے علاوہ اور کوئی شخص اسے استعمال نہیں کرسکتا، کیوں کہ اس میں واقف نے شرط لگائی ہے اور واقف کی شرط شارع کی نص کی طرح ہے، لہٰذا یتیم بچوں کے علاوہ اساتذہ اور ملازمین ان موقوفہ کپڑوں کو استعمال نہیں کر سکتے۔

والدّلیل علی ذلک:

قال في الإسعاف: يجب صرف الغلة على ماشرط الواقف، وفي غيره شرط الواقف كنص الشارع في المفهوم والدلالة. (۱)

ترجمہ: اسعاف میں نقل کیا ہے کہ وقف سے حاصل ہونے والی آمدنی واقف کی شرط کے مطابق خرچ کی جائے گی اور دیگر کتب میں ہے کہ واقف کی شرط مفہوم اور دلالت میں شارع کی نص کی طرح ہے۔



(۱) تنقیح الفتاوی الحامدیة ، کتاب الوقف: ۱/ ۱۲۵،۱۲۶

ایک مسجد کے لیے وقف شدہ رقم دوسری مسجد میں لگانا

سوال نمبر(216):

ایک شخص نے گاؤں ''الف'' کی مسجد کے لیے کچھ رقم وقف کر کے مسجد کے پیش امام صاحب کے پاس رکھ دی۔اب امام اور مقتدیوں میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔جس کی وجہ سے امام صاحب نے یہ ارادہ کیا ہے کہ یہ رقم گاؤں ''ب'' کی مسجد کی تعمیر پر خرچ کی جائے۔کیا اس طرح ایک مسجد کی وقف شدہ رقم دوسری مسجد کی تعمیر میں لگانا جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق جب دو علیحدہ علیحدہ مسجدیں ہوں اور ان میں سے کسی ایک مسجد کے لیے رقم وقف کی گئی ہو تو دوسری مسجد میں اُسے استعمال کرنا جائز نہیں۔

صورتِ مذکورہ میں اگر دونوں مساجد کی آمدنی جدا جدا ہو اور آپس میں دونوں کا کوئی تعلق نہ ہو جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے، تو ایک مسجد کے لیے وقف شدہ رقم دوسری مسجد کی تعمیر میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

(وإن اختلف أحدهما، بأن بنی رجلان مسجدین) أو رجل مسجدا ومدرسة، ووقف عليهما أوقافا (لا) يجوز له ذلك.(۱)

ترجمہ: دو شخص علیحدہ علیحدہ مسجد بنائیں یا ایک ہی شخص نے مسجد اور مدرسہ بنایا اور دونوں کے لیے جدا جدا وقف کیا تو قاضی کے لیے یہ جائز نہیں (کہ ایک وقف کی آمدنی دوسرے وقف میں خرچ کردے)۔

❁❁❁

مقبرہ کے لیے وقفِ مشاع

سوال نمبر(217):

گاؤں سے باہر ایک بڑا میدان ہے جو اہل علاقہ کی مشترکہ ملکیت ہے۔گاؤں کے بعض لوگوں نے یہ خواہش

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الوقف: ٦/٥٥١

ظاہر کی ہے کہ چونکہ یہ زمین سب لوگوں کی مشترکہ ہے اور اکثر اوقات اس پر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا اس کو مقبرہ کے لیے وقف کر کے اللہ کے نام کردیں گے۔ گاؤں کے کچھ افراد اس بات پر راضی نہیں ہیں۔ کیا اس طرح وقف شرعاً درست ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کسی مشترکہ زمین میں تمام شرکا وقف کرنے پر راضی نہ ہوں، تو اس کا وقف درست نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی مذکورہ زمین پورے گاؤں کی مشترکہ ہو اور اس کے بعض شرکا اس کو مقبرہ کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں، بعض نہیں تو از روئے شریعت سب کی رضامندی کے بغیر اس کا وقف درست نہیں، کیوں کہ فقہائے کرام کی اصطلاح میں یہ وقفِ مشاع ہے اور وقفِ مشاع تمام مالکان کی اجازت کے بغیر درست نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

واتفقا على عدم جعل المشاع مسجدا أومقبرة مطلقا سواء كان ممالايحتمل القسمة، أويحتملها.(۱)

ترجمہ: امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مشاع (مشترک زمین) کو مسجد یا مقبرہ نہ بنایا جائے۔ چاہے یہ تقسیم کا احتمال رکھے یا نہ رکھے۔



قبرستان کی زمین فلاحی کام میں لانا

سوال نمبر(218):

ایک پرانا قبرستان ہے جس میں کئی سالوں سے لوگوں نے میت دفنانا چھوڑ دیا ہے، علاقے کی ایک فلاحی تنظیم نے اس قبرستان پر ہسپتال بنانے کا ارادہ کیا ہے۔ کیا اس قبرستان کی زمین پر ہسپتال بنانے کی شرعاً اجازت ہے؟

بیّنوا توجروا

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الثاني فيمايجوز وقفه، فصل في وقف المشاع: ۳٦٥/۲

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

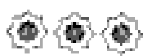
مذکورہ قبرستان اگر وقف شدہ ہو اور علاقے والوں نے اس میں میت دفنانا چھوڑ دیا ہو اور مدفون اموات کے جسم غالب گمان کے مطابق خاک ہو چکے ہوں تو ایسے قبرستان کو ہسپتال میں استعمال کرنا قابل اعتراض نہیں، لہٰذا مذکورہ قبرستان پر ہسپتال بنانا جائز ہوگا۔

والدّلیل علی ذلك:

قال ابن القاسم: لو أنّ مقبرة من مقابر المسلمین عفت، فبنی قوم علیها مسجدًا، لم أر بذلك بأسًا. (۱)

ترجمہ:

ابن القاسمؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کا کوئی مقبرہ پرانا اور بوسیدہ ہو گیا اور لوگوں نے اس پر مسجد تعمیر کیا تو مجھے اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔



مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو رہن میں رکھنا

سوال نمبر (219):

ایک شخص نے مسجد کے لیے پانچ مرلہ زمین وقف کی۔ اس زمین میں نمازیں بھی پڑھی گئیں البتہ اب تک مسجد تعمیر نہیں ہوئی ہے۔ تقریباً دو سال گزرنے کے بعد اس شخص نے ایک ادارے سے تین لاکھ روپے قرض لیے اور موقوفہ زمین کے کاغذات اس ادارے کے ساتھ گروی کے طور پر رکھ دیے۔ سوال یہ ہے کہ جب زمین ایک دفعہ وقف ہو جائے تو کیا وہ گروی (رہن) میں رکھی جا سکتی ہے؟　بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کوئی زمین مسجد کے لیے وقف کی جائے اور اس کا وقف تام ہو جائے تو شریعتِ مقدسہ کی رُو سے اس کی خرید و فروخت یا اُسے کسی کے پاس گروی (رہن) رکھنا جائز نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں اگر زمین باقاعدہ طور پر مسجد کے لیے وقف کی گئی ہو اور اس میں کم از کم ایک مرتبہ

---

(۱) عمدۃ القاري، شرح البخاري، باب حکم نبش قبور المشرکین: ٤/١٧٩

باجماعت نماز ہوچکی ہو تو اس کا وقف تام ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کو قرض کے بدلے کسی کے پاس گروی (رہن) رکھنا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

(فـإذاتـم ولـزم لايُـمْـلَك ولايُـمَـلَّك، ولايعار، ولايرهن) قال ابن عابدين: قوله (لايملك)أي لايكون مملوكا لصاحبه، (ولايملك)أي لايقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه.(١)

ترجمہ: اور جب وقف تام اور لازم ہو جائے تو نہ وہ مالک کی مملوک رہتی ہے اور نہ کسی کو اس کا مالک بنایا جاسکتا ہے، نہ ہی عاریت پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی رہن میں رکھا جاسکتا ہے۔ علامہ ابن عابدین 'لایملک' کا معنی بیان کرتے ہیں کہ: مالک کی مملوک نہیں رہتی۔ اور 'لایملَّک' کا معنی بیان کرتے ہیں کہ دوسرے کو بیع وغیرہ کے ذریعے اس کا مالک نہیں بنایا جاسکتا۔

❁❁❁

قبرستان پر پلازہ بنانا

سوال نمبر (220):

ہماری کالونی میں ایک پرانا قبرستان ہے جس میں تقریباً دس سال سے لوگوں نے اموات دفنانا چھوڑ دیا ہے اس کا مالک فوت ہو چکا ہے، اس کے پوتوں نے مذکورہ قبرستان پر پلازہ بنانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ کیا شرعاً قبرستان کی زمین پر آبادی کرنا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر یہ قبرستان وقف نہ ہو اور لوگوں نے اس میں مردے دفنانا چھوڑ دیا ہو اور اس میں موجود میتیں غالب گمان کے مطابق خاک ہو چکی ہوں تو اسے کسی اور مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔

لیکن اگر وقف قبرستان ہو تو اگر چہ لوگوں نے اُس میں میت دفنانا چھوڑ دیا ہو پھر بھی ذاتی استعمال کے لیے اس میں پلازہ وغیرہ تعمیر کرنا جائز نہیں البتہ دوسرے وقف مثلاً مسجد وغیرہ میں استعمال مرخص ہے۔

---

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب فرق ابو يوسف بين قوله "موقوفة": ٦/٥٣٩

والدّلیل علی ذلك:

ولو بلي الميت وصار ترابا، جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه.(١)

ترجمہ: اگر میت بوسیدہ ہو کر مٹی بن چکی ہو تو کسی دوسرے کو اس قبر میں دفنانا، یا اس میں زراعت کرنا یا اس پر عمارت بنانا جائز ہے۔

❁❁❁

جنازگاہ میں گندگی پھینکنا

سوال نمبر(221):

ہمارے گاؤں میں ایک موقوفہ جنازگاہ ہے جس میں لوگ بول و براز کرنے کے علاوہ نجاست اور گندگی (کوڑا کرکٹ) بھی ڈالتے ہیں۔کیا اہل محلّہ کے لیے جنازگاہ کی موقوفہ زمین میں نجاست اور گندگی ڈالنا جائز ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جس طرح مسجد کو صاف ستھرا رکھنا اور ہر قسم کی گندگی سے بچانا ضروری ہے، اسی طرح جنازگاہ کو بھی پاک وصاف رکھنا چاہیے۔

صورتِ مسؤلہ میں اگر وقف شدہ جنازگاہ کی زمین کے ساتھ لوگ اس طرح نامناسب سلوک کر رہے ہوں تو اہل محلّہ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ مذکورہ زمین گندگی اور نجاست سے خالی کریں اور مسجد کی طرح صاف ستھرا رکھ کر لوگوں کو اس قبیح فعل سے اجتناب کرنے کی ترغیب دیں۔

والدّلیل علی ذلك:

المتخذ لصلوة الجنازة حكمه حكم المسجد، حتى يجنب مايجنب المسجد.(٢)

ترجمہ: جنازگاہ کا حکم مسجد کی طرح ہے، چنانچہ مسجد کو جن چیزوں سے بچایا جاتا ہے اُن سے جنازگاہ کو بھی بچایا جائے گا۔

❁❁❁

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب الحادى والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر:١/١٦٧

(٢) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الحادى عشر في المسجد، الفصل الاول فيمايصير به مسجدا:٢/٤٥٦

مدرسہ کے چندہ سے تجارت کرنا

سوال نمبر(222):

مدرسہ کو جو چندہ دیا جاتا ہے۔کیا اس سے تجارت کرنا جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مدرسہ کے پیسے مہتمم ومتولی کے ہاتھ میں امانت ہوتے ہیں کیوں کہ مہتمم وکیل ہوتا ہے،بعض علما کے ہاں طلبہ کا وکیل ہے اور بعض کے ہاں چندہ دہندگان کا وکیل ہے۔بہر حال وکیل کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ امانت کی رقم سے تجارت کرے،اگر چہ اس میں بظاہر مدرسہ کی منفعت نظر آتی ہو،ورنہ یہ امانت میں خیانت کے مترادف ہوگا۔

والدّلیل علی ذلك:

أن المقبوض في يد الوكيل بجهة التوكيل ....أمانة بمنزلة الوديعه ؛لأن يده نيابة عن الموكل بمنزلة يد المودع، فيضمن بمايضمن في الودائع.(١)

ترجمہ:

وکیل کے ہاتھ میں وکالت کی حیثیت سے مقبوض چیز۔۔۔۔ودیعت کی طرح امانت ہوا کرتی ہے،اس لیے کہ وکیل کا ہاتھ موکل کی جانب سے مودع کی طرح نیابتاً ہوتا ہے،لہٰذا وکالت میں بھی ودائع کی طرح ضمان لازم ہوگا۔

❁❁❁

مدرسہ کی رقم سے قرضِ حسنہ لینا

سوال نمبر(223):

ایک شخص کے پاس کسی مدرسہ کا انتظام ہو اور وہ مدرسہ کے لیے مختص فنڈ سے اپنے کاروبار چلانے کے لیے قرضِ حسنہ لینا چاہتا ہو تو کیا اس کے لیے مدرسہ کے فنڈ سے کاروبار چلانے کے لیے قرضِ حسنہ لینا جائز ہے؟

بینوا توجروا

(١) بدائع الصنائع، کتاب الوكالة، فصل في حكم الوكيلين: ٧/٥٥٤

الجواب وباللہ التوفیق:

مدرسہ کے پیسے متولی کے ہاتھ میں امانت ہوا کرتے ہیں، ان پیسوں کو صرف مدرسہ کے مصالح میں خرچ کرنا ضروری ہے، لہٰذا ان پیسوں سے کسی قسم کی کوئی تجارت کرنا یا اس کو رہن میں رکھنا یا قرض دینا جائز نہیں۔

اس لیے مسئولہ صورت میں متولی کا مدرسہ کے پیسوں سے اپنے کاروبار کے لیے بطور قرض لینا جائز نہیں۔ نیز متولی کے ہاتھ میں یہ مدرسہ کا مال امانت ہوا کرتا ہے اور اس کو اپنی ضرورت میں استعمال کرنا امانت میں خیانت کے مترادف ہے، اس لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

والدّلیل علی ذلک:

(فإذاتم ولزم لایُمْلَك ولایُمَلَّك، ولایعار، ولایرهن) قال ابن عابدین: قوله (لایملك)أي لایکون مملوکا لصاحبه، (ولایملك)أي لایقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه.(۱)

ترجمہ: اور جب وقف تام اور لازم ہو جائے تو نہ وہ مالک کی مملوک رہتی ہے اور نہ کسی کو اس کا مالک بنایا جا سکتا ہے، نہ ہی عاریت پر دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی رہن میں رکھا جا سکتا ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ 'لایملک' کا معنی بیان کرتے ہیں کہ: مالک کی مملوک نہیں رہتی۔ اور 'لایملّک' کا معنی بیان کرتے ہیں کہ دوسرے کو بیع وغیرہ کے ذریعے اس کا مالک نہیں بنایا جا سکتا۔

❁❁❁

ایک مقصد کے لیے جمع شدہ رقم دوسرے مقصد میں استعمال کرنا

سوال نمبر(224):

طلبہ سکاؤٹ نے سندھ کے سیلاب زدگان کی امداد کے لیے لوگوں سے چندہ جمع کیا جس کو بروقت ان لوگوں تک نہیں پہنچایا جا سکا، اب حکومت نے سندھ اور بلوچستان کے قحط زدہ علاقوں کے لوگوں کی امداد کے لیے سکاؤٹ کے طالب علموں کے ذریعے چندہ مہم شروع کی ہے۔ کیا وہ سابقہ رقم ان قحط زدہ علاقوں میں بھیجی جا سکتی ہے؟ یا اس رقم کو صرف سیلاب سے متاثرہ صوبہ سندھ کے افراد تک پہنچانا ہوگا؟

بیّنوا تؤجروا

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب فرق ابویوسف بین قوله "موقوفة": ٦/٥٣٩

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جس مقصد کے لیے لوگوں سے چندہ وصول کیا جائے، اس کو اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہیے۔ اس میں تغیر وتبدیل سے اجتناب ضروری ہے، تاہم ایسی تغییر وتبدیل جو اصولاً چندہ دہندہ کے منشا کے خلاف نہ ہو، جائز ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر یہ چندہ قحط زدہ علاقوں کے لوگوں کی امداد کے لیے بھیج دیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ چندہ دینے والوں کا مقصد مصیبت زدہ عوام کی امداد کرنا ہے، جو دونوں صورتوں میں پورا ہوتا ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

شرط أن یتصدق بفاضل الغلّة علی من یسأل في مسجد کذا کل یوم لم یراع شرطه، فللقیّم التصدّق علی سائل غیر ذلك المسجد، أو خارج المسجد، أو علی من لایسأل. (۱)

ترجمہ:

واقف نے شرط لگائی کہ حاصلات کا جو حصہ اضافی ہو جائے اُسے اُس پر صدقہ کیا جائے جو فلاں مسجد میں روزانہ سوال کرے، واقف کے اس شرط کی رعایت نہیں رکھی جائے گی، لہٰذا وقف کے نگران کے لیے جائز ہے کہ اس مسجد کے سائل کے علاوہ دوسرے سائل پر اس مال کو صدقہ کرے یا مسجد سے باہر صدقہ کرے یا اس شخص پر صدقہ کرے جو سوال ہی نہیں کرتا۔

❁❁❁

وقف املاک کی زائد آمدنی دوسری جگہ خرچ کرنا

سوال نمبر(225):

پشاور کے ایک تعلیمی ادارے اسلامیہ کالج پشاور کے لیے مختلف اوقات میں لوگ اپنی جائیداد وقف کرتے رہے۔ دستاویزات کے مطابق یہ تمام غیر منقولہ جائیداد اسلامیہ کالج کے لیے ہی وقف ہے۔ کالج انتظامیہ کی جانب سے اس غیر منقولہ جائیداد کی خرچ وآمد کے لیے ایک وقف بورڈ مقرر کیا گیا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ اس وقف جائیداد کی آمدن یا اس کا کچھ حصہ کسی ادارے یا کسی شخص کو ہبہ کے طور پر دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ نیز اس کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ یا اس کی آمدن دوسرے ادارے پر خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

(۱) غمز عیون الابصار شرح الاشباہ والنظائر کتاب الوقف: ۱۰۸/۲، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ کراچی

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے جب کسی چیز کا وقف تام ہوجائے اور واقف اس چیز کو متولی کے حوالہ کرے تو متولی کے لیے اس موقوفہ چیز کے استعمال کرنے میں واقف کی جہتِ وقف کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور جب تک کسی بھی صورت میں موقوفہ چیز نفس موقوف علیہ کے مفاد میں استعمال کرنا ممکن ہو، اس وقت تک وقف چیز کو کسی دوسرے مصرف میں استعمال کرنا جائز نہیں، البتہ اگر موقوفہ چیز کا اُس مصرف میں استعمال ممکن نہ ہو تو پھر اس کو وقف کے مصالح میں استعمال کرنا چاہیے۔ اگر ایسی صورتِ حال درپیش ہو کہ اوقاف کی آمدنی متعینہ مصارف سے زائد ہو تو پھر متولی یا حاکم وقت مصلحت کی بنا پر دوسرے رفاہی اداروں اور تعلیمی سرگرمیوں میں خرچ کرسکتا ہے تاکہ وقف شدہ اموال اور جائیداد ضائع ہونے سے بچ سکے۔

لہٰذا اسلامیہ کالج کی موجودہ جائیداد کو کسی دوسرے ادارے یا کسی شخص کو ہبہ کرنا، اس کو بیچنا، اس کو رہن میں رکھنا جائز نہیں، البتہ اگر اس کی زائد آمدنی کے ضائع ہونے یا غلط ہاتھوں میں پہنچنے کا ظنِ غالب ہو تو متولی اس زائد آمدنی کو دوسرے وقف اداروں میں یا دوسرے کارِ خیر میں صرف کرسکتا ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

(فإذاتم ولزم لايُمَلَّك ولايُمَلِّك، ولايعار، ولايرهن) قال ابن عابدين: قوله (لايملك)أي لايكون مملوكا لصاحبه، (ولايملك)أي لايقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه.(١)

ترجمہ: اور جب وقف تام اور لازم ہوجائے تو نہ وہ مالک کی مملوک رہتی ہے اور نہ کسی کو اِس کا مالک بنایا جاسکتا ہے، نہ ہی عاریت پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی رہن میں رکھا جاسکتا ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ 'لایملک' کا معنی بیان کرتے ہیں کہ: مالک کی مملوک نہیں رہتی۔ اور 'لایملّک' کا معنیٰ بیان کرتے ہیں کہ دوسرے کو بیع وغیرہ کے ذریعے اس کا مالک نہیں بنایا جاسکتا۔

ولاسيمافي زماننا، فإن المسجد أو غيره من رباط،أو حوض إذالم ينقل يأخذ أنقاضه اللصوص والمتغلّبون كما هو مشاهد.(٢)

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب فرق ابويوسف بين قوله "موقوفة": ٥٣٩/٦

(٢) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب في انقاض المسجد ونحوه: ٥٥٠/٦

ترجمہ: بالخصوص ہمارے زمانے میں اگر مسجد یا اس کے علاوہ دوسری موقوفہ چیز، جیسے: فقرا کے لیے موقوفہ مکان یا حوض؛ اگر ان کی (زائد) ملبے کو دوسری جگہ منتقل نہ کی جائے تو چور اور ڈاکو اس کو لے لیں گے، جیسا کہ مشاہدہ میں آتا ہے۔

❁❁❁

قبرستان میں اُگے ہوئے پودے کاٹنا

سوال نمبر(226):

قبرستان میں جو گھاس وغیرہ اُگتے ہیں، اُن کا کاٹنا اور جانوروں کے لیے بطورِ چارہ استعمال کرنا کیسا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری مخلوقات کی طرح سرسبز گھاس اور پودے بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں، قبرستان میں جو پودے اُگ جاتے ہیں، اُن کی تسبیح کی وجہ سے مُردوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے، اس لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ قبرستان میں اُگے ہوئے سبز پودوں کا کاٹنا مکروہ ہے، البتہ اگر گھاس وغیرہ خشک ہوجائے تو اس کے کاٹنے میں کوئی حرج نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

ویکرہ أیضاً قطع النبات الرطب والحشیش من المقبرة دون الیابس.(۱)

ترجمہ: قبرستان سے سبز پودے اور گھاس کاٹنا بھی مکروہ ہے اور خشک (گھاس) کا کاٹنا مکروہ نہیں۔

❁❁❁

قبرستان میں موجود درخت

سوال نمبر(227):

ہمارے گاؤں میں دوسوسالہ پرانا قبرستان ہے، اس قبرستان میں کچھ خودرو زیتون کے درخت ہیں۔ پوچھنا یہ

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلاة، باب الجنازة، مطلب في وضع الجرید ......: ۱۵۵/۳

ہے کہ ان درختوں کو فروخت کر کے دوسری جگہ مدرسہ یا دوسرے قبرستان کے لیے جگہ خرید کر قبرستان یا مدرسہ تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس رقم کو اپنے ذاتی استعمال میں لانا کیسا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر قبرستان کے لیے زمین وقف کرتے وقت درخت موجود ہوں اور وقف صرف زمین کا ہوا ہو تو ایسی صورت میں یہ درخت واقف یا اس کے ورثا کی ملکیت ہوگی۔ اگر زمین وقف ہونے کے بعد کسی نے درخت لگائے ہوں اور درخت لگانے والا معلوم ہو تو ایسی صورت میں یہ درخت اُس شخص کی ملکیت ہوگی جس نے یہ درخت لگائے ہیں۔

اور اگر واقف نے زمین وقف کردی ہو اور زمین وقف ہونے کے بعد کسی نے درخت لگائے اور درخت لگانے والا معلوم نہ ہو یا درخت خودرو ہوں تو ان تمام صورتوں میں درخت بھی وقف شمار ہوں گے۔

مؤخر الذکر دو صورتوں میں اگر درختوں کو کسی نے کاٹ کر فروخت کردیا تو ان کی آمدنی اس قبرستان پر صَرف کی جائے گی، اگر اس قبرستان پر خرچ کرنے کی ضرورت نہ ہو تو قریبی قبرستان پر خرچ کی جائے گی اور اگر دوسرے قبرستان پر خرچ کرنے کی ضرورت بھی نہ ہو تو پھر اس رقم سے دوسرے قبرستان کے لیے زمین خریدنا یا مدرسہ وغیرہ کی تعمیر کرنا جائز ہے، تاہم کسی کے لیے اس رقم کو ذاتی استعمال میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

لو كان في المقبرة أشجار وقت الوقف كان للورثة أن يقطعوها؛لأنّ موضعها لم يدخل في الوقف... ولو نبتت فيها بعد الوقف إن علم غارسها كانت للغارس، وإن لم يعلم، فالرأي فيها إلى القاضي إن رأى بيعها، وصرف ثمنها على عمارة المقبرة، فله ذلك.(١)

ترجمہ: اگر مقبرہ وقف کرتے وقت اس میں درخت موجود تھے تو ورثا کے لیے ان کا کاٹنا جائز ہے، کیوں کہ درختوں کی جگہ وقف میں داخل نہیں۔۔۔۔۔ اگر وقف کے بعد درخت اُگ آئے تو اگر اُگانے والا معلوم ہو تو یہ درخت اُگانے والے کے ہیں۔ اور اگر اُگانے والا معلوم نہ ہو تو قاضی کو اختیار ہے۔ اگر وہ مناسب سمجھے تو اس کو فروخت کرے اور اس کی قیمت مقبرہ کی تعمیر میں خرچ کرے، تو اُس کو یہ اختیار حاصل ہے۔

(١) البحرالرائق، كتاب الوقف، تحت قوله (ومن بنى سقاية): ٥/٤٢٦

سیری زمین کی شرعی حیثیت

سوال نمبر(228):

صوبہ سرحد کی ایک سابقہ ریاست ''امب'' کے نوابوں نے اپنے دور میں ائمہ مساجد کو ''سیری'' کے نام سے زمینیں عطیہ کی تھیں، جب یہ ریاست ختم ہوگئی تو محکمہ مال نے ان زمینوں کو وقف قرار دیا ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ ایسی زمین کا شرعاً کیا حکم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

''سیری'' کے نام پر دی جانے والی زمین اگر امام مسجد کو عطیہ اور ہدیہ کے طور پر دی جاتی ہو تو یہ امام مسجد کی ملکیت ہے، بشرطیکہ اس نے اس زمین پر قبضہ کیا ہو۔اس کی وفات کے بعد اس زمین کے مالک اس کے ورثا ہوں گے اور اگر یہ زمین مصالحِ مسجد کے لیے وقف کی گئی ہو تو پھر یہ مسجد کے مفادات میں استعمال ہوگی چنانچہ امام مسجد جب تک اس مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتا رہے گا، اس کی اجرت اس زمین سے ادا کی جائے گی۔

عام طور پر سیری کے نام پر جن علاقوں میں زمین دی جاتی ہے، اس میں مسجد کے لیے وقف کی بہ نسبت امام کو ہبہ کرنے کی جہت راجح ہوا کرتی ہے۔لہٰذا سیری کے نام پر دی جانے والی زمین ''عمریٰ'' کے حکم میں ہو کر امام مسجد کی ملکیت ہوگی اور امام مسجد کی وفات کے بعد اس کے ورثا اس زمین کے مالک متصور ہوں گے۔ہاں اگر ہبہ کی بجائے اس زمین کے بارے میں وقف کی کوئی دلیل سامنے آجائے تو پھر یہ زمین مسجد کے لیے وقف شمار ہوگی۔

والدّلیل علی ذلک:

و صحّ العمری للمعمرله حال حیاته ولورثته بعده.(۱)

ترجمہ:

اورعمریٰ جائز ہے،لہٰذا جس کو دیا جائے، اس کی زندگی میں اس کا ہوگا اور اس کی وفات کے بعد اس کے ورثا کا ہوگا۔

❁❁❁

(۱) البحرالرائق، کتاب الھبة، مسائل شتی في الھبة: ۵۰٤/۷

مدرسہ کے مہتمم اور مدرس کے لیے ذاتی مہمانوں کو مدرسے کے کھانے سے کھلانا

سوال نمبر(229):

مدرسہ کے مہتمم اور مدرس کے لیے ذاتی مہمانوں کو مدرسے کے کھانے سے کھلانا کیسا ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مہتمم کو طلبہ کے اخراجات یا مدرسے کے دوسرے مصالح کے لیے لوگ جو چندہ دیتے ہیں، وہ اس کے پاس امانت کے حکم میں ہوتا ہے جو اسی کام میں صَرف کیا جائے گا جس کام کے لیے ان لوگوں نے دیا ہو اس سے ہٹ کر اپنی مفادات کے لیے استعمال کرنا خیانت ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مہتمم یا مدرس کے لیے ذاتی مہمانوں کو طلبہ کا کھانا کھلانا جائز نہیں۔ اگر کہیں ایسا موقع پیش آجائے کہ ذاتی مہمانوں کو مدرسے کے کھانے سے کھلائے تو اس کے بقدر پیسے مدرسہ میں جمع کیے جائیں، اس سے فراغتِ ذمہ حاصل ہو سکتا ہے اور اگر چندہ دینے والوں کی طرف سے صراحتاً یا دلالتاً اجازت ہو تب اس میں حرج نہیں تاہم دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی حالت میں بھی احتیاط سے کام لیا جائے۔

والدّلیل علی ذلک:

الوکیل أمین فیما في یده کالمودع، فیضمن بمایضمن به المودع.(۱)

ترجمہ: وکیل کے ہاتھ میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اس میں امین ہوتا ہے، لہٰذا وہ ان باتوں سے ضامن بن جاتا ہے جن سے امین ضامن ہوتا ہے۔

۞۞۞

واقف کی وفات کے بعد حقِ تولیت کا استحقاق

سوال نمبر(230):

ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کر کے اس پر کام شروع کیا اور اس میں اپنے دو بیٹوں سمیت چند

(۱) شرح المجلة لخالد الاتاسي، الکتاب الحادی عشر في الوکالة، الباب الاول: ٤/٤٠٤

دوسرے آدمیوں سے بھی مدد لیتا رہا۔ کسی اور کو اپنا نائب مقرر کیے بغیر وہ شخص وفات پا گیا۔ اب اس کی وفات کے بعد مسجد کا متولی کون ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واقف کی وفات کے بعد اس کے خاندان میں سے جو شخص وقف کی ذمہ داری اچھی طرح نبھانے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ اس کا زیادہ حق دار ہے، لہٰذا جب تک اس کے خاندان میں کوئی ایسا فرد ہو تو کسی دوسرے کو اس کا نائب بنانا درست نہیں ہے۔ صورتِ مسئولہ میں واقف کے بیٹوں میں جو بیٹا اچھی طرح یہ ذمہ داری نبھا سکتا ہو، اس کو متولی بنایا جائے۔

والدّلیل علی ذلك:

وفي الأصل: الحاكم لايجعل القيم من الأجانب مادام من أهل بيت الواقف من يصلح لذلك. وإن لم يجد منهم من يصلح ونصب غيرهم، ثم وجد منهم من يصلح صرفه عنه إلى أهل بيت الواقف.(١)

ترجمہ: جب تک واقف کے خاندان کا کوئی فرد وقف کی نگرانی کی صلاحیت رکھتا ہو تو حاکم اس کے علاوہ کسی دوسرے کو متولی نہیں بنائے گا۔ اگر حاکم ان میں سے کوئی صلاحیت والا شخص نہ پائے اور ان کے علاوہ کسی دوسرے کو اس پر متولی مقرر کرے، پھر ان میں سے کوئی اس کی صلاحیت رکھنے والا شخص مل جائے تو اس (حق تولیت) کو واقف کے خاندان کی طرف پھیر دے گا۔

❁❁❁

طلبہ کو مدرسے کے پیسوں پر تعلیمی دورے اور سیر و سیاحت کے لیے بھیجنا

سوال نمبر (231):

کیا کسی مدرسہ کی انتظامیہ کے لیے جائز ہے کہ وہ مدرسہ کے پیسوں سے طلبہ کو کسی تعلیمی دورے یا سیر و سیاحت کے لیے بھیجے؟

بیّنوا توجروا

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الخامس في ولاية الوقف: ٢/٤١٢

الجواب وباللہ التوفیق:

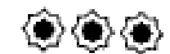
سیر وسیاحت اور مطالعاتی دورے اگر تعیش کی بنیاد پر ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ مدرسہ کے مفاد میں داخل نہیں ہیں، لہٰذا طلبہ کے ایسے اسفار اور دوروں پر مدرسہ کے پیسے خرچ کرنا جائز نہیں۔

لیکن اگر طلبہ کے علمی استفادے کی غرض سے ہو تو یہ مدرسہ کے مفادات کا حصہ بنتا ہے، لہٰذا انتظامیہ کے لیے ایسے دوروں پر ان لوگوں کا دیا ہوا چندہ استعمال کرنے کی گنجائش ہے جنہوں نے پیسے دیتے وقت کسی خاص مصرف میں استعمال کرنے کا تعیین نہ کیا ہو، بلکہ مطلقاً مدرسہ کے مفادات میں خرچ کرنے کے لیے چندہ دیا ہو، تاہم پھر بھی پرتعیش اخراجات مدرسہ پر ڈالنا مناسب نہیں، ورنہ پھر مدرسہ کے لیے ناقابل تحمل بوجھ بن سکتا ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس قسم کے اخراجات طلبہ خود برداشت کریں یا خاص اسی مد میں کسی سے چندہ لیا جائے، ایسی صورت میں یہ اسفار مدرسہ اور طلبہ دونوں کے حق میں زیادہ مفید ہو سکتے ہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

مسجد له مستغلات وأوقاف أراد المتولي أن يشتري من غلة الوقف للمسجد دهنا،أو حصيرا أو حشيشا،أو آجرا، أو جصا لفرش المسجد،أو حصى قالوا:إن وسّع الواقف ذلك للقيم وقال: تفعل ماترى من مصلحة المسجد كان له أن يشتري للمسجد ماشاء، وإن لم يوسّع، ولكنه وقف لبناء المسجد وعمارة المسجد، ليس للقيم أن يشتري ماذكرنا.(۱)

ترجمہ: ایک مسجد ایسی ہے کہ اس کی آمدنی کی جائیدادیں اور اوقاف ہیں، متولی نے یہ ارادہ کیا کہ وہ مسجد کے لیے وقف کی آمدنی سے تیل، چٹائی، گھاس، پکی اینٹیں یا مسجد کے فرش کے لیے چونا یا سنگریزے خریدے تو (اس کے حکم کے متعلق) مشائخ نے کہا ہے کہ اگر اس کے واقف نے متولی مسجد کو ایسا کرنے کی گنجائش دے دی ہو اور اس نے یوں کہا ہو کہ "تو مسجد کی مصلحت کے لیے جو مناسب سمجھے، کرلے" تو اس کے لیے جائز ہوگا کہ وہ مسجد کے لیے جو چاہے خریدے اور اگر واقف نے اس کی گنجائش نہ دی ہو، اس نے مسجد بنانے اور اس کی تعمیر کے لیے وقف کیا ہو تو جو چیزیں ہم نے ذکر کیں، متولی کے لیے انہیں خریدنا جائز نہیں ہے۔



(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الحادى عشرفي المسجد، الفصل الثاني في الوقف على المسجد:۲/۴٦۱

مملوکہ زمین میں موجود قبر پر اُگے درخت کاٹنا

سوال نمبر (232):

ہماری موروثی زمین میں ایک پرانی قبر ہے،اس پر بیر کا ایک درخت ہے کیا ہمارے لیے اس کا کاٹنا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مملوکہ زمین میں اگر کسی قبر پر درخت ہو تو زمین کا مالک اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔صورتِ مسئولہ میں آپ کے لیے اپنی مملوکہ زمین میں قبر پر اُگے ہوئے درخت کا کاٹنا جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

مقبرة عليها أشجار عظيمة فهذاعلى وجهين: إما إن كانت الأشجار نابتة قبل اتخاذ الأرض أو نبتت بعد اتخاذ الأرض مقبرة ، ففي الوجه الأول المسألة على قسمين : أماإن كانت الأرض مملوكة لها مالك أو كانت مواتا لامالك لها، واتخذها أهل القرية مقبرة، ففي القسم الأول الأشجار بأصلها على ملك رب الأرض يصنع بالأشجار وأصلها ماشاء.(١)

ترجمہ: کسی قبرستان میں بڑے درخت ہوں تو اس کی دو صورتیں ہیں: یا تو زمین کو مقبرہ بنانے سے پہلے درخت اُگے ہوں گے،یا مقبرہ بنانے کے بعد،پہلی صورت میں پھر دو قسمیں ہیں: یا تو یہ زمین کسی کی ملک ہوگی اور اس کا مالک موجود ہوگا اور یا یہ ارضِ موات ہوگی کہ اس کا کوئی مالک نہ ہو اور علاقے کے لوگوں نے اسے قبرستان بنایا ہو۔پہلی قسم میں یہ درخت اپنے جڑوں کے ساتھ مالک کی ملک میں باقی ہیں،وہ ان درختوں اور ان کی جڑوں کے ساتھ جو تصرف چاہے کرسکتا ہے۔

❀❀❀

کسی شرط پر زمین وقف کرنا

سوال نمبر (233):

ایک شخص نے اپنے آبائی گاؤں سے بہت دور قبرستان کے لیے زمین اس شرط پر وقف کی ہے کہ میرے والد

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الثاني عشرفي الرباطات والمقابر:٢/٤٧٣، ٤٧٤

صاحب کو اس قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ شریعتِ مطہرہ کی رُو سے واقف کی یہ شرط لگانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ نے واقف کی شرط کو اعتبار دیا ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے اصول سے متصادم نہ ہو۔ صورتِ مسئولہ میں والد صاحب کو موقوفہ زمین میں دفنانے کی شرط شرعاً درست ہے، اس لیے اس شرط کے ساتھ وقف جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

فإن شرائط الواقف معتبرة إذالم تخالف الشرع، وهو مالك فله أن يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية.(١)

ترجمہ: جب واقف کی شرائط شرع سے متصادم نہ ہوں تو وہ معتبر ہیں، وہ چونکہ (اپنے مال کا) مالک ہے، لہٰذا اسے اختیار حاصل ہے کہ اپنا مال جہاں چاہے خرچ کرے، بشرطیکہ کوئی معصیت نہ ہو۔

إذا وقف مقبرة، وشرط أن يدفن فيه نفسه، أو خانا،وشرط أن ينزل هو فيه صح بالإجماع.(٢)

ترجمہ: جب کوئی مقبرہ وقف کرے اور یہ شرط لگائے کہ اسے اس میں دفن کیا جائے گا یا کوئی سرائے وقف کرے، اس شرط پر کہ وہ خود اس میں ٹھہرے گا تو یہ بالاجماع صحیح ہے۔

❁❁❁

وقف کو شرط کے ساتھ معلّق کرنا

سوال نمبر(234):

اگر کوئی شخص اپنی زمین اس شرط کے ساتھ وقف کرے کہ ”فلاں شخص بھی اپنی زمین وقف کرے گا“۔ کیا ایسی صورت میں وقف درست ہوا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا اِسے فروخت کرسکتا ہے؟

بیّنوا توجروا

---

(١) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب: شرائط الواقف معتبرة: ٥٢٧/٦

(٢) الفتاوى التاتارخانية، کتاب الوقف،الفصل الثاني والعشرون: ٥٩٠/٥

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہاے کرام کی تصریحات کے مطابق وقف کوشرط کے ساتھ معلق کرنے سے وقف صحیح نہیں ہوگا۔لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی زمین کو اس شرط کے ساتھ وقف کرے کہ فلاں بھی اپنی زمین وقف کرے گا،تو مشروط ہونے کی وجہ سے یہ وقف درست نہیں۔اور جب وقف درست نہیں تو اس زمین کو فروخت کرنا جائز ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

وشرائطه أهلية الواقف...... وأن يكون منجزًا غير معلّق، فإنّه ممّالا يصلح تعليقه بالشرط.....

وفي البزازية: وتعليق الوقف بالشرط باطل.(۱)

ترجمہ:

اور وقف کے شرائط میں سے ایک واقف کا اہل ہونا ہے۔۔۔۔۔اور یہ کہ وقف منجز ہو، معلق نہ ہو، کیوں کہ وقف کوشرط کے ساتھ معلق کرنا صحیح نہیں۔۔۔۔۔اور بزازیہ میں ہے کہ وقف کوشرط کے ساتھ معلق کرنا باطل ہے۔

❁❁❁

مسجد کے لیے وقف زمین پر ورثا کا دعوی کرنا

سوال نمبر(235):

ہمارے علاقہ میں ایک جگہ مسجد کے لیے تقریباً پندرہ سال پہلے وقف کی گئی تھی۔وہاں پر مسجد تعمیر بھی ہو چکی ہے۔اب واقف کا ایک بیٹا یہ دعوی کرتا ہے کہ یہ ہماری میراث ہے۔ازروئے شریعت ہماری رہنمائی فرمائیں۔

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے زمین کا کوئی حصہ جب ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کر دیا جائے اور اس میں کم از کم ایک مرتبہ باجماعت نماز ادا کر دی جائے تو وہ وقف تام ہو کر ہمیشہ کے لیے مسجد رہے گی۔

---

(۱) البحرالرائق، کتاب الوقف: ۳۱۳/۵

صورتِ مسئولہ میں یہ جگہ جب مسجد کے لیے وقف کردی گئی ہے اوراس پر باقاعدہ مسجد بن چکی ہے تو یہ ہمیشہ مسجد ہوگی اورورثا کے لیے جائزنہیں کہ وہ اس کومیراث میں تقسیم کرنے کا دعویٰ کریں۔

والدّليل على ذلك:

ومن اتخذ أرضه مسجداً، لم يكن له أن يرجع فيه، ولا يبيعه، ولا يورث عنه ؛لأنه تجرد عن حق العباد، وصار خالصا للّٰه تعالىٰ، وهذالأن الأشياء كلها للّٰه تعالى، وإذا أسقط العبد ما ثبت له من الحق رجع إلى أصله فانقطع تصرفه عنه. (١)

ترجمہ:

اورجس نے اپنی زمین مسجد کودے دی تواس کے لیے یہ جائزنہیں کہ اس سے رجوع کرے، نہ اس کو بیچے گا، نہ اس سے میراث میں منتقل ہوگی۔کیوں کہ یہ جگہ لوگوں کے حق سے الگ ہوکر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگئی اور یہ اس لیے کہ تمام چیزیں اللہ ہی کے لیے ہیں، پس بندے کے لیے جوحق ثابت ہوتا ہے جب بندہ اُس حق کوساقط کرے، تو اصل کی طرف لوٹ جائے گی، لہٰذا اُس سے اس کا تصرف منقطع ہوجائے گا۔

❁❁❁

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کے کچھ حصہ میں دُکانیں تعمیر کرنا

سوال نمبر(236):

اگرہم مسجد کی اخراجات کے لیے مسجد کی سیڑھیوں کی جگہ دُکانیں بنائیں تو کیا یہ جائز ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

مسجد کے لیے جتنی زمین وقف ہو، چاہے وہ نماز کے لیے استعمال ہوئی ہو یا ابھی اس کا استعمال نماز کے لیے نہ ہوا ہو، اس حصے میں دُکانیں تعمیر کرنا دُرست نہیں، اگرچہ ان دُکانوں کی تعمیر سے مسجد کے لیے آمدنی حاصل ہوتی ہو۔

---

(١) الهداية، كتاب الوقف: ٢/٦٢٢

البتہ مسجد کی زمین کا وہ حصہ جو نماز کے لیے متعین نہیں ہے تو اُسے مسجد کی دوسری ضروریات، وضوخانہ وغیرہ کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

قيّم المسجد لايجوزله أن يبني حوانيت في حدّ المسجد،أو في فنائه؛لأنّ المسجد إذا جعل حانوتاً ومسكناً، تسقط حرمته، وهذا لا يجوز، والفناء تبع المسجد، فيكون حكمه حكم المسجد.(١)

ترجمہ: مسجد کے متولی کے لیے مسجد یا فنائے مسجد میں دُکانیں بنانا جائز نہیں، اس لیے کہ اگر مسجد دُکان یا رہنے کی جگہ بن جائے تو اس کی حرمت ساقط ہو جائے گی اور یہ جائز نہیں اور صحن چونکہ مسجد کے تابع ہوتی ہے، اس لیے وہ بھی مسجد کے حکم میں ہے۔

❀❀❀

مسجد کے فنڈ سے معلم کو تنخواہ دینا

سوال نمبر(237):

مسجد میں قاری صاحب کی تنخواہ کا انتظام مجموعی چندہ سے کیا جاتا ہے۔ازروئے شریعت قاری صاحب کو مسجد کے چندہ سے تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے مسجد کے لیے مختص رقم کو مسجد ہی کی ضروریات میں صرف کرنا ضروری ہے۔مسجد میں بچوں کو پڑھانے کے لیے قاری صاحب کی تقرری مصالح مسجد میں سے ہے،اس لیے قاری صاحب کی تنخواہ کا مسجد کے چندہ سے بقدر کفالت انتظام کرنا جائز ہے،لہٰذا بچوں کو پڑھانے والے قاری صاحب کے لیے مسجد کے چندہ سے تنخواہ مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔خاص کر جب چندہ دہندگان کو علم بھی ہو کہ قاری صاحب کو مسجد کے چندہ سے پڑھانے کی تنخواہ ملتی ہے۔

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف،الباب الحادي عشر في المسجد: ٤٦٢/٢

والدّليل على ذلك:

(ويبدأمن غلّته بعمارته) ثمّ ماهوأقرب لعمارته.قال ابن عابدين: وهو عمارته المعنوية التي هي قيام شعائره......وأعمّ للمصلحة، كالإمام للمسجد،والمدرّس للمدرسة، يصرف إليهم بقدر كفايتهم.(١)

ترجمہ:

اور وقف کی آمدنی سے اس کی عمارت کی ابتدا کی جائے گی، پھر جو چیز عمارت کے قریب ہو۔۔۔۔ابن عابدین کہتے ہیں: اس سے مراد معنوی تعمیر ہے۔یعنی جس سے شعائر کا قیام ہو۔۔۔۔اور مصلحت کے لیے عام ہو جیسے مسجد کے لیے امام اور مدرسہ کے لیے مدرّس، یہ آمدنی اُن پر بقدر کفایت خرچ کی جائے گی۔

❁❁❁

مسجد کے لیے وقف چیز دوسری مسجد کی طرف لے جانا

سوال نمبر(238):

ایک شخص نے مسجد کے لیے گیزر وقف کیا ہے۔اب وہ شخص دوسرے گاؤں منتقل ہو رہا ہے اور اس نے گیزر کو دوسرے گاؤں کی مسجد میں لے جانے کا ارادہ کیا ہے تو کیا متولی مسجد اس واقف کو ایسا کرنے سے روک سکتا ہے؟

بينوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفيق:

مسجد کے لیے موقوفہ چیز وقف تام ہونے کے بعد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی۔لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں جب گیزر ایک مسجد کے لیے وقف کیا گیا تو اب دوسری مسجد میں منتقل کرنا شرعاً جائز نہیں۔

والدّليل على ذلك:

(فإذاتم ولزم لايُملك ولايُملّك، ولايعار، ولايرهن) قال ابن عابدين: قوله (لايملك)أي

---

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب يبدأ بعد العمارة بماهوأقرب اليها: ٥٥٩/٦-٥٦٠

لایکون مملوکا لصاحبه، (ولا یملك)أي لایقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه.(۱)

ترجمہ:

اور جب وقف تام اور لازم ہو جائے تو نہ وہ مالک کی مملوک رہتی ہے اور نہ کسی کو اِس کا مالک بنایا جاسکتا ہے، نہ ہی عاریت پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی رہن میں رکھا جاسکتا ہے۔علامہ ابن عابدین'لایملک' کا معنی بیان کرتے ہیں کہ: مالک کی مملوک نہیں رہتی۔اور'لایملّک' کا معنیٰ بیان کرتے ہیں کہ دوسرے کو بیع وغیرہ کے ذریعے اس کا مالک نہیں بنایا جاسکتا۔

❀ ❀ ❀

مسجد کے لیے وقف شدہ رقم سے امام مسجد کا علاج کرنا

سوال نمبر(239):

ہماری مسجد کے امام صاحب کو ایک مہلک بیماری لاحق ہوگئی ہے، ڈاکٹر کی تجویز کے مطابق اس کے علاج کے لیے خطیر رقم کی ضرورت ہے، جو کہ امام صاحب کے لیے ناقابل تحمل بوجھ ہے۔کیا ایسی صورت میں مسجد کی رقم (جو لوگوں نے تعمیر کے لیے دی ہے) امام کے علاج معالجہ میں استعمال کی جاسکتی ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جو رقم مسجد کی تعمیر وترقی کے لیے دیا گیا ہو اس کو مسجد کی تعمیر کے علاوہ امام ومؤذن کے علاج ومعالجہ یا دوسرے مصارف میں استعمال کرنا جائز نہیں، البتہ اگر چندہ دہندہ گان اس بات کی اجازت دے دیں کہ اس فنڈ سے امام صاحب کے لیے علاج ومعالجہ بھی کیا جائے، تو پھر اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

والدّلیل علی ذالك:

وإذا أراد أن یصرف شیئاً من ذلك إلی إمام المسجد،أو إلی مؤذن المسجد، فلیس له ذلك إلا إن کان الواقف شرط ذلك في الوقف.(۲)

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب فرق ابویوسف بین قوله "موقوفة": ۶/۵۳۹

(۲) الفتاوی الهندیة، کتاب الوقف، الباب الحادی عشر في المسجد،الفصل الثاني في الوقف علی المسجد: ۲/۴۶۳

ترجمہ:

اگر متولی مسجد کی آمدنی سے کچھ امام یا مؤذن کو دینا چاہے، تو اُسے اس کی اجازت نہیں۔ البتہ اگر واقف نے وقف میں اس کی شرط لگائی ہو تو پھر جائز ہے۔

❁❁❁

مسجد کے اندر وضو

سوال نمبر(240):

گاؤں میں ایک پرانی مسجد ہے۔ اُس کے ساتھ متصل وضوخانہ بھی ہے لیکن ایک شخص مسجد کے اندر لوٹے کے ساتھ وضو کرتا ہے۔ چونکہ مسجد کی زمین کچی ہے اس لیے پانی اس زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ مسجد کے احاطے کے اندر اس شخص کا یہ فعل درست ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مسجد چونکہ عبادت اور ذکر الٰہی کے لیے بنائی جاتی ہے، اس لیے مسجد میں ہر اس کام سے اجتناب کرنا ضروری ہے، جس سے مسجد کا تقدس واحترام پامال ہونے کا خدشہ ہو۔

صورتِ مسئولہ میں مسجد کے اندر اس طرح وضو کرنا کہ وضو کا پانی مسجد میں گرے، مسجد کے تقدس کے منافی ہے۔ فقہائے کرام نے اس کو مکروہ لکھا ہے۔ تاہم اگر مسجد میں وضو اس طرح سے کیا جائے کہ وضو کا مستعمل پانی مسجد کی زمین پر نہ گرے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن بہتر بہر حال یہ ہے کہ مسجد سے باہر وضوخانہ میں وضو کیا جائے۔

والدّلیل علی ذلک:

وتكره المضمضة، والوضوء في المسجد إلاأن يكون ثمة موضع أعد لذلك، ولا يصلى فيه، وله أن يتوضأ في إناء.(۱)

ترجمہ: مسجد کے اندر وضو اور مضمضہ کرنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر وہاں ایک جگہ وضو ہی کے لیے بنائی گئی ہو جہاں نماز ادا نہ کی جاتی ہو تو اس میں مکروہ نہیں۔ نیز کسی برتن میں بھی وضو کرنا جائز ہے۔

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها: ۱/ ۱۱۰

متولی کی اجازت کے بغیر مسجد کی تعمیر میں تصرف

سوال نمبر(241):

ایک شخص نے مسجد کے لیے وقف شدہ زمین پر اپنے پیسوں سے مسجد تعمیر کی۔اب وہ مسجد کا متولی بن گیا ہے۔ دوسرے محلے کے ایک شخص نے مسجد کی دیوار میں ایک دروازہ لگانے کا ارادہ کیا ہے،لیکن متولی مسجد اس کی اجازت نہیں دیتا۔کیا متولی کو یہ حق حاصل ہے کہ دوسرے لوگوں کو مسجد کی تعمیر میں حصہ لینے سے منع کرے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ مسجد کی تعمیر کا حق صرف متولی اور محلہ والوں کو حاصل ہوتا ہے،لہٰذا اگر کوئی شخص متولی اور اہل محلہ کی اجازت کے بغیر مسجد کی تعمیر میں تصرف کرنا چاہے تو متولی مسجد یا اہل محلہ اس کو روک سکتے ہیں،کیوں کہ مسجد کے جملہ اختیارات متولی اور اہل محلہ کو حاصل ہوتے ہیں۔دوسرے محلے کا شخص اس میں تصرف کا حق نہیں رکھتا۔

والدّلیل علی ذلک:

أرادوا نقض المسجد، وبناؤه أحكم من الأول إن لم يكن الباني من أهل المحلة، ليس لهم ذلك، وإن كان من أهل المحلة لهم ذلك.(١)

ترجمہ:

لوگ مسجد شہید کرکے پہلے سے زیادہ مضبوط بنانا چاہیں تو اگر نئی تعمیر کرنے والا اہل محلہ میں سے نہ ہو تو ان کو اس کا اختیار نہیں ہوگا اور اگر اہل محلہ میں سے ہو تو اسے اختیار ہوگا۔

❁❁❁

مسجد کی دیوار کا بیرونی حصہ اجرت پر تشہیر کے لیے دینا

سوال نمبر(242):

شہر کے درمیان ایک مسجد ہے جس کی دیواروں کے ساتھ کوئی متصل آبادی نہیں ہے۔بعض کمپنیاں ایسی

---

(١) البحرالرائق، کتاب الوقف، تحت قوله(ومن بنى مسجدا لم يزل ملكه):٥/٤٢٠

ہیں جو اپنی مصنوعات کی تشہیر کے لیے مسجد کی دیواروں میں سوراخ کرکے بڑے بڑے بورڈ لگانا چاہتے ہیں جس سے مسجد کو آمدنی حاصل ہوتی ہے۔کیا ایسی صورت میں مسجد کی دیواریں اشتہار یا بورڈ لگانے کے لیے استعمال کرنا شرعاً درست ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ جس طرح مسجد کی زمین کسی ذاتی استعمال میں نہیں لائی جاسکتی، اسی طرح مسجد کی دیواریں بھی ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنا یا دوسروں کو کرایہ پر دے کر مسجد کے مفاد کے لیے آمدنی وصول کرنا جائز نہیں۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق مسجد کی دیواروں میں سوراخ کرکے بورڈ لگانا جائز نہیں ہے، اگرچہ ان اشتہاروں کی اجرت وصول کی جاتی ہو۔

والدّلیل علی ذلک:

قلت: وبه علم حكم ما يصنعه بعض جيران المسجد من وضع جذوع على جداره، فإنه لايحل، ولودفع الأجرة.(۱)

ترجمہ:

میں کہتا ہوں اس سے اس مسئلے کا حکم معلوم ہوا کہ مسجد کے بعض پڑوسی جو لکڑیوں کے سرے مسجد کی دیوار پر رکھتے ہیں یہ جائز نہیں، اگرچہ وہ اجرت بھی دے۔

❁❁❁

مسجد کی اشیا عاریتاً استعمال کرنا

سوال نمبر(243):

اگر کوئی شخص مسجد کی اشیا، مثلاً: پانی کا پائپ، سیڑھی یا بالٹی وغیرہ عاریتاً استعمال کرنا چاہے تو استعمال کرنے میں شرعاً کوئی حرج تو نہیں؟

بیّنوا توجروا

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب في أحكام المسجد: ٦/٥٤٨

الجواب وباللہ التوفیق:

جب ایک دفعہ کوئی چیز مسجد کے لیے وقف کردی جائے تو اس کو ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔ فقہائے کرام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ مسجد کی وقف شدہ چیز کا کوئی مالک نہیں ہوتا اس لیے وہ چیز عاریتاً استعمال ہوسکتی ہے اور نہ ہی رہن میں رکھی جاسکتی ہے، البتہ اگر واقف نے وقف کرتے وقت اس کی بھی نیت کی ہو کہ لوگ اُسے عاریتاً استعمال کریں، تو پھر ان کا عاریتاً استعمال جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

(فإذاتم ولزم لايُمَلَّك ولايُمَلَّك، ولا يعار، ولا يرهن) قال ابن عابدين: قوله (لايملك)أي لايكون مملوكا لصاحبه، (ولا يملك)أي لايقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه.(۱)

ترجمہ: اور جب وقف تام اور لازم ہو جائے تو نہ وہ مالک کی مملوک رہتی ہے اور نہ کسی کو اس کا مالک بنایا جاسکتا ہے، نہ ہی عاریت پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی رہن میں رکھا جاسکتا ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ 'لایملک' کا معنی بیان کرتے ہیں کہ: مالک کی مملوک نہیں رہتی۔ اور 'لایملَّک' کا معنی بیان کرتے ہیں کہ دوسرے کو بیع وغیرہ کے ذریعے اس کا مالک نہیں بنایا جاسکتا۔



مسجد کی ضروریات کا تعین

سوال نمبر(244):

مسجد کے لیے جمع شدہ رقم سے متولی مسجد کے لیے ائیر کنڈیشن خرید سکتا ہے یا نہیں، کیونکہ ائیر کنڈیشن ایک بھاری قیمت کی چیز ہے جس کے استعمال سے بجلی کے اخراجات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ کیا یہ مسجد کی ضروریات کا حصہ بن سکتا ہے یا نہیں کہ متولی صوابدیدی اختیارات کو استعمال کرکے مسجد کے لیے ائیر کنڈیشن خریدے۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی شخص مسجد کے لیے کسی مخصوص چیز کی خریداری کے لیے رقم مہیا کرے تو اس

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب فرق ابویوسف بین قوله "موقوفة": ٦/٥٣٩

رقم سے دوسری چیز خریدنا جائز نہیں۔ اگر اس مخصوص چیز کی ضرورت نہ ہو تو رقم مالک کو واپس کی جائے گی، تاہم اگر مالک اجازت دیدے تو وہ رقم دوسری مد میں خرچ کی جاسکتی ہے، لیکن جہاں کہیں عمومی چندہ ہو اور چندہ دہندگان کی طرف سے کسی خاص مد کا تعین نہ ہوا ہو تو ایسی رقم خرچ کرنے میں متولی کی صوابدید کا زیادہ دخل ہے، یعنی متولی کو جہاں ضرورت محسوس ہو تو وہاں یہ رقم خرچ کرسکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ضرورت کا دائرہ ایک نہیں رہتا، بلکہ اشخاص، حالات، مقامات اور موسم کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ گرمی میں کسی مسجد اور ادارہ کی جو ضروریات ہوتی ہیں، وہ سردی کے موسم میں نہیں رہتیں اور سرد علاقوں کی ضروریات گرم علاقوں میں نہیں ہوتیں، چنانچہ سرد علاقوں کی مساجد میں پانی گرم کرنے کا اہتمام ہوتا ہے کیونکہ ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا باعث تکلیف رہتا ہے اس لیے وضو کے لیے پانی گرم کرنا مسجد کی ضروریات میں داخل ہے، جب کہ گرم علاقوں میں پنکھے اور پینے کے لیے ٹھنڈے پانی کا بندوبست کرنا مسجد کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ ایسا ہی اشخاص اور افراد سے بھی مسجد کی ضروریات کا دائرہ بدلتا رہتا ہے۔ اگر مسجد کسی ایسے محلے کی ہو، جہاں کے نمازی آسودہ حال ہوں۔ گھر، دفتر، گاڑی وغیرہ ہر جگہ ان کو مہنگی سہولیات مہیا ہوں، تو مسجد میں جا کر بغیر ائیر کنڈیشن کے نماز پڑھنے میں اُن کے لیے دقت کا سامنا ہوگا لہٰذا ایسی مسجد کی ضرورت کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اگر ایسے لوگ مسجد کے متولی کو چندہ دے کر تعیین نہ کریں اور متولی ائیر کنڈیشن کی ضرورت محسوس کر کے خرید لے تو خرید سکتا ہے۔ ایسی جگہ یہ مسجد کی ضرورت شمار ہوگی۔ لیکن جہاں کہیں لوگ جفاکش ہوں، گھریلو حالات کمزور ہوں، وہ گھر میں پنکھا کی دستیابی تک نعمتِ خداوندی سمجھتے ہوں تو پھر عوامی چندہ سے مسجد کے لیے ائیر کنڈیشن خریدنا عیاشی کے مترادف سمجھا جائے گا اور ایسے محلے کی مسجد کی ضرورت میں ایسی چیزیں شامل نہیں سمجھی جائیں گی۔ غرض یہ کہ عوامی چندہ کے استعمال میں محلہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

لو وقف علی المصالح فهي للإمام، والخطيب، والقيم، وشراء الدهن، والحصير، والمراوح.(١)

ترجمہ: اگر مسجد کے مصالح کے لیے کوئی چیز وقف کی گئی تو وہ امام، خطیب، نگران اور روشنی کے لیے تیل، چٹائی اور پنکھے خریدنے کے لیے ہوں گی۔

---

(١) شرح الاشباه والنظائر، کتاب الوقف: ۲/۱۰۰

مسجد کی توسیع کے لیے جبری طور پر زمین لینا

سوال نمبر (245):

ایک مسجد نمازیوں پر تنگ پڑگئی ہے۔قرب وجوار میں خالی زمین پڑی ہے لیکن مالک زمین دینے سے انکاری ہے۔کیا مسجد کی ضرورت کے لیے ایسے شخص سے جبری طور پر زمین خریدی جاسکتی ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شخصی مفادات کی بجائے اجتماعی مفادات کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔چونکہ مسجد سے اجتماعی مفادات وابستہ ہوتے ہیں، اس لیے شخصی مفادات کی بہ نسبت اجتماعی مفادات کی تقدیم کی وجہ سے مسجد کا حق زیادہ ہے، لیکن یہ اختیار حاکم وقت کو حاصل ہے کہ وہ جہاں اجتماعی مفادات کے لیے ضرورت محسوس کرے تو کسی شخص سے جبری طور پر زمین حاصل کرسکتا ہے، تاہم اس کو مروجہ قیمت کی ادائیگی ضروری ہے۔عام لوگوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسجد کی ضرورت کے پیشِ نظر مالک کی رضامندی کے بغیر اُس سے زمین لے لیں۔عوام کا ایسا بلا اجازت تصرف، غاصبانہ قبضہ متصور ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ منت سماجت کرکے اُسے راضی کروالیا جائے۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو ضاق المسجد علی الناس، وبجنبہ أرض لرجل تؤخذ أرضہ بالقیمة کرھا، وقد صح عن عمر، وکثیر من الصحابة أنھم أخذوا أرضین بکرہ من أصحابھا وزادوا في المسجد الحرام حین ضاق بھم. (۱)

ترجمہ:

اگر مسجد لوگوں پر تنگ ہوئی اور قریب کسی شخص کی زمین ہو تو قیمت دے کر جبری طور پر اس سے لی جائے گی۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے کئی صحابہ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ اُنہوں نے مسجد حرام کے تنگ ہونے کے موقع پر قرب وجوار کی زمین (قیمت دے کر) جبراً خریدی اور مسجد حرام میں اضافہ کیا۔

❁❁❁

(۱) الفتاوی التاتارخانیة، کتاب الوقف، الفصل الحادی والعشرون في المساجد: ۵/۵۷۱

مسجد کی محراب کے لیے راستے کا کچھ حصہ گھیرنا

سوال نمبر(246):

عصرِ حاضر میں اکثر مساجد کی محرابیں باہر کی طرف نکلی ہوئی ہوتیں ہیں۔ہماری مسجد کی توسیع اور تعمیر ہونے والی ہے،جس کا محراب والا حصہ ساتھ گزرنے والے راستے پر تعمیر کیا جائے گا،جب کہ اہلِ محلّہ کو راستے میں مسجد کی محراب کا کچھ حصہ آنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ایسی صورت میں مسجد کی محراب کا حصہ راستہ پر تعمیر کرنا شرعاً کیسا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

صورتِ مسئولہ میں اگر محراب راستہ کی طرف نکالنے سے راستہ پر گزرنے والوں کو تنگی اور تکلیف ہوتو شریعت کی رُو سے اہلِ محلّہ کے لیے ایسا اقدام کرنا شرعاً جائز نہیں،لیکن اگر راستے پر گزرنے والوں کو اس سے تکلیف نہ ہو اور محلّہ والوں کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہ ہو تو پھر مسجد کے منتظمین کے لیے راستے کا کچھ حصہ مسجد کے لیے استعمال کرنے میں گنجائش پائی جاتی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

قوم بنوا مسجداً،واحتاجوا إلی مکان لیتسع المسجد، وأخذوا من الطریق، وأدخلوه في المسجد إن کان یضر بأصحاب الطریق لا یجوز، وإن کان لایضر بهم رجوت أن لایکون به بأس. (۱)

ترجمہ:

کسی قوم نے مسجد بنائی اور ان کو مسجد وسیع کرنے کے لیے جگہ کی ضرورت پڑی تو راستے کا کچھ حصہ انہوں نے مسجد میں داخل کیا،اگر گزرنے والوں کے لیے یہ مضر ہو تو جائز نہیں اور اگر لوگوں کو اس سے تکلیف نہ ہو تو میں امید رکھتا ہوں کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

❁❁❁

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الوقف، الباب الحادی العاشر، الفصل الاول: ۲/۴۵٦

ایک مسجد کا سامان دوسری مسجد کو دینا

سوال نمبر(247):

شہر کی ایک مسجد میں ضرورت سے زیادہ سامان پڑا ہوا ہے، مثلاً: کئی گھڑیاں، پنکھے، صفیں اور دریاں وغیرہ، جب کہ ہمارے گاؤں کی مسجد میں یہ ضروری چیزیں نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ وضو کے لیے لوٹے بھی موجود نہیں ہیں۔ کیا شہر والی مسجد سے زائد سامان لا کر گاؤں کی مسجد میں استعمال کرنا جائز ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کوئی مسجد کسی چیز سے بالکل مستغنی ہو جائے، یعنی وہ چیز فی الحال بالکل استعمال میں نہ آ رہی ہو اور آئندہ بھی اس کی ضرورت پیش آنے کا کوئی امکان نہ ہو جس کی وجہ سے یونہی بوسیدہ اور ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں اس چیز کو دوسری مسجد لے جانے کی گنجائش پائی جاتی ہے، لیکن اگر سامان کی ضرورت آئندہ پیش آنے کا امکان ہو تو پھر دوسری مسجد کو دینا جائز نہیں، نیز اگر واقف نے پہلے سے نیت کی ہو کہ اس چیز کو دوسری مساجد میں بھی استعمال کر سکتے ہیں تو پھر بھی ایک مسجد کا سامان دوسری مسجد میں استعمال کرنا جائز ہے۔

صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی شہر کی مسجد میں ضرورت سے زائد سامان پڑا ہے تو متولی مسجد کی اجازت سے اسے گاؤں کی مسجد میں لے جانا جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

ينقل الحصر والحشيش إلى مسجدٍ آخر على الصحيح من مذهب أبي يوسف، أو يبيعها القيِّم لأجل المسجد.(۱)

ترجمہ:

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے صحیح مذہب کے مطابق چٹائیاں اور گھاس دوسرے مسجد کو منتقل کی جا سکتی ہیں۔ یا پھر مسجد کا نگران انہیں مسجد کے لیے بیچ دے۔

---

(۱) درر الحکام شرح غرر الأحکام: کتاب الوقف

مسجد کے درختوں کا پھل استعمال کرنا

سوال نمبر(248):

اگر کسی مسجد میں پھل دار درخت ہوں جن کے پھل لوگ اپنے استعمال میں لانا چاہتے ہوں تو از روئے شریعت مسجد کا پھل ذاتی تصرف میں لانا جائز ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مقدسہ کی رُو سے اگر واقف نے ابتداءً یہ نیت کی ہو کہ جو شخص بھی اس مسجد میں داخل ہو، وہ مذکورہ پھل کھا سکے گا تو ایسی صورت میں مسجد کے پھل دار درخت سے پھل کھانے کی شرعاً گنجائش پائی جاتی ہے، لیکن بہتر صورت یہ ہے کہ اس کو فروخت کر کے مسجد کے مصالح میں وہ رقم خرچ کی جائے۔ اگر واقف نے درخت کو مسجد کے لیے وقف کیا ہو تو پھر موقوفہ پھل ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں اور پھلوں کی قیمت مسجد کے مصارف پر خرچ کی جائے گی۔

والدّلیل علی ذلک:

وفي الحاوي: وما غرس في المساجد من الأشجار المثمرة إن غرس للسبيل، وهو الوقف على العامة كان لكل من دخل المسجد من المسلمين أن يأكل منها، وإن غرس للمسجد لايجوز صرفها إلا إلى مصالح المسجد، الأهم فالأهم كسائر الوقوف. (۱)

ترجمہ:

اور حاوی میں لکھا ہے کہ مساجد میں جو پھل دار درخت بوئے گئے ہوں اُن کا حکم یہ ہے کہ اگر عام راہ گیروں کے لیے بوئے گئے ہوں جو کہ وقفِ عام ہو تو مسلمانوں میں سے جو بھی مسجد میں داخل ہو اس کو کھا سکتا ہے اور اگر مسجد کے لیے بویا گیا ہے تو پھر اس کا استعمال مصالح مسجد کے علاوہ جائز نہیں۔ اہم سے اہم مصرف میں خرچ کیا جائے گا۔ جس طرح ہر وقف کا حکم ہے۔

❁❁❁

(۱) البحر الرائق، کتاب الوقف، تحت قوله (وصح وقف العقار ......): ۵/۳٤١،٣٤٢

حرام مال سے مسجد کی تعمیر

سوال نمبر(249):

مسجد کی تعمیر کے لیے ایک شخص نے سودی رقم دی ہے۔کیا مسجد کی تعمیر میں ایسی رقم کو استعمال کرنا جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد اللہ تعالیٰ کا مقدس اور پاکیزہ گھر ہے۔اس کی تعمیر ومرمت میں حلال اور پاکیزہ مال استعمال کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کو پسند کرتا ہے۔سود کا مال چونکہ حرام اور ناپاک ہے اس لیے سود کی رقم مسجد کی تعمیر یا اس کے مصالح ومقاصد میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

قال تاج الشریعة: أمّالوانفق في ذلك مالا خبیثًا ومالاًسببه الخبیث والطیب، فیکره ؛لأن اللّٰہ تعالیٰ لایقبل إلاالطیب، فیکره تلویث بیته بمالایقبله.(۱)

ترجمہ:

تاج الشریعہ فرماتے ہیں کہ اگر ناپاک مال کو مسجد میں خرچ کرے یا ایسا مال جس کا سبب پاک اور ناپاک مخلوط ہو تو یہ مکروہ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ صرف پاک مال کو قبول کرتا ہے، لہٰذا اس کے گھر کو ایسے مال سے آلودہ کرنا مکروہ ہے جس کو وہ قبول نہیں کرتا۔

❁❁❁

مسجد کے نچلے حصے میں دکانیں بنانا

سوال نمبر(250):

بازار کی ایک جگہ پرانے زمانے کے مسلمانوں نے مسجد کے لیے وقف کی ہے۔لوگ اس میں باقاعدہ نماز باجماعت پڑھتے ہیں۔جمعہ وعیدین بھی اس میں شروع ہو چکے ہیں۔اس مسجد کا کافی فنڈ اکٹھا ہو چکا ہے

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلاۃ، باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ فیھا،مطلب کلمۃ "لاباس":۲/۴۳۱

فنڈ کی کثرت کی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کے مصالح کے لیے اس کے نیچے دکانیں بنائی جائیں اور اس کے اوپر مسجد تعمیر کی جائے۔ کیا ایسی صورت میں مسجد کے نیچے دکانیں بنانا شرعاً درست ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی مسجد حقیقت میں تحت الثریٰ سے لے کر آسمان تک مسجد ہوتی ہے، اس لیے مسجد کے نیچے اور اوپر والی فضا بھی قابلِ احترام بن جاتی ہے۔ لہٰذا مسجد کے اوپر یا نیچے دکانیں بنانا مسجد کی حرمت کے خلاف ہے اور مسجد میں تبدیلی ہے جو کہ ناجائز ہے۔

صورتِ مسئولہ میں جس مسجد کا ذکر ہے چونکہ یہ باقاعدہ مسجدِ شرعی ہے اور اس میں باجماعت نمازیں ادا ہوتی ہیں اس لیے اس کی تعمیرِ نو میں نیچے دکانیں بنانا شرعاً جائز نہیں۔ تاہم اگر موجودہ وضوخانے یا امام کے کمرے کی جگہ دکانیں بنائی جائیں تو گنجائش ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

قيم المسجد لايجوزله أن يبني حوانيت في حدّالمسجد،أو في فنائه ؛لأنّ المسجد إذا جعل حانوتاً ومسكناً تسقط حرمته، وهذا لا يجوز، والفناء تبع المسجد، فيكون حكم المسجد.(۱)

ترجمہ: مسجد کے نگران کے لیے مسجد یا فنائے مسجد میں دُکانیں بنانا جائز نہیں، کیونکہ اگر مسجد دُکان یا رہنے کی جگہ بن جائے تو اس کا احترام ختم ہو جائے گا اور یہ جائز نہیں اور صحن چونکہ مسجد کے تابع ہوتی ہے، اس لیے وہ بھی مسجد کے حکم میں ہے۔

❁❁❁

مساجد کے محراب

سوال نمبر(251):

ایک مسجد میں محراب بنی ہوئی ہے جس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ اسلامی ثقافت کے موافق نہیں۔ کیا اس محراب کو گرا کر بلا محراب مسجد بنائیں یا اس محراب کو عام محراب کی طرح کر دیں؟

بیّنوا تؤجروا

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف،الباب الحادي عشر في المسجد: ۲/۴۶۲

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ مسجد میں محراب کا تصور دورِ نبوی ﷺ سے چلا آرہا ہے البتہ اس کے لیے کوئی مخصوص شکل متعین نہیں اور اس کا مقصد صف کے وسط کو متعین کرنا ہے اس لیے صف کا وسط معلوم کرنے کے لیے کسی بھی طرح محراب بنانا درست ہے، تاہم ایسی تعمیر سے احتراز کرنا چاہیے جس سے غیر مسلم ثقافت کی عکاسی ہوتی ہو۔

صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ مسجد کی محراب عام مساجد میں بنائے گئے محرابوں سے زیادہ مختلف ہو تو اس کو عام مساجد کی طرح بنانا زیادہ مناسب رہے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قلت: أي لأن المحراب إنما بني علامة لمحل قیام الإمام، لیکون قیامه وسط الصف، کما هو السنة.(۱)

ترجمہ:

اس لیے کہ محراب امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کی علامت کے طور پر بنائی جاتی ہے تاکہ وہ صف کے درمیان میں کھڑا ہو، جیسا کہ سنت ہے۔

❁❁❁

مسجد کی تعمیر میں مرتد کا تعاون

سوال نمبر(252):

مسجد کی تعمیر کے لیے ایک مرتد شخص نے سیمنٹ کی دوسو بوریاں دی ہیں۔ متولی مسجد ان سیمنٹ کی بوریوں کو مسجد کی تعمیر میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کیا متولی کا ایسا کرنا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعی کسی شخص نے ارتداد کا راستہ اختیار کیا ہو اور اپنے ارتداد پر بدستور قائم ہو تو فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق مرتد ہونے کی وجہ سے ایسے شخص کا ہبہ باطل ہوگا، لیکن اگر اسلام کی طرف راغب ہونے کی امید ہو تو

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلاة، باب مایفسد الصلاة ومایکره فیها: ۲/ ٤١٤

ہبہ موقوف رہے گا اور اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ہبہ نافذ ہو جائے گا۔ ارتداد کی حالت میں اس کی بوریاں مسجد کی تعمیر کے لیے قبول نہ کی جائیں۔

والدّلیل علی ذلک:

توقف مبايعته وعتقه وهبته، فإن أمن نفذ، وإن هلك بطل. (۱)

ترجمہ: مرتد کی خرید وفرخت، غلام یا باندی کی آزادی اور ہبہ (یہ سب تصرفات) اس کے ایمان لانے تک موقوف رہیں گے۔ اگر ایمان لے آیا تو نافذ ہوں گے اور اگر ہلاک ہوگیا تو باطل ہوں گے۔

❁❁❁

مسجد میں نماز کے منتظرین کو سلام کرنا

سوال نمبر (253):

عموماً مسجد میں جب لوگ داخل ہوتے ہیں تو لوگوں کو سلام کرتے ہیں۔ کیا مسجد میں داخل ہونے والوں کا سلام کرنا شرعاً درست ہے حالانکہ لوگ ذکر واذکار اور نماز میں مشغول ہوتے ہیں؟

بيّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''جو شخص مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھا ہو، وہ بھی نماز میں ہے'' اس حدیث کی بنا پر مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے لوگ حکماً نماز میں ہوتے ہیں، اس لیے ان کو سلام کرنا مناسب نہیں، البتہ اگر نماز کے بعد مسجد میں فارغ بیٹھے ہوں تو پھر سلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اول الذکر صورت میں جواب نہ دینے سے گناہ گار نہیں ہوں گے۔

والدّلیل علی ذلک:

عن عياش بن عقبة أن يحيى بن ميمون حدثه قال: سمعت سهل بن سعد الساعدي يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من كان في مسجد ينتظر الصلاة فهو في الصلاة. (۲)

(۱) كنزالدقائق، كتاب السير، باب المرتدين: ۱۹۵/۱

(۲) صحيح ابن حبان، كتاب الصلاة، باب فضل الصلاة الخمس، رقم الحديث:۱۷٤۷:۳/۹٦

ترجمہ:

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص مسجد میں نماز کا انتظار کرتا ہو تو وہ نماز میں ہے''۔

❁❁❁

منبر کا محراب کے دائیں یا بائیں ہونا

سوال نمبر (254):

زمانۂ قدیم سے دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ عموماً مساجد میں منبر محراب کی دائیں طرف رکھا اور بنایا جاتا ہے، لیکن بعض مساجد میں دیکھا ہے کہ منبر محراب کی بائیں طرف رکھا ہوتا ہے۔ اِن میں سے کونسا طریقہ درست ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

رسول اللہ ﷺ کے دورِ مبارک میں منبر محراب کی دائیں طرف ہوتا تھا اور اسی پر حضور ﷺ خطبہ دیا کرتے تھے لہٰذا منبر کا محراب اور مصلّی کی دائیں طرف رکھنا اور بنانا سنت ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

و کان منبر رسول اللّٰہ ﷺ عن یمین المحراب إذا استقبلت القبلۃ. (۱)

ترجمہ:

حضور ﷺ کا منبر محراب کی دائیں طرف ہوتا تھا۔ جب قبلہ کی طرف رخ کیا جائے۔

❁❁❁

غصہ کی حالت میں مسجد سے لاتعلقی کا اظہار

سوال نمبر (255):

ایک شخص کو مسجد آنے کی دعوت دی گئی کہ'' آؤ مسجد میں دین کی بات ہورہی ہے، آپ سن لیں ان شاء اللہ آپ کو

(۱) بذل المجهود، باب موضع المنبر: ٦/٧٧

فائدہ ہوگا۔" وہ شخص ردِعمل کے طور پر جلال میں آیا اور کہنے لگا "مسجد میں بیٹھنا تمھارے جیسے لوگوں کا کام ہے، ہم مصروف لوگ ہیں، ہمارا مسجد سے کیا تعلق ہے، جاؤ تم جانو اور تمہاری مسجد" کیا ان کلمات سے اس شخص کے ایمان پر اثر پڑتا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

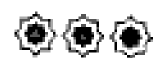
مسجد مسلمانوں کا مذہبی ورثہ ہے اور مسجد سے دل لگانا ایمان کی علامت ہے، لیکن ہر وقت مسجد میں رہنا کوئی ایسا عمل نہیں، جو ایمان کا بنیادی رکن ہو اور اس کے بغیر ایمان ناقص رہے۔

صورتِ مسئولہ میں اس شخص کے یہ الفاظ نہایت قبیح ہیں لیکن اس سے کفر لازم نہیں آتا کہ یہ دائرہ اسلام سے خارج ہو کیونکہ بظاہر اس آدمی کے جملے کا مطلب یہ ہے کہ "کون مسجد کو چوبیس گھنٹے دے سکتا ہے، کچھ تو دنیا کے لیے بھی کرنا پڑتا ہے،" لیکن تعبیر خلاف شرع ہے، ایسے الفاظ بولنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

والدّلیل علی ذلک:

سئل عن رجل قیل له بایکدرم بده تابعمارت مسجد صرف کنم یابمسجد حاضر شود بنماز فقال من نه مسجد آیم، ونه درهم دهم مرابامسجد چه کار، وهو مصر علی ذلك قال: لایکفر، ولکن یعزر.(۱)

ترجمہ: ایک آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس سے کہا گیا کہ ایک درہم دو تا کہ مسجد کی تعمیر میں خرچ کروں یا مسجد میں نماز کے لیے آؤ، اس شخص نے کہا کہ میں نہ درہم دوں گا اور نہ مسجد آؤں گا۔ میرا مسجد سے کیا کام ہے اور وہ شخص اس پر مصر ہے تو جواب دیا گیا کہ اس سے یہ شخص کافر نہیں ہوا، البتہ تعزیری سزا کا مستحق ہے۔



مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال نمبر(256):

ہماری مسجد کی محراب سے قبلہ کی طرف ایک دروازہ ہے اور اس کے آگے مسجد سے باہر تقریباً ایک صف کی جگہ

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب السیر، الباب التاسع في أحكام المرتدین، مطلب في موجبات الكفر:۲/ ۲۸۰

ہے۔امامِ جنازہ اور کچھ لوگ وہاں کھڑے ہوتے ہیں، باقی لوگ جنازہ کی صفیں مسجد میں بناتے ہیں۔کیا یہ جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد میں بغیر کسی عذر کے نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، خواہ میت مسجد سے باہر کیوں نہ ہو، البتہ اگر نمازِ جنازہ کے لیے کوئی جگہ میسر نہ ہو یا اتنی بارش ہو جس میں نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے لوگ مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں شریعتِ مقدسہ کی رُو سے مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

(وكرهت تحريما)وقيل (تنزيها في مسجد جماعة هو)أي الميت (فيه) وحده، أو مع القوم (واختلف في الخارجة)عن المسجد وحده، أو مع بعض القوم (والمختار الكراهة)قال ابن عابدين: (مطلقا)أي في جميع الصور المتقدمة.......... سواء كان الميت فيه، أو خارجه، هو ظاهر الرواية.(١)

ترجمہ:

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے اور ایک قول کے مطابق مکروہ تنزیہی ہے، خواہ صرف میت مسجد میں ہو یا پوری قوم مع میت کے مسجد میں ہو اور میت کا مسجد سے باہر ہونے میں اختلاف ہے کہ صرف میت باہر ہو یا اس کے ساتھ بعض لوگ بھی باہر ہوں۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں: ان تمام گزری ہوئی صورتوں میں مطلقاً مکروہ ہے۔۔۔ خواہ میت مسجد سے باہر ہو یا مسجد کے اندر اور یہی ظاہر الروایۃ ہے۔

إنما تكره في المسجد بلاعذر، فإن كان، فلا، ومن الأعذار المطر.(٢)

ترجمہ: اور مسجد میں بلاعذر (جنازہ پڑھنا) مکروہ ہے۔اگر عذر ہو تو پھر کوئی کراہت نہیں۔اور بارش بھی اعذار میں سے ہے۔

❁❁❁

(١) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجنازۃ، مطلب في كراهة صلاة الجنازة في المسجد:٣/١٢٦

(٢) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجنازۃ، مطلب مهم اذاقال: إن شتمت فلانا في المسجد:٣/١٢٩

مسجد کی رقم سے امام کی تنخواہ

سوال نمبر(257):

ایک شخص نے مسجد کی تعمیر کے لیے کچھ رقم دینے کا ارادہ کیا تھا جس میں آدھی رقم امام کی تنخواہ لیے مقرر تھی، لیکن بدقسمتی سے جو رقم امام کی تنخواہ کے لیے مختص کی گئی تھی، اب موصوف اس کا انکار کر رہا ہے تو کیا ایسی صورت حال میں امام کو مسجد کے فنڈ سے تنخواہ دینا جائز ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کی تعمیر کے لیے وقف شدہ رقم سے امام کو تنخواہ دینا جائز نہیں۔ اگر واقف نیت کرلے تو پھر اس صورت میں جائز ہوگا، البتہ عام ضروریات کے لیے مسجد میں جو رقم موجود ہوتی ہے تو اس سے امام کے لیے تنخواہ کا بندوبست کرنا جائز ہے، کیوں کہ تنخواہ دار امام کا بندوبست کرنا بھی مسجد کی ضروریات میں سے ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

قوله:(اتحد الواقف والجهة)بأن وقف وقفين على المسجد أحدهما على العمارة، والآخر إلى إمامه أومؤذنه، والإمام والمؤذن لايستقر لقلة المرسوم للحاكم الدين أن يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة إلى الإمام والمؤذن باستصواب أهل الصلاح من أهل المحلة.(١)

ترجمہ:

اگر واقف اور جہت وقف ایک ہو، اس طرح کہ مسجد کے لیے دو وقف کرے، ایک عمارت کے لیے اور دوسرا امام یا مؤذن کے لیے، اور امام ومؤذن تنخواہ میں کمی کی وجہ سے ٹھہرتے نہیں تو دیندار حاکم کے لیے جائز ہے کہ وہ عمارت یا مصالح مسجد سے فاضل رقم اہل محلہ کے باصلاحیت لوگوں کے مشورے سے امام اور مؤذن کو دیں۔

❁❁❁

(١) ردالمحتارعلى الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب في نقل انقاض المسجد: ٦/١٥٥

نہر پر مسجد بنانا

سوال نمبر(258):

گاؤں کے وسط میں ایک نہر گزری ہے جس پر مسجد بنانے کا ارادہ ہے۔کیا شریعتِ مقدسہ کی رُو سے نہر پر مسجد بنانا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر کوئی قوم ایسی نہر پر مسجد بنانا چاہتی ہو جو ان کی اپنی ملکیت ہو یا مالک سے اجازت لی ہو اور نہر پر مسجد کی یوں تعمیر کی جارہی ہو جس سے دوسرے لوگوں کی املاک متاثر نہ ہوں تو مذکورہ شرائط کا خیال رکھتے ہوئے ایسی نہر پر مسجد بنانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

نهر لأهل قرية، فأرادوا أن يبنوا عليه مسجدا، فلابأس به مالم يضر بالنهر، ولم يعترض له أصحاب النهر.(۱)

ترجمہ: گاؤں والوں کی نہر ہو اور لوگوں کا اس پر مسجد بنانے کا ارادہ ہو تو اگر لوگوں کو اس سے نقصان نہ پہنچے اور اس پر اعتراض بھی نہ کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

❁❁❁

مسجد کے میناروں میں بلب

سوال نمبر(259):

ایک مسجد کے میناروں میں بہت زیادہ بلب اور رنگین قمقمے لگائے گئے ہیں جو ساری رات روشن رہتے ہیں۔ کیا مسجد کی بجلی کا اس طرح استعمال شرعاً جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

(۱) الفتاوى التاتارخانية، كتاب الوقف، الفصل الحادي والعشرون في المساجد: ٥٧١/٥

الجواب وباللہ التوفیق:
واضح رہے کہ مسجد کی موقوفہ چیز ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا درست نہیں۔صورتِ مسئولہ میں میناروں کے اندر زینت اور زیبائش کے لیے بلب اور رنگین قمقمے ساری رات روشن کرنا چونکہ مسجد کی بجلی کی ضرورت سے زائد استعمال ہے،اس لیے فقہاے کرام نے ایسے اقدام کو شرعاً ممنوع قرار دیا ہے۔اگر مسجد کے بلب صرف نمازوں کے اوقات میں استعمال کیے جائیں تو ضرورت کی بنا پر اس بات کی گنجائش پائی جاتی ہے کہ مینار میں ایک آدھ بلب اس غرض سے روشن کرے،تاکہ نئے آنے والے نمازیوں کو دور سے مسجد کا پتہ چل سکے۔اگر علاقہ میں یہ رواج ہو تو پھر یہ مسجد کی ضرورت رہے گی،البتہ اس کے لیے مستقل چندہ کی ضرورت ہوگی۔

والدّلیل علی ذلک:
ولو وقف علی دهن السراج للمسجد، لایجوز وضعه جمیع اللیل، بل بقدر حاجة المصلین، ویجوز إلی ثلث اللیل أو نصفه إذا احتیج إلیه للصلاة فیه.(۱)

ترجمہ: اگر کوئی مسجد کے چراغ کے تیل کے لیے کچھ وقف کردے تو تمام رات اس کو روشن رکھنا جائز نہیں، بلکہ نمازیوں کی حاجت کے بقدر اس کو روشن رکھے اور حاجت کے وقت اس کو تہائی رات یا نصف رات تک روشن رکھنا جائز ہے۔

❁❁❁

مساجد سے گھونسلے ختم کرنا

سوال نمبر(260):
دیہاتی علاقے میں ایک بہت پرانی مسجد ہے جس میں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ان گھونسلوں میں کبھی انڈے اور چھوٹے بچے بھی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے مسجد میں گندگی پھیلتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مسجد میں ان کی بدبو کی وجہ سے نمازیوں کی تعداد میں روز بروز کمی محسوس ہورہی ہے اور لوگوں کو یقینی تکلیف کا سامنا ہے تو کیا ایسی صورت میں پرندوں کے گھونسلوں کو ختم کرنا شرعاً درست ہے؟

بیّنوا توجروا

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الوقف، الباب الحادی عشر في المسجد: ۲/۴۵۹

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مساجد کو صاف ستھرا رکھنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ چونکہ پرندوں کی بیٹ وغیرہ سے مسجد میں بدبو اور گندگی پھیلتی ہے جس کی وجہ سے نمازیوں کی تعداد میں کمی کا اندیشہ ہے، اس لیے فقہائے کرام نے ایسی حالت میں پرندوں کے گھونسلوں کو مسجد سے ختم کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ مسجد میں زیادہ سے زیادہ نمازیوں کو باجماعت نماز پڑھنے کا موقع ملے۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو كان في المسجد عش خطاف،أو خفاش يقذر المسجد، لابأس برميه، بمافيه من الفراخ.(۱)

ترجمہ:

اگر مسجد میں خطاف (سیاہ رنگ کا پرندہ جس کو عام طور پر لوگ ابابیل کہتے ہیں) یا چمگادڑ کا گھونسلہ ہو جو مسجد کو گندہ کرتا ہو تو ان کے ہٹانے میں حرج نہیں، کیوں کہ ان میں ان پرندوں کے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔

❁❁❁

مسجد کی رقم یتیم خانے میں خرچ کرنا

سوال نمبر (261):

مسجد کی تعمیر کے لیے کافی عرصہ پہلے سے ایک خطیر رقم جمع ہو چکی ہے، لیکن دوسری طرف گاؤں میں یتیم خانہ بن رہا ہے۔ کیا مسجد کا چندہ یتیم خانہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اس لیے کہ ظاہری طور پر اس وقت یتیم خانہ کی حاجت بھی زیادہ ہے اور وہاں رقم خرچ کرنے کی ضرورت زیادہ ہے۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق جب ایک وقف کی رقم اس موقوفہ مصرف میں استعمال ہو سکتی ہو تو اس کو دوسرے وقف میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد: ۳۲۱/۵

صورتِ مسئولہ میں چونکہ مسجد اور یتیم خانہ کی الگ الگ حیثیتیں ہیں، لہٰذا مسجد کے لیے وقف شدہ رقم یتیم خانہ کی تعمیر وترقی میں استعمال کرنا جائز نہیں۔ اگر واقف نے ابتداہی سے یہ شرط لگائی ہو کہ اس رقم کا اتنا حصہ یتیم خانے کی تعمیر پر لگایا جائے تو پھر واقف کی شرط کا اعتبار کرکے مسجد کی رقم میں سے متعین شدہ رقم یتیم خانہ میں استعمال کرنا جائز ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

(وإن اختلف أحدهما،بأن بنى رجلان مسجدين)أو رجل مسجدا و مدرسة، ووقف عليهما أوقافا (لا)يجوز له ذلك.(۱)

ترجمہ:

دو شخص علیحدہ علیحدہ مسجد بنائیں یا ایک ہی شخص نے مسجد اور مدرسہ بنایا اور دونوں کے لیے جدا جدا وقف کیا تو قاضی کو حق نہیں ہے کہ ایک وقف کی آمدنی دوسرے وقف میں خرچ کردے۔

فإن شرائط الواقف معتبرة إذالم تخالف الشرع، وهو مالك، فله أن يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية.(۲)

ترجمہ: جب واقف کی شرائط شریعت سے متصادم نہ ہوں تو وہ معتبر ہیں، وہ چونکہ (اپنے مال کا) مالک ہے، لہٰذا اسے اختیار حاصل ہے کہ جب تک کوئی معصیت نہ ہو، اپنا مال جہاں چاہے خرچ کرے۔

❁❁❁

جمعہ کے دن مسجد میں مسجد کے لیے چندہ کرنا

سوال نمبر(262):

ہمارے علاقے کی اکثر مساجد میں جمعہ کے دن تقریر کے بعد اور خطبہ سے پہلے مسجد کے اندر چندہ کیا جاتا ہے کیا شریعت مطہرہ کی رُو سے مسجد کی تعمیر وترقی کے لیے چندہ کا مذکورہ رائج شدہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الوقف: ۵۵۱/۶

(۲) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب: شرائط الواقف معتبرة: ۵۲۷/۶

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مسجد کے مفاد کے لیے چندہ کی بہتر اور مناسب صورت یہ ہے کہ مسجد سے باہر کسی بورڈ پر چندہ کی اپیل لکھ دی جائے یا مسجد کے کسی حصہ میں مقفل محفوظ صندوق رکھ دی جائے تاکہ لوگ اس میں چندہ ڈالیں یا لوگوں سے ملاقات کر کے ان سے چندہ وصول کیا جائے۔ اگر مذکورہ طریقوں سے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو تو پھر مسجد میں چندہ کرنے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

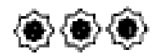
لہٰذا محررہ حالات کی روشنی میں اگر خطبہ سے پہلے اور تقریر کے بعد مسجد اور نمازیوں کے احترام واکرام کا لحاظ رکھتے ہوئے چندہ کیا جائے، مثلاً کسی کی گردن کو نہ پھلانگیں اور چندہ دینے پر زیادہ زور نہ دیں۔ نیز خطبہ کے دوران چندہ نہ کیا جائے، کیوں کہ اس طرح خطبہ کے آداب کی رعایت ختم ہو جاتی ہے، ان آداب کی رعایت رکھتے ہوئے فقہائے کرام مسجد کی تعمیر وترقی کے لیے مسجد میں چندہ کی اجازت دیتے ہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

قوله: (ويكره التخطي للسؤال) قال في النهر: والمختار أن السائل إن كان لايمر بين يدي المصلي، ولايتخطى الرقاب، ولايسأل إلحافا، بل لأمر لابد منه، فلابأس بالسؤال والإعطاء.(١)

ترجمہ:

اور مانگنے کے لیے لوگوں کی گردنیں پھلانگنا مکروہ ہے۔ نہر میں کہا گیا ہے کہ مفتی بہ یہ ہے کہ اگر سائل نمازی کے سامنے سے نہ گزرے اور نہ لوگوں کی گردنیں پھلانگیں اور لوگوں سے لپٹ کر نہ مانگے تو اس طرح سوال کرنے یا سائل کو دینے میں کوئی حرج نہیں۔



مسجد کے کمرہ میں سونا

سوال نمبر(263):

ایک مسجد سے متصل چند کمرے بنائے گئے ہیں۔ لوگ اس میں سو جاتے ہیں تو کیا یہ کمرے مسجد کے حکم میں ہیں؟ اور اس میں سونا شرعاً جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، مطلب في الصدقة على سؤال المسجد: ٤٢/٣

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کسی مسجد میں کمرے مسجد کی حدود سے باہر بنائے گئے ہوں تو ایسے کمروں میں سونا بغیر کسی کراہت کے درست ہے، لیکن اگر کمرے مسجد کے حدود میں داخل ہوں تو ان کمروں کا حکم مسجد کے حکم کی طرح ہے، لہٰذا جس طرح مسجد میں بلاضرورت غیر معتکف شخص کا سونا مکروہ ہے، اس طرح ان کمروں میں بلاضرورت سونا مکروہ ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

ویکره النوم والأكل فيه لغير المعتكف، وإذاأراد أن يفعل ذلك، ينبغي أن ينوي الاعتكاف، فيدخل فيه، ويذكر الله تعالىٰ بقدر مانوى، أويصلي ثم يفعل ماشاء، كذا في السراجيه. ولابأس للغريب ولصاحب الدار أن ينام في المسجد في الصحيح من المذهب، والأحسن أن يتورع، فلاينام.(١)

ترجمہ:

اور (مسجد میں) غیر معتکف کے لیے سونا اور کھانا مکروہ ہے اور جب ان چیزوں کا ارادہ کرے تو چاہیے کہ اعتکاف کی نیت سے مسجد میں داخل ہو اور نماز اور ذکر کرے، پھر جو چاہے (سونا، کھانا وغیرہ) کرے۔ مسافر اور رہائش پذیر کے لیے صحیح مذہب کے مطابق مسجد کے سونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ سونے سے پرہیز کرے اور نہ سوئے۔



مسجد کا پانی گھر میں استعمال کرنا

سوال نمبر (264):

بعض علاقوں میں اکثر لوگ مسجد کا پانی گھریلو کام کاج کے لیے لے جاتے ہیں۔ کیا مسجد کا پانی گھر میں استعمال کرنا شرعاً جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسجد کے لیے وقف شدہ پانی صرف مسجد کی ضروریات تک محدود رہے گا اور ایسی

(١) الفتاویٰ الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد: ٣٢١/٥

حالت میں مسجد کا پانی گھروں کو لے جانا جائز نہیں، البتہ اگر واقف نے پانی وقف کرتے وقت اس کی اجازت دی ہو تو پھر کوئی مضائقہ نہیں، لیکن پھر بھی مسجد کی ضروریات کو مقدم رکھا جائے گا۔ اگر واقف نے کنواں مسجد اور دیگر ضروریات کے لیے تو وقف کیا ہو، مگر پانی بجلی کے واٹر پمپ یا ڈیزل انجن وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہو تو اس میں بھی چندہ دینے والوں کی نیت ضروری ہوگی۔

والدّلیل علی ذلك:

(فإذاتم ولزم لايملك، ولايملك، ولايعار، ولايرهن)قال ابن عابدين: قوله (لايملك)أي لا يكون مملوكا لصاحبه، (ولايملك)أي لايقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه.(۱)

ترجمہ:

اور جب وقف تام اور لازم ہو جائے تو نہ کسی کی ملکیت ہوگی اور نہ کوئی اس کا مالک بنے گا، نہ ہی عاریت پر دی جاسکتی ہے اور نہ ہی رہن میں رکھی جاسکتی ہے۔ (مالک نہیں بنے گا) یہ وقف جگہ نہ واقف کی ملکیت بنے گی اور نہ دوسرے شخص کی ملک میں بیع وغیرہ سے منتقل ہوسکتی ہے۔

فإن شرائط الواقف معتبرة إذالم تخالف الشرع، وهو مالك، فله أن يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية.(۲)

ترجمہ:

جب واقف کی شرائط شریعت سے متصادم نہ ہوں تو وہ معتبر ہیں، وہ چونکہ (اپنے مال) مالک ہے، لہٰذا اسے اختیار حاصل ہے کہ جب تک کوئی معصیت نہ ہو، اپنا مال جہاں چاہے خرچ کرے۔

۞۞۞

مسجد کی زمین پر گھر بنانا

سوال نمبر(265):

ایک گاؤں میں پرانی مسجد ہے جس کی عمارت منہدم ہو چکی ہے اور اب زمین ویران پڑی ہے۔ اس پر ایک

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب فرق ابو یوسف بین قوله "موقوفة": ۵۳۹/۶

(۲) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب: شرائط الواقف معتبرة: ۵۲۷/۶

شخص مکان بنانا چاہتا ہے اور لوگوں کو یہ اعتماد دلاتا ہے کہ میں اس کی جگہ مسجد کے لیے اس سے اچھی زمین وقف کردوں گا تو شرعاً اس طرح کرنا جائز ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ جس زمین پر ایک مرتبہ مسجد بن جائے اور اس میں باقاعدہ نماز شروع ہو جائے تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اور اس کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، بلکہ اس کو اپنی اصلی حالت پر مسجد کی حیثیت سے باقی رکھنا ضروری ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مسجد کی زمین پر گھر تعمیر کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

(یبقی مسجدا عندا لإمام، والثاني)أبداإلی قیام الساعة (وبه یفتی).قال ابن عابدینؒ: فلایعود میراثا، ولایجوز نقله ونقل ماله إلی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أولا،وهو الفتوی.(۱)

ترجمہ:

امام صاحب کے نزدیک مسجد قیامت تک مسجد ہی رہے گی اور اسی پر فتویٰ ہے۔ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ مسجد نہ میراث بنے گی اور نہ اس کا یا اس کے مال کا دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا درست ہے۔چاہے اس مسجد میں لوگ نماز پڑھتے ہوں یا نہ،اسی قول پر فتویٰ ہے۔



مسجد میں وضوخانہ بنانا

سوال نمبر(266):

ہمارے علاقے میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر ہو چکی ہے جس میں ایک مہینہ سے باقاعدہ نمازیں بھی ادا ہو رہی ہیں۔اب اس میں وضوخانہ بنانے کا ارادہ ہے تو کیا مسجد میں لوگوں کی سہولت کی خاطر وضوخانہ بنایا جا سکتا ہے؟

بیّنوا توجروا

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب في مالو خرب المسجد: ٦/٥٤٨

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کوئی زمین مسجد کے لیے وقف کی جائے اور اس میں با قاعدہ نماز باجماعت شروع ہو جائے تو یہ قیامت تک مسجد رہے گی اور اس کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔

لہٰذا محررہ حالات کی روشنی میں مسجد کے احاطہ میں وضوخانہ بنانا شرعاً جائز نہیں۔ اس کے علاوہ فقہائے کرام نے مسجد کے اس حصہ میں وضو، مضمضہ اور استنشاق وغیرہ مکروہ لکھا ہے جس میں نماز ادا کی گئی ہو، اس لیے مسجد میں وضوخانہ بنانے سے اس میں کراہت کا ارتکاب لازم آتا ہے، البتہ اگر ابتداءً کوئی جگہ وضوخانہ کے لیے متعین کی گئی ہو اور اس میں نماز نہیں پڑھی گئی ہو تو پھر اس جگہ میں وضوخانہ بنانا جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

ویکره التوضي، والمضمضة في المسجد إلا أن يكون فيه موضع اتخذ للضوء، ولا يصلي فيه. (۱)

ترجمہ:

مسجد میں وضو کرنا اور کلی کرنا درست نہیں۔ ہاں البتہ اگر مسجد میں کوئی جگہ اس کے لیے اس طور پر مختص ہو کہ وہاں نماز نہ ہوتی ہو (تو پھر جائز ہے)۔



پرانے قبرستان پر مسجد بنانا

سوال نمبر(267):

ہمارے علاقے کی مسجد بہت چھوٹی ہے جو نمازیوں کے لیے کافی نہیں۔ اس کے ساتھ متصل ایک پرانا قبرستان ہے جس میں کئی سالوں سے لوگوں نے میت دفنانا چھوڑ دیا ہے تو کیا اس قبرستان کے کچھ حصہ کو مسجد میں داخل کیا جاسکتا ہے تاکہ مسجد کشادہ ہو کر نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔

بیّنوا تؤجروا

---

(۱) خلاصة الفتاوی، كتاب الصلاة، الفصل السادس والعشرون في المسجد ومايتصل: ۱/ ۲۲۹

الجواب وباللہ التوفیق:

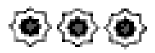
اگر مذکورہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو، بلکہ قبرستان کے لیے وقف کی گئی ہو اور اس میں لوگوں نے مردے دفنانا چھوڑ دیے ہوں اور غالب گمان یہ ہو کہ مردوں کے اجسام ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے تو فقہائے کرام کے ہاں ایسے قبرستان کو مسجد میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو بلی المیت وصار ترابا، جاز دفن غیرہ فی قبرہ، وزرعہ، والبناء علیہ.(۱)

ترجمہ:

اگر میت پرانی اور مٹی ہو جائے تو کسی دوسرے کو اس کی قبر میں دفنانا، اس میں زراعت کرنا اور اسی طرح اس پر عمارت بنانا جائز ہے۔



مسجد میں تعویذ اور گنڈوں کا کاروبار کرنا

سوال نمبر(268):

بعض لوگ مسجد میں تعویذ اور گنڈے لکھ کر فروخت کرتے ہیں، اس لیے عورتیں زیادہ آتی ہیں۔ پھر ان عورتوں میں بعض حیض والی ہوتی ہیں، اس طرح عورتوں کا مسجد آنا اور تعویذ خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ حیض سے پاک عورت کا مسجد میں نماز کے لیے یا ویسے ہی داخل ہونا فی نفسہ جائز ہے، لیکن فتنہ کے اس دور میں عورتوں کو مساجد سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا جب عام حالات میں مساجد سے عورتوں کو فتنہ کے خدشہ سے منع کیا گیا ہے تو تعویذ کے لیے مساجد کا رُخ کرنا بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا۔ خاص کر وہ عورتیں جو حیض والی ہوں، تاہم عورتیں شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ سے یہ چیزیں وصول کر سکتی ہیں، اس لیے فقہائے کرام نے مسجد میں تعویذ فروشی کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہے۔

---

(۱) الفتاوی الھندیۃ، کتاب الصلاۃ، الباب الحادی والعشرون فی الجنائز، الفصل السادس فی القبر:۱/۱۶۷

والدّلیل علی ذلك:

رجل يبيع التعويذ فى المسجد الجامع، ويكتب فى التعويذ التوراة والانجيل والفرقان، ويأخذ عليه المال، ويقول ادفع الى الهدية لا يحل له ذالك (١)

ترجمہ:

کوئی شخص مسجد میں بیٹھ کر تعویذ فروشی کرے اور اس میں تورات، انجیل یا فرقان لکھے اور اس پر مال لے اور کہے یہ (تعویذ) لو اور مجھے ہبہ (رقم) دو تو یہ اس کے لیے حلال نہیں۔

❀❀❀

مسجد میں درخت لگانا

سوال نمبر (269):

گاؤں کے ایک معزز شخص نے ارادہ کیا ہے کہ وہ مسجد میں شجر کاری کریں گے۔ جب کہ مسجد اب بھی نمازیوں کی تعداد کے لیے ناکافی ہے، لہٰذا اگر اس میں درخت لگائے جائیں تو اس سے نمازیوں کی تعداد متاثر ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ ایسی صورت میں مسجد کے اندر درخت لگانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد میں ایسا تصرف کرنا جس کی وجہ سے مسجد کا اصلی مقصد فوت ہونے کا قوی اندیشہ ہو، مکروہ ہے۔
محررہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مسجد میں ایسی جگہ پر درخت لگانا جس کی وجہ سے نمازیوں کو مشکلات ہوں یا صفوں میں درستگی برقرار نہ رہ سکے اور نمازیوں کی توجہ میں خلل ڈالنے کا سبب ہو یا اس کی وجہ سے مندر و گرجے کے ساتھ مشابہت کا قوی امکان ہو تو ایسے حالات میں مسجد کے اندر درخت لگانا درست نہیں، تاہم اگر درخت ایسی جگہ لگائی جائیں جس کے ساتھ مسجد کے مصالح وابستہ ہوں اور نمازیوں کے لیے ضرر کا سبب نہ ہو تو پھر ایسی صورت میں درخت لگانا درست ہے۔

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس فى آداب المسجد: ٣٢١/٥

والدّليل على ذلك:

قال في الخلاصة: غرس الأشجار في المسجد لابأس به إذاكان فيه نفع للمسجد، بأن كان المسجدذانزّ، والأسطوانات لاتستقر بدونها، وبدون هذا لايجوز.وفي الهندية عن الغرائب: إن كان لنفع الناس بظله، ولايضيق على الناس، ولايفرّق الصفوف لابأس به، وإن كان لنفع نفسه بورقه،أوثمره، أو يفرّق الصفوف، أوكان في موضع تقع به المشابهة بين البيعة والمسجد، يكره.(١)

ترجمہ: مسجد میں درخت لگانے میں کوئی حرج نہیں، جب کہ اس میں مسجد کا نفع ہو۔مثلاً مسجد کی زمین ایسی نمی ہو جس میں ستون قائم نہ رہتے ہوں جب تک کہ درخت نہ لگائے جائیں اور اگر یہ ضرورت نہ ہو تو پھر جائز نہیں۔ ہندیہ میں غرائب سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر لوگوں کے لیے اس کے سائے میں نفع ہو اور یہ لوگوں کے لیے تنگی کا باعث نہ ہو اور اس سے صفوں میں فرق نہ آتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر اس کے پتوں یا پھل سے اس کا ذاتی نفع ہو یا یہ صفوں میں فرق کا باعث بنتا ہو یا یہ ایسی جگہ میں ہوں جہاں مسجد اور گرجے میں مشابہت پیدا ہوتی ہو تو مکروہ ہے۔

۞۞۞

مسجد کی تنگی کی وجہ سے دوسرے محلّے والوں کو مسجد آنے سے روکنا

سوال نمبر(270):

اگر کسی محلے کی مسجد بہت تنگ ہو اور دوسرے محلے کے لوگ اس میں نہ سما سکیں تو کیا دوسرے محلے والوں کو مسجد سے روکنا جائز ہے۔

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

مسجد ایک عبادت گاہ ہے جس میں ہر کسی کو نماز، ذکر و تلاوت کرنے کا حق حاصل ہے۔ بلاوجہ کسی کو مسجد سے منع کرنا جائز نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسجد میں آنے سے منع کرنے والوں کے لیے وعید ذکر کی ہے۔

﴿ومن اظلم ممن منع مساجد الله ان يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها﴾.(٢)

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة ومايكره فيها: ٤٣٥/٢

(٢) البقرة/١١٤

ترجمہ:

اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے کو روکے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے۔

اگر محلے کی مسجد بہت تنگ ہو اور دوسرے محلے کے لوگ اس میں نہ سما سکیں تو اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر دوسرے محلے والوں کو مسجد سے روکنے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

و کذا لأهل المحلة أن يمنعوا من ليس منهم عن الصلوة فيه إذا ضاق بهم المسجد.(۱)

ترجمہ: جب اہل محلہ کی مسجد تنگ ہو تو دوسرے محلہ والوں کو اپنی مسجد میں نماز پڑھنے سے روک سکتے ہیں۔

❁❁❁

مسجد میں کھانا، پینا اور سونا

سوال نمبر(271):

مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں۔شریعتِ مطہرہ کی رُو سے اس میں کھانا، پینا اور سونا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق مسجد میں کھانا، پینا اور سونا صرف معتکف کے لیے جائز ہے اور غیر معتکف یا مقیم وغیرہ کے لیے مسجد میں بغیر نیتِ اعتکاف کے کھانا اور سونا مکروہ ہے، لہٰذا مسجد میں کھانا کھاتے وقت اعتکاف کی نیت کرکے داخل ہونا چاہیے اور اس کے لیے وہاں نیت کے مطابق نماز اور ذکر و اذکار کرنے کے بعد دیگر ضروریات سونا، کھانا وغیرہ میں مشغول ہونا درست ہے، البتہ مسجد کے ساتھ متصل کسی جگہ یا کمرہ کو قصداً چھوڑ کر مسجد میں ہی کھانا کھانا یا سونا مناسب نہیں۔

---

(۱) البحر الرائق، کتاب الوقف، تحت قوله (ومن بنى مسجدا لم يزل ملكه): ٥/٤١٩

والدّلیل علی ذلک:

ویکره النوم والأكل فيه لغير المعتكف، وإذاأراد أن يفعل ذلك، ينبغي أن ينوي الاعتكاف، فيدخل فيه، ويذكر الله تعالى بقدر مانوى، أويصلي ثم يفعل ماشاء، كذا في السراجيه. ولابأس للغريب ولصاحب الدار أن ينام في المسجد في الصحيح من المذهب، والأحسن أن يتورع، فلاينام.(۱)

ترجمہ:

اور (مسجد میں) غیر معتکف کے لیے سونا اور کھانا مکروہ ہے اور جب ان چیزوں کا ارادہ کرے تو چاہیے کہ اعتکاف کی نیت سے مسجد میں داخل ہو اور نماز اور ذکر کرے، پھر جو چاہے (سونا، کھانا وغیرہ) کرے۔ مسافر اور رہائش پذیر کے لیے صحیح مذہب کے مطابق مسجد کے سونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ سونے سے پرہیز کرے اور نہ سوئے۔



عیدگاہ کو مسجد بنانا

سوال نمبر(272):

اگر کوئی شخص عیدگاہ کے لیے زمین وقف کردے اور وہاں پر لوگ عید کی نماز پڑھتے ہوں تو عیدگاہ کی زمین پر مسجد بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کوئی زمین صرف نمازِ عید کے لیے وقف کی گئی ہو تو واقف کی اجازت کے بغیر ایسی زمین پر مسجد بنانا جائز نہیں۔ کیوں کہ شریعت میں واقف کی شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہے جب تک شریعت کے موافق ہوں، البتہ واقف کی اجازت سے عیدگاہ کی زمین پر مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

فإن شرائط الواقف معتبرة إذالم تخالف الشرع، وهو مالك، فله أن يجعل ماله حيث شاء مالم

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد: ۳۲۱/۵

یکن معصیة.(۱)

ترجمہ:

جب واقف کی شرائط شریعت سے متصادم نہ ہوں تو وہ معتبر ہیں، وہ چونکہ (اپنے مال کا) کا مالک ہے، لہٰذا اسے اختیار حاصل ہے کہ جب تک کوئی معصیت نہ ہو، اپنا مال جہاں چاہے خرچ کرے۔

❁❁❁

مسجد کے کسی حصہ کو سڑک بنانا

سوال نمبر(273):

ہمارے علاقے میں ایک مسجد ہے، جو رقبہ کے لحاظ سے نمازیوں کی تعداد کے مقابلے میں کافی وسیع ہے اور مسجد کے ساتھ متصل سڑک بن رہی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کا کچھ حصہ سڑک میں شامل کیا جائے۔ عوام کی سہولت کے پیش نظر مسجد کا کچھ حصہ سڑک میں شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر اہل محلہ مسجد کا کچھ حصہ لوگوں کی سہولت کی خاطر راستہ میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو یہ شرعاً جائز نہیں۔ کیوں کہ جو جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس کو کسی اور مصرف میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، اگرچہ اس میں عوام کی سہولت پیش نظر ہو۔

لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں سڑک کی توسیع کے لیے مسجد کا کچھ حصہ اس میں شامل کرنا جائز نہیں ہوگا۔

والدّلیل علی ذلك:

قوله:(لاعكسه)وإن أراد أهل المحلة أن يجعلوا شيئاًمن المسجد طريقا للمسلمين، فقد قيل: ليس لهم ذلك، وإنه صحيح.(۲)

---

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب: شرائط الواقف معتبرة: ٥٢٧/٦

(۲) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب في جعل شيء من المسجد طريقا:٥٧٦/٦

ترجمہ:

(اس کا عکس جائز نہیں) یعنی اگر اہل محلہ مسجد کا کچھ حصہ مسلمانوں کو راستہ بنانے کے لیے دینے کا ارادہ کریں تو کہا گیا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں اور یہی صحیح ہے۔

❀❀❀

مسجد کی صفائی

سوال نمبر(274):

اگر چاردیواری نہ ہونے کی وجہ سے گندا پانی یا نالہ وغیرہ مسجد میں داخل ہوتا ہو اور اہل محلہ قدرت رکھنے کے باوجود اس کی تعمیر کی فکر نہیں کرتے ہوں تو اہلِ محلہ گناہ گار ہوں گے یا نہیں؟ اور کیا اہل محلہ پر اس کی تعمیر کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

بیّنوا توجروا

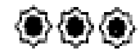
الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کی تعمیر یا اس کی چاردیواری کے اخراجات مسجد کے فنڈ سے پورے کیے جاتے ہیں۔ اگر فنڈ اتنا نہ ہو کہ اس سے مسجد کی چاردیواری کا انتظام ہو سکے یا اہل محلہ قدرت رکھنے کے باوجود اس کی تعمیر کا انتظام نہیں کرتے جس کی وجہ سے مسجد کو نقصان پہنچتا ہو تو ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ گار ہوں گے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے مساجد کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا ہے، اس لیے مسجد کو گندے پانی اور گندے نالے سے بچانا محلہ والوں کی ذمہ داری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾.(۱)

ترجمہ: میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک کرو۔



(۱) البقرة/ ۱۲۵

مسجد کے لیے جبری چندہ

سوال نمبر(275):

مسجد کی تعمیر کے لیے کمیٹی والے اہل محلہ پر چندہ مقرر کر کے لگاتے ہیں۔بسا اوقات لوگ دینے میں بخل سے کام لیتے ہیں تو کمیٹی والے ان سے جبری طور پر چندہ وصول کرتے ہیں۔یہاں تک کہ اگر کوئی چندہ نہ دے تو اس سے ترک موالات کیا جاتا ہے۔کیا اس طریقہ پر مسجد کے لیے چندہ وصول کرنا جائز ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مسجد کے لیے چندہ ثواب کی نیت سے دیا جاتا ہے۔مذکورہ طریقے سے چندہ وصول کرنے میں اخلاص باقی نہیں رہتا جو عمل کے لیے بنیادی چیز ہے۔جبری طور پر وصول کرنے میں طیبِ خاطر بھی باقی نہیں رہتا جو کسی کے مال کو اپنے لیے یا کسی کے لیے حلال کرنے کے لیے بنیادی شرط ہے۔حضرت محمد ﷺ فرماتے ہیں:

"ألا لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه". (۱)

ترجمہ: کسی مسلمان کا مال اس کی رضا کے بغیر جائز نہیں۔

مسجد میں یہ ضروری نہیں کہ یہ پختہ ہو اور اس پر زیادہ خرچ ہو،مسجد کی آبادی نمازیوں کی کثرت سے ہے جو عام مساجد میں بھی ممکن ہے،اس لیے چندہ کے لیے یہ طریقہ اپنانا مستحسن نہیں،اس لیے اگر لوگوں کو مسجد کے اخراجات کی تفصیل بیان کر کے ان کی مرضی پر چھوڑا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔تاہم محلہ کی مسجد کو آباد رکھنا اہل محلہ کی ذمہ داری ہے،لہٰذا اس میں بخل نہیں کرنا چاہیے۔



حرام مال مسجد میں لگانا

سوال نمبر(276):

ایک نئی تعمیر شدہ مسجد کے محلہ والوں نے ضرورت کے لیے رشوت دے کر اپنی باری سے قبل سوئی گیس اور بجلی کنکشن حاصل کیے۔پھر باہمی طور پر ایک کمیٹی بنا کر یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ کے لیے جو لوگ یہاں آ کر جگہ خریدیں گے،ان

(۱) مسند احمد،رقم الحدیث: ۲۰۱۷۲: ۶/۶۹

کو گیس اور بجلی کنکشن کے لیے دو ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یہ درحقیقت اس رقم میں اپنا حصہ ڈالنا ہے جو ابتدائی موقع پر کنکشن وصول کرتے ہوئے بطورِ رشوت دی گئی ہے، تاہم کمیٹی والوں نے مسجد کو اس رقم کے لیے بہترین مصرف قرار دیا، اس لیے اس کالونی والوں میں یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ یہ رقم وصول کر کے مسجد میں دی جاتی ہے۔ یہاں پر دو باتیں قابل غور ہیں:

(۱) کیا کمیٹی والوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ لوگوں سے یوں رقم وصول کرتے رہیں اور بطور رشوت دی ہوئی رقم میں آئندہ آنے والوں کو شریک کردیں۔

(۲) کیا ایسی رقم وصول کر کے مسجد میں لگانا جائز ہے۔

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

بجلی اور سوئی گیس کا حصول ہر شہری کا بنیادی حق ہے، جس علاقہ میں بجلی اور گیس پہنچ جائے تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو حسبِ قانون کنکشن دیا کرے، لیکن ایسی حالت میں جہاں افسران بالا یا ماتحت عملہ رکاوٹ پیدا کر کے صارفین کو تنگ کرنے کا باعث بنے اور کسی صورت میں رشوت دیئے بغیر حق دینے کے لیے تیار نہ ہوں تو وہاں ان کے شر سے بچنے کے لیے رشوت دینے کی گنجائش ہے، اگرچہ لینے والے کے لیے بہرحال ناجائز ہے۔

صورتِ مسئولہ میں جب اس کالونی میں اولین رہائش رکھنے والوں نے گیس اور بجلی والوں کو بطورِ رشوت کچھ رقم دی ہے تو ان کی مجبوری کی وجہ سے ان کا یہ اقدام جائز تھا، لیکن یہ صرف ان تک محدود رہے گا، اس لیے بعد میں آنے والوں کو اس میں شریک رکھنے کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اگر غور کیا جائے تو اولین رہائشی لوگوں نے رشوت دینے کی قیمت درحقیقت وصول کی ہے، کیوں کہ ابتدا میں ان کو یہ زمین یقیناً سستی ملی ہوگی، جب کہ بعد میں آنے والوں سے بنیادی سہولیات کی وجہ سے قیمت زمین زیادہ وصول کی جاتی ہے، اس لیے کمیٹی والوں کے لیے ان لوگوں سے یہ رقم وصول کرنا جائز نہیں۔ پھر ایسی ناجائز رقم مسجد میں صَرف کرنا دوسری غلطی ہے۔ مسجد کے لیے حلال اور پاک رقم ضروری ہے جو رقم حرام ذرائع آمدنی سے وصول ہو، مسجد میں اس کا خرچ کرنا جائز نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ مسجد کے لیے ایسی رقم اکٹھی ہو جس میں حرمت کا شبہ نہ ہو۔

والدّلیل علی ذلك:

قوله:(ولو بماله الحلال) قال تاج الشريعة: أمّالو انفق في ذلك مالا خبيثاًو مالاً سببه الخبيث والطيب، فيكره ؛لأن الله تعالىٰ لايقبل إلاالطيب، فيكره تلويث بيته بمالايقبله.(١)

ترجمہ:

(اگر چہ حلال مال ہو) تاج الشریعہ فرماتے ہیں کہ اگر مال خبیث کو اس میں خرچ کرے اور طیب اور خبیث مال یکجا ہوں تو یہ مکروہ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ صرف پاک مال کو قبول کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے گھر کو ایسے مال سے آلودہ (تعمیر) کرنا مکروہ ہے جس کو وہ قبول نہیں کرتا۔

❁❁❁

مسجد کی دکانوں کی چھت پر نماز پڑھنا

سوال نمبر(277):

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسجد ہے جس کے سیدھ میں دکانیں ہیں اوران دکانوں کے اوپر امام مسجد اور موذن کا حجرہ ہے۔اس کے اوپر مسجد اور حجرہ کی چھت ایک ہے، یعنی دکانوں کے اوپر حجرہ کی چھت اور مسجد کی چھت ایک ہے۔سوال یہ ہے کہ اگر چہ مسجد وحجرہ کی چھت میں کوئی فاصلہ نہیں، بلکہ ایک ہے تو اس چھت کے اس حصے پر جو کہ حجرہ کے اوپر ہے، نماز کی ادائیگی کا کیا حکم ہے؟ یہ حجرہ والی چھت مسجد کا حصہ ہے، اس حصے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والوں کو جماعت اور مسجد کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ نیز اب اس چھت کے اوپر ایک اور چھت ڈالی جارہی ہے جو کہ مکمل ایک چھت کی صورت میں ہے۔اس دوسری منزل کا کیا حکم ہے، آیا مسجد اور حجرے والے حصے کو الگ الگ شمار کیا جائے گا؟ دوسری منزل میں حجرے والے حصے پر نماز ادا کی جائے صحیح ہے یا نہیں؟ نیز حجرے والا حصہ مسجد کے حکم میں شمار ہوتا ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر یہ دکانیں مسجد کے مفادات کے لیے وقف ہوں اور ظاہر ہے کہ امام صاحب کا کمرہ بھی مسجد کی ضروریات کا

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة وما يكره فيها،مطلب كلمة "لاباس":٢/ ٤٣١

ایک حصہ ہے، اسی صورت میں اس کمرے کے اوپر مسجد کی چھت سے برابر جو چھت ڈالی جائے وہ بھی مسجد کے حکم میں رہے گی۔اس جگہ نماز پڑھنے والے کا حکم مسجد شرعی میں نماز پڑھنے والے کی طرح ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

ظاھرہ أنه لافرق بین أن یکون البیت للمسجد، أو لا،إلا أنه یؤخذ من التعلیل أن محل عدم کونه مسجدافیما إذالم یکن وقفا علی مصالح المسجد، وبه صرح في الاسعاف فقال: وإذاکان السرداب أوالعلولمصالح المسجد،أو کانا وقفا علیه صار مسجداً.(۱)

ترجمہ:

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی گھر کا مسجد کے نیچے بن جانا خواہ مسجد کے لیے ہو یا نہ ہو۔دونوں صورتوں میں مسجد نہیں رہے گی، لیکن علت بیان کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکم تب ہے جب یہ گھر مسجد کے مفادات کے لیے نہ ہو۔ چنانچہ جب تہہ خانہ یا بالا خانہ مسجد کے مصالح کے لیے ہو اور یہ مسجد کے لیے وقف ہو تو اس کے اوپر نیچے مسجد رہے گی۔

❁❁❁

مسجد کی ایمرجنسی لائٹ گھر لے جانا

سوال نمبر(278):

ایک شخص نے ایمرجنسی لائٹ مسجد کے لیے وقف کردی جو لوڈ شیڈنگ کے دوران نماز پڑھتے وقت استعمال کی جاتی ہے۔مسجد کا بانی جو کہ متولی مسجد بھی ہے،اس کو روزانہ گھر لے جا کر مطالعہ کے لیے استعمال کرتا ہے تو کیا متولی کے لیے مسجد کی لائٹ گھر میں استعمال کرنا جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر ایمرجنسی لائٹ واقعی مسجد کے لیے وقف کی گئی ہو تو مسجد کی وقف شدہ چیز متولی کے لیے اپنے گھر میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں۔

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب في أحکام المسجد: ٦/٥٤٧

والدّليل على ذلك:

متولي المسجد ليس له أن يحمل سراج المسجد إلى بيته، وله أن يحمله من البيت إلى المسجد.(١)

ترجمہ: مسجد کے متولی کے لیے مسجد کا چراغ اپنے گھر لے جانا جائز نہیں، ہاں گھر کا چراغ مسجد لانا جائز ہے۔

۞۞۞

خالی پلاٹ کو مسجد بنانا

سوال نمبر(279):

ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے جس پر ابھی تک عمارت نہیں بنی ہے اور لوگ اس میدان میں باقاعدہ طور پر نماز باجماعت اور جمعہ وعیدین کی نماز ادا کرتے ہیں تو کیا بغیر تعمیر کے اس پر شرعی مسجد کا اطلاق ہوسکتا ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

اگر کوئی زمین ایسی ہو جس پر ابھی تک کوئی تعمیر نہیں ہوئی ہے اور واقف نے اس بات کی نیت کرلی ہو کہ اس موقوفہ زمین پر لوگ جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں گے اور لوگوں نے نماز باجماعت ادا کرنا شروع کردیا ہو تو ایسی زمین پر شرعی مسجد کے احکامات جاری ہوں گے، کیونکہ اگر کسی جگہ کو مسجد قرار دینے کے لیے تعمیر شرط نہیں۔

لہٰذا مذکورہ زمین پر اگر باقاعدہ نماز باجماعت شروع ہوچکی ہو تو یہ کسی کی ملکیت نہیں ہوگی اور قیامت تک یہ مسجد ہی رہے گی۔

والدّليل على ذلك:

اعلم أنه لايشترط في تحقق كونه مسجدا البناء كمافي الخانية: لو كان له ساحة لا بناء فيها أمر قومه بالصلوة فيها بجماعة قالوا:إن أمر هم بالصلوة أبدا،أو أمرهم بالصلوة فيها باالجماعة، ولم يذكر الأبد إلاأنه أراد بها الأبد، ثم مات، لايكون ميراثا عنه.(٢)

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الحادى عشر في المسجد: ٤٦٢/٢

(٢) حاشية الطحطاوى، كتاب الوقف، تحت قوله(وبقوله):٥٣٦/٢

ترجمہ: ملحوظ رہے کہ مسجد کے ثبوت کے لیے اس کی عمارت ضروری نہیں۔ جیسا کہ خانیہ میں لکھا ہے اگر کسی واقف کے پاس کوئی میدان ہو جس میں کوئی عمارت نہ ہو، لوگوں کو اس میں نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم کرے۔ علما فرماتے ہیں کہ اگر لوگوں کو اس میں ''ہمیشہ'' نماز ادا کرنے کو کہے یا صرف نماز باجماعت کرنے کے لیے کہے اور ہمیشہ کا لفظ ذکر نہ کرے، لیکن اگر ''ہمیشہ'' کا ارادہ ہو اور یہ شخص وفات پا جائے تو مسجد کی یہ زمین اس کی میراث شمار نہیں ہوگی۔

❀❀❀

مسجد کی اضافی چیز فقرا کو دینا

سوال نمبر (280):

اگر کوئی شخص نئی مسجد میں پنکھے، دریاں، فانوس وغیرہ لگائے اور متولی مسجد پرانی چیزیں فقرا کو دینا چاہے تو کیا مسجد کی اضافی چیزیں فقرا کو دینا جائز ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق مسجد کی اضافی چیزیں فقرا کو دینا جائز نہیں، بلکہ ان کو فروخت کر کے اس کی رقم مسجد کے مصالح ومقاصد میں خرچ کی جائے گی۔

لہٰذا مذکورہ اشیا فقرا کو دینے کی بجائے فروخت کر کے مسجد کی تعمیر وترقی پر خرچ کی جائیں تا کہ موقوفہ چیز کا تصرف صحیح جگہ پر ہو سکے، کیوں کہ یہ چیزیں مسجد کے لیے وقف تھیں جس کا حکم یہ ہے کہ وہ جس مقصد کے لیے وقف ہوں اسی میں استعمال کی جائیں گی، اگرچہ بعد میں ضرورت کی وجہ سے اس کی قیمت ہی استعمال ہو۔

والدّلیل علی ذلك:

الفاضل من وقف المسجد هل يصرف إلى الفقراء؟ قيل: لا يصرف، وانه صحيح، ولكن يشتري به مستغلا للمسجد، كذافي المحيط. (۱)

ترجمہ: محیط میں لکھا ہے کہ مسجد سے زائد وقف چیز کو فقرا پر خرچ نہیں کیا جا سکتا اور یہی صحیح قول ہے، البتہ اس فاضل چیز سے مسجد کے مصالح کے لیے کوئی چیز خریدی جائے۔

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الحادى عشر في المسجد: ۲/۴٦۳

مسجد کے چندہ سے مینار بنانا

سوال نمبر(281):

کیا مسجد کے چندہ سے مسجد کے مینار کی تعمیر جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مسجد کے مصالح ومقاصد کا پورا کرنا مینار کی تعمیر پر موقوف نہیں۔ مینار نہ بھی ہو تو پھر بھی لوگ اس میں پانچ وقت اور جمعہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں، بلکہ بعض علاقے ایسے بھی پائے جاتے ہیں جہاں مینار کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، لیکن بذاتِ خود مینار مسجد کی پہچان ہے، مسجد کے تشخص کی بقا اور اظہار کے لیے مینار اہم ذریعہ ہے۔ شعائر اللہ کی تعظیم میں مینار ایک اہم حیثیت رکھتا ہے، اس لیے جہاں کہیں معاشرتی طور پر مینار مسجد کے لیے ضروری قرار دیا جاسکتا ہو، وہاں مسجد کا چندہ اس پر خرچ کرنا جائز ہے، ہاں جن علاقوں میں لوگ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے ہوں، وہاں ضرورت کے دائرے سے باہر ہونے کی وجہ سے مینار کے لیے مستقل چندہ کی ضرورت ہے، اگر مسجد کا نقشہ بنوا کر اس پر کام ہو رہا ہو اور انجینئر نے مسجد ڈیزائن کرتے وقت مینار بھی دیا ہو اور لوگ اس نقشہ کا علم رکھتے ہوئے چندہ دے رہے ہوں تو مینار کے لیے الگ اعلان کی ضرورت نہیں، لوگوں کو نقشہ کا علم ہونا مینار بنوانے کی اجازت کے مترادف ہے، منصوبہ بندی کرتے وقت جب فنی ماہرین کی خدمات لی جائیں تو مینار مسجد کی ضرورت میں شمار ہوتا ہے، شاید کوئی انجینئر ہو جو مسجد ڈیزائن کرتے وقت مینار کا خیال نہ رکھے ایسی صورت میں مینار پر چندہ خرچ کیا جاسکتا ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

وأما بناء منارة المسجد من غلة الوقف إن كان بناء ها مصلحة للمسجد، بأن يكون أسمع للقوم، فلابأس به، وإن لم يكن مصلحة لايجوز.(١)

ترجمہ:

مسجد کا مینار اگر مسجد کی مصلحت ہو، مثلاً اذان کی آواز دور اور اونچا سنانا ہو تو مسجد کی آمدن سے مینار بنانا جائز ہے اگر کوئی مصلحت نہ ہو تو جائز نہیں۔

---

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد: ٣٢٢/٥

مسجد کی دیوار پر قرآنی آیات یا احادیث لکھنا

سوال نمبر(282):

کیا مسجد کی دیوار پر قرآنی آیات یا احادیث نبوی ﷺ کا لکھنا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وبالله التوفيق:

مسجد کی دیواروں پر لکھائی سے اگر نماز میں خلل واقع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر اندرون مسجد قبلہ کی جانب لکھائی سے اجتناب بہتر ہے، کیوں کہ بعض اوقات مصلی کی اس پر نظر پڑ جاتی ہے جس کی وجہ سے نمازی کا دھیان کسی اور طرف چلا جاتا ہے۔ اگر لکھائی اتنی اونچائی پر ہو کہ سنت کے مطابق نماز پڑنے والے کی اس پر نظر نہ پڑے تو جائز ہے، خاص کر جب قرآن کی آیت یا کسی حدیث سے نمازیوں کو خاص پیغام ملتا ہو۔ ہاں قبلہ کی جانب کی دیوار کو نقش ونگار سے بھرنا اگر نمازی کی توجہ متاثر ہونے کا ذریعہ ہو تو پھر ایسے نقش ونگار سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

والدّليل على ذلك:

ولو كتب القرآن على الحيطان والجدران، بعضهم قالوا: يرجى أن يجوز.(١)

ترجمہ: اگر دیواروں پر قرآن لکھا جائے تو بعض علما کرام فرماتے ہیں کہ امید ہے کہ یہ جائز ہوگا۔

❁❁❁

مسجد کے صحن میں دکان بنانا

سوال نمبر(283):

ہماری مسجد پرانی ہو چکی ہے۔ علاقے کے معزز لوگ اس کو شہید کر کے دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ مسجد کے لیے جو نقشہ بنایا گیا ہے، اس میں مسجد کے صحن کی ایک طرف میں مسجد کی آمدنی کی نیت سے دکانوں کے لیے ایسی جگہ متعین کی گئی ہے جو پہلے مسجد کا حصہ تھا۔ کیا مسجد کی آمدنی کے لیے ایسی جگہ دکان بنانا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

---

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد: ٥/٣٢٣

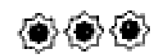
الجواب وباللّٰہ التوفیق:

صورتِ مسئولہ میں اگر یہ بات قطعی اور یقینی ہو کہ مذکورہ جگہ پہلی تعمیر میں مسجد میں داخل تھی اور اب دوبارہ تعمیر میں مسجد کے اس حصے میں دکانیں بنائی جارہی ہیں تو ایسی جگہ کو دکانوں کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، کیوں کہ اس سے مسجد کا تقدس پامال ہو جائے گا اور اس کی حرمت اپنی جگہ باقی نہیں رہے گی، البتہ اگر ابتداً مسجد میں واقف نے دکانوں کے لیے جگہ متعین کی ہو جو مسجد سے خارج ہو تو ایسی جگہ پر مسجد کی آمدنی کے لیے دکان وغیرہ بنانے میں کوئی حرج نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

قیم المسجد لایجوزله أن یبني حوانیت في حدّالمسجد،أو في فنائه؛لأنّ المسجد إذا جعل حانوتاً ومسکناً، تسقط حرمته، وهذا لا یجوز، والفناء تبع المسجد، فیکون حکمه حکم المسجد.(۱)

ترجمہ: مسجد کے متولی کے لیے مسجد یا فنائے مسجد میں دُکانیں بنانا جائز نہیں، اس لیے کہ اگر مسجد دُکان یا رہنے کی جگہ بن جائے تو اس کی حرمت ساقط ہو جائے گی اور یہ جائز نہیں اور صحن چونکہ مسجد کی تابع ہوتی ہے، اس لیے وہ بھی مسجد کے حکم میں ہے۔



مسجد کی پرانی اشیا کو پھینکنا

سوال نمبر(284):

ایک مسجد کے اسٹور میں کافی پرانی چیزیں مثلاً صفیں، بجلی کی تاریں، ٹوٹیاں وغیرہ پڑی ہوئی ہیں جو کہ استعمال کے قابل نہیں ہیں تو کیا ان فالتو اشیا کو کوڑے کرکٹ میں پھینکا جا سکتا ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر مسجد کی اشیا پرانی ہو کر ناقابلِ استعمال ہو چکی ہوں اور ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہو تو اگر ان کو فروخت

(۱) الفتاوی الهندیة،کتاب الوقف،الباب الحادي عشر في المسجد: ۲/۴٦۲

کرنا ممکن ہو تو ان کو فروخت کر کے رقم مسجد کے مصالح ومقاصد میں استعمال کی جائے، البتہ اگر فروخت کرنے کے بھی قابل نہ ہوں تو پھر ان اشیا کو مسجد سے باہر پھینکنے میں کوئی حرج نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

سئل أبوبكر: عن حشيش المسجد يخرج عن المسجد أيام الربيع ؟قال: إن لم يكن له قيمة، لابأس بطرحه خارج المسجد، ولابأس برفعه والانتفاع به.(۱)

ترجمہ:

ابوبکر سے پوچھا گیا کہ موسم بہار میں مسجد کی گھاس کو مسجد سے نکالنے کا کیا حکم ہے تو فرمایا کہ اگر بے قیمت اور بے فائدہ ہو تو اس کو باہر پھینکنے میں کوئی حرج نہیں اور اس کو اٹھا کر استعمال کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

❁❁❁

قرآن پاک کی موجودگی میں مسجد کی چھت پر گھومنا

سوال نمبر(285):

اگر کسی مسجد کی دو منزلیں ہوں، پہلی منزل میں قرآن مجید کے نسخے موجود ہوں تو دوسری منزل میں نماز پڑھنا یا ویسے گھومنا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر گھر یا کسی مسجد کی نچلی منزل میں قرآن مجید موجود ہو تو بالائی منزل کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس سے توہین کا تاثر نہیں ملتا، بلکہ یہ ایک معاشرتی مجبوری بھی ہے، کیوں کہ کئی کئی منزلہ عمارتیں اور مساجد بنانا معاشرہ کی اہم ضرورت ہے تو ضرور تاً اوپر کی منزلوں کو لوگ استعمال کریں گے۔ بسا اوقات لوگ چھتوں پر گھومتے پھرتے ہیں اور نیچے الماریوں میں قرآن کے نسخے رکھے ہوتے ہیں، بلکہ دوسری چھت سے اگر پہلی چھت میں قرآن مجید کے رکھے ہوئے نسخے نظر بھی آئے، پھر بھی اس میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ ایک مسلمان کے ذہن میں گھومتے وقت توہین کا تصور نہیں آتا۔

---

(۱) الفتاوی التاتارخانیة، كتاب الوقف، الفصل الحادی والعشرون في المساجد: ۵/۵۷۷

والدّلیل علی ذلك:

ألا ترى أنه لو وضع في البيت، لاباس بالنوم على سطحه.(۱)

ترجمہ:

کیا ایسا نہیں کہ کسی گھر میں اگر قرآن موجود ہو تو اس کی چھت پر سونے میں کوئی حرج نہیں۔

❀❀❀

بلا اجازت کسی جگہ کو جاے نماز بنانا

سوال نمبر(286):

ایک گودام کرائے پر لیا گیا اور اس میں کاروبار کی جارہی ہے۔ کچھ مدت تک مالکِ مکان اور کرایہ دار کے درمیان تعلقات اچھے تھے، لیکن ابھی دونوں کے درمیان کرایہ پر اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ مالکِ مکان جس کرایہ پر گودام دینا چاہتا ہے، کرایہ دار اس کے لیے تیار نہیں، جب کہ کرایہ دار کے کرایہ پر مالکِ مکان راضی نہیں۔ دونوں کا تنازعہ عدالت تک پہنچا ہے۔ ایسی صورت میں کرایہ دار نے گودام کی دوسری چھت میں نماز پڑھنے کے لیے عارضی جگہ بنائی ہے جس میں پانچ وقت باجماعت نماز ادا کی جارہی ہے۔ کیا ایسی جگہ میں جماعت کی نماز کے لیے حاضری جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے کسی کی زمین یا دکان سے انتفاع خواہ کرایہ کی صورت میں ہو یا تبرعاً، مالک کی اجازت پر موقوف ہے۔ کرایہ کی صورت میں طرفین باہمی معاہدہ کے تابع ہوں گے۔ اجارہ میں تعیینِ مدت لازمی امر ہے جس میں بعد از اں طرفین کو معاہدہ ختم کرنے یا تجدید کا اختیار حاصل ہوتا ہے جہاں کہیں مدت کے اختتام پر مالکِ مکان کرایہ دار کو گزشتہ کرایہ پر دینے کے لیے راضی نہ ہو تو کرایہ دار کا بلا اجازت قبضہ جمانا غصب کے مترادف ہے، تاہم مقررہ مدت کے دوران بلاوجہ کرایہ دار کو تنگ کرنا مالک کے لیے جائز نہیں، لیکن مقررہ مدت ختم ہونے پر رضامندی حاصل کرنا ضروری امر ہے۔

جب مذکورہ گودام کے گزشتہ کرایہ کی مدت بڑھانے پر مالک راضی نہ ہو اور کرایہ دار کسی تجدید معاہدہ کے

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد: ۳۲۲/۵

لیے تیار نہ ہوتو ایسی صورت میں کرایہ دار کا جبری قبضہ غصب کے مترادف ہے۔اس جگہ اگر قدیم زمانے سے نمازیں پڑھی جارہی ہوں تو پھر کرایہ دار اور مالک کے تنازعہ سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ظاہر ہے کہ مسلمان مالک بھی نماز پڑھنے سے ناراض نہیں ہوگا،لیکن اگر یہ نمازیں تنازعہ کے بعد شروع کی گئی ہوں اور اس سے کرایہ دار اپنے قبضہ کو دوام بخشتا ہوتو پھر بہتر یہ ہے کہ ایسی جگہ نماز پڑھنے سے احتراز کیا جائے اور قریب کسی شرعی مسجد کی جماعت میں شریک ہونا چاہیے۔مغصوبہ زمین پر نماز پڑھنے سے احتراز ضروری ہے،تاہم جو شخص ایسی جگہ انفرادی یا باجماعت نماز پڑھے تو اس کا ذمہ فارغ ہوجاتا ہے،کیوں کہ یہ غاصبانہ قبضہ ایک عارضی امر ہے جو کسی وقت کرایہ دار کے چھوڑنے یا مالک کی اجازت سے ختم ہوسکتا ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

إذا غصب أرضاً،فبنى فيها مسجداً......فلا بأس بالصلاة في المسجد......وإن غصب داراً، فجعلها مسجدا،لا يسع لأحد أن يصلي فيه، ولا أن يدخله، وإن جعلها مسجدا جامعا، لا يجمع فيه. (۱)

ترجمہ: جب کوئی زمین غصب کرے اور اس پر مسجد بنائے۔۔۔۔تو اس مسجد میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔۔۔۔اگر کسی نے کوئی گھر غصب کیا اور پھر اس میں مسجد بنائی تو کسی کے لیے گنجائش نہیں کہ وہ اس میں نماز پڑھے یا داخل ہو اور اگر عام مسجد بنائی جائے تو اس میں جماعت نہیں کرائی جائے گی۔

تاہم موجودہ وقت میں مالک اور کرایہ دار کے باہمی تنازعات میں مطلقاً بغیر اجازت کے غصب کا حکم لگانا مشکل ہے،بسا اوقات مالک کے ناجائز مطالبات اور کرایہ دار سے ناروا سلوک بھی باہمی تنازعہ کا سبب بن سکتا ہے،جیسے بعض جگہ مالک لالچ میں آکر کرایہ دار کو آرام کرنے نہیں دیتا اور آئے دن ناجائز مطالبات سے اس کو جگہ چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے،جب کہ کرایہ دار بھی بعض وقت ملکی قانون یا عرف ورواج کا سہارا لے کر مالک کے مالکانہ حقوق ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے،ایسی صورت میں دونوں کے موقف کو سن کر کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے،تاہم موجودہ وقت کرایہ کے نظام میں مالکِ مکان اور کرایہ دار کے دائرہ اختیار کے تعین اور معاشرہ میں مالک یا کرایہ دار کی زیادتی کے تدارک کے لیے حکومت کے بنائے ہوئے قوانین کا شرعی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ طرفین کے لیے کہاں تک قانون کی پاسداری ضروری ہے۔

❁❁❁

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد: ٥/ ٣٢٠

مسجد کی محراب کو راستہ میں تبدیل کرنا

سوال نمبر(287):

ہمارے گاؤں میں تقریباً ڈیڑھ سوسالہ پرانی مسجد ہے۔اب لوگ اس کو وسعت دینے کی غرض سے اس کی تعمیر نو کرنا چاہتے ہیں۔انجینئر نے نقشہ میں مسجد کی محراب کی جگہ کو راستہ کے لیے مختص کیا ہے تو کیا محراب کی جگہ راستہ بنانا شرعاً درست ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جو جگہ مسجد کے لیے متعین ہو جائے اور اس پر باقاعدہ نماز باجماعت شروع ہو جائے تو وہ جگہ قیامت تک مسجد رہے گی اور اسے دوسری ضروریات مثلاً راستہ،وضوخانہ،استنجاخانہ وغیرہ کے لیے استعمال کرنا ازروئے شریعت جائز نہیں چونکہ محراب مسجد کا حصہ ہوتا ہے،اس لیے مسجد کا حصہ راستہ کے لیے استعمال کرنا درست نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

قوله:(لاعكسه)وإن أراد أهل المحلة أن يجعلوا شيئاًمن المسجد طريقا للمسلمين، فقد قيل: ليس لهم ذلك، وإنه صحيح.(١)

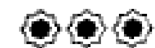
ترجمہ:

(اس کا عکس جائز نہیں)یعنی اگر اہلِ محلّہ مسجد کا کچھ حصہ مسلمانوں کو راستہ بنانے کے لیے دینے کا ارادہ کریں تو کہا گیا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں اور یہی صحیح ہے۔

داخل المحراب له حكم المسجد.(٢)

ترجمہ:

محراب کی اندر کی جگہ مسجد کے حکم میں ہے۔



(١) ردالمحتارعلى الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب في جعل شيء من المسجد طريقا:٦/٥٧٦

(٢) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد: ٥/٣٢١

مسجد کے نام پر دیا گیا چندہ کسی اور جگہ استعمال کرنا

سوال نمبر(288):

مسجد کے نام پر جمع شدہ چندے کا ایک بڑا حصہ مسجد پر لگایا جائے اور کچھ حصہ کسی رفاہی کام میں صَرف کیا جائے، جیسے اسی مسجد کے محلّہ کی صفائی کا انتظام کرنا، محلّہ کی دیواروں پر نصیحت آمیز کلمات لکھنا اور یا اہل محلّہ کے غم وخوشی کے موقع پر صَرف کیا جائے تو جائز ہے یا نہیں؟　　بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مسجد کا چندہ کسی ایسی جگہ لگانا جس کا تعلق مسجد کی تعمیر یا مسجد کے مصالح سے نہ ہو، جائز نہیں، بلکہ یہ چندہ مسجد اوراس کے مصالح کے لیے استعمال کرنا ضروری ہے۔

صورتِ مسئولہ میں مسجد کے چندہ سے اس محلّہ کی صفائی کا انتظام کرنا یا محلّہ کی دیواروں پر نصیحت آمیز کلمات لکھنا اور یا اہل محلّہ کے غم وخوشی کے موقع پر اس رقم سے خرچ کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو اشتری القیّم بغلة المسجد ثوبا، ودفع إلی المساکین لایجوز، وعلیه ضمان مانقد من مال الوقف.(۱)

ترجمہ: اگر مسجد کا نگران مسجد کے وقف کی آمدنی سے کپڑا خرید لے اور وہ مساکین کو دے تو یہ جائز نہیں ہے اور وقف مال سے جتنا خرچ کیا ہے اس پر اس کا ضمان لازم ہے۔

❁❁❁

مسجد کے چندہ سے جنازہ کے لیے چار پائی خریدنا

سوال نمبر(289):

جو چندہ مسجد کے مصالح کے لیے اکٹھا کیا گیا ہو، ان پیسوں سے جنازہ کے لیے چار پائی خریدی جاسکتی ہے یا نہیں؟

---

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الوقف، الباب الحادی عشر في المسجد: ۲/۶۲٤

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کے لیے جو چندہ جمع کیا جائے، ان سے جنازہ کے لیے چارپائی خریدنا درست نہیں ہے، البتہ اگر مسجد کا انتظامیہ اس کا اہتمام کرلے کہ اس کے لیے مخصوص مد مقرر کرکے چندہ کیا جائے تو وہ پیسے چونکہ مسجد کے لیے نہیں ہیں، لہٰذا ان پیسوں سے جنازہ کے لیے چارپائی خریدنا درست ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

ليس لقيم المسجد أن يشتري جنازة،وإن ذكر الواقف، أن القيم يشتري جنازة.(١)

ترجمہ:

مسجد کے نگران کے لیے جنازہ کی چارپائی خریدنا درست نہیں ہے، اگرچہ واقف نے یہ ذکر کیا کہ یہ نگران اس کے ذریعے جنازے کے لیے چارپائی خرید لے۔

❁❁❁

مسجد کے لیے وقف قرآن پاک دوسری جگہ منتقل کرنا

سوال نمبر(290):

جس مسجد کا نام لے کر اس کے لیے قرآن کریم کے نسخے وقف کرکے متولی کو دیے جائیں۔کیا ان نسخوں کو کسی دوسری مسجد منتقل کیا جاسکتا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

وقف کی ہوئی چیز کو وہاں استعمال کرنا ضروری ہے جس کی واقف نے تصریح کی ہو، اس لیے فقہاے کرام کی تصریحات کے مطابق ایک مسجد کے لیے وقف شدہ قرآن کریم کے نسخوں کو دوسری جگہ یا مسجد منتقل کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

وقف مصحفا على أهل مسجد للقراءة إن يحصون جاز، وإن وقف على المسجد جاز، ويقرأ

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الحادى عشر في المسجد: ٤٦٢/٢

فيه، ولا يكون محصورا على هذا المسجد.(١)

ترجمہ:

اہلِ مسجد کے لیے کسی نے قرآن پاک کے نسخے وقف کیے تو وہ ان کو محصور کر سکتے ہیں۔اگر وقف مسجد کے لیے ہو تو پھر وہ ان میں تلاوت کر سکتے ہیں،لیکن ان کو ایک مسجد میں محصور نہیں کر سکتے۔

❁❁❁

مسجد کی بجلی سے مسجد کے بیرونی حصے میں ٹیوب لائٹ جلانا

سوال نمبر(291):

مسجد کی بیرونی طرف جو حصہ ہے جس سے نمازی مسجد کو آیا کرتے ہیں،اگر بوقتِ ضرورت مسجد کے اس حصہ پر مسجد کی بجلی سے ٹیوب لائٹ جلائے رکھنے کا انتظام کیا جائے تو جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جس طرح مسجد کے اندرونی حصہ میں نمازیوں کی سہولت کے لیے مسجد کی بجلی سے روشنی کا انتظام کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے،اسی طرح نمازیوں کی سہولت کے لیے مسجد کے بیرونی حصے میں راستے کی طرف روشنی کا انتظام مسجد کی بجلی سے کرنا جائز ہے اور ساری رات اس کو جلائے رکھنے سے احتراز کیا جائے،البتہ اگر واقف،یعنی چندہ دہندہ کی طرف سے پوری رات جلائے رکھنے کی اجازت ہو تو پھر جائز ہے۔

والدّليل على ذلك:

ولو وقف على دهن السراج للمسجد، لايجوز وضعه جميع الليل، بل بقدر حاجة المصلين، ويجوز إلى ثلث الليل أو نصفه إذا احتيج إليه للصلاة فيه......إلا في موضع جرت العادة فيه كل بذلك ......أو شرط الواقف تركه فيه كل الليل، كما جرت العادة به في زماننا.(٢)

---

(١) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الوقف ٦١/٥٥٧، ٥٥٨

(٢) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الحادى عشر في المسجد: ٤٥٩/٢

ترجمہ:

اگر کوئی مسجد کے چراغ کے تیل کے لیے کچھ وقف کردے تو تمام رات اس کو روشن رکھنا جائز نہیں، بلکہ نمازیوں کی حاجت کے بقدر اس کو روشن رکھے اور حاجت کے وقت اس کو تہائی رات یا نصف رات تک روشن رکھنا جائز ہے۔۔۔۔۔اور یہ جائز نہیں کہ ساری رات اس کو ایسا ہی جلائے رکھے چھوڑا جائے، لیکن جہاں پر عادت اور رواج بھی جاری ہو۔۔۔۔یا واقف نے اس کو ساری رات مسجد میں جلائے رکھنے کی شرط لگائی ہو تو پھر ساری رات جلائے رکھنا جائز ہے، جیسا کہ ہمارے اس زمانہ میں لوگوں کی یہ عادت جاری ہے۔

❁❁❁

مسجد کا میٹر بند کرنا

سوال نمبر(292):

ایک محلہ والے اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ مسجد کی بجلی کا بل زیادہ آتا ہے، لہٰذا ان میں ایک شخص مسجد کے لیے بجلی کے استعمال کا غیر قانونی راہ اختیار کر کے میٹر اکثر اوقات میں بند کر دیتا ہے۔کیا شریعت کی رُو سے یہ جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جو ملکی قوانین ایسے ہوں کہ شریعت سے متصادم نہ ہوں تو ان میں حاکم کی اطاعت واجب ہوتی ہے، قانونی لحاظ سے بجلی حکومت کی ملکیت ہوتی ہے اور اس کی چوری کرنا ایک جرم ہے، چاہے وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو، بجلی کا غیر قانونی استعمال اس میں جائز نہیں، لہٰذا بل کی زیادتی کا بہانہ بنا کر میٹر بند کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجب. (۱)

ترجمہ:

جو کام (شرعاً) گناہ نہ ہو، اس میں حاکم کی اطاعت واجب ہے۔

❁❁❁

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة، باب العيدين، مطلب تجب طاعة الامام في ماليس بمعصية: ۵۳/۳

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین میں مالک کا تصرف

سوال نمبر(293):

آبادی کے اندر میں نے اپنا ایک خالی پلاٹ مسجد کے لیے وقف کیا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور کئی سال تک وہ خالی پڑا رہا اور کسی نے اس میں نماز بھی نہیں پڑھی۔ آج کل اس پلاٹ پر دو دینی جماعتوں کا سخت جھگڑا ہے، ہر ایک اس کی تعمیر اور متولی بننے کی خدمات انجام دینا چاہتا ہے۔ کیا اب مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں ان میں سے کسی ایک فریق کو وہ پلاٹ حوالہ کروں؟ تاکہ وہ اس کی تعمیر اور متولی بننے کے فرائض انجام دے دیں اور ان کا تنازع ختم ہو جائے۔ بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مسجد کے لیے زمین کا وقف اس وقت تام ہوتا ہے جب واقف کی اجازت سے اس جگہ اذان واقامت کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی جائے، ورنہ وقف تام نہیں رہے گا اور جب تک وقف تام نہ ہو مالک اس میں تصرف کرسکتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں مسجد کے لیے پلاٹ وقف کرنے کے بعد آج تک وہ خالی پڑا رہا ہے اور کسی نے اس میں نماز نہیں پڑھی ہے، لہٰذا اس میں مالک کی ملکیت باقی ہے۔ اب مالک کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ان دونوں میں سے جس کو چاہے اس کی تعمیر کی اجازت دے کر اس کو متولی بنائے۔

والدّلیل علی ذلک:

اعلم أنه لایشترط في تحقق کونه مسجدا البناء کمافي الخانیة: لوکان له ساحة لا بناء فیها أمر قومه بالصلوة فیها بجماعة قالوا:إن أمرهم بالصلوة أبدا،أو أمرهم بالصلوة فیها باالجماعة، ولم یذکر الأبد،إلاأنه أراد بها الأبد، ثم مات، لایکون میراثا عنه.(۱)

ترجمہ: ملحوظ رہے کہ مسجد کے ثبوت کے لیے اس کی عمارت ضروری نہیں۔ جیسا کہ خانیہ میں لکھا ہے اگر کسی واقف کے پاس کوئی میدان ہو جس میں کوئی عمارت نہ ہو، لوگوں کو اس میں نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم کرے۔ علما فرماتے ہیں کہ اگر لوگوں کو اس میں ''ہمیشہ'' نماز ادا کرنے کو کہے یا صرف نماز باجماعت کرنے کے لیے کہے اور ہمیشہ کا لفظ ذکر نہ کرے، لیکن اگر ''ہمیشہ'' کا ارادہ ہو اور یہ شخص وفات پا جائے تو مسجد کی یہ زمین اس کی میراث شمار نہیں ہوگی۔

(۱) حاشیة الطحطاوی، کتاب الوقف، تحت قوله(وبقوله):۲/۵۳۶

کمرشل ریٹ سے بچنے کے لیے مسجد کی بجلی استعمال کر کے تمام بل خود ادا کرنا

سوال نمبر (294):

ایک شخص کمرشل ریٹ سے بچنے کے لیے اپنی ایک ذاتی بجلی کی مشین چلانے کے لیے مسجد کی بجلی استعمال کرکے تمام بل خود ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جواشیا مسجد کے ساتھ مخصوص ہوں، کسی کے لیے بھی ان کا ذاتی نفع کے لیے استعمال میں لانا درست نہیں۔

صورتِ مسؤلہ میں کمرشل ریٹ سے بچنے کے لیے مسجد کی بجلی کا استعمال درست نہیں،اگر چہ یہ شخص خود اس کا پورا بل ادا کرتا ہو، کیوں کہ مسجد کی بجلی ذاتی نفع میں استعمال کرنا جائز نہیں۔نیز کمرشل ریٹ سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا قانونی جرم بھی ہے اور جو ملکی قوانین جب تک شریعت کے خلاف نہ ہوں،ان میں حاکم کی اطاعت واجب ہوتی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

متولي المسجد ليس له أن يحمل سراج المسجد إلى بيته، وله أن يحمله من البيت إلى المسجد.(۱)

ترجمہ:

مسجد کے متولی کے لیے مسجد کا چراغ اپنے گھر لے جانا جائز نہیں،ہاں گھر کا چراغ مسجد لانا جائز ہے۔

طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجب. (۲)

ترجمہ:

جو کام (شرعاً) گناہ نہ ہو،اس میں حاکم کی اطاعت واجب ہے۔

❁❁❁

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الحادى عشر في المسجد: ۴۶۲/۲

(۲) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة، باب العيدين، مطلب تجب طاعة الامام في ماليس بمعصية: ۵۳/۳

مسجد میں بھیک مانگنا

سوال نمبر(295):

کیا مسجد میں بھیک مانگنا جائز ہے؟ اور کیا دینے والے کو ثواب ملے گا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق مسجد میں چند شرائط کی رعایت کے ساتھ بھیک مانگنا اور مانگنے والے کو کچھ دینا جائز ہے، ورنہ کسی ایک شرط کے نہ ہونے کی صورت میں سوال کرنا اور سوال کرنے والے کو کچھ دینا جائز نہیں۔

(۱)......سائل نمازیوں کے سامنے سے نہ گزرے۔

(۲)......لوگوں کی گردنوں کو پھلانگ کر سوال نہ کرے، یعنی لوگوں کو کسی قسم کی اذیت نہ دے۔

(۳)......کسی کے ساتھ لپٹ کر سوال نہ کرے، یعنی صرف اپنی حاجت کا اظہار کرے اور خواہ مخواہ لوگوں کو دینے پر مجبور نہ کرے۔

(۴)......اگر کسی کے پاس کم از کم ایک دن کے خرچے کا انتظام فی الحال موجود ہو یا وہ صحت مند اور تندرست ہو، یعنی وہ خود کما سکتا ہو تو ایسے شخص کی صورتِ حال جاننے کے باوجود اگر کوئی اسے کوئی چیز دے تو لینے اور دینے والا دونوں گناہ گار ہوں گے۔

والدّلیل علی ذلك:

والمختار أن السائل إن كان لا يمر بين يدي المصلي، ولا يتخطي الرقاب، ولا يسأل إلحافاء بل لأمر لا بدمنه، فلابأس بالسوال، والإعطاء، ومثله في البزازية: قال: ولا يجوز الإعطاء إذالم يكونوا على تلك الصفة المذكورة ....وسيأتي في باب المصرف أنه لا يحل أن يسأل شيئا من له قوت يومه بالفعل أوبالقوة كالصحيح المكتسب،و يأثم معطيه إن علم بحاله لإعانته على المحرم.(١)

ترجمہ:

اورراجح قول یہ ہے کہ سوال کرنے والا اگر نمازیوں کے سامنے سے نہ گزرے اور نہ ہی لوگوں کے کندھوں

(١) رد المحتار على الدر المختار، باب الجمعة،مطلب في الصدقة على سوال المسجد: ٤٢/٣

کندھوں کو پھلانگے اور نہ ہی چمٹ کر اصرار کے ساتھ مانگے، بلکہ اپنی ایک ضروری حاجت کے لیے سوال کرے تو مانگنے اور دینے میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح بزازیہ میں بھی ہے اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب مانگنے والے میں یہ مذکورہ صفات موجود نہ ہوں تو ان کو دینا جائز نہیں۔۔۔۔اور باب المصرف میں آنے والا ہے کہ جس کے پاس ایک دن کی خوراک فی الحال (بالفعل) موجود ہو یا اس میں ایک دن خوراک کمانے کی قوت موجود ہو، یعنی تندرست کمانے والا ہو تو اس کے لیے مانگنا جائز نہیں اور ایسے شخص کو دینے والا بھی گناہ گار ہے، اگر اس کو اس کی حالت معلوم ہو، کیوں کہ یہ ایک حرام کام میں اس کی مدد کرنی ہے۔

❁❁❁

مسجد میں ہیٹر وغیرہ جلانا

سوال نمبر(296):

بعض حضرات مسجد میں ہیٹر وغیرہ جلانے کو آتش پرستی کے ساتھ تشبیہ دے کر نماز کے منافی سمجھتے ہیں۔کیا ہیٹر وغیرہ جلانے کی صورت میں نماز صحیح ہوگی؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مساجد اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین اور مقدس ترین مقامات ہیں، اس لیے ان کا ادب و احترام کرنا نہایت ہی ضروری ہے اور ان کو ہر اس چیز سے پاک وصاف رکھنا جس سے نمازیوں کو تکلیف ہو یا غیر اقوام کی عبادات کے ساتھ مشابہت ہو یا اس کی وجہ سے نمازیوں کی خشوع وخضوع میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔

لہٰذا مسجد میں روشنی کے لیے بلب، ٹیوب لائٹ یا شمع جلانے اور گرم رکھنے کے لیے ہیٹر لگانے میں کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ ان میں غیر اقوام کے ساتھ مشابہت ہے اور نہ ہی یہ اشیا عبادت کے لیے مسجد میں لگائی جاتی ہیں، اس لیے ہیٹر، شمع اور چراغ اگرچہ نمازی کے سامنے جل رہے ہوں، نماز بلا کراہت درست ہے۔امام بخاریؒ نے اس کے جواز پر مستقل باب باندھا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ولو توجه إلى قنديل أو إلى سراج، لم يكره كذافي المحيط السرخسي، وهو الأصح.(۱)

---

(۱) الفتاویٰ الهندية، كتاب الصلوة، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره: ۱۰۸/۱

ترجمہ:

اور اگر نمازی نے قانوس یا چراغ کی طرف رخ کیا تو مکروہ نہیں، جیسا کہ محیط سرخسی میں ہے اور یہی صحیح قول ہے

❁❁❁

مسجد کے محراب میں شیشے لگانا

سوال نمبر (297):

کسی شخص کا نماز کے دوران محراب کے شیشوں میں عکس نظر آنے سے نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ نیز اس نقش ونگار پر متولی کا مسجد کے وقف مال سے خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق نماز میں خشوع وخضوع ضروری ہے جس سے نماز کی تکمیل بھی ہوتی ہے، اس لیے خشوع وخضوع میں خلل ڈالنے والی چیزوں سے احتراز کرنا چاہیے۔

مسجد کے محراب میں لگے ہوئے شیشوں میں صورت یعنی عکس نظر آنے سے اگرچہ نماز فاسد نہیں ہوتی، لیکن خشوع میں خلل ڈالتے ہیں، اس لیے مسجد کے قبلہ والی دیوار پر ایسی قیمتی نقش ونگار کرنا مکروہ ہے جو خشوع میں خلل ڈالے اسی وجہ سے متولی کے لیے مسجد کی تزئین اور نقش نگار میں وقف مال لگانا جائز نہیں، کیوں کہ وقف شدہ مال صرف مسجد کی تعمیری ضروریات کی حد تک استعمال میں لایا جاسکتا ہے، البتہ اگر اس طرح کا نقش ونگار مسجد کی بنیاد کے استحکام کے واسطے ہو تو مسجد کے وقف شدہ مال سے خرچ کرنے کی گنجائش ہے، ورنہ بصورت دیگر متولی ان پیسوں کا ضامن رہے گا۔ ہاں کسی شخص کے ذاتی خرچے سے نقش ونگار کرنے میں کوئی قباحت اور کراہت نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

(ولا بأس بنقشه خلا محرابه) فإنه يكره ؛لأنه يلهي المصلي، ويكره التكلف بدقائق النقوش ونحوها، خصوصا في جدار القبلة .... وقيل: يكره في المحراب دون السقف والمؤخر، وظاهره أن المراد بالمحراب جدار القبلة.(۱)

(۱) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الصلوة، فروع اشتمال الصلوة على الصماء: ۲/ ۴۳۰،۴۳۱

ترجمہ:

محراب کے علاوہ مسجد کے نقش ونگار میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ یہ نمازی کو غافل کر دیتا ہے، اس لیے محراب میں نقش ونگار کرنا مکروہ ہے۔ نقش ونگار وغیرہ پر تکلف کرنا خصوصاً قبلہ کی دیوار میں مکروہ ہے۔۔۔کہا گیا ہے کہ چھت اور مسجد کے پچھلی حصے کے علاوہ محراب میں نقش ونگار مکروہ ہے اور ظاہر یہ ہے کہ محراب سے مراد قبلہ کی دیوار ہے۔

قوله:(كمافي نقش المسجد)قال ابن عابدينؒ:أي ما خلا محرابه،أو بالجص، وماء الذهب، لامن مال الوقف، وضمن متوليه لو فعل.(۱)

ترجمہ:

جیسا کہ مسجد کا نقش سوائے محراب، چونے اور سونے کی پانی سے مسجد کی تزئین جائز ہے جو وقف کے مال سے نہ ہو، ورنہ مسجد کا متولی اس کا ضامن رہے گا۔

❁❁❁

مسجد یا مدرسہ کی بجلی سے موبائل چارج کرنا

سوال نمبر(298):

تشکیل کے دوران تبلیغی حضرات کے لیے مسجد کی بجلی سے اور طلبہ کرام کو مدرسہ کی بجلی سے موبائل چارج کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بينوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

وقف شدہ اشیا کا استعمال اس کے مقصد اور اس کے مصرف تک محدود رکھنا ضروری ہے، جس کا دوسرے امور میں واقف کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں، لیکن اگر مسجد ومدرسہ کے مخیر یا متولی حضرات اور چندہ دہندہ گان حضرات مسجد کی بنیادی ضرورت کے ساتھ دیگر معمولی نوعیت کے مصارف بھی ذہن میں رکھتے ہوں تو پھر مسجد اور مدرسہ کی بجلی سے موبائل چارج کرنا جائز ہوگا، کیوں کہ موبائل چارج کرنے پر صرف 1.5 وولٹ بجلی خرچ ہوتی ہے جس مقدار سے فن بجلی کے ماہرین کے مطابق بجلی کا میٹر بھی نہیں چلتا۔

(۱) رد المحتار على الدر المختار، كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع: ۵۵٤/۹

لہٰذا اگر کسی اور استعمال کے بغیر بجلی سے صرف موبائل چارج کیا جارہا ہو تو یہ بجلی کے بل میں اضافے کا سبب ہی نہیں بنتا، البتہ بجلی کے دیگر استعمال کے ساتھ موبائل چارجنگ سے میٹر کی سپیڈ میں اضافہ ہوجاتا ہے، لیکن عام طور پر واقف کی طرف سے ایسی معمولی استعمال کی اجازت دلالتاً موجود ہوتی ہے، اس لیے بوقتِ ضرورت مسجد یا مدرسے کی بجلی سے موبائل چارج کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن کسی مسجد کی انتظامیہ کی صراحتاً ممانعت کی صورت میں اس سے احتراز کرنا لازمی ہوگا۔ بہرحال ایسے وقت میں موبائل چارج کیا جائے کہ یونٹ میں اضافہ نہ ہوجائے، ورنہ شبہ کو زائل کرنے کے لیے مسجد کے چندے میں کچھ رقم ڈالنی چاہیے۔

والدّلیل علی ذلک:

الإذن دلالة كالإذن صراحة، أمّا إذا وجدالنهي صراحة،فلاعبرة للإذن دلالة.(١)

ترجمہ: دلالتاً اجازت صراحتاً اجازت کی طرح ہے، البتہ جب صریحی نفی موجود ہو تو اس وقت دلالتاً اجازت کا اعتبار نہ ہوگا۔



مسائلِ استبدالِ وقف

مسجد کے لیے موقوفہ پلاٹ کی خرید وفروخت

سوال نمبر(299):

تقریباً پچاس سال ہوچکے ہیں کہ ایک شخص نے مسجد کے لیے پلاٹ وقف کیا تھا اور اب تک وہ پلاٹ ویسے ہی پڑا ہوا ہے، لیکن ابتدائی عرصہ میں اس پر ایک یا دو مرتبہ نماز باجماعت ادا کی گئی ہے۔ علاقے کی ایک معزز شخصیت نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس موقوفہ پلاٹ کا چونکہ بہت عرصہ ہوچکا ہے، اس لیے اس کو فروخت کرنا چاہیے۔ کیا اس شخص کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

(١) شرح المجلة لسليم رستم باز،المادة /٧٧٢،ص/٤٢٨

الجواب وباللہ التوفیق:

جب مسجد کے لیے کوئی زمین وقف کی جائے اور اس پر ایک دفعہ بھی اذان واقامت کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی جائے تو وہ تا قیامت مسجد کے حکم ہی میں رہے گی۔ خواہ وہ زمین تعمیر کے بغیر پلاٹ کی صورت میں کیوں نہ ہو، نہ تو اس کی خرید وفروخت کسی صورت میں جائز ہوگی اور نہ کوئی شخص موقوفہ زمین کا مالک بن سکتا ہے، لہٰذا اس پلاٹ کی تبدیلی یا بیچنا جائز نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

(فإذاتم ولزم لایملك، ولایملّك، ولایعار، ولایرهن)قال ابن عابدین: **قوله (لایملك)**أي لا یکون مملوکا لصاحبه، (ولایملّك)أي لایقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه.(۱)

ترجمہ:

اور جب وقف تام اور لازم ہو جائے تو نہ کسی کی ملکیت ہوگی اور نہ کوئی اس کا مالک بنے گا، نہ ہی عاریت پر دی جاسکتی ہے اور نہ ہی رہن میں رکھی جاسکتی ہے۔ (مالک نہیں بنے گا) یہ وقف جگہ نہ واقف کی ملکیت بنے گی اور نہ دوسرے شخص کی ملک میں بیع وغیرہ سے منتقل ہوسکتی ہے۔

❁❁❁

پرانے قبرستان میں نئے مردوں کو دفن کرنا

سوال نمبر(300):

ہمارے علاقے میں ایک پرانا قبرستان ہے اور اس میں مزید قبریں بنانے کی گنجائش نہیں، تقریباً چالیس، پچاس سال سے زائد عرصہ ہوگیا ہے کہ لوگوں نے اس میں مردوں کو دفنانا چھوڑ دیا ہے۔ ازروئے شریعت پرانے قبروں کو ہموار کر کے اس میں نئے قبریں بنانا کیسا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر قبرستان میں دفن کیے گئے مُردوں پر اتنا عرصہ گزر جائے جس میں

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب فرق ابو یوسف بین قوله "موقوفة": ۶/۵۳۹

وہ میت گل سڑ جاتے ہوں تو ایسی صورت میں قبروں کو ہموار کر کے اس میں نئے مردوں کی تدفین جائز ہے۔

لہٰذا اگر اس قبرستان پر اتنی مدت گزر چکی ہو جس میں مردوں کے گل سڑ جانے کا قوی امکان ہو تو وہاں نئے قبریں بنانا جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

ولو بلي الميت وصارترابا، جاز دفن غيره في قبره، وزرعه، والبناء عليه.(١)

ترجمہ: اگر میت پرانی اور مٹی ہو جائے تو کسی دوسرے کو اس کی قبر میں دفنانا، اس میں زراعت کرنا اور اسی طرح اس پر عمارت بنانا جائز ہے۔

❁❁❁

قبرستان کی زمین پر جنازہ گاہ بنانا

سوال نمبر(301):

ایک علاقہ میں قبرستان کے لیے زمین وقف ہے۔لوگوں نے اس زمین میں اپنے مُردوں کو دفنانا چھوڑ دیا ہے سوائے چند قبروں کے کوئی قبر اپنی حالت پر باقی نہیں، ایسی صورت میں اس زمین میں جنازگاہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وبالله التوفيق:

شرعی نقطہ نظر سے قبرستان میں قبروں کو ہموار کر کے اس میں تعمیر کرنا دُرست نہیں، البتہ موقوفہ قبرستان میں جب قبروں کے نشان باقی نہ رہے اور مُردوں کے اجسام غالب گمان کے مطابق خاک ہو چکے ہوں اور گاؤں والوں نے اس میں مردوں کو دفنانا چھوڑ دیا ہو تو ایسی قبرستان میں تعمیر کرنا جائز ہے۔

مذکورہ صورت میں اگر قبرستان کی زمین ہموار ہو چکی ہو تو اس میں جنازگاہ بنانا جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

ولو بلي الميت وصارترابا، جاز دفن غيره في قبره، وزرعه، والبناء عليه.(٢)

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب الحادى والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر: ١٦٧/١

(٢) ايضا

ترجمہ: اگر میت پرانی اور مٹی ہو جائے تو کسی دوسرے کو اس کی قبر میں دفنانا، اس میں زراعت کرنا اور اسی طرح اس پر عمارت بنانا جائز ہے۔

❁❁❁

قبرستان کے لیے وقف زمین تبدیل کرنا

سوال نمبر (302):

ایک شخص نے اپنی جائیداد سے دو کنال زمین مسجد اور قبرستان کے لیے وقف کردی تھی، ایک کنال زمین پر مسجد تعمیر ہوئی تھی اور ایک کنال زمین مسجد کے سامنے خالی پڑی ہے اور اس خالی پلاٹ کے ساتھ اُس شخص کا گھر بھی ہے اب یہ شخص اس خالی پلاٹ پر حجرہ بنانا چاہتا ہے اور قبرستان کے لیے دوسری زمین دینا چاہتا ہے۔ از روئے شریعت ایسا کرنا کیسا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کوئی شخص اپنی مملوکہ زمین کا بعض حصہ وقف کرے اور وقف تام ہو جائے تو پھر واقف کو رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں رہتا اور قبرستان میں وقف تام ہونے کے لیے شرط ہے کہ لوگ اس میں اپنے مردوں کو دفنانا شروع کردیں۔

صورتِ مسئولہ میں جب اس شخص نے اپنی جائیداد سے دو کنال زمین مشترکہ طور پر مسجد اور قبرستان کے لیے وقف کردی، ایک کنال زمین پر مسجد کی تعمیر سے قبرستان کے لیے ایک کنال زمین کی تعیین ہوگئی اور اس زمین میں جب تک لوگوں نے اپنے مردوں کو دفنانا شروع نہ کیا ہو، اُس وقت تک مالک کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے، لہٰذا یہ شخص قبرستان کے لیے دوسری جگہ وقف کر کے اس وقف شدہ خالی پلاٹ پر حجرہ بنا سکتا ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

عند محمدؒ إذا استقی النّاس من السقاية، وسكنوا الخان والرباط، ودفنوا في المقبرة، زال الملك.(۱)

(۱) تبیین الحقائق، کتاب الوقف، فصل من بنی مسجدا لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه: ۲۷۳/٤

ترجمہ:

اور امام محمدؒ کے نزدیک جب لوگ پانی پینے کی جگہ سے پانی پی لے اور سرائے اور فقرا کے لیے بنائی گئی جگہ میں سکونت اختیار کیا جائے اور مقبرہ میں اپنے مردوں کو دفن کیا جائے تو واقف کی ملک اس سے زائل ہوگئی (ان امور سے پہلے واقف کی ملک باقی رہتی ہے)۔

۞۞۞

پرانے قبرستان میں مدرسہ تعمیر کرنا

سوال نمبر(303):

مقبرہ پر جب کافی وقت گزر جائے اور قبروں کے نشانات مٹ جائیں تو اس زمین پر بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا قبرستان جہاں قبروں کے نشانات مٹ چکے ہوں اور لوگوں نے اس قبرستان میں اپنے مردوں کو دفنانا چھوڑ دیا ہو تو وہاں عمارت تعمیر کرنے گنجائش ہے۔
لہٰذا اگر مذکورہ زمین قبرستان کے لیے وقف ہو اور ضرورت سے زائد ہو، لوگ اب اس میں مردوں کو نہیں دفناتے اور بیکار رہنے سے اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ غلط مصرف میں استعمال ہو کر ضائع ہو جائے گی تو اس زمین پر بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

قال ابن القاسم: لو أنّ مقبرة من مقابر المسلمین عفت، فبنی قوم علیها مسجدًا، لم أر بذلك بأسًا.(۱)

ترجمہ: ابن القاسمؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے مقبرہ میں میت دفنانا ترک جائے اور قوم اس پر مسجد تعمیر کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

---

(۱) عمدة القاري، شرح البخاري، بیان حکم نبش قبور المشرکین: ۱۷۹/٤

پُرانے قبرستان میں مفادِ عامہ کے لیے ٹیوب ویل لگانا

سوال نمبر(304):

اگر کسی علاقے کے لوگ اپنے علاقائی پرانے قبرستان میں حکومت سے ٹیوب ویل لگانے کا مطالبہ کریں تو کیا اس قبرستان میں عام لوگوں کے فائدے کی خاطر ٹیوب ویل لگانا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کسی علاقے کے لیے ٹیوب ویل لگانے کا تعلق چونکہ مفادعامہ سے ہے، اس لیے جو وقف قبرستان اس قدر پرانا ہو کہ اس میں مُردوں کے اجسام خاک ہو جانے کا ظن غالب ہو اور اس میں ایسی کوئی خالی جگہ پڑی ہو کہ قبروں کے لیے استعمال نہ ہوتی ہو تو اس میں مفادِعامہ کے لیے ٹیوب ویل لگانا جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو بلي الميت وصار ترابا، جاز دفن غيره في قبره، وزرعه، والبناء عليه.(۱)

ترجمہ: اگر میت پرانی اور مٹی ہو جائے تو کسی دوسرے کو اس کی قبر میں دفنانا، اس میں زراعت کرنا اور اسی طرح اس پر عمارت بنانا جائز ہے۔



پرانے قبرستان کا مفادعامہ میں استعمال

سوال نمبر(305):

ایسا قبرستان جس میں قبروں کے نشانات مٹ گئے ہوں، اس کو کسی مفادعامہ میں استعمال کرنا کیسا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر قبرستان اس قدر پرانا ہو کہ قبروں کے نشانات مٹ چکے ہوں اور ظن غالب یہ ہو کہ قبروں میں مُردے

---

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر: ۱/۱٦٧

خاک ہوگئے ہوں گے تو ایسے وقف قبرستان کو کسی مفاد عامہ میں بروئے کار لانے میں کوئی حرج نہیں۔

والدّليل على ذلك:

قال ابن القاسم: لوأنّ مقبرة من مقابر المسلمين عفت، فبنى قوم عليها مسجدًا، لم أر بذلك بأسًا.(۱)

ترجمہ:

ابن القاسمؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے مقبرہ میں میت دفنا نا رک جائے اور قوم اس پر مسجد تعمیر کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

❁❁❁

ضائع ہونے کی صورت میں چندے کا متبادل استعمال

سوال نمبر(306):

ایک ڈاکٹر صاحب نے پانچ کنال اراضی ایک قاری صاحب کو مدرسۃ البنات کے لیے دے دی اور مدرسہ کی تعمیر کے لیے چندہ ہوتا رہا، جس سے تعمیر ہوتی رہی، وقت گزرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد اس قاری صاحب نے اپنی طرف سے ایک ساتھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ دبئی میں چندہ کرنے کے لیے بھیجا تقریباً چار لاکھ روپے چندہ ہوا اور وہ واپس وطن آگئے، کچھ رقم ڈاکٹر صاحب نے اپنے پاس رکھ دی اور بقیہ رقم قاری صاحب کو دے دی، قاری صاحب نے اس رقم کو مدرسہ کی تعمیر کی بجائے ذاتی استعمال میں لایا ہے اور مدرسہ کی مزید تعمیر سے منکر ہوگیا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ رقم قاری صاحب کو دے دیں یا نہیں؟ اس رقم کا مصرف کیا ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وبالله التوفيق:

جب کوئی شخص کسی نیک کام کے لیے چندہ دے تو جس شخص کو چندہ دیا گیا ہے، اس پر لازم ہے کہ اس کو صرف اسی مصرف میں خرچ کرے، جہاں چندہ دینے والے نے خرچ کا کہا ہو اور اگر چندہ وصول کرنے والے کے پاس وہ مصرف موجود نہ رہے تو چندہ دینے والے کی اجازت کے بعد دوسرے مصرف میں وہ چندہ استعمال کیا جاسکتا ہے اور اگر

(۱) عمدة القاري، شرح البخاري، بيان حكم نبش قبور المشركين: ٤/١٧٩

چندہ دینے والے تک رسائی ممکن نہ ہو تو اس کی منشا کی رعایت کرتے ہوئے دوسرے قریبی مصرف میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کے لیے چندہ دینے والوں میں سے جن کے ساتھ رابطہ ممکن ہو، ان کے مشورے سے متبادل مصرف میں خرچ کریں اور اگر رابطہ ممکن نہ ہو تو ان کی منشا کو دیکھتے ہوئے دوسرے مستحق مدارس کو وہ چندہ رقم دیں، کیوں کہ آپ کے پاس یہ رقم امانت ہے، اس کی حفاظت آپ کی ذمہ داری ہے، حتی الوسع کوشش کریں کہ جس جگہ یہ رقم ضائع ہونے کا خدشہ بھی ہو، ادھر یہ رقم نہ دی جائے۔

والدّلیل علی ذلك:

حوض في محلة خرب، فصار بحيث لاتمكن عمارته، واستغنى أهل المحلة عنه، إن كان يعرف واقفه يكون له إن كان حيا، ولورثته إن كان ميتا، وإن كان لايعرف واقفه، فهو كاللقطة في أيديهم يتصدقون به على فقير، ثم يبيعه الفقير، فينتفع بالثمن.(۱)

ترجمہ:

کسی محلہ میں کوئی حوض اس قدر خراب ہو جائے کہ اس کی تعمیر ممکن نہ ہو اور محلہ والوں کو اس کی ضرورت نہ رہے۔ پس اگر اس کا واقف معلوم ہوا اور زندہ ہو تو وہ اس کی ہوگی اور اگر وہ فوت ہوا ہو تو وہ اس کے ورثا کی ہوگی اور اگر واقف معلوم نہ ہو تو وہ ان کے ہاتھوں میں لقطہ کی طرح ہے اسے کسی فقیر پر صدقہ کریں اور پھر فقیر اس کو بیچ کر اس کے پیسوں سے نفع اٹھائے۔

❁❁❁

مخصوص مد میں استعمال نہ کرنے پر واقف کی واپسی کا مطالبہ

سوال نمبر(307):

ایک شخص نے مسجد کے متولی کو پچیس ہزار روپے دے کر کہا کہ اس سے مسجد میں فرش بنالو، مسجد کے فرش کے لیے یہ رقم ناکافی ہونے کی وجہ سے مسجد کے متولی نے اس سے دس ہزار روپے مسجد کی دوسری ضروریات میں خرچ کیے، واقف کو پتہ چلا تو اس سے مطالبہ کیا کہ مجھے یہ بقیہ پیسے واپس دے دو، میں اس کو دوسری مسجد میں لگاؤں گا۔

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف، الباب الثالث عشر في الاوقاف التي يستغنى عنها: ۴۷۹/۲

واقف کا یہ مطالبہ شرعاً کیسا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

چندہ دینے والے کی رقم کو مخصوص مد میں خرچ کرنے کی تصریح کرنا ایک قسم کی شرط کی حیثیت رکھتا ہے، اور واقف کی شرائط کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔

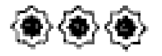
لہٰذا متولی نے جب اس شرط کا لحاظ نہیں رکھا اور رقم کا کچھ حصہ مسجد کی دوسری ضروریات میں خرچ کیا تو واقف کے لیے اس سے بقیہ رقم کا مطالبہ کرکے اس کو کسی دوسری مسجد میں استعمال کرنا درست ہے۔

والدّلیل علی ذلك:

فإن شرائط الواقف معتبرة إذالم تخالف الشرع، وهو مالك، فله أن يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية. (۱)

ترجمہ:

جب واقف کی شرائط شریعت سے متصادم نہ ہوں، تو وہ معتبر ہیں، وہ چونکہ (اپنے مال کا) مالک ہے، لہٰذا اسے اختیار حاصل ہے کہ جب تک کوئی معصیت نہ ہو، اپنا مال جہاں چاہے خرچ کرے۔



موقوفہ مکان کی تبدیلی

سوال نمبر(308):

محلّہ کے لوگوں نے ایک مکان فاتحہ خوانی اور شادی بیاہ وغیرہ کے لیے وقف کیا ہے۔ اب اس محلّہ میں ایک شخص نے اپنے مملوکہ مکان کو موقوفہ مکان سے تبدیل کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اہل محلّہ بھی اس کے ساتھ اس بات پر متفق ہیں۔ واضح رہے کہ یہ مملوکہ مکان موقوفہ مکان سے بڑا اور تعمیر کے لحاظ سے بہتر ہے اور لوگ اس بہتری کی غرض سے اس پر متفق ہیں۔ تو کیا موقوفہ جگہ کی اس طرح تبدیلی شرعاً جائز ہوگی؟

بیّنوا توجروا

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب: شرائط الواقف معتبرة: ٦/٥٢٧

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے وقف شدہ مکان کو دوسرے مکان کے ساتھ تبدیل کرنا اس شرط پر جائز ہے کہ جب دونوں مکان ایک محلّہ میں واقع ہوں اور مملوکہ مکان موقوفہ مکان سے اچھا اور بہتر ہو۔

صورتِ مسئولہ میں اگر اہلِ محلّہ کے لیے مذکورہ شخص کے مکان میں زیادہ بہتری نظر آتی ہو تو ایسی موقوفہ جگہ کی مملوکہ جگہ کے ساتھ تبادلہ شرعاً جائز ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

مبادلة دار الوقف بدارأخرى إنما تجوز إذا كانت في محلة واحدة، وتكون المحلة المملوكة خيرامن محلة الموقوفة، وعلى عكسه لايجوز.(۱)

ترجمہ:

موقوفہ گھر کو دوسرے کے ساتھ تبدیل کرنا اس وقت درست ہے، جب وہ ایک ہی محلّہ میں ہوں اور تبدیل ہونے والے گھر کا محلّہ اس موقوفہ محلّہ سے بہتر ہو اور اس کا عکس جائز نہیں۔

❁❁❁

موقوفہ گھر واپس لینا

سوال نمبر(309):

ایک دین دار شخص نے مسجد کے امام کے لیے گھر وقف کیا۔ امام کی وفات کے بعد یہ شخص خود اس مسجد کا امام بنا اور اب وہ اس گھر میں رہتا ہے، لیکن اس نے ارادہ کیا ہے کہ چونکہ یہ گھر میں نے امام مسجد کے لیے وقف کیا تھا اور اب مسجد کا امام میں ہوں تو اس کو فروخت کر کے رقم ذاتی استعمال میں لاؤں گا۔ تو کیا اس شخص کے لیے ایسا کرنا درست ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق جب کوئی چیز ایک دفعہ وقف کی جائے اور وہ وقف تام ہو تو اس کی خرید وفروخت جائز ہے اور نہ ہی کوئی اس کا مالک بن سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص اپنا مملوکہ گھر امام مسجد کے لیے وقف

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الوقف، الباب الرابع في مايتعلق بالشرط في الوقف: ۲/ ۴۰۰

کردے تو امام کی وفات کے بعد اس کے لیے مسجد سے مذکورہ گھر واپس لینا جائز نہیں۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں مذکورہ شخص کا یہ اقدام کہ امام مسجد کے لیے اپنا گھر وقف کیا اور اس کی وفات کے بعد جب وہ خود اس مسجد کا امام بن گیا تو اب اس موقوفہ گھر کو فروخت کر کے رقم ذاتی استعمال میں لاتا ہے، درست نہیں، کیوں کہ امام مسجد کو وقف کرنے سے وہ اس کی ملکیت سے نکل گیا ہے، البتہ امام مسجد کی حیثیت سے اس میں رہائش اختیار کر سکتا ہے، ہاں اگر سابقہ امام کو عمر بھر کے لیے دیا ہو تو پھر عمریٰ کے حکم میں ہو کر امام اس کا مالک ہوگا اور اس کے فوت ہونے بعد اس کے ورثا کا حق ہوگا۔

والدّلیل علی ذلك:

سئل القاضي برهان الدين عمن وقف داراً علي إمام المسجد، ثم إن الواقف جعل نفسه إماما أيجوز له أخذ تلك الدار؟ قال لا.(۱)

ترجمہ:

قاضی برہان الدینؒ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو امام مسجد کے لیے گھر وقف کرے اور پھر خود امام بن جائے تو کیا اس شخص کے لیے یہ گھر لینا درست ہے؟ قاضی برہان الدینؒ نے کہا! نہیں۔

وإذا صح الوقف، لم يجز بيعه، ولا تمليكه.(۲)

ترجمہ: اور جب وقف صحیح ہو جائے تو پھر اس کی بیع یا تملیک درست نہیں۔

❁❁❁

ناقابلِ انتفاع موقوفہ چیز کو بدلنا

سوال نمبر(310):

میری پھوپھی کی ملکیت میں تین مرلہ پلاٹ تھا، اس نے وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد یہ زمین مسجد کے لیے وقف ہے۔ اب وہ فوت ہو چکی ہے۔ کسی عالم نے بتایا ہے کہ یہ وصیت مال کے ایک تہائی حصہ میں جاری ہوگی تو تین مرلہ میں ایک مرلہ پلاٹ مسجد کے لیے وقف ہوگی جو کہ مسجد کے لیے ناکافی ہے۔ کیا اس زمین کو بیچ کر اُس رقم کو

(۱) الفتاوی التاتارخانیة، کتاب الوقف، الفصل الحادي والعشرون، نوع منه: ٥/٥٧٤

(۲) الهداية، کتاب الوقف: ٦١٩/٢

کسی مسجد میں خرچ کرنا جائز ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے جب وقف تام ہو جائے تو اس کو اُسی مصرف میں استعمال کرنا ضروری ہے، تاہم اگر موقوفہ چیز سے انتفاع ممکن نہ ہو تو اس کو بیچ کر اس رقم کو کسی مسجد کے مصالح میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔

صورتِ مسئولہ میں سائل کے پھوپھی کا کل ترکہ اگر یہ تین مرلہ پلاٹ ہو تو پھر اس کی وصیت ثلث مال میں جاری ہوگی، لہٰذا صرف ایک مرلہ وقف ہوگی، جو مسجد کی تعمیر کے لیے کافی نہیں، لہٰذا اس کو بیچ کر کسی بھی مسجد کے مصالح میں خرچ کرنا جائز ہے۔ تاہم اگر اس تین مرلہ پلاٹ کے علاوہ بھی مال ہو تو پھر اس پورے مال میں اگر یہ تین مرلہ ایک تہائی سے کم یا برابر ہو تو اس کی وصیت پر عمل کر کے پورے تین مرلے میں مسجد کی تعمیر ہوگی۔

والدّلیل علی ذلك:

(ولا تجوز بما زاد على الثلث) لقول النبي ﷺ في حديث سعد بن أبي وقاصؓ: "الثلث والثلث كثير" بعد ما نفى وصيته بالكل والنصف.(۱)

ترجمہ: اور وصیت جائز نہیں اس مقدار کے ساتھ جو ثلث سے زیادہ ہو، نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کے بعد جب انہوں نے سعد بن ابی وقاصؓ کے کل مال اور نصف مال کی وصیت کی نفی کرنے کے بعد فرمایا تھا: ''تہائی مال (کے ساتھ وصیت کرو) اور تہائی (مقدارِ وصیت کے لیے کافی) زیادہ ہے۔

(وجاز شرط الاستبدال به) اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه:......والثاني: أن لا يشترطه سواء شرط عدمه أو سكت، لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية......فهو أيضاً جائز على الأصح.(۲)

ترجمہ: (اس کا بدلنا جائز ہے) جان لے کہ وقف میں استبدال تین صورتوں میں ہوتی ہے۔۔۔۔دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے بالکل شرط نہیں لگائی ہو چاہے شرط نہ لگانے کی شرط ہو یا سکوت اختیار کی ہو، لیکن وہ موقوفہ چیز ایسی ہو کہ اس سے انتفاع ناممکن ہو۔۔۔۔تو اصح قول کے مطابق وہ بھی جائز ہے۔

❁❁❁

---

(۱) الهداية، كتاب الوصايا، باب في صفة الوصية مايجوز من ذلك ......: ٦٣٨/٤

(۲) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الوقف، مطلب في استبدال الوقف وشروطه: ٥٨٣/٦

امام کا مسجد کے لیے وقف شدہ زمین کو اپنے نام انتقال کروانا

سوال نمبر(311):

گاؤں کی ایک مسجد کے ساتھ موقوفہ جائیداد ہے۔جس سے امام اور خطیب استفادہ کرتے ہیں اور لوگوں نے اس کی اجازت بھی دی ہے،لیکن اس کا یہ استفادہ صرف منصب امامت وخطابت کی وجہ سے ہے۔کیا امام یا خطیب اس مذکورہ زمین کا انتقال اپنے نام کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق جب کوئی چیز مسجد کے لیے وقف کی جائے تو اس کا کسی شخص کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اس میں میراث جاری ہوسکتی اور نہ ہی اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔

لہٰذا صورتِ مذکورہ میں جو بھی شخص منصب امامت پر فائز ہو تو اس سے استفادہ کا حق دار ہے اور اس کو اپنے نام پر انتقال کروانا یا اس کو فروخت کرکے رقم اپنی ضروریات میں استعمال کرنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔

والدّلیل علی ذلک:

ومن اتخذ أرضه مسجداً، لم یکن له أن یرجع فیه، ولا یبیعه، ولا یورث عنه ؛لأنه یحرز عن حق العباد، وصار خالصا لله تعالیٰ.(١)

ترجمہ: اور جس نے اپنی زمین مسجد کو دے دی تو اس سے رجوع کرنا، اس کا بیچنا یا اس سے بطور میراث منتقل ہونا درست نہیں، کیونکہ یہ (مسجد) لوگوں کے حق سے محفوظ ہوکر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگئی۔

❁❁❁

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین کی تبدیلی

سوال نمبر(312):

ایک شخص نے حجرے کی ایک جانب مسجد کے لیے زمین وقف کی تھی اور اس میں باقاعدہ اذان اور نماز باجماعت ادا کی جاتی تھی جو کہ اب شہید کی گئی ہے۔اب وہ شخص چاہتا ہے کہ اس کے بدلے میں کسی دوسری جگہ مسجد تعمیر

(١) الهدایة، کتاب الوقف: ٢/٦٢٢

کی جائے۔کیا ازروئے شریعت حجرے کی حدود میں مسجد کی موقوفہ زمین کے عوض دوسری جگہ مسجد بنائی جاسکتی ہے؟ انتقال وقف کے اس طریقہ کار کا شرعاً کیا حکم ہے؟ بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کوئی شخص مسجد کے لیے زمین وقف کرے اور اس پر کم از کم ایک مرتبہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو یہ شرعی مسجد کے حکم میں ہوکر قیامت تک مسجد ہی رہے گی۔ اس کی تبدیلی جائز نہیں۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر منہدم مسجد باقاعدہ طور پر وقف کی جاچکی ہو اور اس میں باقاعدہ نماز باجماعت ادا کی گئی ہو تو ایسی مسجد کی منتقلی جائز نہیں، بلکہ اسی موقوفہ زمین کی حدود میں مسجد دوبارہ تعمیر کی جائے گی۔

والدّلیل علی ذلک:

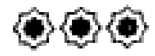
من بنی مسجدا لم یزل ملکه عنه، حتی یفرزه عن ملکه بطریقه، ویأذن بالصلوٰة فیه، فاذا صلی فیه واحد، زال ملکه.(١)

ترجمہ: جو کوئی مسجد بنائے تو اس وقت تک وہ مسجد اس کی ملکیت ہے، جب تک کہ وہ اس مسجد کا راستہ بنا کر اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے کر اس کو اپنی ملکیت سے جدا نہ کرے اور جب ایک شخص بھی اس میں نماز پڑھ لے تو اس کی ملکیت زائل ہوجاتی ہے۔

ومن اتخذ أرضه مسجداً، لم یکن له أن یرجع فیه، ولا یبیعه، ولا یورث عنه؛ لأنه یحرز عن حق العباد، وصار خالصا للّٰه تعالیٰ، وهذا؛ لأن الأشیاء کلها للّٰه تعالیٰ.(٢)

ترجمہ:

اور جس نے اپنی زمین مسجد کو دیدی تو اس سے رجوع کرنا، اس کا بیچنا یا اس سے بطورِ میراث منتقل ہونا درست نہیں، کیونکہ یہ (مسجد) لوگوں کے حق سے محفوظ ہوکر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگئی اور یہ اس لیے کہ تمام چیزیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔



---

(١) کنزالدقائق، کتاب الوقف، فصل في أحکام المسجد ......: ١/٢٠٥، ٢٠٦

(٢) الهدایة، کتاب الوقف: ٢/٦٢٢

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر دکانیں بنانا

سوال نمبر(313):

ہمارے گاؤں میں ایک مالدار شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے۔زمین کے کچھ حصہ پر باقاعدہ مسجد بنائی گئی ہے،جس میں اذان اور نماز باجماعت ادا ہوتی ہے،لیکن مسجد سے زائد زمین ویران پڑی ہے،صرف جمعہ اور عیدین میں لوگ اس زائد زمین پر نماز پڑھتے ہیں۔مسجد کی انتظامیہ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس زائد زمین پر دکانیں بنائی جائیں۔اس سے جو منافع حاصل ہوں گے، وہ مسجد کے مصالح اور مقاصد میں استعمال ہوں گے۔کیا کمیٹی کا یہ اقدام شرعاً درست ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مذکورہ زمین کے جس حصہ پر باقاعدہ مسجد بن گئی ہے اور اس میں لوگ باقاعدہ باجماعت نماز پڑھتے ہیں، خواہ یہ مسجد تعمیر شدہ ہو یا عارضی چبوترہ وغیرہ ہو، ہر حال میں ایسی جگہ پر اس غرض سے دکانیں بنانا کہ اس کے منافع مسجد کے مصالح میں استعمال کیے جائیں گے، جائز نہیں۔البتہ مسجد کے نام پر جو زائد زمین وقف کی گئی ہو اور اسے غیر آباد چھوڑ دیا گیا ہو تو ایسی زمین پر مسجد کے مقاصد کے لیے دکانیں بنانے میں شرعاً گنجائش پائی جاتی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

قیم المسجد لایجوزله أن یبني حوانیت في حدّالمسجد،أو في فنائه؛لأنّ المسجد إذا جعل حانوتاً ومسکناً تسقط حرمته، وهذا لا یجوز، والفناء تبع المسجد، فیکون حکمه حکم المسجد.(۱)

ترجمہ:

مسجد کے متولی کے لیے مسجد یا فنائے مسجد میں دُکانیں بنانا جائز نہیں، اس لیے کہ اگر مسجد دُکان یا رہنے کی جگہ بن جائے، تو اس کی حرمت ساقط ہو جائے گی اور یہ جائز نہیں اور فنا چونکہ مسجد کی تابع ہوتی ہے، اس لیے وہ بھی مسجد کے حکم میں ہے۔



(۱) الفتاوی الهندیة،کتاب الوقف،الباب الحادي عشر في المسجد: ۲/۴٦۲

ویران مسجد کو کارخانہ بنانا

سوال نمبر(314):

تقریباً بیس سال سے ایک مسجد میں لوگوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ایک مالدار شخص نے اس غیر آباد مسجد پر چپل کا کارخانہ بنانے کا ارادہ کیا ہے۔کیا ازروئے شریعت ایسی زمین کا استعمال کارخانہ کے لیے درست ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مقدسہ کی رُو سے جس زمین پر ایک مرتبہ شرعی مسجد بن جائے تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی۔ اوراس پر کسی قسم کا کارخانہ بنانا یا کسی دوسرے دنیاوی کام کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، بلکہ مذکورہ مسجد کے ساتھ وابستہ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ اس کو آباد کر کے اس میں باقاعدہ نماز باجماعت شروع کریں۔

والدّلیل علی ذلک:

(ولو خرب ماحوله واستغنی عنه یبقیٰ مسجدا عندالإمام والثاني)أبداإلی قیام الساعة (وبه یفتیٰ).(۱)

ترجمہ:

اگر مسجد کے اردگرد کا علاقہ ویران ہو جائے اور مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اور اسی پر فتویٰ ہے۔



مسجد کے کسی حصہ کو دکان بنانا

سوال نمبر(315):

ہماری مسجد کے متصل تین دکانیں ہیں۔دکانوں کی ایک طرف مسجد کا صحن ہے جس میں باقاعدہ نماز باجماعت پڑھی جاتی ہے۔مسجد کی کمیٹی والوں نے مشورہ کیا ہے کہ چونکہ ہماری مسجد کی آمدنی بہت کم ہے اور اخراجات زیادہ ہیں،

(۱) الدرالمختارعلی صدرردالمحتار، کتاب الوقف: ۶/۵۴۸

اس لیے اس تکون نما جگہ جو کہ مسجد کا حصہ ہے، میں دکان بنائی جائے۔کیا مسجد کے مذکورہ حصے میں شریعت مطہرہ کی رُو سے دکان بنانا جائز ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

مسجد کے لیے وقف کردہ زمین پر کم از کم ایک بار اذان، اقامت سمیت باجماعت نماز ادا کر لینے سے اسے مسجد شرعی کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس لیے اس کے بعد اس زمین کا استعمال مسجد کے علاوہ کسی اور کام میں درست نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں جس حصہ پر دکان بنانے کا ارادہ کیا گیا ہے، وہ باقاعدہ مسجد کا حصہ ہے، اس لیے اس پر دکان بنانا شرعاً جائز نہیں۔

والدّليل على ذلك:

قيم المسجد لايجوزله أن يبني حوانيت في حدّالمسجد،أو في فنائه؛لأنّ المسجد إذا جعل حانوتاً ومسكناً، تسقط حرمته، وهذا لا يجوز، والفناء تبع المسجد، فيكون حكم المسجد.(١)

ترجمہ:

مسجد کے متولی کے لیے مسجد یا فنائے مسجد میں دُکانیں بنانا جائز نہیں، اس لیے کہ اگر مسجد دُکان یا رہنے کی جگہ بن جائے تو اس کی حرمت ساقط ہو جائے گی اور یہ جائز نہیں اور فنا چونکہ مسجد کی تابع ہوتی ہے، اس لیے وہ بھی مسجد کے حکم میں ہے۔

❁❁❁

قبر کو مسجد بنانا

سوال نمبر(316):

کالونی کی ایک مسجد نمازیوں کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے تنگ ہو گئی ہے۔علاقے کے معزز لوگوں نے مسجد کی وسعت کی غرض سے قریب ایک گھر خرید لیا ہے، لیکن مسجد اور اس گھر کے درمیان ایک پختہ قبر واقع ہے جو مسجد کی

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الوقف،الباب الحادي عشر في المسجد: ٢/٤٦٢

توسیع میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔کیا اس قبر کو اسی حالت پر چھوڑ دیں یا ختم کر کے وہ جگہ مسجد میں شامل کریں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جس قبر کی میت کے بارے میں اس کے اعضا کی بوسیدگی کا ظن غالب ہو تو مسجد کی توسیع کی خاطر ایسی صورت میں قبر کو مسمار کر کے اس جگہ کو مسجد میں شامل کرنا جائز ہے۔اگر قبر نئی ہو تو پھر اس کو اسی حالت پر چھوڑ کر مسجد کی تعمیر کے وقت قبر کے ساتھ کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں کہ قبر کی طرف عبادت کا شائبہ نہ ہو۔

والدّلیل علی ذلک:

ولو بلي الميت وصارترابا، جاز دفن غيره في قبره، وزرعه، والبناء عليه.(١)

ترجمہ:

اگر میت پرانی اور مٹی ہو جائے تو کسی دوسرے کو اس کی قبر میں دفنانا، اس میں زراعت کرنا اور اسی طرح اس پر عمارت بنانا جائز ہے۔

وفي القهستاني عن جنائز المضمرات: لاتكره الصلوة إلى جهة القبر إلا إذا كان بين يديه بحيث لو صلى صلوة الخاشعين وقع بصره عليه.(٢)

ترجمہ:

قہستانی نے جنائز المضمرات میں لکھا ہے کہ قبر کی طرف نماز پڑھنا اس وقت مکروہ ہے، جب نمازی کے بالکل سامنے قبر موجود ہو۔اس طور پر کہ اگر وہ خشوع خضوع کی نماز پڑھے تو اس کی نظریں قبر پر پڑتی ہوں۔



درمیانی منزل کو مسجد بنانا

سوال نمبر(317):

بازار میں ایک شخص نے عمارت تعمیر کی ہے جس کے نیچے تہہ خانہ اور اوپر بالا خانہ ہے جو کہ مسافر خانہ کا کام

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر: ١٦٧/١

(٢) حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، فصل في المكروهات: ص/٢٩٠

دیتا ہے۔اس کے درمیانی حصے کو مسجد کے لیے مختص کیا گیا ہے۔اب وہ شخص صاحبِ فراش ہے،اس نے وصیت لکھوائی ہے کہ چونکہ عمارت میری ملکیت میں ہے،اس لیے میری وفات کے بعد اسے میرے ورثا میں تقسیم کی جائے۔واضح رہے کہ عمارت کا تہہ خانہ اور بالا خانہ سے جو منافع آتے ہیں۔موصوف ان کو اپنے مقاصد اور ضروریات میں استعمال کرتے ہیں۔اس طرح کی مسجد کسی شخص کے میراث کا حصہ بن سکتا ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

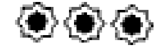
شریعتِ مطہرہ کی رُو سے اگر کسی شخص نے اپنے ایسے مکان کو مسجد بنایا ہو جس کے نیچے تہہ خانہ اور اوپر بالا خانہ ہو تو اس صورت میں وہ مکان مسجد متصور نہیں ہوگی۔باوجودیکہ واقف نے اسے اپنی ملکیت سے علیحدہ کردیا ہو۔

لہٰذا حالتِ محررہ کی روشنی میں ایسی جگہ میراث کا حصہ بنانا شرعاً جائز ہوگا۔اگر واقف نے پوری عمارت مسجد کے لیے وقف کی ہو اور تہہ خانہ و بالا خانہ بھی مسجد کے مصالح میں استعمال ہوتے ہوں تو پھر اس پورے مکان کو مسجد قرار دیا جائے گا جس کی نہ خرید وفروخت جائز ہوگی اور نہ کسی شخص کے لیے میراث کا حصہ بن سکے گا،لیکن محررہ حالات کی روشنی میں یہ جائے نماز ہے،شرعی مسجد نہیں۔

والدّلیل علی ذلك:

ومن جعل مسجدا تحته سرداب أو فوقه بيت، وجعل باب المسجد إلى الطريق، وعزله عن ملكه، فله أن يبيعه، وإن مات يورث عنه ؛لأنه لم يخلص لله تعالىٰ لبقاء حق العبد متعلقا به، ولو كان السرداب لمصالح المسجد جاز.(۱)

ترجمہ: اور جس نے ایسی مسجد بنائی،جس کے نیچے تہ خانہ یا اوپر گھر ہو اور مسجد کا دروازہ راستے کی طرف بنالے اور اپنی ملک سے الگ کرے تو اس کے لیے اس کا بیچنا جائز ہے اور اگر وہ مرجائے تو اس کی وراثت بھی جاری ہوگی۔کیوں کہ اس نے یہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص نہیں کیا،اس لیے کہ اس کے ساتھ بندے کا حق قائم ہے اور اگر تہ خانہ مسجد کے مصالح کے لیے ہے تو جائز ہے(وقف صحیح متصور ہوگا)۔



(۱) الهداية، كتاب الوقف: ۶۲۲/۲

غصب کی زمین پر بنی ہوئی مسجد کو ختم کرنا

سوال نمبر(318):

گورنمنٹ کی زمین پر لوگوں نے جبراً اجازت کے بغیر مسجد بنائی ہے۔اب حکومت نقشے کے مطابق شہر کی توسیع کرنا چاہتی ہے۔تو کیا حکومت ایسی مسجد کو منہدم کر کے اپنے تصرفات میں لاسکتی ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام نے مسجد کے لیے زمین وقف کرنے کی صحت کے لیے یہ شرط لکھی ہے کہ وہ زمین واقف کی ملک تام ہو۔اگر مذکورہ زمین حکومت کی ملکیت ہو تو لوگوں کے لیے حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرنا جائز نہیں،اس لیے جب کسی زمین پر جبراً قبضہ کرکے مسجد بنائی جائے تو وہ شرعی مسجد نہیں،لہٰذا حکومت کے لیے اس کو منہدم کر کے اپنے مصالح میں استعمال کرنا جائز ہے۔تاہم اگر اس مسجد سے حکومت کو کوئی نقصان نہ ہو تو مسجد کو اپنی جگہ چھوڑنا بہتر ہے تاکہ مسجد کا تقدس اپنی جگہ برقرار رہے۔

والدّلیل علی ذلک:

أفادأن الواقف لابدأن یکون مالکه وقت الوقف ملکا باتاً،ولوبسبب فاسد، وأن لایکون محجورا عن التصرف، حتی لووقف الغاصب المغصوب لم یصح، وإن ملکه بعد بشراء أو صلح، ولو أجاز المالك وقف فضولي، جاز. (۱)

ترجمہ:

معلوم ہوا کہ وقف کرتے وقت واقف کا پوری طرح مالک ہونا ضروری ہے،اگرچہ کسی سبب فاسد کی وجہ سے ہو اور اسی طرح (موقوفہ زمین) میں تصرف سے منع نہ کیا گیا ہو۔چنانچہ اگر غاصب نے مغصوبہ وقف کیا تو جائز نہیں۔اگرچہ وہ بعد میں خریدنے یا صلح کرنے سے اس کا مالک بنے اور فضولی کا وقف اس وقت درست ہے،جب اصل مالک اجازت دے۔

❁❁❁

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب قدیثبت الوقف بالضرورۃ: ۵۲۳/۶

مسجد کا قطعہ مفادِ عامہ کے لیے استعمال میں لانا

حضرت مفتی صاحب اسسٹنٹ کمشنر کی دعوت پر مردان تشریف لے گئے تھے۔شیخ ملتون ٹاؤن کے قریب ایک ہسپتال زیرِ تعمیر ہے۔اس مجوزہ قطعہ اراضی کے ایک کونہ میں مین روڈ کے کنارے پر تقریباً ۲۰ سال پرانی مسجد ہے۔ نقشہ کے مطابق ہسپتال کا روڈ مسجد کے صحن میں گزارنا ہوگا۔جس کے لیے مسجد کے صحن میں روڈ کا راستہ بنا کر بجری وغیرہ ڈال دی گئی ہے۔دوسری طرف مسجد کا ہال مین روڈ کے کنارے پر لمبی گرین بیلٹ (گھاس کی ہری پٹی) کی زد میں ہے۔ اس طرح پوری مسجد ہسپتال کے روڈ اور گرین بیلٹ کی نذر ہو جائے گی۔

مقامی علمائے کرام کی تحریک وتشویش پر ''اے سی'' صاحب نے حضرت مفتی صاحب کو موقع دیکھنے کی فرمائش کی۔مفتی صاحب نے مقامی علمائے کرام، اے سی صاحب اور دوسرے سرکاری ذمہ دار حضرات کی موجودگی میں ہسپتال اور مسجد کا معائنہ کر کے عدالت میں ان سب حضرات کی موجودگی میں اس مسجد کو برقرار رکھنے کے بارے میں اہم فتویٰ صادر کیا۔قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے اس اہم تاریخی فیصلہ اور فتویٰ کو فتاوی عثمانیہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔

سوال نمبر(319):

مردان اور نوشہرہ روڈ پر واقع شیخ ملتون ٹاؤن کے ساتھ ایک گاؤں دامان کلے کے نام سے آباد تھا۔صنعتی علاقہ ہونے کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں رہائش پذیر تھے۔مقامی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مالک زمین نے ایک مخصوص قطعہ اراضی مسجد کے لیے باقاعدہ وقف کیا جس پر باقاعدہ مسجد بنا کر بائیس سال سے مقامی لوگوں کے استعمال میں رہی۔مسجد کا باقاعدہ ایک وسیع ہال ہے۔صحن کی چاردیواری کا عام لوگ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔جب کہ مشرقی جانب کچھ کمرے بھی بنائے گئے ہیں جو مسافر طلبہ کی رہائش کے لیے استعمال ہوتے رہے ۱۹۸۴ء میں یہ جگہ ہسپتال کے لیے منتخب کی گئی۔چنانچہ حکومت نے مالکِ زمین سے ۵۱۳ کنال کا وسیع قطعہ اراضی جملہ خسرہ جات کے حوالہ سے بیع قطعی کے ساتھ خرید لیا۔ہسپتال کے فنی اور حفاظتی امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو نقشہ تیار ہوا اس میں مسجد کے لیے دوسری جگہ منتخب ہوئی، جب کہ موجودہ مسجد کی جگہ سبزہ زار اور سروس روڈ بنایا گیا۔تعمیراتی کمپنی نے مسجد کے صحن سے سڑک نکالنے کی کوشش کر کے چاردیواری توڑ دی ہے۔مقامی علما نے اربابِ اقتدار کو اپنی مسئولیت کا احساس دلا کر مسجد کے تحفظ کی یاد دہانی کرائی، لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔چنانچہ علما نے عدالت سے حکم امتناعی حاصل کر کے فی الحال اس پر عمل درآمد روک دیا گیا، لیکن اربابِ اختیار نقشہ میں کسی قسم کی تبدیلی پر آمادہ نہیں۔کیا ایسے

حالات میں حکومت کے لیے اس مسجد کا گرانا اور اس کی جگہ متبادل مسجد دوسری جگہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ حکومت کے کارندے اپنے موقف کے جواز کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حکومت نے مالکِ زمین سے ۵۱۳ کنال زمین خرید لی ہے۔ انتقالات بھی بحوالہ حکومت کی ملکیت ہے، اس لیے حکومت کے لیے اپنی ملکیت میں تغییر وتبدیل کا حق حاصل ہے۔

دوسری اہم دلیل جس پر حکومت کا موقف مضبوط سمجھا جاتا ہے، وہ مفادِ عامہ کا سہارا ہے۔ حکومت والے کہتے ہیں کہ ہسپتال جس میں علاج ومعالجہ کی سہولتیں میسر آتی ہیں۔ یہ ایک عوامی ضرورت ہے، پھر ہسپتال کے لیے سروس روڈ اور سبزہ زار بنانا ہسپتال کا بنیادی حصہ ہے۔ ایسی حالت میں مفادِ عامہ کی خاطر بہت بڑی بڑی قربانیاں دی جاسکتی ہیں۔ اگر اہم ضرورت کی تکمیل کے لیے مسجد گرائی جائے تو اس میں کونسی قباحت ہے؟ جبکہ حکومت متبادل جگہ میں اس سے اچھی مسجد بنانے کی پابند ہے۔ براہِ کرام شرعی نقطہ نظر سے یہ واضح کریں کہ ان حالات کی روشنی میں ہسپتال کے مجوزہ نقشہ پر عمل کرتے ہوئے موجودہ مسجد کو ختم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ایسی حالت میں عام مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جاننا چاہیے کہ مسلمانوں کی نماز جیسی عبادت کسی متعین مقام کے ساتھ خاص نہیں۔ کرۂ ارض کے کسی بھی پاک حصہ پر جب بندہ خالق کائنات کے سامنے سر جھکائے تو اس کی ذمہ داری فارغ ہو جاتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

قال رسول اللہ ﷺ:فضلنا علی الناس بثلاث..........جعلت لنا الأرض کلھامسجدا. (١)

ترجمہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیں پچھلی امتوں پر تین چیزوں سے فضیلت دی گئی ہے۔۔۔۔۔(جن میں ایک یہ ہے) کہ پوری زمین ہمارے لیے مسجد بنادی گئی ہے۔

لیکن اس کے باوجود باقاعدہ شرعی مسجد میں نماز پڑھنا زیادہ باعثِ ثواب اور موجبِ اجر ہے، کیوں کہ مسجد روئے زمین پر مقدس ترین قطعہ ہے۔ ایک دوسری روایت میں رحمۃ للعالمین ﷺ فرماتے ہیں:

"أحب البلاد إلی اللہ مساجد ھا. (٢)

---

(١) الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ: ١٩٩/١

(٢) الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ: ١٩٩/١

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین جگہیں مساجد ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں ''مسجد'' کا لفظ خاص حقیقت کا حامل ہے۔لغوی اعتبار سے اگر چہ ہر''جاے نماز'' کو مسجد کہنے میں کوئی حرج نہیں،لیکن مسجد کے احکام کے اجرا کے لیے''شرعی مسجد'' کا ہونا ضروری ہے جس میں باقاعدہ وقف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اس لیے ہروہ''جاے نماز''شرعی مسجد متصور ہوگی کہ مالک زمین یا مجاز ادارہ یا کوئی مجاز افسر کسی خاص قطعہ اراضی کو مسلمانوں کی عبادت گاہ کے طور پر ہمیشہ کے لیے اجازت دے کر وقف کر دے اور جب ایسی مخصوص جگہ میں ایک مسلمان نماز ادا کرے تو وقف مکمل ہو کر اس اقدام سے یہ جگہ مسجد کے نام سے تبدیل ہو جاتی ہے یہ حقیقت وقف کنندہ کی نیت اور عملی اقدام پر موقوف ہے۔کسی تحریری سند یا سرکاری انتقالات پر مسجد کا وجود موقوف نہیں۔

اعلم أنه لايشترط في تحقق كونه مسجدا البناء كمافي الخانية: لوكان له ساحة لا بناء فيها أمر قومه بالصلوة فيها بجماعة قالوا:إن أمر هم بالصلوة أبدا،أو أمرهم بالصلوة فيها باالجماعة، ولم يذكر الأبدإلاأنه أراد بها الأبد، ثم مات، لايكون ميراثا عنه.(١)

ترجمہ: ملحوظ رہے کہ مسجد کے ثبوت کے لیے اس کی عمارت ضروری نہیں۔جیسا کہ خانیہ میں لکھا ہے اگر کسی واقف کے پاس کوئی میدان ہو جس میں کوئی عمارت نہ ہو،لوگوں کو اس میں نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم کرے۔علما فرماتے ہیں کہ اگر لوگوں کو اس میں''ہمیشہ''نماز ادا کرنے کو کہے یا صرف نماز باجماعت کرنے کے لیے کہے اور ہمیشہ کا لفظ ذکر نہ کرے، لیکن اگر''ہمیشہ'' کا ارادہ ہو اور یہ شخص وفات پا جائے تو مسجد کی یہ زمین اس کی میراث شمار نہیں ہوگی۔

یہاں تک کہ اگر وقف کے الفاظ نہ بھی کہے، بلکہ صرف نیت وارادہ کر کے لوگوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے اور موت تک لوگ ایسی جگہ میں نماز پڑھتے رہیں اور اس کے ساتھ مسجد جیسا معاملہ ہو تو عرف کی وجہ سے یہ وقف متصور ہوگا،یعنی واقف کنندہ کی نیت وارادہ ہی کافی ہے۔ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

أن العرف جار بأن الأذن في الصلوة على وجه العموم، والتخلية يفيد الوقف على هذه الجهة، فكان كالتعبير به.(٢)

ترجمہ: عرف اس بات پر جاری ہے کہ نماز کے لیے اجازت عمومی طور پر دی جاتی ہے اور اس طریقے سے فارغ کرنا (خالی کرنا) مفید وقف ہوا کرتا ہے۔گویا (یہی طریقہ) وقف کرنے کی ایک تعبیر ہے۔

---

(١) حاشية الطحطاوي، كتاب الوقف، تحت قوله(وبقوله):٢/٥٣٦

(٢) فتح القدير، كتاب الوقف، فصل اختص المسجد بأحكام: ٥/٤٤٤

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جگہ کا باقاعدہ شرعی مسجد بننا کسی اتفاقی اقدام کا نتیجہ نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں نماز پڑھنے کی اجازت میں دوام واستقلال کی حقیقت مفقود ہوتو مدتوں تک جائے نماز رہنے کے باوجود اس کو شرعی مسجد نہیں کہا جائے گا۔اس میں بنیادی کردار وقف کا ہے،اس لیے وقف کنندہ جب برضاورغبت اپنی جائیداد کے کسی خاص قطعہ اراضی کو محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے عام مسلمانوں کی نماز کے لیے خاص کر کے اجازت دے تو نماز پڑھنے سے وقف تام ہوکر یہ جگہ مالک کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اوراس کی نسبت خالق کی طرف ہو جاتی ہے۔چنانچہ اس کو بیت اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے گھر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔یہ نسبت چونکہ نا قابل انتقال ہے،اس لیے ایسی جگہ سے مخلوق کے لیے ذاتی انتفاع کا حق حاصل نہیں۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

ویشکل بالمسجد، فإنه حبس علی ملك اللّٰه تعالیٰ بالإجماع.(۱)

ترجمہ: اور مسجد کے وقف میں (وقف کی تبدیلی یا واپسی) مشکل ہے۔کیوں کہ وہ بالاجماع اللہ تعالیٰ کی ملک میں بندھی ہوئی ہوتی ہے۔

یہ ایسی مضبوط اور قوی نسبت ہے کہ دنیا کے نشیب وفراز اور حالات سے متاثر نہیں ہوتی،آبادیاں مٹ سکتی ہیں قومیں ختم ہوسکتی ہیں،لیکن مسجد ہمیشہ کے لیے مسجد رہے گی۔قیامت تک مسجد اپنے تشخص کی امین ہے۔اگر چہ کوئی ایک بھی اس میں نماز پڑھنے والا نہ رہے،اس لیے فقہاے کرام فرماتے ہیں:اگر کسی جگہ کی آبادی ویرانی کا شکار ہو،کوئی اذان دینے والا باقی نہ رہے۔مسجد میں کوئی آمد ورفت نہ ہو۔پھر بھی لوگ اس کو بے فائدہ سمجھ کر اس کو گرانے اور یہ جگہ دوسرے منافع کے لیے بروئے کار لانے کا حق نہیں رکھتے۔ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

(یبقی مسجدا عندا لإمام، والثاني)أبداإلی قیام الساعة (وبه یفتی).قال ابن عابدینؒ: فلایعود میراثا، ولایجوز نقله ونقل ماله إلی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أولا،وهو الفتویٰ.(۲)

ترجمہ:

امام صاحب کے نزدیک مسجد قیامت تک مسجد ہی رہے گی اوراسی پرفتویٰ ہے۔ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ مسجد نہ میراث بنے گی اور نہ اس کا یا اس کے مال کا دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا درست ہے۔چاہے اس مسجد میں لوگ نماز پڑھتے ہوں یا نہ،اسی قول پرفتویٰ ہے۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الوقف: ٥١٩/٦

(۲) ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الوقف،مطلب فیمالو حرب المسجد: ٥٤٨/٦

ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے صورتِ مسئولہ کے بارے میں یہی رائے ہے کہ جب مسجد مالک زمین کی باقاعدہ اجازت سے بنائی گئی۔ مدتِ دراز تک اس میں باقاعدہ نماز باجماعت ادا کی گئی تو مسجد شرعی بن جانے کی وجہ سے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ ہسپتال کے مجوزہ نقشہ کے لیے اس مسجد کو گرانا اور اس کی جگہ سروس روڈ یا سبزہ زار بنانا شرعاً جائز نہیں، جیسا کہ مسجد کے ہال کا تقدس لازمی ہے، ایسا ہی مسجد کے صحن یعنی بیرونی حصہ کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ مسجد کے مصداق کے لیے چھت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ مسجد کی زمین پر چھت اور سائبان کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔ فقہائے کرام لکھتے ہیں:

اعلم أنه لایشترط في تحقق کونه مسجدا البناء ممافي الخانیة: لو کان له ساحة لا بناء فیها أمر قومه بالصلوة فیها بجماعة قالوا:إن أمر هم بالصلوة أبدا،أو أمرهم بالصلوة فیها باالجماعة، ولم یذکر الأبدإلاأنه أراد بها الأبد، ثم مات، لایکون میراثا عنه.(١)

ترجمہ:

ملحوظ رہے کہ مسجد کے ثبوت کے لیے اس کی عمارت ضروری نہیں، جیسا کہ خانیہ میں لکھا ہے اگر کسی واقف کے پاس کوئی میدان ہو جس میں کوئی عمارت نہ ہو، لوگوں کو اس میں نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم کرے۔ علما فرماتے ہیں کہ اگر لوگوں کو اس میں ''ہمیشہ'' نماز ادا کرنے کو کہے یا صرف نماز باجماعت کرنے کے لیے کہے اور ہمیشہ کا لفظ ذکر نہ کرے، لیکن اگر ''ہمیشہ'' کا ارادہ ہو اور یہ شخص وفات پا جائے تو مسجد کی یہ زمین اس کی میراث شمار نہیں ہوگی۔

اس لیے بیرونی یا اندرونی برآمدہ اور صحن غرض یہ کہ مسجد کے کسی حصہ کے تقدس کو پائے مال کرنا شرعاً حرام ہے۔ چنانچہ ہندیہ میں ہے:

قیم المسجد لایجوزله أن یبني حوانیت في حدّالمسجد،أو في فنائه؛لأنّ المسجد إذا جعل حانوتاً ومسکناً تسقط حرمته، وهذا لا یجوز، والفناء تبع المسجد، فیکون حکمه حکم المسجد.(٢)

ترجمہ: مسجد کے متولی کے لیے مسجد یا فنائے مسجد میں دُکانیں بنانا جائز نہیں، اس لیے کہ اگر مسجد دُکان یا رہنے کی جگہ بن جائے تو اس کی حرمت ساقط ہو جائے گی اور یہ جائز نہیں اور فنا چونکہ مسجد کی تابع ہوتی ہے، اس لیے وہ بھی مسجد کے حکم میں ہے۔

(١) حاشیة الطحطاوي، کتاب الوقف، تحت قوله(وبقوله):٢/٥٣٦

(٢) الفتاوی الهندیة، کتاب الوقف،الباب الحادي عشر في المسجد: ٢/٤٦٢

اس لیے از روئے شریعت کسی شخص یا ادارہ کو یہ حق نہیں کہ وہ شرعی مسجد کی عظمت سے کھیلے۔ مسجد جیسی مقدس ترین جگہ کی تبدیلی کی جرأت کرنا قہرِ خداوندی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اربابِ اختیار پر لازم ہے کہ مسجد کے تقدس کے لیے تعمیراتی نقشہ میں تبدیلی کریں تاکہ قدیم مسجد کی عظمت بحال رہے۔ دوسری مسجد بنانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ قدیم مسجد کو بروئے کار لا کر اس کو آباد کریں۔ اگر ایسے معمولی منصوبوں کی تکمیل کے لیے ہم خانہ خدا کے تقدس کا خیال نہ رکھیں تو ہندوؤں کا ''بابری مسجد'' سے توہین آمیز سلوک کرنے پر پاکستان اور پورے عالم اسلام کا سراپا احتجاج بنا بے سود کوشش ہوگی۔ ممکن ہے ہنود مسجد گرانے کے لیے ایسی کمزور توجیہات کا سہارا لے کر شعائر اللہ کا نام ونشان باقی نہ چھوڑیں۔

جہاں تک سرکاری کارندوں کا یہ کہنا کہ ہم نے مالکِ زمین سے ۵۱۳ کنال زمین خریدی جس میں مسجد کا حصہ بھی شامل ہے۔ سرکاری ملکیت ہونے کی وجہ سے حکومت کو اس میں تبدیلی کا حق حاصل ہے، درست نہیں۔ کیوں کہ خرید وفروخت اس جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ کی ہوسکتی ہے جو قابلِ انتقال اور کسی کی مِلک ہو۔ مسجد کی زمین خود مالکِ زمین کے مِلک میں نہیں، اس لیے قابلِ انتقال نہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے حصہ پر حکومت کی ملکیت کا دعوی ناقابلِ تسلیم ہے جملہ خسرہ جات کی فروخت کے وقت مسجد کی جگہ اس سے مستثنیٰ رہے گی۔

جہاں تک مفادِ عامہ کا مسئلہ ہے، یہ بھی مسجد گرانے کے جواز کے لیے چنداں مفید نہیں، کیوں کہ اس میں شک نہیں کہ مفادِ عامہ کو ذاتی مفاد کے مقابلہ میں ترجیحی حیثیت حاصل ہے، لیکن مساجد اس دائرہ سے خارج ہیں۔ مساجد خود مفادِ عامہ کا اہم حصہ ہے، اس لیے سڑک یا چمن بنانے کے لیے اس کی عظمت کو پامال کرنا جائز نہیں۔ عرف میں قومی سرمایہ یا تاریخی مقامات مفادِ عامہ سے متاثر نہیں ہوتے۔ حکومت کسی ایسے منافع بخش منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار نہیں ہوتی جس سے (مثلاً کراچی میں مزارِ قائد، اسلام آباد میں صدارتی محل یا وزیر اعظم ہاؤس) متاثر ہوں۔ کیوں کہ حکومت ان کو قومی املاک سمجھتے ہوئے ان کا تحفظ ضروری سمجھتی ہے۔ منصوبوں کے نقشے قومی ورثہ کے تحفظ کے تابع ہوتے ہیں۔ ایسے ہی مساجد مسلمانوں کے دینی اور مذہبی اثاثے ہیں جو مفادِ عامہ سے متاثر نہیں ہوتے۔ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے مذہبی سرمائے کا تحفظ کریں۔ ہر اس اقدام کو کامیاب نہ ہونے دیں جس سے مساجد کا تقدس اور عظمت مجروح ہو۔



جاے نماز یا مصلّٰی کی تبدیلی

سوال نمبر (320):

ایک سرکاری ہسپتال میں پرائیویٹ کمرے ہیں۔ جو مریضوں کو کرایہ پر دیے جاتے ہیں۔ متعلقہ ڈاکٹر نے ان کمروں میں ایک بڑا ہال مسجد کے لیے متعین کیا ہے۔ جس میں مریضوں کے لواحقین باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں۔ کیا ایسی جگہ جو حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کے لیے متعین کی گئی ہو۔ حکومت اپنے استعمال میں دوبارہ لاسکتی ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جس زمین پر جاے نماز (عارضی مسجد) بنائی جائے یا بغیر اجازت کے کسی مغصوبہ زمین پر مسجد بنائی جائے تو ایسی جگہ شرعی مسجد کے حکم میں شمار نہیں ہوتی، بلکہ یہ عارضی مسجد ہوگی اور ضرورت پڑنے پر حکومت اس کو سرکاری ضروریات میں استعمال کرسکتی ہے۔

چونکہ مذکورہ ہال کو بھی حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کے لیے متعین کیا گیا ہے، اس لیے یہ شرعی مسجد کے حکم میں نہیں، بلکہ حکومت اس کو اپنی تحویل میں لے کر تصرف کرسکتی ہے۔

والدّلیل علی ذلک:

أفاد أن الواقف لابد أن یکون مالکه وقت الوقف ملکا باتاً، ولو بسبب فاسد، وأن لایکون محجورا عن التصرف، حتی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح، وإن ملکه بعد بشراء أو صلح، ولو أجاز المالك وقف فضولي، جاز. (۱)

ترجمہ:

معلوم ہوا کہ وقف کرتے وقت واقف کا پوری طرح مالک ہونا ضروری ہے، اگرچہ کسی سبب فاسد کی وجہ سے ہو اور اسی طرح (موقوفہ زمین) میں تصرف سے منع نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ اگر غاصب نے مغصوبہ وقف کیا تو جائز نہیں۔ اگرچہ وہ بعد میں خریدنے یا صلح کرنے سے اس کا مالک بنے اور فضولی کا وقف اس وقت درست ہے، جب اصل مالک اجازت دے۔

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورۃ: ۶/۵۲۳

مسجد کے لیے متعین کردہ زمین کا تبادلہ

سوال نمبر(321):

ایک شخص نے زمین متعین کر کے اس پر مسجد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا،لیکن اب اس زمین پر وہ مارکیٹ بنانا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ متصل دوسری جگہ میں مسجد کے لیے زمین دینا چاہتا ہے تو کیا مسجد کے لیے متعین شدہ زمین کا تبادلہ کر کے دوسری جگہ مسجد بنانا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ کسی جگہ کے بارے میں صرف ارادہ کرنے سے وہ جگہ شرعی مسجد کے حکم میں شمار نہیں ہوتی، کیوں کہ کوئی زمین وقف کرنے والے کی ملکیت سے اس وقت تک خارج نہیں ہوتی، جب تک واقف لوگوں کو اپنی وقف کردہ مسجد کی جگہ پر نماز پڑھنے کی اجازت نہ دے، تاہم شرعی مسجد بننے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ اس میں باقاعدہ باجماعت نماز پڑھی جائے، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں دوسری جگہ مسجد بنانا اور اسی جگہ کو اپنی ذاتی اغراض ومقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز ہوگا۔

والدّلیل علی ذلک:

(ویزول ملکه عن المسجد والمصلی) بالفعل و(بقوله جعلته مسجدا)عند الثاني (وشرط محمدٌوالإمام الصلاة فیه بجماعة).(۱)

ترجمہ:

مسجد اور عیدگاہ سے واقف کی ملکیت اس کے فعل سے زائل ہوجاتی ہے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کے اس طرح کہنے سے زائل ہوتی ہے کہ میں نے اس کو مسجد بنایا اور امام ابو حنیفہؒ وامام محمدؒ کے نزدیک اس جگہ باجماعت نماز پڑھنے سے واقف کی ملکیت زائل ہوجاتی ہے۔

❁❁❁

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الوقف: ٦/٥٤٤، ٥٤٥

مسجد کے لیے وقف زمین پر مدرسہ بنانا

سوال نمبر(322):

ایک شخص نے مسجد کے لیے اپنی زمین وقف کرلی، اس کے چند دنوں بعد اس نے چاہا کہ اس جگہ ایک مدرسہ بنایا جائے، جبکہ اس جگہ پر ابھی تک مسجد کے لیے تعمیر شروع نہیں ہوئی ہے۔ کیا اس جگہ پر مسجد کی بجائے مدرسہ بنانا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مسجد کے لیے زمین وقف کرنے کے بعد جب لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے اور اس جگہ اذان دے کر باجماعت نماز پڑھی جائے تو یہ جگہ مسجد بن جاتی ہے، اس کو مسجد کے علاوہ کسی دوسرے مقصد، یعنی مدرسہ وغیرہ کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔

تاہم جب تک اس میں اذان دے کر باجماعت نماز نہ پڑھی جائے، وہ جگہ مسجد شرعی کے حکم میں نہیں ہوتی، لہٰذا اس جگہ پر مالک کی مِلک حسب سابق برقرار رہے گی اور مالک کو اس میں دوسرے تصرفات کا حق حاصل ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں مسجد کے لیے زمین وقف کرنے کے بعد اگر اس جگہ پر مسجد شرعی بننے سے پہلے واقف مدرسہ بنانا چاہتا ہو تو اس پر مدرسہ بنانا جائز ہے اور اگر ایک بار وہ مسجد شرعی بن چکی ہو اور اس میں اذان واقامت کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی گئی ہو تو اس جگہ پر مدرسہ بنانا جائز نہیں ہے، اگرچہ ابھی تک مسجد کی تعمیر نہیں ہوئی۔

والدلیل علی ذلک:

(ویزول ملکہ عن المسجد والمصلی) بالفعل و(بقولہ جعلتہ مسجدا)عند الثانی (وشرط محمدٌوالإمام الصلاۃ فیہ بجماعۃ).(۱)

ترجمہ:

مسجد اور عیدگاہ سے واقف کی ملکیت اس کے فعل سے زائل ہوجاتی ہے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کے اس طرح کہنے سے زائل ہوتی ہے کہ میں نے اس کو مسجد بنایا اور امام ابوحنیفہؒ وامام محمدؒ کے نزدیک اس جگہ باجماعت نماز پڑھنے سے واقف کی ملکیت زائل ہوجاتی ہے۔

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الوقف: ۶/ ۵۴۴،۵۴۵

کسی مدرسے کا ہال مسجد کے نام سے خاص کردینے سے مسجد بننا

سوال نمبر(323):

ایک مدرسہ جس کے قریب کوئی مسجد نہ ہو، اگر اس کے انتظامیہ والے مدرسہ کے ایک بڑے ہال کو مسجد کی نیت سے خاص کردے کہ وہ ہمارے لیے مسجد ہوگی اور اذان واقامت کر کے اس میں باجماعت نماز ادا کی جانے لگے اور باہر سے جو لوگ آتے ہیں، وہ بھی اس میں نماز پڑھتے ہیں تو کیا یہ جگہ مسجد شرعی بن جاتی ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

زمین کا کوئی حصہ باقاعدہ طور پر مسجد کی نیت سے نمازیوں کے لیے خاص کیا جائے اور اس میں اذان و اقامت کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی جائے تو اس حصہ زمین کا حکم مسجد شرعی کا ہے۔

صورتِ مسئولہ میں جب مدرسہ کے انتظامیہ نے مدرسہ کا ایک ہال مسجد قرار دینے کی نیت سے خاص کیا اور اس میں اذان واقامت کر کے باجماعت نماز پڑھی گئی اور لوگوں کو بھی نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی تو اب مدرسے کا یہ حصہ مسجد شمار ہوگا اور اس پر مسجد کے احکام جاری ہوں گے۔ ہاں اگر صرف ضرورت پوری کرنے کے لیے ہال متعین ہو تو یہ وقف کے حکم میں نہیں، لہٰذا یہ مسجد شرعی بھی نہیں۔

والدلیل علی ذلک:

(ویزول ملکه عن المسجد والمصلی) بالفعل و(بقوله جعلته مسجدا)عند الثاني (وشرط محمدؒوالإمام الصلاة فيه بجماعة).(۱)

ترجمہ:

مسجد اور عیدگاہ سے واقف کی ملکیت اس کے فعل سے زائل ہوجاتی ہے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کے اس طرح کہنے سے زائل ہوتی ہے کہ میں نے اس کو مسجد بنایا اور امام ابوحنیفہؒ وامام محمدؒ کے نزدیک اس جگہ باجماعت نماز پڑھنے سے واقف کی ملکیت زائل ہوجاتی ہے۔

❁❁❁❁❁

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الوقف: ۶/۵۴۴،۵۴۵

مصادر و مراجع

نمبرشمار	نام کتاب	نام مصنف	ناشر
		ألف	
۱	إرشاد السّاري إلی مناسك الملاعلي القاري	حسين بن محمدسعيد عبدالغني المكي	دار الكتب العلمية بيروت
۲	أحكام القرآن	ظفرأحمد العثماني (۱۳۹٤هـ)	إدارة القرآن والعلوم الإسلامية كراچی
۳	أحكام القرآن	أبو بكر أحمد بن علي الرازي الجصاص الحنفي (۳۷۰هـ)	سهيل اكيڈمی لاهور
٤	إسلامی تهذيب وتمدن اردوترجمه "التشبه في الإسلام"	قاری محمد طيب قاسمي (۱٤۰۳هـ)	إداره إسلاميات لاهور
٥	إعلاء السنن	ظفرأحمد العثماني (۱۳۹٤هـ)	دارالكتب العلمية بيروت
٦	إعلام الموقّعين	ابن القيم الجوزية (۷٥۱هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
۷	الإتقان في علوم القرآن	جلال الدين السيوطي (۹۱۱هـ)	سهيل اكيڈمی لاهور
۸	الاختيارلتعليل المختار	أبوالفضل عبد اللّٰه الموصلي (٦۸۳هـ)	دارالمعرفة بيروت لبنان
۹	الاستصناع	سعودبن مسعد الثبيتي	دارابن حزم بيروت
۱۰	الاعتصام	أبوإسحاق إبراهيم الشاطبي (۷۹۰هـ)	مكتبه رشيديه پشاور
۱۱	الأشباه والنظائر	زين الدين بن إبراهيم ابن نجيم (۹۷۰هـ)	ايچ ايم سعيد كراچي
۱۲	البحر الرائق	ابن نجيم (۹۷۰هـ)	دارالكتب العلمية بيروت

الرقم	الكتاب	المؤلف	الناشر
١٣	البداية والنهاية	إسماعيل ابن كثير (٧٧٤هـ)	دارالفكر بيروت
١٤	الترغيب والترهيب	زكي الدين عبدالعظيم بن عبدالقوي المنذري (٦٥٦هـ)	دارإحياء التراث العربي بيروت
١٥	التشريع الجنائي الإسلامي	عبدالقادر عودة	مؤسسة الرسالة بيروت
١٦	التعليق الصّبيح	محمد إدريس الكاندهلوي (١٣٩٤هـ)	المكتبة العثمانية لاهور
١٧	التعليق الميسر على حاشية الروض الأزهر في شرح الفقه الاكبر	الشيخ الوهبي سليمان الغاوجي	دار البشائر الإسلامية بيروت
١٨	التفسيرالكبير	فخر الدين الرازي (٦٠٦هـ)	دارإحياء التراث العربي لبنان
١٩	التلخيص الحبير	ابن حجر العسقلاني (٨٥٢هـ)	المكتبة الا ثرية شيخو پوره
٢٠	الجامع لأحكام القرآن للقرطبي	محمد القرطبي (٦٧١هـ)	دارإحياء التراث العربي لبنان
٢١	الجوهرة النيرة	أبوبكربن علي بن محمدالزبيدي (٨٠٠هـ)	دارالكتب العلمية لبنان
٢٢	الحيلة الناجزة	أشرف علي التهانوي (١٣٦٢هـ)	دارالإشاعت كراچی
٢٣	الدّرالمختار مع ردالمحتار	محمد بن علي الحصكفي (١٠٨٨هـ)	مكتبه إمداديه ملتان
٢٤	الدّرالمنتقى على هامش مجمع الأنهر	ملا علي بن سلطان القاري (١٠١٤هـ)	دار احياء التراث العربي بيروت لبنان
٢٥	الزهد الكبيرللبيهقي	أبوبكر أحمد بن الحسين البيهقي (٤٥٨هـ)	دارالجنان بيروت لبنان
٢٦	الشريفية شرح السراجية	السيدالشريف علي الجرجاني (٨١٦هـ)	المكتبة الحقانية پشاور
٢٧	السنن الكبرى للنسائي	أحمد النسائي (٣٠٣هـ)	مؤسسة الرسالة بيروت لبنان

۲۸	السنن الكبرى للبيهقي	أبوبكر أحمد بن الحسين البيهقي (۴۵۸هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
۲۹	السّراجی فی المیراث	محمدبن عبدالرشيد السجاوندي (۶۰۰هـ)	المیزان لاهور
۳۰	السّعاية	محمد عبدالحي اللكهنوي (۱۳۰۴هـ)	سهيل اكيڈمی لاهور
۳۱	الشمائل المحمدية للترمذي	محمد بن عيسى الترمذي (۲۷۹هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
۳۲	العرف الشذي	أنورشاه الكشميري (۱۳۵۲هـ)	دار إحياء التراث العربي بيروت
۳۳	العقائد الإسلامية	سيد سابق (۱۴۲۰هـ)	دار الكتاب العربي
۳۴	العقيدة في الله	عمرسليمان الأشقر (۱۴۳۳هـ)	مكتبة الفلاح الكويت
۳۵	العناية على هامش فتح القدير	أكمل الدين محمدبن محمد البابرتي (۷۸۶هـ)	المكتبة الحقانية بشاور
۳۶	الفتاوى البزازية على هامش الفتاوى الهندية	محمد بن شهاب الكردي (۸۲۷هـ)	مکتبه رشیدیه کوئٹه، دارالكتب العلمية بيروت
۳۷	الفتاوى الخانية على هامش الفتاوى الهندية	فخرالدين حسن بن منصور الأوزجندي (۵۹۲هـ)	مکتبه رشیدیه کوئٹه
۳۸	الفتاوى الكاملية في الحوادث الطرابلسية	محمد كامل بن مصطفى الطرابلسي (۱۳۱۵هـ)	المكتبة الحقانية بشاور
۳۹	الفتاوى الهندية (العالمگيرية)	شيخ نظام وجماعة من علماء الهند	مکتبه رشیدیه کوئٹه
۴۰	الفتاوى التاتارخانية	عالم بن العلاء الدهلوي (۷۸۶هـ)	دارإحياء التراث العربي بيروت
۴۱	الفقه الحنفي وأدلته	أسعد محمد سعيد الصاغرجي	دارالكلم الطيب بيروت لبنان

٤٢	الفقه الإسلامي وأدلته	د.وهبة الزحيلي (١٤٣٦هـ)	دارإحسان دمشق
٤٣	القاموس الجديد	وحيد الزمان قاسمي كيرانوي (١٤١٥هـ)	إداره إسلاميات لاهور كراچي
٤٤	الكفاية على هامش فتح القدير	جلال الدين الخوارزمي(٧٦٩هـ)	مكتبه حقانيه پشاور
٤٥	المبسوط للسرخسي	شمس الأئمة السرخسي (٤٨٣هـ)	دارالكتب العلمية بيروت
٤٦	المبسوط للشيباني	محمد بن الحسن الشيباني (١٨٩هـ)	دارالمعارف النعمانية لاهور
٤٧	المجموع شرح المهذب	محي الدين أبوزكريا يحيىٰ بن شرف النووي (٦٧٦هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٤٨	المحيط البرهاني في الفقه النعماني	محمودبن أحمدبن عبدالعزيز عمربن مازة البخاري (٦١٦هـ)	المكتبة الغفارية كوئته
٤٩	المختصرللقدوري	أبوالحسين أحمد القدوري (٤٢٨هـ)	الميزان لاهور
٥٠	المدخل	محمدبن محمد العبدري المالكي المعروف بابن الحاج (٧٢٧هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٥١	المسامرة على المسايرة	كمال الدين محمد بن محمد ابن أبي الشريف (٩٠٦هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٥٢	المستدرك على الصحيحين	أبوعبدالله محمدبن عبدالله الحاكم النيسابوري (٤٠٥هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٥٣	المسلك المتقسط في المسلك المتوسط على هامش إرشادالساري	الملا علي بن سلطان القاري (١٠١٤هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
٥٤	المصنف لابن أبي شيبة	الإمام أبوبكر عبد الله بن محمد ابن أبي شيبة (٢٣٥هـ)	إدارة القرآن والعلوم الإسلامية كراچي، طيب إكادمي ملتان

٥٥	المعجم الأوسط	الحافظ سليمان الطبراني(٣٦٠هـ)	مكتبة المعارف الرياض
٥٦	المعجم الكبيرللطبراني	الحافظ أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني (٣٦٠هـ)	شركة معمل و مطبعة الزهراء الحديثة المحدودة عراق
٥٧	المغني على الشرح الكبير	للإمامين موفق الدين(٦٢٠هـ) و شمس الدين ابني قدامة(٦٨٣هـ)	المكتبة التجارية المكةالمكرمة
٥٨	المفهم شرح صحيح مسلم	أحمد بن عمر بن إبراهيم القرطبي (٦٥٦هـ)	دارابن كثيردمشق، دارالكلم الطيب بيروت لبنان
٥٩	المنجد في اللغة والأعلام	جماعة علماء المستشرقين	دار المشرق بيروت لبنان
٦٠	الموافقات في أصول الأحكام	أبو إسحاق إبراهيم بن موسى اللخمي الشاطبي (٧٩٠هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
٦١	الموسوعة الفقهية الكويتية	وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية الكويت	طباعة ذات السلاسل الكويت
٦٢	الموضوعات الكبرىٰ	ملاعلي بن سلطان القاري (١٠١٤هـ)	مكتبه دارالسلام پشاور
٦٣	النبراس شرح شرح العقائد	عبد العزيز فرهاروي (١٢٣٩هـ)	المكتبة الحقانية ملتان
٦٤	النتف في الفتاوىٰ	علي بن الحسين السغدي (٤٦١هـ)	موسسة الرسالة بيروت دار الفرقان عمان
٦٥	النّهر الفائق	عمر بن إبراهيم بن نجيم (١٠٠٥هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه
٦٦	الوجيز	عبد الكريم زيدان (١٤٣٥هـ)	فاران اكيڈمی لاهور
٦٧	الوسيط في شرح القانون المدني	عبدالرزاق السنهوري (١٣٩١هـ)	دارإحياء التراث العربي، بيروت
٦٨	الهداية	برهان الدين أبو الحسن علي بن أبي بكر المرغيناني (٥٩٣هـ)	مكتبه رحمانيه لاهور

٦٩	اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة	جلال الدين عبد الرحمن السيوطي (٩١١هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٧٠	الأحكام السلطانية	علي بن محمد الماوردي (٤٥٠هـ)	نفيس اكيڈمی کراچی
٧١	كفاية الأخيار في حل غاية الاختصار	تقي الدين أبوبكر بن محمد الحصيني (٨٣٩هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
٧٢	الإتقان في علوم القرآن	جلال الدين عبدالرحمن السيوطي (٩١١هـ)	سهيل اكيڈمی لاهور
٧٣	الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف	علاؤالدين علي بن سليمان المرداوي (٨٨٥هـ)	دارإحياء التراث العربي بيروت
٧٤	إمدادالفتاوی	أشرف علي التهانوي (١٣٦٢هـ)	مكتبه دارالعلوم كراچی
٧٥	أوجز المسالك	محمدزكريا الكاندهلوي (١٣٠٢هـ)	مكتبه إمداديه ملتان
٧٦	اوزان شرعيه	مفتي محمد شفيع (١٣٩٦هـ)	إدارة المعارف كراچی
٧٧	آكام المرجان في أحكام الجان	بدر الدين أبوعبد الله محمد بن عبد الله الشبلي (٧٦٩هـ)	كارخانه تجارت كتب كراچی
٧٨	أشرف التوضيح	نذير أحمد (١٤٢٥هـ)	مكتبة العارفي فيصل آباد

ب

٧٩	بدائع الصّنائع في ترتيب الشّرائع	علاء الدين أبوبكربن مسعود الكاساني (٥٨٧هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٨٠	بداية المجتهد ونهاية المقتصد	ابن رشد محمدبن أحمد القرطبي (٥٩٥هـ)	مكتبة نزار مصطفي الباز مكة المكرمة
٨١	بذل المجهود في حل أبي داؤد	خليل أحمد السهارنفوري (١٣٤٦هـ)	دار اللو ئ للنشر و التوزيع الرياض

ت

۸۲	تاريخ التشريع الإسلامي	منّاع القطان (۱٤۲۰هـ)	موسسة الرسالة بيروت لبنان
۸۳	تبصرة الحكّام في أصول الأقضية ومناهج الأحكام	إبراهيم بن علي ابن فرحون المالكى (۷۹۹هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
۸٤	تبيين الحقائق في شرح كنزالدّقائق	فخرالدين عثمان بن علي الزيلعي (۷٤۳هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
۸٥	تحفة الفقهآء	علاء الدين السمر قندي (۵۷۵هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
۸٦	تفسير المظهري	محمد ثناء الله پانى پتى (۱۲۲۵هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه پاكستان
۸۷	تفسيرالقرآن الكريم	عمادالدين إسماعيل بن كثير (۷۷٤هـ)	مكتبه إمداديه مكة المكرمة
۸۸	تفسير أبي السعود	أبو السعود محمد بن محمد (۹۸۲هـ)	دار إحياء التراث العربي بيروت
۸۹	تقرير ترمذي	محمد تقي العثماني	ميمن إسلامك پبلشرزكراچي
۹۰	تقريرات الرافعي	محمدرشيد بن عبداللطيف البيساري الرافعي(۱۳۲۳هـ)	مكتبه إمداديه ملتان
۹۱	تقليدكى شرعى حيثيت	محمد تقي العثماني	ميمن إسلامك پبلشرز كراچي
۹۲	تكملة البحرالرائق	محمدبن حسين بن علي الطوري (۱۱۳۸هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
۹۳	قرة عيون الأخيار تكملة ردالمحتار	محمدعلاء الدين بن محمدأمين ابن عابدين (۱۳۰٦هـ)	مكتبه إمداديه ملتان
۹٤	تكملة عمدة الرعاية على شرح الوقاية	مولانا فتح محمد التائب (۱۳۲۷هـ)	مكتبه رحمانية اقراء سنٹر غزنى سٹريٹ اردو بازار لاهور

٩٥	تكملة فتح الملهم	محمدتقي العثماني	مكتبه دارالعلوم كراچي
٩٦	تنوير الأبصار مع الدرالمختار	محمد بن عبدالله بن أحمد التمرتاشي (١٠٠٤هـ)	مكتبه إمداديه ملتان

ج، ح، خ، د

٩٧	جامع البيان المعروف تفسيرالطبري	أبو جعفر محمدبن جرير الطبري (٣١٠هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
٩٨	جامع الترمذي	أبوعيسىٰ محمدبن عيسى الترمذي (٢٧٩هـ)	الميزان، لاهور
٩٩	جامع الرموز	شمس الدين محمد القهستاني (٩٥٣هـ)	ايچ۔ ايم۔ سعيد كراچی
١٠٠	جوا هرالفقه	مفتي محمد شفيع (١٣٩٦هـ)	مكتبه دارالعلوم كراچی
١٠١	حاشية الشلبي على تبين الحقائق	شهاب الدين أحمد بن يونس الشلبي (١٠١٠هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
١٠٢	حاشية الموسوعة الفقهية الكويتية	وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية	طباعة ذات السلاسل الكويت
١٠٣	حاشية الهداية	محمد عبد الحيّ اللكهنوي (١٣٠٤هـ)	مكتبه رحمانيه لاهور
١٠٤	حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح	أحمد بن محمد الطحطاوي الحنفي (١٢٣١هـ)	المكتبةالعربية كوئته
١٠٥	حاشية على البناية في شرح الهداية	ناصرالإسلام محمد عمر رامفوري (١٢٩٥هـ)	مكتبه رشيديه كوئته
١٠٦	حجة الله البالغة	شاه ولي الله أحمد الدهلوي (١١٧٦هـ)	المكتبة السلفيةلاهور

الرقم	الكتاب	المؤلف	الناشر
١٠٧	خلاصه التحقيق في حكم التقليد و التلفيق	عبد الغني النابلسي (١١٤٣هـ)	مكتبة الحقيقة استنبول، تركيا
١٠٨	خلاصة الفتاوى	طاهربن أحمد البخاري (٥٤٢هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه
١٠٩	درر الحكام شرح مجلة الأحكام	علي حيدر (١٢٥٤هـ)	المكتبة العربية كوئٹه
		ر، س، ش	
١١٠	رحمة الأمة في اختلاف الآئمة	أبو عبد الله محمد بن عبد الرحمن قاضي صفد (٧٨٠هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
١١١	ردّالمحتار على الدّرالمختار	محمدأمين ابن عابدين (١٢٥٢هـ)	مكتبه امداديه ملتان
١١٢	روح المعاني	شهاب الدين محمود الآلوسي البغدادي (١٢٧٠هـ)	دار إحياء التراث العربي بيروت لبنان
١١٣	سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد	شمس الدين محمد بن يوسف الشامي (٩٤٢هـ)	دار الكتب العلمية بيروت، لبنان
١١٤	سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة	محمد ناصرالدين الألباني (١٤٢٠هـ)	المكتب الإسلامي بيروت
١١٥	سنن الدارمي	عبدالله بن عبد الرحمن الدارمي (٢٥٥هـ)	قديمى كتب خانه كراچي
١١٦	سنن النسائي	أبو عبد الرحمن أحمدبن شعيب الخراساني النسائي (٣٠٣هـ)	مكتبه رحمانيه اردو بازار لاهور
١١٧	سنن أبي داؤد	سليمان بن الأشعث السجستاني (٢٧٥هـ)	ايچ ايم سعيد كراچي
١١٨	سنن الدارقطني	علي بن عمر الدار قطني (٣٨٥هـ)	داراالكتب العلمية بيروت لبنان

۱۱۹	شرح السّنة	الحسين بن مسعود البغوي (۵۱۰هـ)	المكتب الإسلامي بيروت، لبنان
۱۲۰	شرح العقائد النّسفية	مسعود بن عمر التفتازاني (۷۹۳هـ)	مکتبه حقانيه پشاور
۱۲۱	شرح العقيدة الطحاوية	ابن أبي العزّ الحنفي (۷۹۲هـ)	قديمی کتب خانه کراچی
۱۲۲	شرح المجلّة	سليم رستم باز اللبناني (۱۳۳۸هـ)	المكتبةالحبيبية كوئٹه
۱۲۳	شرح المجلة	خالد الأتاسي (۱۳۲٦هـ)	المكتبةالحقانية پشاور
۱۲٤	شرح النقاية	علي بن محمدسلطان القاري (۱۰۱٤هـ)	ايچ ايم سعيد كمپنی کراچی
۱۲۵	شرح الوقاية	عبيدالله بن مسعود (۷٤۷هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه
۱۲٦	شرح صحيح البخاري لابن بطال	أبو الحسن علي بن خلف بن عبد الملك (٤٤۹هـ)	مكتبة الرشد الرياض
۱۲۷	شرح عقود رسم المفتي لابن عابدين	محمدأمين الشهير بابن عابدين (۱۲٤۳هـ)	مكتبة البشرى كراچی
۱۲۸	شرح مسلم للنووي	يحيى بن شرف النووي (٦۷٦هـ)	مكتبه دارالفكر بيروت لبنان
۱۲۹	شرح معاني الآثار	أحمدبن محمد الطحاوي (۳۲۱هـ)	ايچ ايم سعيد كمپنی کراچی
۱۳۰	شعب الإيمان للبيهقي	أبوبكر أحمد بن الحسين البيهقي (٤۵۸هـ)	دارالكتب العلميه بيروت لبنان

ص، ع، غ

۱۳۱	صحيح ابن حبان	محمد بن حبان (۳۵٤هـ)	مكتبة دارالفكر بيروت لبنان

١٣٢	صحيح البخاري	محمدبن إسماعيل البخاري (٢٥٦هـ)	قديمى كتب خانه كراچي
١٣٣	صحيح مسلم	مسلم بن الحجاج القشيري (٢٦١هـ)	قديمي كتب خانه كراچي
١٣٤	عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد	شاه ولي الله الدهلوي (١١٧٦هـ)	دار الفتح الشارقه
١٣٥	علوم الحديث	عبيدالله أسعدي	مجلس نشريات إسلام كراچي
١٣٦	علوم القرآن	محمد تقي عثماني	مكتبه دارالعلوم كراچي
١٣٧	عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية	محمد عبد الحي اللكهنوي (١٣٠٤هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه
١٣٨	عمدة القاري شرح صحيح البخاري	العلامة بدرالدين العيني (٨٥٥هـ)	دار إحياء التّرا ث العربي بيروت لبنان
١٣٩	عون المعبود شرح سنن أبي داؤد	محمدشمس الحق عظيم آبادي (١٣٢٩هـ)	دارالفكربيروت، لبنان
١٤٠	غمز عيون البصائر شرح الأشباه والنظائر	أحمدبن محمد الحموي (١٠٩٨هـ)	إدارة القرآن والعلوم الإسلامية، كراچی
١٤١	غنية الناسك في بغية المناسك	محمد حسن شاه المهاجر المكي (١٣٤٦هـ)	مكتبه ادارة القرآن والعلوم الإسلامية كراچي
١٤٢	غنيةالمستملي المعروف بالحلبي الكبيري	إبراهيم الحلبي (٩٥٦هـ)	مكتبه نعمانيه كوئٹه

ف

١٤٣	فتاوىٰ ابن تيميه	تقي الدين ابن تيميه (٧٢٨هـ)	تحت إشراف الرئاسة العامة لشئون الحرمين الشريفين
١٤٤	فتاوىٰ المرأة المسلمة	جماعة من علماء العرب	دارالفكر بيروت لبنان

١٤٥	فتاوی خیریة علی هامش تنقیح الفتاوی الحامدية	خیر الدین الرملی (١٠٨١ھ)	مکتبه حقانیه پشاور پاکستان
١٤٦	فتاوی رشیدیه	رشیدأحمدگنگوهي(١٣٢٣ھ)	مؤتمرالمصنفین اکوڑه خٹك
١٤٧	فتح الباري	أحمد بن علي بن حجر العسقلاني (٨٥٢ھ)	دارالفکر بیروت، لبنان
١٤٨	فتح الغفار شرح المنار	زین الدین بن إبراهیم ابن نجیم(٩٧٠ھ)	مکتبه اسلامیه، کوئٹه
١٤٩	فتح القدير الجامع بين فني الرواية والدراية من علم التفسير	محمد بن علي بن محمد الشوكاني (١٢٥٠ھ)	دار الفکر بیروت لبنان
١٥٠	فتح القدير	ابن الهمام كمال الدين محمدبن عبدالواحد (٨٦١ھ)	مکتبه حقانیه پشاور پاکستان
١٥١	فتح الملهم شرح صحيح مسلم	شبیرأحمد العثماني(١٣٦٩ھ)	مکتبه دارالعلوم کراچي
١٥٢	فقه السنة	السيد السابق (١٤٢٠ھ)	دار ابن کثیر دمشق لبنان
١٥٣	فيض الباري على صحيح البخاري	محمد أنورشاه الكشميري (١٣٥٢ھ)	مکتبه حقانیه پشاور
١٥٤	فيض القدير شرح الجامع الصغير	محمد عبد الرؤوف المناوي (١٠٣١ھ)	دارالکتب العلمية بيروت، لبنان

ق، ک

١٥٥	قاموس الفقه	سیف الله رحمانی	زم زم پبلشرز کراچي
١٥٦	كتاب التعريفات	سید شریف الجرجاني(٨١٦ھ)	دارالمنارللطباعة والنشر
١٥٧	كتاب الفقه على المذاهب الأربعة	عبدالرحمن بن محمدعوض الجزيري (١٣٦٠ھ)	وحیدي کتب خانه پشاور
١٥٨	كتاب الأموال	أبو عبيد قاسم بن سلام (٢٢٤ھ)	دارالکتب العلمية بيروت

١٥٩	كشاف القناع عن متن الإقناع	منصور بن يونس البهوتي (١٠٥١هـ)	دار الكتب العلميه بيروت
١٦٠	كشف الأسرار	أبو البركات عبدالله بن أحمد حافظ الدين النسفي (٧١٠هـ)	دارالكتب العلمية بيروت
١٦١	كفايت المفتى	مفتى كفايت الله دهلوی (١٣٥٢هـ)	دارالاشاعت كراچی
١٦٢	كنزالدّقائق	أبو البركات عبدالله بن أحمد حافظ الدين النسفي (٧١٠هـ)	ايچ ايم سعيد كمپنى كراچى
١٦٣	كنزالعمال	علاء الدين المتقي الهندي (٩٧٥هـ)	اداره تاليفات اشرفيه ملتان پاكستان

ل،م

١٦٤	لسان الحكام	إبراهيم بن محمد، المعروف بابن الشحنة الحلبي (٨٨٢هـ)	البابي الحلبي القاهرة
١٦٥	لسان العرب	محمد بن منظور الافريقي (٧١١هـ)	دارإحياء التراث العربي بيروت
١٦٦	ماهنامه العصرپشاور	مفتى غلام الرحمن	جامعه عثمانيه پشاور
١٦٧	مجلة الأحكام العدلية	لجنة العلماء المحققين	مير محمد كتب خانه كراچى
١٦٨	مجمع الأنهرشرح ملتقى الأبحر	عبدالله بن محمد بن سليمان داماداُفندي (١٠٧٨هـ)	دارإحياء التراث العربي‌بيروت
١٦٩	مجمع الزوائد	نور الدين علي بن أبي بكرالهيثمي (٨٠٧هـ)	دار الكتب العلمية بيروت
١٧٠	مجموعه قوانين اسلامى	ڈاكٹرتنزيل الرحمن	اداره تحقيقات اسلامى اسلام آباد
١٧١	مجموعة رسائل ابن عابدين	محمدأمين ابن عابدين (١٢٤٣هـ)	سهيل اكيڈمي لاهور

۱۷۲	مجموعة رسائل اللكهنوي	عبدالحي اللكهنوي (١٣٠٤هـ)	إدارة القران كراجي
۱۷۳	مرقاة المفاتيح	ملا علي بن سلطان القاري (١٠١٤هـ)	المكتبة الحقانية بشاور
۱۷٤	مسند الإمام أحمد	أحمد بن حنبل (٢٤١هـ)	دار إحياء التراث العربي بيروت
۱۷٥	مسند أبي عوانة	أبو عوانه يعقوب بن إسحاق الأسفرائيني (٣١٦هـ)	دار المعرفة بيروت
۱۷٦	مسند أبي يعلى الموصلي	أحمدبن علي الموصلي(٣٠٧هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
۱۷۷	مشكوة المصابيح	محمدبن عبدالله الخطيب التبريزي (٧٣٧هـ)	المكتبة الحقانيه بشاور
۱۷۸	مصنف عبدالرزاق	أبو بكر عبد الرزاق بن همام الصنعاني(٢١١هـ)	إدارة القران والعلوم الاسلاميه كراجي
۱۷۹	معارف السنن	محمديوسف البنوري (١٣٩٧هـ)	ايچ۔ ايم ۔سعيد كراجي
۱۸۰	معجم لغة الفقهاء	محمد رواس قلعه جي (١٤٣٥هـ)	دارالنفائس بيروت
۱۸۱	معين الحكام	علاء الدين علي بن خليل الطرابلسي (٨٤٤هـ)	مكتبة القدس كوئله
۱۸۲	مغني المحتاج	محمدبن أحمد الخطيب الشربيني(٩٧٧هـ)	دارالذخائرللمطبوعات قم إيران
۱۸۳	مفردات غريب القرآن	الحسين بن محمد الراغب الأصفهاني (٥٠٢هـ)	دارالقلم دمشق
۱۸٤	منحةالخالق على البحرالرائق	محمدأمين ابن عابدين (١٢٤٣هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
۱۸٥	منهاج السنن شرح جامع السنن	المفتي محمد فريد(١٤٣٢هـ)	مكتبه حقانيه بشاور

۱۸۶	موارد الظمآن إلى زوائد ابن حبان	نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي (۸۰۷هـ)	المطبعة السلفية و مكتبتها بيروت
۱۸۷	موسوعة الفقه الإسلامي المعاصر	عبد الحليم عويس (۱٤۳۳هـ)	دار الوفاء منصورة
۱۸۸	موطا الإمام مالك	مالك بن انس (۱۷۹هـ)	الميزان لاهور
۱۸۹	نفع المفتي والسائل	عبد الحي اللكهنوي (۱۳۰٤هـ)	ايچ ايم سعيد كمپنى كراچي
		ن	
۱۹۰	نور الأنوار	ملاأحمدجيون (۱۱۳۰هـ)	مير محمد كتب خانه كراچى
۱۹۱	نيل الأوطار	محمدبن علي بن محمد الشوكاني (۱۲۵۰هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان


العصر اکیڈمی پشاور
AL-ASR ACADEMY
ihsan.usmani@gmail.com
+92 333-9273561 / +92 321-9273561
+92 312-0203561 / +92 315-4499203